

دل گداز تحریروں کا، زندگی کی تصویریں

کراچی

سچی کہانیاں

مقامی

June

2014

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس شمارے میں:

- ☆ ہزاروں لپٹ گئے مگر کوہِ حیاتوں کشمیر، دیر، مالاوی خان
- ☆ لالہ مرگئی اسلام آباد، لالہ احمد، لالہ چستان اور کراچی سے موصولہ درد، خیر کی کہانیاں
- ☆ خیال و لپٹ سلسلہ "تین مہرہ تین کہانیاں"
- ☆ مسئلہ ہے "قرآنی آیات کی روشنی میں" آپ کے مسائل کا حل

156 **ادھوری محبت**
نسیم سحر

ادھوری محبت کا شکار،
ایک مرد کی کتھا.....

191 **بیٹی بھی جلتی ہے**
عادل حسین

مردوں کے انا کی بھینٹ
چڑھنے والی ایک بیٹی کی کہانی

218 **پسند اپنی اپنی**
عابد حسین

محبوبہ کے گھر کو لٹنے والے
محبوب ڈاکو کی اثر انگیز کہانی

234 **بکھرا موتی چن لیا**
شازیہ گل

راگ نمبر کے ذریعے زندگی
کا روپ پانے والی کہانی

252 **سنگِ ملامت**
امتیاز حسین ملک

وقت کے ہاتھوں چت ہو جانے
والے ایک کرل کی داستانِ ملامت

148 **کہاں آ کے لئے کارواں**
ایم اشفاق بیٹ

محبت کے قافلے میں لٹنے
والے خزاں رسیدہ شخص کی کتھا

184 **نصیب کی بارش**
طارق محمود آکاش

خواہشات کو خون میں رنگنے
والی ایک حسینہ کی داستان

200 **مکھنی**
ارشاد علی ارشد

خیال اور حقیقت کی قید سے
آزاد ایک عجوبہ لڑکی کی داستان

230 **امانت**
نصرت سرفراز

ہمدردی کے دیپ جلاتی
ایک خوب صورت تحریر

248 **سخن آباد**
قارئین

شعراء کے کلام سے آباد
ایک سخن فہم سلسلہ خاص

136 **سلونی**
شانستہ میر آزاد

دولت کی بوس میں گرفتار
ایک باپ کی داستانِ ملامت

162 **ناگن**
اعجاز احمد نواب

ہزاروں سال کی تپسیا پر
پھیلا زندگی کا ایک رنگ

195 **اپنا بویا کاٹ رہی ہوں**
شکیلہ انجم طارق

لاہور سے، ماں کے روپ
میں ایک ڈائن کی داستان

224 **جنت نظیر میرا کشمیر**
عزوبہ عتقان

کشمیر کی حسین وادیوں میں
جہنم لیتی بہادری کی داستان

238 **مسئلہ**
احارہ

آپ کے مسائل کا حل،
جتنی کہانیاں کا لازوال سلسلہ

10 **احوال**
محبوب

قارئین کے خطوط اور حال
احوال کا دلچسپ سلسلہ

62 **ایک ہی راستہ**
مریم شاہ بخاری

سرگودھا سے، ایک معصوم
بچی کے انتقام کی جاگتی تصویر

84 **پانچ پریاں**
شکیلہ احمد اصدانی

ذریعہ غازی خان سے، ایک
نوجوان کی عبرت خیز داستان

97 **امرِ رتی**
غلام مصطفیٰ خان

مظفر گڑھ سے مردوں کے
ستم کی شکار، امر کی کہانی

116 **آتش جنوں**
سلیم فاروقی

چٹان سا حوصلہ رکھنے والے
ایک نوجوان کی سرگزشت

08 **کچھ اپنی باتیں**
کاشی چوہان

اپنے قارئین سے مخاطب
مدیر کی کچھ دلداریاں

46 **خواہشات نا آسودہ**
گونیشیر

مایوس زندگی میں رنگ
بھرتی ایک اچھوتی کہانی

80 **انتقام**
محمد اسلم آزاد

بلوچستان سے، ایک نوجوان
کے انتقام کی لرزہ خیز داستان

94 **بھرم ٹوٹ گیا**
سویرا فلک

بیوی کے طعنوں سے تنگ
ایک قاتل مرد کی سچ بیانی

107 **شریکِ سفر**
نہیسا فضل

بیتے لمحات میں قید ایک
عورت کی سچ بیانی.....

07 **ممتا**
منزہ سحام

روح میں اترتی ایک
سچ بیانی، کراچی سے

31 **حلالہ**
م. ص. ایمین

روح میں اترتی ایک
سچ بیانی، کراچی سے

67 **خارزار ہے زندگی**
ام مناٹل

خارزار سے بھرپور دکھوں کی
گود میں پلتی ایک سچ بیانی

87 **خواہشوں کا اسیر**
جسٹینر شہزاد

چالاکیوں سے بھرپور ایک
سچ بیانی، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے

104 **معصوم بچیاں**
مالا سرفراز

معصوم زندگیوں کے گرد
گھومتی ایک سبق آموز کہانی

فون: 34930470 - 34939823 / 021-34939823 / برسرِ سہام جی الدین ممائی سٹی پریس OB-7 ٹیکہ روڈ کراچی

دور: 34939823 / 34939823 / 34939823 / 34939823 / 34939823 / 34939823 / 34939823 / 34939823 / 34939823 / 34939823

SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریجن
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریجن
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



ممننا

کچھ دن قبل بڑے جوش و خروش سے ماؤں کا دن منایا گیا۔ صبح سے مختلف ٹی وی چینلز پر اکثر مائیں جن کا تعلق شو بزنس سے تھا اپنے بچوں کے ساتھ موجود تھیں۔ جن کی مائیں حیات نہیں تھیں، وہ اپنی ماؤں کو نم آنکھوں سے یاد کر رہے تھے۔ کچھ ایسی مائیں بھی موجود تھیں جن کو ان کی اولاد نے ایدھی ہوم میں بھجوا دیا تھا اور وہ اپنی بوڑھی آنکھوں میں انتظار بسائے اپنے نامراد بچوں کی راہ تک رہی تھیں..... بہت سی خرافات کی طرح یہ دن منانا بھی ہم نے مغرب سے سیکھ لیا حالانکہ ہماری ماؤں کے بغیر تو ہمارا ایک دن بھی نہیں گزرتا۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کی جنت ان کے پاس ہے..... لیکن جس دن ماؤں کو یاد کیا جا رہا تھا اس دن ایک سفاک ماں نے اپنے تین بچوں کو زہر دے کر مار ڈالا..... معاملہ وہی شوہر سے رنجش، تین ننھے منے فرشتے اپنی ہی ماں کے ہاتھوں، قبر میں جاسوئے۔ اس سے پہلے لاہور میں بھی اس طرح کا اندوہناک واقعہ رونما ہو چکا ہے جس میں ماں نے شیرخوار بچوں کو گلابا کر اور پانی میں ڈبو کر مار ڈالا تھا..... میں ان سفاک ماؤں کی جرأت پر نوحہ کناں ہوں کہ ممتا تو زندگی کا نام ہے، ممتا چھاؤں کا نام ہے، ممتا تو قربانی دینے کا نام ہے..... بے شک یہ دنیا بہت عجیب جگہ ہے، روز نئے نئے تماشے دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن میری اللہ سے دعا ہے کہ اللہ ہم سب کو اپنے والدین کی اچھی اولاد بننے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہماری اولاد بھی ہمارے لیے خوشیوں اور آسودگی کا سبب بنے (آمین)

منزہ سہام

کچھ اپنی باتیں

یہ کچھ دن پہلے ہی کی بات ہے۔ گرمی کا تہریں رہا تھا، بالکل ایسے جیسے کوئی غضبناک دیو آگ اٹھا جا رہا ہو۔ میں ایک درخت کے سائے میں سڑک کنارے کھڑا تھا، جس کی ایک ڈالی پر گھبر یوں کا جوڑا خرمستیاں کر رہا تھا۔ یہ پتا چلا تا مشکل تھا کہ ان میں سے مادہ کوئی بھی اور ٹرکوں سا تھا۔ اچلی اچلی سرخی سفید دھاریوں والی گھبر کی باتھ میں ایک ایک کا بوسیدہ سا کھڑا تھا، وہ اسے ذرا سا کترتی اور پھد پھداتی دم ہلاتی کہ یک دم دوسری گھبر جھپٹ کر اس سے ایک چھین لیتی اور پھدک کر دوسری ڈالی جا کچکتی۔ اس اثنا میں وہ کچھ ایک کترتی، صاحب یک گھبر جھپٹ کر اس سے ایک چھین لیتی، خوب چھین چھین، ٹریں ٹریں ہو رہی تھیں۔ ان دونوں کی چھینا چھینتی میں صاف لگ رہا تھا کہ پیار بھری انھیسیاں ہیں، انہیں ایک سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، ایک دوسرے سے چھین خانی کرنے اور تھپتھپانے میں انہیں مزہ آ رہا تھا۔ کافی دیر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مجھے ان کا یہ پیار بھرا جھگڑا اتنا دل نہیں لگا رہا تھا کہ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اس میں غلطاں تھا، ان کی کترتی کترتی آنکھوں اور ننھے ننھے چہروں میں وہ خوشی نظر آ رہی تھی جو کہ انسانوں کے چہرے پر آج کل مفقود ہے۔ وہ قلندریاں مارتی پھر رہی تھیں۔ ”ٹریں ٹریں“ کرتے ایک دوسرے سے لپٹ جاتی تھیں! میں سوچتے لگا کہ یہ آخر اتنی خوش کیوں ہیں؟ یہ تہی داماں، یہ لاغر و کمزور، یہ بے بس و مجبور جانور اتنے خوش کیسے ہیں؟ آج کا انسان اتنا خوش کیوں نہیں ہے؟ یہ بوسیدہ سا ایک کسی کچرے کے ڈھیر سے اٹھا کر اتنا اتر رہے ہیں، ہمارے پاس تو ہزاروں لاکھوں انواع و اقسام کے لڑنے کھانے ہیں، پھل میوہ جات ہیں حالانکہ ان کے پاس نہ تو بجلی کی چکا چوند ہے، نہ موبائل فون جیسی جادوگری، ان کے پاس نہ تو پختہ و محفوظ آرام وہ گھر ہیں، نہ سواری کے لیے گاڑیاں، ہوائی جہاز ہیں، ان کے پاس نہ تو فریزر ہیں کہ ٹھنڈے مشروبات کا مزہ لیں اور اپنی غذا کو محفوظ رکھ سکیں۔ ان کے پاس گرمیوں کا توڑ کرنے والے ایئر کنڈیشنر ہیں نہ ہی سردیوں کو نرم گرم بنانے والے جدید ہیٹر ہیں۔ ان کے پاس نہ تو پولیس ہے نہ فوج ہے، نہ خفیہ سیکورٹی ایجنسیاں ہیں جو ان کی حفاظت کریں۔ ان میں سے کسی کی کوئی جدا گانہ شناخت نہیں، یہ تو سب گھبریاں ہیں، سب کی سب گھبریاں ہی کہلاتی ہیں۔ ان میں کوئی کاشی چوہان، اظہر حبیب، علی زبیر، اقبال زمان نہیں ہوتا، یہ تو سب بس گھبریاں ہی ہوتی ہیں۔ ان کے پاس نت نئے، رنگ رنگ ملبوسات بھی نہیں ہوتے، ان کے پاؤں میں جوتے بھی نہیں ہوتے، ان کا کوئی ہینر اسٹائل بھی نہیں ہوتا، یہ کسی بیوٹی پارلر میں بھی نہیں جاتیں، ان کے ہاں تو پارٹیز کا بلہ گلہ بھی نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں تو خوشی بھری پارٹیوں کی بھرمار ہوا کرتی ہے، شادی کی پارٹی، ویسے کی پارٹی، سالگرہ پارٹی، عقیقہ پارٹیاں اور بے شمار پارٹیاں جن میں خوب بلہ گلہ ہو۔ ارے ہاں ان کے پاس ٹی وی بھی تو نہیں ہے، ہمارے ہاں سیکڑوں چینل ہیں۔ ڈراموں کے چینل الگ، فلموں کے چینل الگ، جٹ پی ٹی سنسٹی خیر خیروں کے چینل الگ، کھانا پکانے کے چینل الگ، صحت کے چینل الگ، اسپورٹس کے چینل الگ، شو بز کے چینل الگ، فیشن

انڈسٹری کا چینل الگ، بیوٹیشن چینل الگ تو ملبوسات کے چینل الگ، موسیقی کے چینل الگ، کھانے پکانے کے چینل الگ، صحت کے چینل الگ، اسپورٹس کے چینل الگ، شو بز کے چینل الگ، فیشن انڈسٹری کا چینل الگ، بیوٹیشن چینل الگ تو ملبوسات کے چینل الگ، موسیقی کے چینل الگ، تحقیق و جستجو کے چینل الگ، ڈاکو میٹری چینل الگ، جانوروں کے چینل الگ، علاقائی زبانوں کے چینل الگ، مزاحیہ چینل الگ، ڈرامے چینل الگ، بچوں کے لیے چینل الگ، کارٹون چینل الگ تو کونز پروگرام کا چینل الگ اور نہ جانے کتنی اقسام کے چینل ہیں۔ ظاہر ہے ان سب کا مقصد انسان کی قلاع و بہبود اور خوشی ہی ہے۔ ہماری خوشی اور فلاح کے لیے ہزاروں چینلوں میں لاکھوں کروڑوں لوگ کام کر رہے ہیں، جبکہ ان گھبر یوں کو تو اگلے درخت کی خبر نہیں۔

ان کا تو یہ کوئی گھر ہے نہ در ہے۔ انہیں تو ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ کہیں کوئی شکرہ، عقاب ندا چک لے یا کوئی کتا نہ دیوچ لے۔ سردی میں ان کے گرم بال ان کو سکون پہنچاتے ہوں گے، مگر گرمی میں تو ان کی جان لے لیتے ہوں گے۔ ان کے پاس ہمارے جیسی ایک بھی سہولت نہیں، ان کا معاشرے میں کوئی مقام نہیں، مگر یہ پھر بھی اتنے خوش ہیں، بے فکرے ہیں۔

میں ان کی طرف دیکھ کر مسلسل اسی طرح کی اوٹ پٹانگ باتیں سوچے جا رہا تھا کہ یک دم وہ دونوں ایک دوسرے سے بے طرح لپٹ گئے اور لپٹے لپٹے ہی ڈالیوں پر لڑھکنے لگے، ان کی ٹریں ٹریں سے پورا درخت گونجنے لگا اور پھر نہ جانے کیا ہوا۔ ان میں سے ایک کا توازن شاید بگڑ گیا تھا۔ ایک گھبر کی درخت سے جدا ہوئی اور بیچ سڑک پر آن گری۔

اس کا گرنا تھا اور زن ن ن ن ن کے ایک سوز کی کا پیہ اس کے ننھے سے وجود پر سے گزر گیا۔ وہ بے چاری ”ٹریں“ بھی نہ کر سکی۔ بس ایک آواز آئی تھی ”چپک“ اور خون کے بہت تھوڑے سے چھینٹے سڑک پر بکھر گئے۔ میرا دل لہو لہو ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھیں اٹکبار ہو چکی ہیں اور چہرہ اشکوں سے تر۔ میں رومال سے آنسو پونچھ رہا تھا کہ درخت سے دوسری گھبر ”ٹریں ٹریں ٹریں“ کرتے ہوئے، پیچھے چلا تے ہوئے، تین کرتے ہوئے، آہ بکا کرتے ہوئے، خدا سے فریاد کرتے ہوئے اتری اور سڑک پر چسپاں ہوئے اس بے گور و کفن لاشے کی طرف دوڑی جو ابھی کچھ دیر پہلے اس کے ساتھ خرمستیاں کر رہا تھا۔ اسے شاید پتا ہی نہیں تھا کہ اس سڑک پر مسلسل ٹریفک رواں دواں رہتی ہے۔ گاڑی کے پیچھے گاڑی چلتی ہے۔ وہ تو بس اپنے ہمسفر کے قریب پہنچنے کی فکر میں تھی، میں نے بے اختیار ہاتھ بڑھائے کہ اس نادان کو روکوں، مگر ہاتھ بڑھا کا بڑھا ہی رہ گیا، ایک دوسری ”چپک“ کی آواز آئی اور کچھ اور لو کے چھینٹے سڑک پر بکھر گئے۔ میں نے ارد گرد دیکھا، شاید لوگوں کا دل غم سے پھٹ گیا ہوگا، مگر یہ بھی سچ ہے کہ وہاں میرے علاوہ کسی کو پتا ہی نہیں تھا کہ دو گھبریاں سڑک کے بچوں سچ چکی جا چکی ہیں۔

مجھے ان کی خوشی کا راز تو معلوم نہ ہو سکا مگر یہ ضرور جان لیا کہ ہماری ضرورتیں نہ صرف ہماری خوشیوں کی قاتل ہیں بلکہ یہ دوسروں کی صرف خوشیاں ہی قتل نہیں کرتیں بلکہ انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیتی ہیں۔

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور ان کے جواب



بہت پیارے ساتھیو!

سدا خوش رہیں۔ یہ زندگی ایک بلبہ ہے پانی کا۔ دنیا دکھ اور سکھ کے باہمی استخراج کا نام ہے۔ ساتھیو! ہمیشہ سے میں یہی کہتا آیا ہوں کہ محبت کرو، محبت عام کرو، کیوں کہ محبت مقناطیس ہے اور جب ہم محبت کرتے ہیں تو ہم خود مقناطیس بن جاتے ہیں۔ ہم سے پیار کرنے والے جب ہمارے طرف آتے ہیں تو اس مقناطیس محبت سے چپک جاتے ہیں اور وہ بھی مقناطیس بن جاتے ہیں، آپ کو معلوم ہے نا خدا تعالیٰ کا یہ نظام بھی مقناطیس کے اصولوں پر ہی Base کر رہا ہے۔ محور سورج ہے اور سب سیارے اپنے اپنے دائروں میں اس سورج کے گرد مقررہ اوقات میں اپنا سفر کرتے چلے جا رہے ہیں، خدا کا یہ نظام اربوں کھربوں سالوں سے بغیر کسی رکاوٹ کے چلتا چلا جا رہا ہے تو کیا ہم اپنی زندگی، جو اس وقت صرف اوسطاً 50 یا 60 برس ہے، محبت کے ساتھ نہیں گزار سکتے؟؟

وعدہ کریں کہ آپ بھی آج سے لایعنی سوچوں اور تقرقوں سے دور ہو کر صرف ایک دوسرے سے محبت کریں گے۔ ساتھیو! دوستو! مترو! چلتے ہیں احوال کی جانب.....

✉ محمد اسماعیل بروہی۔ نواب شاہ سے احوال میں شریک ہیں، لکھتے ہیں السلام علیکم کاشی بھائی کیسے ہیں آپ..... امید ہے کہ آپ منظرہ آپی اور پورا اشاف خیریت سے ہوں گے، چار ماہ سے غیر حاضر تھا کیوں کہ ہمارے گھر میں بہت بڑی ٹریجنڈی ہو گئی تھی، ہماری ماں جیسی بھابی ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئیں، کاشی بھیا ہم نے کبھی نہ سوچا تھا کہ ہماری ہنستی مسکراتی بھابی ایک دن ہمیں چھوڑ کے چلی جائے گی۔ بھائی کی شادی کو 15 سال ہو گئے مگر ایسا لگتا ہے جیسے 15 دن ہوئے ہیں۔ چھوٹی سی عمر کی بھابی کیا آئی کہ سارا گھر سنبھال لیا۔ بہو کے آتے ہی امی نے سب کچھ اس کے حوالے کر دیا اور خود بے فکری اور سکون کی زندگی گزارنے لگیں۔ بھابی کے پاس شاید کوئی جادو کی چھڑی تھی وہ ہر کام منٹوں میں کرتی تھیں، امی ابو کی دن رات خدمت کرتا، تینوں دیوروں کے لیے طرح طرح کے کھانے پکانا، بھائی کا خیال رکھنا، بچے سنبھالنا اور جب ننڈیں آتیں تو لگتا جیسے دعوت کا سماں ہے، سب کے لیے مزے دار کھانے تیار کرنا وہ بھی بھاگ بھاگ کر اور خوش دلی سے اس کے دم سے گھر جیسے جنت تھا، پینا ٹائٹس ہی جیسا موڈی مرض اچانک آیا اور اس کی جان ہی لے لی۔ اور وہ شانستہ، گلاب، زاہد، مریم، شاہدہ اور 2 سالہ فائزہ کو روٹا ہوا چھوڑ گئیں۔ کاشی بھائی یہ خط لکھتے ہوئے بھی میں رو رہا ہوں۔ ہمارا پورا گھر اس غم سے غرق تھا۔ دعا کیجیے کہ اللہ ان کو صبر اور بھائی کو ہمت دے۔ تمام قارئین سے گزارش ہے کہ میری بھابی کے لیے دعائے مغفرت ضرور کریں، اس غم کے دوران آپ اور تمام قارئین مجھے ہر وقت یاد آئے۔ آپ نے میرے زخموں پر مرہم اس وقت رکھ دیا، جب میرا سالانہ خریداری کا سال پورا ہوا تھا، مارچ کو، پھر بھی آپ نے اپریل کا شمارہ بھیج کر میرا مان رکھا۔ مجھے عزت دی، حوصلہ دیا۔ میں اگلے سال کی خریداری کے لیے مئی آؤر بھیج رہا ہوں۔

☆ بہت پیارے اسماعیل۔ دکھ اور سکھ سانچے ہوتے ہیں، خدا آپ سب کو اس غم کو پہننے کا حوصلہ اور ہمت دے۔ قارئین سے التماس ہے کہ مرحومہ کے لیے ایک بار ضرور مغفرت کی دعا کیجیے۔



✉ پورے والا سے احوال میں یہ شرکت ہے رانا محمد شاہد کی۔ رانا جی لکھتے ہیں، اپریل کا شمارہ شوخ رنگ و انداز والی ماڈل کے ساتھ ملا۔ جاذب نظر سرورق ہی کچی کہانیاں کی پہچان ہیں۔ منظرہ سہام کا ادارہ حکمرانوں کی بے حسی اور معاشرتی ایلے کا احاطہ کر رہا تھا۔ منشی محمد عزیز نے، الحمد للہ ابو کی طبیعت اب پہلے سے کافی بہتر ہے۔ میں تمام قارئین خصوصاً مور شاہد حسین، سدرہ انور علی کا تذکرہ سے مشکور ہوں، جنہوں نے ابو کی صحت یابی کے لیے دعا فرمائی، مور شاہد حسین کا ذکر تو اکثر احوالی کرتے نظر آئے۔ یہ مور نام انہوں نے مور سے متاثر ہو کر رکھا ہے یا کوئی اور وجہ ہے؟ سدرہ انور علی تصویر سے تو لگتا ہے کہ آپ کسی نہ کسی کھیل سے وابستہ رہی ہیں۔ آپ کی برتھ ڈے 9 مارچ ہے تو ہماری شادی کی برتھ ڈے 23 مارچ ہے۔ دو سال پہلے 23 مارچ کو ہی ہم نے یہ لڈو، پٹائیں بیٹھا تھا یا کڑوا، بہر حال چکھ لیا تھا۔ حیدر آباد کے غلیل جبار بھی آج کل غائب ہیں۔ ذریعہ جو نیچو یاد کرنے کا شکریہ۔ کہانیاں سبھی زبردست تھیں۔ غیر ملکی ادب، سرحد پار ادب اور ممتاز ادیبوں میں سے بھی ایک ایک شاہکار دیتے رہا کریں۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ پیارے رانا محمد شاہد! کہانیاں جلد شائع ہوں گی، آپ کا تبصرہ اب لیٹ کیوں آنے لگا ہے۔ اپنا بہت خیال رکھیے۔

✉ کراچی سے گل رحمان طراز ہیں، ڈیڑھ کاشی چوہان بھیا! السلام علیکم 28 اپریل کو ماہنامہ کچی کہانیاں کا شمارہ گھر پر ملا۔ بے حد شکریہ کہانی شائع کرنے کا، ابھی پورا رسالہ نہیں پڑھا ہے کیوں کہ ایک اتار سو پیار، سارے دوست احباب کہانی پڑھنے کو بے تاب ہیں اور گھر گھر رسالہ گھوم رہا ہے۔ بہر حال، نوٹاں والی سرکار، مکھنی اور ناگن پڑھ لی ہیں، باقی تبصرہ انشاء اللہ اگلے ماہ۔ رسالے کی تعریف میں الفاظ نہیں مل رہے، یہ کچی تعریف ہے یہ مت سمجھیے گا کہ کہانی شائع کر دینے کی وجہ سے تعریف کر رہی ہوں۔ آپ کی آمد کی وجہ سے رسالے میں ایک تنوع، ایک تبدیلی آرہی ہے۔ آپ کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے یہ سب۔ میری باجی بھی بہت تعریف کرتی ہیں کہ آپ کی ادارت میں رسالہ دن دو کچی رات چوٹی ترتی کر رہا ہے۔ باقی سب احوالی بہن بھائیوں کو میری طرف سے سلام۔

☆ بہت پیاری رعنائی! سلامت رہیے۔ آپ کو شمارہ پسند آیا، ہماری محنت وصول ہوگئی، خوش رہیے۔ مگر یہ کیا مثال ہوئی "ایک انار سو بیار" کراچی میں رہ کر بھی آپ کے "اسے" آپ کی محبت میں ایک پرچہ نہیں خرید سکے۔

☆ کراچی سے یہ آمد ہے نیر رضا ولی کی۔ لکھتے ہیں محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم، دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو حفظ و امان میں رکھے (آمین) اس سے قبل بھی تحریریں بھیجتا رہا ہوں لیکن زیادہ تر تحریریں شائع نہیں ہو سکیں، شاید کہ "جی کہانیاں" کے معیار پر نہ اتری ہوں۔ ایک تحریر اور ارسال کر رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ جلد شائع ہو جائے گی اور مزید اشاعت کا موقع میری تحریروں کو نصیب ہوتا رہے گا، عین نوازش ہوگی۔

☆ بھائی نیر! آپ کی تحریریں نظم اور غزل کی صورت ہم تک جیسے جیسے موصول ہوئیں، ہم نے شائع کیں آپ بھی تو غائب ہو جاتے ہیں۔ اگلے ماہ آپ کا بھرپور تبصرہ ہم تک پہنچ جائے، اسے ہماری محبت سمجھیں یا حکم۔

☆ بشیر احمد بھٹی فوجی بستی بہاولپور سے لکھتے ہیں مدیر اعلیٰ، منظرہ سہام صاحبہ مدبر کاٹی چوہان صاحب، السلام علیکم! مئی 2014 کا جی کہانیاں اعزازی شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ آپ نے جی کہانیاں کا ہر شمارہ مختلف نمبرز سے نکالنے کا جو طریقہ اپنایا ہے، یہ اچھا ہے۔ اس طرح قارئین کو نئے نئے موضوعات پر کہانیاں پڑھنے کا موقع ملے گا۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ جناب کاٹی چوہان صاحب، آپ سے گزارش ہے کہ یہ جو پراسرار نمبر، روحانی نمبر کا سلسلہ آپ نے چلایا ہے، خوب تر ہے، اسے جاری رکھیے۔

☆ پیارے بھائی بشیر بھٹی! احوال میں شرکت اور نمبرز کا سلسلہ پسند کرنے کا شکریہ۔

☆ یہ احوال میں آمد ہے ہماری بہت اچھی ٹائیپ بھی کی سیالکوٹ سے، لکھتی ہیں۔ السلام علیکم سب سے پہلے سرورق پہ نظر پڑی پلیز آپ ڈیل بیج ختم کریں بہت مشکل ہوئی ہے، پڑھنے میں..... محترم منظرہ سہام کا "تھر پیسا ہے" کچھ اپنی باتیں پڑھ کر احساس ہوا کہ اس دنیا میں اچھے بُرے دونوں لوگ موجود ہیں۔ "پچھی واس، ہم نام، کفارہ، ذرا سی بھول، کس پر اعتبار کریں، آخری خواہش، اب میں مطمئن ہوں، دل ایک شہر خوشاں، کملی، سسٹم" وغیرہ زبردست رہیں۔ خن آباد میں سب کی شاعری اچھی تھی پر ظفر اللہ رند کی "منت" پڑھ کر بے اختیار منہ سے واہ واہ نکلا..... باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔ آخر میں منظرہ سہام آنٹی کی خدمت میں بہت سی دعا میں سب اسٹاف کو بہت سلام..... تمام قارئین کو دعائیں، میرا ٹوٹا چھوٹا تبصرہ ضرور شائع کیجیے گا اللہ حافظ۔

☆ پیاری سدرہ! ہم سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کا تبصرہ اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا دعاؤں کو رائیگاں نہیں کرتا۔

☆ سہیل خان، کورنگی کراچی سے رقم طراز ہیں، جناب کاٹی صاحب السلام علیکم۔ بعد سلام کے عرض یہ ہے کہ میری اور میرے گھر والوں کی طرف سے آپ کو یہ نئی ذمہ داری سنبھالنے پر بہت بہت مبارکباد۔ دیر اس لیے ہوگئی کہ میرا 17 سال کا جوان بیٹا ہے ایب نارٹل اور محذور، نہ وہ چل سکتا ہے نہ بول سکتا ہے جس کی وجہ سے میں لیٹ ہو گیا خط لکھنے میں ورنہ میں آپ کو پہلے ہی مبارکباد دے دیتا۔ آپ کی اور میری پہلی ملاقات ہے جی کہانیاں کے حوالے سے مگر میرا اور میری بیگم کا جی کہانیاں کا ساتھ بہت پرانا ہے، وہ بڑے شوق سے یہ ڈائجسٹ پڑھتی ہیں۔ جب یہ گھر میں ڈائجسٹ آنے لگا تو مجھے بھی شوق ہو گیا اگر میں تھوڑا کچھ لیٹ لے کر آؤں تو ناراض ہو جائیں کہ تم نے لیٹ کر دیا۔ میری اللہ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اچھی اچھی باتیں لکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ جی کہانیاں کے ایک ایک فرد کو سر پرست اعلیٰ سے نیچے عملے تک صحت اور تندرستی عطا فرمائے اور کسی کا محتاج نہ رکھے۔



☆ پیارے بھائی سہیل! آپ کا خط احوال میں شامل ہے اور امید ہے اب آپ احوال میں غیر حاضر نہ ہوں گے۔

☆ یہ احوال میں شرکت ہے حیدر آباد کی ایک نامور شخصیت اور مصنف ادیب سمیع چمن کی، لکھتے ہیں کاٹی چوہان بھائی، سنے جی جگ جگ جیو! امید ہے دل و دماغ سوچیں دوچیں سب کچھ اپنی جگہ فٹ اور خیر و خیر یافت سے ہوں گے، ادیب سمیع چمن اکبر آبادی کا سلام پر سلام۔ آپ سے پہلے ہمارے ہی شہر کے ایک قلمدان، ادوہ سوری معاف کیجیے گا قلم کار بے ملک ملت جناب محترم راجہ جی کا جی کہانیاں میں دور حکومت چل رہا تھا۔ ہر تحریر کے ماتھے پر اشعار کی بندیا لگاتے چلے جا رہے تھے، کہنے کو میرے ہم شہر اور ہم قلم تھے اور علیک سلیم بھی مجھ سے رسما رکھتے تھے مگر دل میں اپنے لنگوٹیاں اپنے شہر کے دوست لبو جی صاحب کا لے صاحب کی عین خواہش کے تحت۔ کینہ بھی رکھتے تھے۔ لنگوٹیاں یار کی ہدایت یہ تھی کہ راجہ مہاراجہ صاحب ان کی خواہش کے برخلاف کسی اور ان کے ناپسندیدہ رائٹرز کی اور خاص کر میری تو تحریر کا داخلہ بالکل بند کر دیں اور فوراً خالہ ردی کی نوکری کی بھوک کا خیال کرتے ہوئے اس پر وار دیں۔ آباہا کتنا شاندار، ایمانداری کا سلسلہ تھا، اب آپ کی بھی یقیناً حیرت سے آنکھیں تو ضرور پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہوں گی، کہ میں تو کافی دیر کے بعد آپ پر یہ شاخسانہ افشاں کر رہا ہوں، مجھ سے پہلے جی کہانیاں کے متعدد لکھاریوں نے برملا ان ہی شکایات کا اظہار کر دیا ہے۔ بات ہو رہی تھی تحریروں کی، ہر تحریر فنی تحریر اور بڑی چابکدستی سے لکھی گئی ہے۔ خن آباد میں تمام کاٹی بھیا کے پسندیدہ شاعرات شاعروں کی بھرمار بلکہ گویا رہے نہیں ہے تو ہم جیسے ادنیٰ شاعرات شاعروں کی، افسوس دل کھدے میں، آخر میں پھر عرض ہے کہ ہم نے پہلی دفعہ بڑے ارمانوں کے ساتھ آپ کی محفل آپ کے رسالے میں قدم رنجہ فرمایا ہے ہم جیسے اور بھی صاحب اور صاحبان ہوں گے۔ اب دیکھتے ہیں یہ خط کب شائع ہوتا ہے، کب اس پر نظر کر م فرمائی کی عطریات خوشبویات کا چھڑکاؤ آپ فرماتے ہیں۔

☆ پیارے چچا میاں! لیجیے آپ بھی ہمارے پسندیدہ شعراء میں شامل ہو گئے، آپ کی نظم خن آباد کا حصہ ہے۔ چچا جان! پلیز اب کچھ تحریر ایسی بھیج دیں کہ جو میں جلد جی کہانیاں کا حصہ بنا سکوں۔

☆ احوال میں یہ پہلی بار آمد ہے سلی سیدی کی بہاول نگر سے۔ لکھتی ہیں محترم ایڈیٹر السلام علیکم! میں نے آپ کا میگزین اپنی دوست کے گھر دیکھا تھا، بہت پسند آیا تھا۔ میں اکثر میگزین میں لکھتی رہتی ہوں اور بچوں کے رسائل میں لکھتی ہوں نئی نسل کو رہنمائی کی ضرورت ہے۔ پچھلے دنوں میری آنکھ کا آپریشن ہوا ہے، تو میں زیادہ لکھ نہیں سکتی، لیکن یکم جون 2014 کو امی کی پہلی برسی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ کے میگزین میں امی کے لیے کہانی لکھوں گی، لیکن ڈاکٹر نے زیادہ لکھنے سے منع کیا ہے۔ یہ اپنی زندگی کی کہانی اپنی جی سے ڈکٹیٹ کروا کے بھیج رہی ہوں کہ امی کے بعد زندگی کیسی ہے! آپ کے رسالے کا معیار واقعی قابل تعریف ہے، دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ اچھی شگلی جی! خدا آپ کو صحت دے۔ آپ کی حوصلہ افزائی ہمارا فرض ہے۔

☆ یہ ہری پور سے ہمارے ساتھ ہیں محمد عمیر شہزاد، لکھتے ہیں۔ عزت مآب و قابل احترام جناب کاٹی چوہان صاحب اور مدیر اعلیٰ منظرہ سہام صاحبہ اور جی کہانیاں کے تمام معزز اسٹاف کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مشکور ہوں، مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ 31 مارچ میرا جنم دن تھا اور اس موقع پر آپ کی طرف سے ایک خوب صورت ساتھ بصورت "جی کہانیاں" موصول کر کے میری خوشی کو چار چاند لگ گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ میری ایک تحریر کو خوب صورت شمارے کی زینت بنا کر مجھے اپنا گرویدہ بھی بنالیا۔ اب تو ہم "جی کہانیاں" کے سگے قاری اور مکمل طور پر لکھاری بنے رہنے کی تادم مرگ کوشش جاری رکھیں گے۔ اپریل کا یہ شمارہ بے حد قیمتی تھا۔ سب سے پہلے تھر کے بارے میں جان کر دل افسردہ ہوا بحیثیت مسلمان ہمیں اپنے بھائیوں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑنا چاہیے اور کاٹی صاحب آپ کی مثبت سوچ بھی اچھی لگی۔ مور شاہد حسین کی "ذرا سی بھول" ہمیں اچھا خاصا سبق سکھا گئی۔ اس کے بعد "محمد عزیز مئے" صاحب نے بہت عمدہ لکھا، اس کے علاوہ کملی، بابا عمرو دین اور کون بنے گا کروڑ پتی صف اول کی کہانیاں رہیں۔ بعد ازاں خن آباد پر نظر پڑی تو ذہن و دل خوشی سے

سرشار ہو گیا، پہلی بار کوئی ایسا ماہنامہ ملا ہے جو اپنوں سے بھی زیادہ اپنا ہے اور مجھے اپنوں کا ساتھ دینے میں خوشی ملتی ہے۔
☆ پیارے میر جیو۔ آپ کی دوسری کہانی کیوں نہیں آئی اب تک؟ اور ہاں احوال میں آمد کو مستقل بناؤ بھائی۔
✉ ڈاکٹر صغیر احمد عاجز، بڑا گواہ، جہلم سے رقم طراز ہیں، ڈیرہ چوہان السلام علیکم۔ امید واثق ہے کہ آپ بشمول مکمل اسٹاف بفضل خدا خیریت سے ہوں گے۔ ماہ اپریل کا شمارہ دیدہ زیب سرورق کے ساتھ اچھوتی تحاریر سے مزین میرے ہاتھوں میں ہے۔ اولین صفحہ جات پر منزہ سہام صاحبہ نے تحریر کیا ہے کے حوالے سے اپنے جذبات کے جو موتی بکھیرے ہیں، کاش یہ حساس اور نڈر سوز دل کی آواز بن جائے۔ بھٹی صاحب کی بھی واسطی سوچ رکھنے والے لوگوں کی ذہنی اختراع ہے۔ سلمیٰ غزل کی تخلیق ”سزا کی جزا“ لا جواب تحریر ہے، اشفاق بٹ نے ”ہم نام“ میں معاشرے کی روایتی اقدار اور رتوں کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مور صاحب کی ”ذرا سی بھول“ متنبہ کرتی ہے بعض اوقات ذرا سی بھول ایک بہت بڑے طوفان کا سبب بن جایا کرتی ہے۔ ”کس پر اعتبار کریں“ دوستی جیسے پاک رشتے اور جذبے کا خون ہے۔ بے رنگ حیات ایک اچھی کاوش ہے۔ ”سنگتے ارماں“ منشی صاحب کی زبردست تخلیق ہے۔ ”تجھ سا ڈھونڈوں کہاں، بابا عمر دین، شہزاد صاحب کی ”دل ایک شہرِ خوشاں“ بہترین تخلیقات ہیں۔



تجھے اپنے دل سے میں کیسے بھلا دوں
تیری یاد ہی تو میری زندگی ہے

اگر بابا عمر دین جیسے کردار جو کہ انسانی ہمدردی کے جذبات سے لبریز دل رکھنے والے ہیں اپنا کردار نبھاتے رہیں۔ سعید اور عابد جیسے سچے اور سچے لوگ محنت اور لگن میں بٹتے رہیں تو جھگڑا ختم ہو کر ہی رہتی ہے اور ایسی نیت رکھنے والوں پر اللہ تعالیٰ ضرور نظر کرم کرتا ہے۔ سلسلہ وار سلسلے بھی زبردست جار ہے ہیں، ناگن اپنے کلائس کی طرف بڑھ رہی ہے، غرض یہ کہ تمام قلم کار اور ان کی قلم کاریاں قابل تحسین ہیں، آخر میں اس دعا کے ساتھ کہ خدا تعالیٰ ہم تمام لوگوں کا حامی و ناصر ہو اور ایک دوسرے سے نیکی اور آسانی بانٹنے کی توفیق سے نوازتا رہے۔

☆ ڈاکٹر صغیر عاجز! آپ کے تبصرے نے دل خوش کر دیا، سلامت رہیے۔ آپ کا تبصرہ لیٹ موصول ہونے کی وجہ سے مئی میں شامل نہ ہو سکا تھا۔ امید ہے اب شکایت رفع ہوگئی ہوگی۔

✉ یہ آمد ہے ملکہ احوال ادبی تحسین جو نیچو کی پورٹی شریف، خیر پور تا قلعہ شاہ سے لکھتی ہیں، اچھے بھیا کاشی اور تمام قارئین السلام علیکم! خداوند کریم آپ کو خوش و خرم رکھے۔ (آمین) سرورق ماشاء اللہ زبردست رہا۔ ادارہ ”پنٹہ عزم“ منزہ آپ نے پاکستانی کھلاڑیوں کو خراج تحسین پیش کر کے سر بلند کیا۔ کچھ اپنی باتیں میں کاشی بھیا نے کمال لکھا، احوالیوں، اب احوال سن لیں، مور شاہد حسین بھائی یہ ”کوچ“ تو ہے ہی اپنی، تو کرایہ ملنے والا بھی نہیں خیال رہے لیڈرز فرسٹ تو فرسٹ سیٹ تو بس..... پھر اس خیال کو ”کوچ“ ہی کرا دیجیے۔ زربینہ جو نیچو میری بڑی بہن ہیں۔ باقی صنوبر جو نیچو دوست لکھاری ہیں، اب کہاں ہیں ہم لاعلم ہیں۔ ان کا تعلق حیدر آباد سے ہے۔ شفقت حسین صاحب پسندیدگی کے لیے ممنون ہوں، خوش رہیے۔ شاکستہ جمال خوش آمدید جی بے انتہا مشکور ہوں سراپے پر۔ شاد رہیں۔ اوئے سدرہ جی جھولے میں بیٹھنے کا شوق کیوں چڑھا، شکر کرو بچت ہوگئی، پتا ہے کیوں، اپنوں کی دعا میں میرا حصہ بھی شامل تھا نا، سچ میں دل سے پکارا تھا، تو وہ پکار آپ تک پہنچ گئی خوشی ہوئی، کیا ہے نا کہ کوئے میں ملنے آئی تھی تو واپس کھینچ لائی دیکھ تو لیا ہی ہوگا تو یکچکر کی ضرورت کہاں رہی اب اپنا بہت سا خیال رکھنا، آبی زربینہ بھی طبیعت کا پوچھ رہی ہیں۔ ویسے شمیمہ ناجی، سدرہ اور ہم کیا شاندار پارٹی رہی، متحد حساب چکنا کر دیا جی..... عبدالغفار عابد صاحب و حکیم بیک، روحانی نمبر دیکھ کر روح سرشار ہوئی کہ ہمارے آس پاس کتنی ہی چمکی ہوئی، بزرگ شخصیات مدفون ہیں کہ لوگ فیض یاب ہو کر مرادیں بر لاتے ہیں، یہ بھی اللہ سائیں کی طرف سے بھیجا ہوا انعام ہیں کہ ان کی رسائی سے اپنی حاجات پہنچاتے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر

ایک لا جواب، اسرار سے ہر سبق آموز بہترین کہانیاں پڑھنے کو ملیں، خاص کر ”دعا“ صفدر علی حیدر۔ شان مولانا، صدف آصف۔ پڑوسی گل رعنا۔ درتو بہ کھلا ہے مجید احمد جانی۔ رنی اللہ والی نچیل میٹلو۔ سبز پیر کنول عمران خان۔ کایا پلٹ مسز نوید ہاشمی اور مرشد کی دعائیں سیکھنے صدف یہ تمام تحریریں زبردست اور شمارے کی جان رہیں۔ سخن آباد میں تمام کلام عمدہ رہا۔ اب اجازت بھائی (اللہ حافظ)



☆ اڈی تحسین آپ کے تبصرے نے دل خوش کر دیا۔ سلامت رہو۔
✉ مور شاہد حسین گمر۔ شہداد کوٹ سے لکھتے ہیں ہر دل عزیز کاشی چوہان بھیا السلام علیکم امید ہے کہ آپ سمیت پورا اسٹاف، رائٹرز اور قارئین حضرات خدا کے فضل و کرم سے خوشی، صحت، سلامتی والی زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ مئی کا شمارہ حسب معمول 30 تاریخ کو

موصول ہوا۔ شمارہ ملتے ہی ہم اس کی خوب صورتی میں اس طرح کھو گئے کہ جن صاحب نے پڑھا کر دیا اسے سلام کرنا بھی بھول گئے۔ روحانی نمبر کے لیے ٹائٹل بہت زبردست تھا۔ یہی تو سچی کہانیاں کی خاص خوبی ہے۔ اشتہارات نظر انداز کرتے ہوئے مختلف اولیائے کرام کی مزاروں سے سچی فہرست دیکھ کر روح تک سرشار ہوگئی۔ آئی منزہ سہام نے ”پنٹہ عزم“ بہت ہی خوب صورت سبق دیا۔ کچھ اپنی باتیں لفظ لفظ سے آپ جھلک رہے تھے خدا آپ کو بہت سی کامیابیوں سے نوازے۔ محفل احوال میں جیسے ہی قدم رکھا، ارے یار واہ! بھیا آپ نے ہماری خواہش پوری کر دی۔ ”تھینک یو سوچ“ ارے غلام رسول گل تم نے تو کمال کر دیا چھوٹے بھائی کو بھی لے آئے، غلام حسین گلے لگ جاؤ یار۔ محفل میں باقی تمام لوگوں کی آمد بہت اچھی لگی Welcome ڈاکٹر ایں وقاس حسین محفل میں آنے کی آپ کو بھی دل سے دعوت ہے۔ شاہد فراز اور طارق جاوید آپ کو محفل میں دیکھ کر دل خوشی سے باغ باغ ہوا، انکل محمد اقبال زمان کی والدہ اور ایم اشفاق بٹ کی بھانجی کو خدا صحت کاملہ عطا فرمائے۔ سدرہ انور علی خدا کے کرم سے ہم ٹھیک ہیں، آپ سنائیں اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ انیل حسین یکم مئی کو سا لگرہ مبارک ہو۔ ادی تحسین جو نیچو آپ سمیت چند ہی خواتین کاشی بھیا کے پاس محفل میں شرکت کرنے کے لیے ٹکٹ بک کر دانے آتی ہیں۔ سٹیشن تو ہم نے کب کی خالی کر دی ہیں مگر آپ گھر کے کاموں میں مصروف جو ہیں۔ ہا ہا ہا۔ پھر نوید شاہ صاحب آپ کے خط سے اندازہ ہوا کہ آپ 40 برس کے ہیں مگر تصویر میں تو 28-27 برس کے لگ رہے ہیں؟ کہانیوں میں سب سے پہلے سرور شاہ کی ”کھٹل“ کا دوسرا اور آخری منفرد حصہ پڑھا۔ اس کے بعد سخن آباد میں انٹری دی، عبدالعزیز جی آنکل ایک آزاد قلم، بہت پسند آئی۔ انیل حسین قریبان پٹھان، مزدور ڈے، مومن، بٹول اپنی دھرتی دل کو بھاگتی۔ رحمان آفاق، حکیم خان حکیم، تمثیلہ لطیف، فریدہ فری یوسف زئی کی غزلیں اچھی تھیں اور نظموں میں سب کے خیال اچھے تھے۔ غلام رسول گل تم نے پہلی بار شاعری کر کے کمال کر دیا۔ مبارکباد۔ مختصر کہانیاں مہر پرویز احمد اعجاز دعا، کنول عمران خان سبز پیر، یقین کامل، ندیا بانی نور کا بال، الماس فاطمہ ارمان، بھر دے جھولی، مسز نوید ہاشمی، کایا پلٹ سیم سیکھ صدف، مرشد کی دعا مختصر مگر جامع روحانی تحریریں تھیں۔ جلوہ جنوں جاوید راہی، نوناں والی سرکار، ممتاز احمد، چشمہ فیض ملک عاشق حسین ساجد ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ سلیم فاروقی آتش جنوں اپنی مخصوص رفتار سے چل رہی ہے۔ صفدر علی حیدری دعا، بشیر احمد بھٹی وہ سو روپے، گل رعنا پڑوسی، مجید احمد جانی درتو بہ کھلا ہے، صدف آصف شان مولانا، نچیل میٹلو رنی اللہ والی، حنا بشری وہ میرا مہرباں، عیدہ تحریریں پڑھنے کو ملیں۔ اعجاز احمد نواب ناگن اچھا سلسلہ ہے۔ ریاض حسین شاہد، صنم کدہ ہے جہاں، ایمان تازہ ہوا۔ منکشی ارشد علی ارشد پسندیدہ سلسلہ پڑھنے کو دے رہے ہیں۔



☆ مور سائیں! تبصرہ بھر پور کیا آپ نے۔ جیس، بہت جیس۔
✉ یہ ہیں احوال میں ہمارے نئے دوست غلام رسول گل۔ جیکب آباد سے عرض کرتے ہیں، کاشی چوہان بھیا امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے، 28 اپریل کڑی دھوپ، سچی کہانیاں ملتے ہی ٹھنڈک ثابت ہوا۔ شمارہ ملتے ہی احوال کی جانب چھلانگ لگائی ارے یار واہ

مور شاہد حسین صدارت کی کرسی پر براجمان تھے۔ ساتھ میں چھوٹے بھائی غلام حسین اور خود کو پا کر بڑا مزہ آیا۔ کاشی بھیا بے حد شکر یہ۔ بہن سدرہ انور علی آپ کی صحت کے لیے دعائیں۔ شاہد فراز بھائی کیا حال ہے؟ ڈاکٹر ایس وفا کی خدمت میں سلام و دعائیں۔ ظفر اللہ رند اور صفیہ سلطانہ باجی آپ کہاں ہیں؟ آپ دونوں پڑوسی ہیں، حسین جو نیو عبدالعزیز جی آ، ممتاز احمد، ظفر علی ایڈووکیٹ تمام لوگوں کو سلام۔ کاشی بھیا سخن آباد میں میری نظم لگانے کا بے حد شکریہ۔ روحانی نمبر کی تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں، اتنا معیاری پرچہ مہیا کرنے کا شکریہ۔ وہ میرا مہرباں، شان مولا، پڑوسی، کایا پلٹ اچھی تھیں۔ جلوہ جنوں، درتوبہ کھلا ہے، ربی اللہ والی، نونال والی سرکار، چشمہ فیض، بہت پسند آئیں۔ مصروفیات کے باعث باقی شمارہ زیر مطالعہ ہے انشاء اللہ اگلی بار بھر پور تبصرے کے ساتھ حاضری دوں گا، اب اجازت خدا اہم سب کا حامی و ناصر ہو (آمین)

☆ پیارے گل! خوش رہو۔ تبصرہ اچھا کیا تم نے، اب اگلے ماہ کوئی تحریر بھی تو لاؤ۔

✉ کراچی سے ہمارے شاعر، لکھاری اور قاری عادل حسین احوال میں براجمان ہیں۔ عرض کرتے ہیں۔ محترم کاشی جی! السلام علیکم امید ہے مزاج بخیر ہوں گے، رخسانہ آئی اور منترہ آپ کی کو بھی سلام اور دعائیں! اللہ پاک اقبال زمان صاحب کی والدہ اور بہن سدرہ انور علی کو مکمل صحت و تندرستی عطا فرمائے (آمین) مئی کا تازہ شمارہ روحانی نمبر کی صورت جلوہ گر ہوا۔ فولڈنگ ٹائٹل کی تبدیلی پر بے حد شکریہ! اور آید درست آید، یہ تبدیلی اگر دو شیزہ میں بھی ہو جائے تو بہت خوب۔ روحانی نمبر کے لیے اس سے بہتر اور خوب صورت ٹائٹل مشکل تھا۔ اچھا لگا۔ آئی کا لکھا سولہ آنے سچ ہے۔ کچھ اپنی باتیں بڑھ کر ہمیشہ ہی دل خوش ہو جاتا ہے۔ احوال میں داخل ہوئے تو دل باغ باغ ہو گیا۔ جس جس نے میری کہانی کی تعریف کی میں اُن سب کے لیے دعا گو ہوں۔ کاشی بھائی سمجھ نہیں آتا کیا تبصرہ کروں؟ ان بزرگان دین کی کرامات کسی سے ڈھکی چھپی بات تو نہیں ہے۔ جو لوگوں کے ساتھ جیتی، وہ لکھتے ہوئے یقیناً اُن کا دل فرط جذبات سے ضرور رو پڑا ہوگا۔ پڑھتے ہوئے میرا بھی کئی بار یہی حال تھا۔ کاش کاش بھائی بزرگان دین کی کرامتوں کے منکر یہ روحانی نمبر پڑھ لیں۔ یقین جانے قائل ہو جائیں گے۔ جس کسی کی تحریر کو پڑھا دل عجیب سے کیف میں ڈوب گیا۔ کاشی بھائی میں سورج کو چراغ نہیں دکھا سکتا۔ یہ تمام تحریریں بھی سورج کی طرح چاروں طرف روشنی پھیلا رہی ہیں۔ میں تمام لکھنے والوں کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دینا چاہتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ بزرگان دین سے ہم سب فیض پاتے رہیں۔ میں نے روحانیت پر سیکڑوں رسالے پڑھے ہوں گے، مگر اتنا خوب صورت شمارہ صرف کاشی بھائی کی صورت پڑھنے کو ملا ہے۔ مبارک صدمبارک! آتش جنوں، ناگن اور مٹھنی حسب روایت ٹھیک چل رہے ہیں۔ سرور شاہ صاحب کی کھٹل کا دوسرا دور آخری حصہ پڑھ کر مزا آ گیا۔ بہت خوب ”مسئلہ یہ ہے“ ایک بہت خوب صورت سلسلہ ہے۔ سخن آباد میں سب نے ہی بہت خوب لکھا ہے، اس بار غزلیں صرف 4 تھیں مگر کون سی زیادہ خوب صورت، یہ کہنا ذرا مشکل ہے۔ آخر میں سب کو ڈھیروں دعائیں۔ مجھے بھی دعاؤں میں یاد رکھیے گا، کوئی غلطی ہو تو معافی! بشرط زندگی پھر ملاقات ہوگی۔

☆ پیارے عادل۔ تبصرہ شاندار کیا، تمہاری محبت کے لیے لفظ کم پڑ جائیں گے اس لیے فی الحال صرف اتنا۔ ویلڈن۔

✉ ایم جے قریشی، ڈی آئی خان سے پہلی بار احوال میں شریک ہیں، لکھتے ہیں السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کاشی بھائی اور کاشی بھائی کی پوری ٹیم خیر و عافیت سے ہوں گے۔ ماہ مئی 2014 کا کاشی بھائی کا تازہ شمارہ 29 مئی کو ہمارے گھر کی دہلیز پر اپنا قدم رکھ چکا تھا، روحانی نمبر کا ٹائٹل بہت پسند آیا۔ کاشی بھائی کی ہر تحریر، ہر کہانی اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ کہانیوں میں، آتش جنوں سلیم فاروقی، دعا صفدر علی حیدری، یقین کامل تنویر خالد، مرشد کی دعائیں سیکھ صدف کی کہانیاں بہت پسند آئیں۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ سخن آباد میں سب دوستوں نے اچھا لکھا۔



میں عرصہ ایک سال سے کاشی بھائی کا قاری ہوں، لیکن شرکت پہلی بار کر رہا ہوں امید ہے حوصلہ افزائی کریں گے۔ میں اور میرے دوست، جواد حسن، محمد سعید، محمد عرفان، جمشید حسین اور محمد عثمان کی دعا ہے کہ کاشی بھائی آپ کی ادارت میں ہمیشہ پھلتا پھولتا رہے۔ کاشی بھائی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ پیارے بھائی ایم جے۔ سدا خوش رہو، تبصرہ! اچھا کیا آپ نے اور آپ کی تحریر بھی بہت خوش خط ہے۔ شاعری جلد سخن آباد کے صفحات کا حصہ بنے گی۔

✉ ساحل ایڈو بلوچستان سے کافی عرصے بعد احوال میں مہمان ہیں، لکھتے ہیں قابل احترام کاشی چوہان، سدا خوش رہو مسکراتے رہو۔ السلام علیکم بعد عرض ہے کہ میں یہاں بالکل خیریت سے ہوں اللہ پاک سے دعا ہے کہ آپ اور آپ کی پوری ٹیم بھی خیر خیریت سے ہوگی۔ دیگر احوال یہ ہے کہ ماہ اپریل کا تازہ شمارہ کاشی بھائی میں میرے ہاتھوں میں ہے، آپ کی باتیں اور اس بار جو کاشی بھائی پر محنت کی گئی ہے تو اس کا اندازہ شاید آپ کو قارئین کے خطوط سے ہوگا، کیوں کہ اس کی محنت سے تو کاشی بھائی کے ورق بہ ورق سے ادبی خوشبو مہکے لگی ہے اور گیل کا غنڈ خشک نورانی کپڑے کی طرح چمکنے لگا ہے اور خطوط کی محفل میں سجے ہوئے سوتیوں کے دانوں سے گلدستہ ہمارے ادیب حضرات ایک دوسرے کو خوشیوں بھرا تھپتھپ کر رہے ہیں۔ اللہ کرے ایسی محنت ہمیشہ کے لیے ہوتی رہے۔ کاشی بھائی کبھی کبھار آپ سے باتیں ہوتی ہیں تو اکثر آپ کو نگہ ہوتا ہے کہ ساحل کوئی کہانی تبصرہ لکھے۔ تو میں یہاں صرف یہ کہوں گا کہ ایک تو کاشی بھائی مجھے (ذیرہ اللہ یار) میں بہت دیر سے ملتا ہے جس پر تبصرہ کرنا ناممکن ہوتا ہے ہاں مگر کبھی کبھار جلدی پہنچ جاتا ہے تو حاضری دیتے رہتے ہیں۔ آپ ایک رائٹر کی حیثیت سے مدبر اعلیٰ تک پہنچ گئے ہیں! یہ آپ کی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے۔

☆ بہت عزیز ساحل! تمہاری یہ امیر غریب کی تکرار نے مجھے پریشان کر دیا۔ اپنا ہی ایک شعر اس کے جواب میں۔

دل میں جھانکا تو یہ کھلا ہم پہ
باد شیشہ بھی غریب ہوتے ہیں

✉ ظفر علی ایڈو۔ ملیر کراچی سے رقم طراز ہیں، کاشی چوہان بھائی بہت سی دعائیں نیک تمنائیں آپ سمیت پورے اسٹاف اور تمام کاشی بھائی کے چاہنے والوں کے نام۔ 2 مئی صبح جب مارکیٹ کا چکر لگایا تو کاشی بھائی کو اسٹال پر دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی قدم روک لیے تمام شماروں میں منفرد اور ممتاز نظر آ رہا تھا ایک دم خرید لیا، روحانی نمبر دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی آپ اس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ آپ کی خدمت اور دم سے کاشی بھائی عروج پر پہنچ چکا ہے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ آمین۔ بس امید ہے آپ یونہی ہمیں اپنی محبتوں، شفقتوں سے نوازتے



رہیں گے۔ 22 صفحہ پر 22 ویں سیٹ میری تھی۔ اپنا خط پڑھنے سے پہلے آپ کا محبت بھرا جواب پڑھا۔ بھائی واقعی کاشی بھائی ہمارا ہی پرچہ ہے۔ اس کی ترقی ہماری ترقی ہے۔ احوال میں نئے لوگوں کی آمد بھلی لگی۔ سدرہ انور علی شکر یہ۔ مور شاہد حسین آپ کی نظم ”وہ“ خوب رہی، بھائی ہم اشارہ نہیں سمجھتے؟ امجد علی بھیا، غلام رسول گل، شفقت حسین، فیض رسول کیا حال ہیں جناب؟ منترہ سہام کے ادارے ”پختہ عزم“ سے لے کر ارشد علی ارشد کی لکھنی تک سب کی سب کہانیاں بے حد پسند آئیں۔ رائٹر حضرات نے روحانی نمبر کے لیے اچھے موضوع پڑھنے کو دیے۔ مبارک باد۔

☆ ظفر بھیا! تم تو ہمارے پڑوسی ہو مگر تبصرہ T.C.S سے.....؟ پھر بھی ہمیں تمہاری محبت پر مان ہے۔

✉ امجد علی۔ جنرل آباد سے شریک احوال ہیں، لکھتے ہیں مدبر اعلیٰ منترہ سہام اور مدبر کاشی چوہان کاشی بھائی السلام علیکم امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ تازہ شمارہ وکٹش روحانی نمبر ہاتھوں میں ہے۔ آپ کاشی بھائی کی ترقی کے لیے انتھک محنت کر رہے ہیں لیکن



اس کے باوجود بھی سچی کہانیاں 29-30 کو ملتا ہے اور آپ نے خط لکھنے کی 6-7 تاریخ مقرر کی ہے۔ پلیز بھائی اس پر خاص توجہ دیں۔ امید ہے آپ میری اس چھوٹی سی گزارش کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ سب سے پہلے کچھ اپنی باتیں پڑھی، یہ اچھا نہیں بہت اچھا سلسلہ ہے جاری رہنا چاہیے۔ مصروفیات کے باعث چند کہانیاں پڑھی ہیں جن پر تبصرہ پیش خدمت ہے۔ جلوہ جنوں جاوید راہی، چشمہ فیض، ملک عاشق حسین ساجد، صفدر علی حیدری دعا، بشیر احمد بھٹی وہ سو روپے اچھی تھیں بے حد پسند آئیں۔ ارشد علی ارشد مکھن، سلیم فاروقی آتش جنوں، اعجاز احمد نواب ناگن حیرت اور نجس سے بھرپور پسندیدہ سلسلے ہیں۔ اب اجازت انشاء اللہ اگلے ماہ ان ہی صفحات پر آپ کے ساتھ ہوں گے۔ بشرط زندگی۔

☆ پیارے امجد - شمارہ پسند کرنے کا شکریہ، آپ کے اگلے تبصرے کا انتظار ہے۔

✉ سرگودھا سے عظمیٰ شکور رقم طراز ہیں، ایڈیٹر صاحب آداب، چھ چاندوں سا چمکتا ہر ورق لیے سچی کہانیاں آن پہنچا، میں نے دو چاندوں کا اضافہ کر دیا ہے کیوں کہ چار چاند کچھ کم لگ رہے تھے کہ سرورق تھا ہی اتنا حسین بالکل نورانی، سر پر ٹھیک سے دو پٹا جمایا اور کھول کر لگے پڑھنے، منزہ سہام کے سچے جذبے اپنے ملک کے لیے ہمیشہ کی طرح کھرے تھے، کاشی چوہان صاحب کی بہت ساری باتیں پڑھنے کو ملیں، احوال میں آئے تو گویا گم ہو گئے بہت سے قارئین میں گھر کر اچھا لگا، آگے بڑھے کہانیاں پڑھنے کو ملیں، تمام کہانیاں پڑھ کر امات سے بھری پڑی تھیں ان کہانیوں پر کچھ رائے دینا سوچ کر چراغ دکھانے کے برابر ہے پھر بھی جو محسوس کیا ہے لکھ ڈالا ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آتے ہیں، ممتاز احمد کی لکھی تحریر "نوٹاں والی سرکار" پر یہ کہانی اصل میں ایک یقین کی عکاسی کرتی ہے۔ "صفدر علی حیدر" کی لکھی کہانی دعا میں "دعا" کی حقیقت کو بیان کیا گیا تھا۔ بشیر احمد بھٹی کا لکھا "وہ سو روپے" میں حضرت سیدنا جبریلؑ کے مزار کے بارے میں بہت سی معلومات ملیں۔ گل رعنا کی "پڑوسی" بھی خوب رہی۔ مجید احمد جانی کی لکھی تحریر "درتو یہ کھلا ہے" زلای تو ڈالا اس تحریر نے۔ "رتی اللہ والی" بھی زبردست تحریر تھی، اب آتے ہیں ریاض حسین شاہد کی لکھی کہانی کی طرف "صنم کدہ ہے جہاں" عشق مجازی سے عشق حقیقت تک لے جانے والی یہ کہانی اچھی تھی۔ یہ روحانی سفر تھا زبردست، بزرگوں کی کرامات، مزاروں پر لوگوں کا ہجوم سب کا ایک ہی مقصد کہ اللہ راضی ہو جائے۔ اس غرض کی دنیا سے ہٹ کر بالکل اک نئی دنیا کی سیر کرانے میں کامیاب رہے آپ۔ اپنی کوششوں میں، ویلڈن، ویری ویلڈن۔

☆ عظمیٰ شکور صاحب! سلامت رہیے۔ ہمیشہ کی طرح آپ کا تبصرہ شاندار رہا، اگلے ماہ کے لیے آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

✉ ہماری بہت پیاری گڑیا سی سدرہ انور علی جھنگ صدر سے احوال میں شریک ہیں۔ لکھتی ہیں،



محترم کاشی چوہان بھیا، میرے پیارے مہربان برادرزادہ اینڈ میری جان قدردان سسرز، السلام علیکم! اسی امید کے ساتھ حاضر خدمت ہوں کہ تمام پڑھنے والے صحت و امان کی بہترین حالت میں ہوں گے اور اپنی زندگی رضائے الہی میں گزار رہے ہوں گے، چڑھتی گرمیوں کا پہلا شمارہ ملا جو کہ روحانی نمبر بھی تھا یقین کیجئے میں نے آج تک ایسا نمبر نہیں پڑھا۔ روحانی نمبر کے حساب سے فائل بہترین تھا۔ کچھ اپنی باتیں نے ہلا کر رکھ دیا۔ احوال میں تمام خطوط بہتر تھے لیکن ممتاز احمد بھیا، ثمنہ ناز اور ملکہ احوال حسین جو نیچو کے خطوط بہترین تھے۔ ملکہ احوال حسین جو نیچو میں تو اور بھی کئی زبانوں سے واقف ہوں مثلاً خاص طور پر نفرت و محبت کی زبان سے۔ ممتاز احمد بھیا جب آپ اتنا مان سامان دیتے ہیں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ فیصل ندیم جی اللہ آپ کو زندگی کے ہر امتحان میں کامیابیوں سے نوازے۔ آمین، زرینہ جو نیچو آپ، رانا شاہد بھیا، محمد عزیز بھیا، عزیز انکل، فییم انکل، سلیم اختر انکل کو سلام پلیز اب آ بھی جائیے۔ منزہ سہام آنٹی کا اداریہ، پختہ عزم، دل کی آنکھ سے پڑھا۔ روحانی نمبر بہت پسند آیا، پہلی کہانی جاوید راہی کی جلوہ جنوں، ممتاز احمد بھیا کی نوٹاں والی سرکار، ملک عاشق حسین کی فیض عشق، صفدر علی حیدر کی دعا، بشیر احمد بھٹی کی، سو روپے، گل رعنا کی پڑوسی، مجید احمد کی توبہ کا در کھلا ہے، حنا بشری کی وہ

میرا مہرباں، مہر پرویز کی اعجاز دعا، روح کو تقویت پہنچانے والی بہترین کہانیاں تھیں۔ صدف آصف کی شان مولا، بہت پسند آئی، صنم کدہ ہے جہاں ریاض حسین شاہد کی کہانی بہت لا جواب تھی، سخن آباد میں تمام شاعروں کی شاعری پسند آئی۔ جن میں خاص طور پر غلام رسول گل، عبدالعزیز انکل اور زرینہ آنٹی کی۔ سلسلے وار کہانیوں میں انکل سلیم فاروقی کی آتش جنوں، اعجاز احمد نواب کی ناگن کا جواب نہیں۔ تبصرے میں کچھ رہ گیا ہو تو بہت معذرت، کسی کو کوئی بات بری لگی ہو تو دلی معذرت، سانسوں کا تسلسل اسی طرح قائم و دائم رہا تو پھر ہوگی ملاقات کب تک کے لیے اپنا اور اپنے ساتھ والوں کا خیال رکھیے گا، اللہ نگہبان۔

☆ سدرہ سسر! سلامت رہو۔ تبصرہ بہت اچھا کیا۔

✉ طارق جاوید، بہاول نگر سے لکھتے ہیں، محترم کاشی چوہان بھائی۔ السلام علیکم، خدا آپ کو سدا سلامت رکھے آمین احوال میں یہ میری دوسری شرکت ہے۔ اس کی خاص وجہ آپ کی محبت و اپنائیت ہے آپ کا خوب صورت جواب پڑھ کر بے حد خوش ہوئی، میں ہمیشہ آپ کا مشکور و ممنون رہوں گا کہ آپ نے اگلے ماہ بھی ان ہی صفحات پر ملاقات کرنے کا اظہار کیا۔ روحانی نمبر بہت اچھا تھا بے حد پسند آیا۔ سچی کہانیاں تمام ڈائجسٹوں میں منفرد ہے۔ میں پہلے اور رسالے پڑھتا تھا مگر ایک بار میں نے سچی کہانیاں پڑھا تب سے میں اس کا دل سے مداح ہو گیا۔ روزانہ انتظار کی سولی پر لٹک کر اس کا انتظار کرنا ملنے کے بعد اس میں کھوجانا اب عادت بن چکی ہے۔ پرچے کی شروعات آپ کی تحریر کچھ اپنی باتیں سے کی۔ آپ بہت خوب لکھتے ہیں بھائی مگر آپ کی کہانی کی کمی محسوس ہوتی ہے، اب اجازت۔



☆ طارق! آپ نے پرچے کو پسند کیا، ہمیں بہت اچھا لگا، اگلے ماہ آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔

✉ شفقت حسین حب چوکی سے رقم طراز ہیں۔ پیارے بھائی کاشی چوہان خدا آپ کو سدا سکھی رکھے۔ آمین، ماہنامہ سچی کہانیاں روحانی نمبر شاندار ٹائٹل کے ساتھ شمارہ بھی نہایت ہی شاندار تھا۔ آپ نے بھیا جی کو فرٹ سیٹ دے دی ہمیں بھی خوشی ہوئی، مبارک ہو بھائی۔ غلام رسول گل بھی نظم لائے خوشی ہوئی، سدرہ انور علی کیسی ہیں آپ؟ ممتاز احمد کی تحریر نوٹاں والی سرکار بے حد پسند آئی۔ گل رعنا کی پڑوسی، صدف آصف کی شان مولا، حنا بشری کی وہ میرا مہرباں، ریاض حسین شاہد کی صنم کدہ ہے جہاں زیادہ پسند آئیں، ندا ہاشمی کی نور کا ہال، نسیم سیکڑہ صدف کی مرشد کی دعا بھی عمدہ لگی۔ اب اجازت آپ سے اس شعر کے ساتھ۔



سرخ آنکھوں سے جب وہ ہمیں دیکھتے ہیں
ہم گھبرا کے آنکھیں جھکالیتے ہیں
ارے کاشی کیسے ملائیں ان کی آنکھوں سے آنکھیں
نا ہے وہ آنکھوں سے اپنا بتالیتے ہیں

☆ ارے واہ شفقت حسین! کیا بات ہے آپ کی۔ خوش رہیے، کبھی کبھی وہ آنکھیں بھی دکھا دیتے ہیں۔

✉ یہ احوال میں آمد ہے فیض رسول کی بہاد پور سے، لکھتے ہیں، جناب مدیر سچی کہانیاں کاشی چوہان صاحب بتائیے کیسے مزاج ہیں آپ کے، مجھے خدا کے فضل و کرم سے پوری امید ہے کہ آپ اور پورا اسٹاف بخیریت ہوں گے، سچی کہانیاں کی جتنی تعریف کریں اتنی کم ہے، ہمیشہ کی طرح ٹائٹل خوب رہا، محترمہ منزہ سہام پختہ عزم اور کاشی چوہان بھائی آپ کی تحریر کچھ اپنی باتیں لا جواب سلسلہ ہے۔ ہر ماہ کوئی خوب صورت سبق پڑھنے کو ملتا ہے۔ احوال کی کیا بات ہے۔ بھائی اپنوں کی محبتوں سے بھی محفل بہت اچھی ہے۔ احوال میں اپنا خط اور تصویر دیکھ کر خوشی ہوئی ہر ماہ تھوڑی سی جگہ دینے



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ٹملہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کا شکر یہ۔ جھنگ صدر کی بہن سدرہ انور علی یاد کرنے کا شکر یہ، خدا آپ کو دراز عمر عطا فرمائے۔ باقی تمام احوالیوں کو سلام۔ کاشی بھائی حسب معمول 3 تاریخ کو کچی کہانیاں ملا۔ احوال ہی پڑھ سکا ہوں اگر بروقت پرچہ ملتا تو بھر پور تبصرہ ضرور کرتا۔ بس خدا سے دعا ہے کہ آپ سدا مسکراتے رہو پیارے قارئین کے ساتھ دکھ سکھ اور خوشیاں بانٹتے رہو۔



☆ فیض رسول! بھائیہ تو آپ کی محبت ہے۔ احوال میں آمد آپ کا حق ہے۔ مگر تبصرہ اب آپ نے بھر پور کرنا ہے۔ ✉ ظفر اللہ رند، ڈیرہ مراد جمالی سے احوال میں شریک ہیں، لکھتے ہیں۔ محترم جناب مدیر اعلیٰ منظرہ سہام آئی اور مدیر کاشی چوہان صاحب تمام اسٹاف اور لکھاری بھائیوں اور بہنوں آپ تمام اس ناچیز کی طرف سے سلام قبول ہو۔ السلام علیکم! کاشی بھائیہ بات میں آپ کو بھی نہ کہوں تو کس کو کہوں آپ یقین کریں جب میں نے محمد اقبال زمان سے بات کی تھی تو صرف 3 مہینے مجھے ڈائجسٹ بروقت ملتا رہا ہے۔ اس کے بعد اب پھر وہی سسٹم ہے جیسے پہلے تھا۔ اب آپ یقین کریں ماہ اپریل کا ڈائجسٹ مجھے اپریل کی 13 تاریخ کو ملا اور اس وجہ سے میں شامل احوال نہ ہو سکا اور آج ماہ مئی 4 تاریخ کو آپ کو خط لکھ رہا ہوں اور ابھی تک کچی کہانیاں نہیں ملا ہے۔ آخر ہم پر اتنا کیوں ستم کر رہے ہیں۔ چوں کہ ڈائجسٹ ملا نہیں ہے اس لیے مختصر لکھ رہا ہوں پلیز اگر ہو سکے تو شامل اشاعت کر دیں اور اس مسئلے کو حل کریں تاکہ ہر ماہ بروقت احوال میں شامل ہو جائیں اور کاشی بھائی ماہ اپریل میں، میں نے اپنی شاعری دیکھی تو قسم سے خوشی کے مارے میں تو پاگل ہو رہا تھا اور خود یہ یقین نہیں تھا کہ یہ میری شاعری ہے اور وہ بھی کچی کہانیاں میں بدل سے میں آپ کا مشکور ہوں اور اب مزید شاعری بھیج رہا ہوں، اگر جگہ مل جائے تو کسی کو نے میں شائع کر دیتا۔ اب اجازت امید ہے کہ میرے اس مسئلے کو بخیرگی سے حل کریں گے۔

☆ بھائی ظفر اللہ رند، آپ کا مسئلہ متعلقہ شعبے تک پہنچا دیا گیا ہے۔ مگر آپ سے ایک گزارش ہے کہ آپ اپنی مٹی آرڈر کی رسید کی فوٹو کاپی روانہ کر دیجیے۔



✉ عبدالعزیز جی آچکوال سے بڑے دن بعد احوال میں موجود ہیں، لکھتے ہیں اچھے کاشی چوہان سلام عقیدت، کچی کہانیاں ”روحانی نمبر“ موصول ہوا دیدہ زیب ٹائٹل خوب صورت باسٹڈنگ، قابل صدا احترام قاری بھائی، بہنوں، بچوں کی شیشی شیشی باتوں اور پیاری پیاری تصویروں، سبق آموز تحریروں عظمیٰ شکور کے نٹ گھٹ جملوں سے سجا احوال بندہ فقیر کے ہاتھوں میں پہنچا ضرور مگر وہ چیز دیکھنے میں نہیں آئی جو ہمارے وقتوں میں محفل دوستاں احوال و چوپال کی زینت تھی۔ ”جہاں جہاں شرارت وہاں وہاں تحسین“ جیسے خوب صورت جملے کہیں نظر نہیں آتے۔ سدرہ بیٹی آپ نے ہمیں پچھلے شمارے میں آواز دی تھی، احتجاجاً کچی کہانیاں سے بایکٹ کیے بیٹھا تھا لیکن بیٹی کی آواز سن کر رہا نہ گیا اور چلا آیا۔ میلہ دیکھنے اور زخمی ہونے کا واقعہ آرزوہ کر گیا۔ آپ نے لکھا مجھے قبر سے ڈر لگتا ہے، نماز پنجگانہ کی عادت ڈالو ہو سکے تو تہجد بھی پڑھو قبر کا خوف جاتا رہے گا۔ ”یہ آرمایا ہوا نسخہ ہے“ مور شاہد اور ممتاز احمد نے بھی ہمیں یاد کیا۔ جیتے رہو۔ ملک عاشق حسین ساجد، عبدالغفار عابد، ریاض حسین شاہد، بشیر حسن اور اشفاق بٹ کو کچی کہانیاں میں خوش آمدید۔ اشفاق جی اللہ بیٹی کو صحت کاملہ نصیب فرمائے۔ میری تمام نیوکمز سے درخواست ہے کہ ادب کی دنیا میں بے ادبی سے گریز کرنا سب سے بڑا احترام اور جو نیوز پر دست شفقت رکھنا۔ ہمیشہ سچ بولنا، عمر مت چھپانا۔ تصویر ہمیشہ فریش دینا۔ اس عمل سے آپ کی عزت و توقیر میں اضافہ ہوگا۔ محبوبہ بنانے کا شوق پڑائے تو جی آنکھ کی طرح سچائی کو محبوبہ بنالیتا۔ انشاء اللہ ایک نہ ایک دن اصل محبوب کو پا لو گے۔ میری دعائیں ہمیشہ آپ لوگوں کے ساتھ رہیں گی۔ کاشی میرے عزیز دوست نظم لگانے کا بہت شکر یہ۔ نیک تمناؤں کے ساتھ محبت نامہ بند کرتا ہوں۔ ہر یاد کرنے والے کو سلام۔ آپ سب کا انکل جی آ۔

☆ بھائی! سلامت رہیے۔ اب بڑے بن کر دکھائیں اور ہر ماہ احوال میں حاضری باقاعدہ بنائیں۔



✉ فیصل ندیم بھی چک نمبر 58 شمالی سرگودھا سے شامل احوال ہیں۔ السلام علیکم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں محترمہ منزہ سہام صاحبہ اور مدیر جناب کاشی چوہان اور تمام معاون اشاف خیر و عافیت سے ہوگا۔ 30 اپریل کو ماہ مئی کا شمارہ پراچہ بک ڈپو سے ملا۔ شمارے کا ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ روحانی نمبر کی مناسبت سے اسلامی خواتین کی جھلک دیکھنے کو ملی اور دوسرا ورق جو ڈبل ہوتا تھا شکر ہے کہ اس سے جان چھوٹی حسب روایت سب سے پہلے منزہ سہام صاحبہ کا ادارہ ”پختہ عزم“ پڑھنے کو ملا۔ کاشی بھیا کی کچھ اپنی باتیں مختصر سی کہانی بہت بڑا سبق اپنے اندر سیٹھ ہوئے۔ اس کے بعد احوال پڑھتے پڑھتے جب سدرہ انور علی کا احوال پڑھا تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ سدرہ جی اللہ نے آپ کو ایک نئی زندگی دی ہے اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور آپ کے من کا آنگن ہمیشہ خوشیوں سے مہکتا رہے۔ آمین۔ ممتاز احمد صاحب آپ کا بڑا پیار ہے مجھ ناچنے کی تعریف میں چند الفاظ جو آپ نے لکھے ہیں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں ہمیشہ خوش رہیں۔ اب کچھ تبصرہ کہانیوں پر سب سے پہلی کہانی جاوید راہی کی جلوہ جنوں پڑھ کر ایک زندہ دلی کی کشف و کرامات سے دل روشن ہوا۔ ممتاز صاحب کی نوٹاں والی سرکار کی فضیلت و کرامات پڑھ کر اسی دن میں نوٹاں والی سرکار پر حاضری دیے بغیر نہ رہ سکا۔ چشمہ فیض پڑھ کر بھی دل ایمانی جذبے سے سرشار ہوا اور روحانیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ سلیم فاروقی کا آتش جنوں بھی کامیابی کی طرف ایک نیا قدم ہر بار لیے جا رہا ہے۔ دعا صدق علی حیدری بھی وسیلہ دعا کی عظیم مثال حقیقت ہے کہ دعا سے تقدیر بھی بدل جاتی ہے۔ بشیر احمد بھی صاحب کی وہ سورہ پے۔ گل رعنا کی پڑوسی، مجید جانی کی دیر تو بے کھلا ہے، صدف آصف کی شان مولا، منجیل مجتوب کی رتی اللہ والی، حنا بشری کی وہ میرا مہربان، سہزاد کنول عمران کی۔ یقین کامل تنویر خالد کی۔ ندا ہاشمی کی نور کا ہالا، الماس فاطمہ ارمان کی بھر دے جھولی، مسز نوید ہاشمی کی کایا پلٹ، مرشد کی دعائیں سیکھ صدف کی اور کھٹل کا دوسرا حصہ بھی بہت دلچسپ تھا۔ تمام کہانیاں پڑھ کر ایک بار پھر دل نور ایمان سے منور ہوا اور روح کو سکون ملا۔ مبشر حسن ہیڈ بکائی سے احوال میں شریک ہونے پر خوش آمدید کہتا ہوں، مجھ ناچنے کے خط کی پسندیدگی کا شکر یہ جناب یہ ہیڈ بکائی کس جگہ واقع ہے؟؟ SMS کے ذریعے احوال میں سرگودھا سے صائمہ شاہین نے شرکت کی ہے احوال میں شامل ہونے پر خوش آمدید اب اگلی بار بذریعہ خط احوال میں شامل ہونا چاہیے آپ کو۔ انہی الفاظ کے ساتھ اجازت کہ اللہ تعالیٰ ملک پاکستان کو امن کا گہوارہ بنائے آمین۔ کاشی بھیا اب تو میری کہانی شائع کر ہی دیں۔

☆ پیارے فیصل۔ سدا سلامت رہو، تبصرہ سنا دیا کیا تم نے، واہ مزہ آ گیا۔ بس تمہاری کہانی شائع ہونے ہی والا ہے۔ ✉ تحصیل کچھرو، ضلع ساکھڑے محمد علی خڑ پھلی بار احوال میں تشریف لائے ہیں، عرض کرتے ہیں محترمہ مدیرہ اعلیٰ منزہ سہام صاحبہ السلام علیکم، مجھے آپ کا ڈائجسٹ سچی کہانیاں بہت پسند ہے جو میں پہلے حیدر آباد رہتا تھا تو وہاں سے لیتا تھا۔ اب میں گاؤں چلا گیا ہوں۔ وہاں پر آپ کا رسالہ مجھے نہیں ملتا۔ بہت افسوس کی بات ہے۔ اگر آپ ہر مہینے وی پی پارسل سے ہر مہینے بھجوائیں گے تو میں پیسے دے کر وہ ڈاک ہاتھوں ہاتھ لے جاؤں گا۔ اگر آپ ایسی عنایت کریں گے تو بہت مہربانی ہوگی، میں بھی آپ کے ڈائجسٹ میں لکھنا چاہتا ہوں سچی کہانیاں، مگر میں لکھ نہیں پا رہا ہوں کہ ڈائجسٹ نہیں ملتا تو مجھے کیسے پتا چلے گا کہ میری اسٹوری شامل ہے یا نہیں۔ مہربانی

☆ بہت پیارے محمد علی خڑ! جناب اتنا خرچہ کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ VP پارسل کے ذریعے پرچہ پہنچایا جائے۔ آپ فوری طور پر 720 روپے کا مٹی آرڈر آفس میں بھجوادیں پرچہ ہر ماہ، وقت پر آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔ ✉ کراچی سے ایک طویل عرصے بعد ہماری بہت اچھی رائٹر عروہہ عدنان احوال میں شامل ہیں، لکھتی ہیں قابل احترام کاشی چوہان صاحب! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ بالکل خیریت سے ہوں گے اور آپ کی سربراہی میں سچی کہانیاں اور دو شیزہ بڑی تیزی سے ترقی کی منازل طے کر رہے ہیں۔ کافی عرصے سے غیر حاضر ہوں، معذرت قبول

کچھ مصروفیات کی بناء پر عارضی طور پر لکھنے لکھانے کا سلسلہ رک گیا تھا مگر لکھاری کا لکھنا بند کرنا ایک ناممکن امر ہے، سو آپ کے دربار میں پھر حاضر ہوں۔ ایک چھوٹا سا شکوہ ہے آپ سے کہ ہماری ایک کہانی ”کشمیر جنت نظیر“ آپ کے پاس محفوظ ہے ابھی تک سچی کہانیوں میں چھپ نہ سکی، برائے مہربانی وجہ بیان فرمادیں۔ میرے خیال میں تحریر میں کچھ نقص نہیں بہر حال مرضی ہے صاحب..... آج تک ہمارے ساتھ ایسا ہوا نہیں۔

☆ پیاری بہن عروہہ! بس ”کشمیر جنت نظیر“ کل نمبر آیا ہی چاہتا ہے اور آپ احوال میں اتنی غیر حاضر کیوں ہیں؟ ✉ ڈیرہ قازی خان سے ہماری بہن ارم خان لکھتی ہیں، السلام علیکم! مجھے بھائی! امید ہے ٹھیک ہوں گے، آپ کی یہ بہن آپ کی خوشیوں کے لیے دعا گو ہے، بہت بہت شکر یہ جو آپ ہر ماہ آپ میرے خط کو احوال کی محفل میں جگہ دیتے ہیں اور اس ماہ اپنی شاعری دیکھ کر بے حد خوش ملی، میری شاعری کو شامل کرنے کے لیے ایک بار پھر شکر ہے۔ اس ماہ کا اپنا خط دیکھ کر تھوڑا اچکرا سا آ گیا کیوں کہ خط اور نام میرا تھا لیکن ایڈریس اور پھر غور سے دیکھنے کے بعد تسلی ہوئی۔ اس ماہ خط کے ساتھ ایک غزل بھی بھیج رہی ہوں۔ اب آتے ہیں اس ماہ کے رسالے کی طرف جو میرے سامنے ہے۔ رسالہ اس بار بھی کیم کو ملا۔ بھیا جب لے کر آئے اور مجھے دے دیا میں نے رسالہ ہاتھ میں لیا دیکھا تو ٹائٹل والی لڑکی مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کے میں بھی مسکرا دی، پھر کچھ آگے چلی تو آپ کی منزہ سے ملاقات ہوئی پھر کچھ آگے چل کے بھیا جی کی کچھ اپنی باتیں پڑھیں پھر آگے جا کے احوال کی محفل میں تاک جھانک کی جہاں اپنا نام بھی نظر آیا پھر اس کے بعد کہانیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پڑوسی، رتی اللہ والی، بھر دے جھولی، نور کا ہالا یہ سب بہت اچھی تھیں، پھر ان کے بعد، صنم کدہ ہے جہاں پڑھی جسے پڑھ کے دل دکھ سے بھر گیا۔ باقی رسالہ ابھی نہیں پڑھا، کیوں کہ پورے ماہ اسے تھوڑا تھوڑا پڑھتا ہے، اگر اسے ایک دو دن میں ختم کر دیا تو پھر باقی دن کیسے گزریں گے۔ خط کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا ہے، سوا ب چلتے ہیں اگلے ماہ پھر سے آنے کے لیے اس وقت خدا حافظ۔

☆ پیاری ارم! سلامت رہیں، شاعری جلد شائع ہوگی، تبصرہ شامل ہے۔ ✉ کورنگی کراچی سے کشور وسم صاحبہ احوال میں ہمارے ساتھ ہیں، لکھتی ہیں جناب محترمہ مدیرہ اعلیٰ صاحبہ السلام علیکم! اس سے پہلے ایک کہانی آپ کو ارسال کر چکی ہوں اور جس کے چھپنے کی امید ظاہر کی گئی تھی، اب یہ دوسری کہانی لکھنے کی کوشش کی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ کوشش کامیاب ہوتی ہے یا نہیں۔

☆ بہن کشور وسم! پہلی کہانی بہت جلد ان صفحات پر نظر آئے گی۔ دوسری بھی جلد شائع ہو جائے گی، مگر یہ کیا؟؟ تبصرہ کہاں ہے پرچہ پر..... یہ تو قافل ہونا ہمارے ساتھ۔



✉ سرگودھا سے ہمارے بہت عزیز بھائی ممتاز احمد رقم طراز ہیں، محترمہ القام کاشی بھیا السلام علیکم۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں اس دعا کے ساتھ اپنے خط کا آغاز کرتا ہوں کہ رب رحمن رحیم جس کی رحمتوں اور نعمتوں کا کوئی شمار نہیں وہ اپنے خزانہ خاص سے ہم سب کو نواز دے۔ ماہ مئی کا روحانی نمبر خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ ہاتھوں میں ہے، آپ نے روحانی نمبر شائع کر کے سب کے دل جیت لیے ہیں، ادارہ میں منزہ سہام نے بہت عمدہ بات کہی یقیناً عزم ارادہ نیت اور لگن مضبوط ہوں، جذبے جواں ہوں تو جیت مقدر بن جاتی ہے۔ میں اپنے ان محترم دوستوں کا بھی بہت شکر گزار ہوں جنہوں نے بابا عمر دین کو سراہا اور پسندیدگی کی سند سے نوازا۔ ٹڈو جام کے بھائی سہزاد شاہ کو میرا احوال میں تبصرہ اچھا لگا بہت شکر یہ۔ احوال میں چھا جانے والی عظمیٰ شکور جی یہ بھی تو ایک کلا جگس ہے کہ ”بابا عمر دین“ پڑھنے کے دوران آپ کو چاہے کی طلب رہی۔ چلیں آپ کی چاہے میری طرف اُدھار رہی۔ لالہ موسیٰ کے ایم اشفاق بٹ صاحب میرا سلام قبول فرمائیں۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ کریم کائنات نبی کو جلد از جلد صحت یابی عطا فرمائے۔ آمین۔ احوال میں سب لکھاریوں نے بہت خوب صورت الفاظ کے ساتھ تبصرے لکھے۔ مجھے بہت صدمہ ہوا

کہ بیٹی سدرہ انور علی کو گرنے کی وجہ سے سخت چوٹ لگی۔ اللہ رب العزت کے فضل و کرم اور حضور نبی کریم ﷺ کے نفعین پاک کے تصدق سے اپنی اہلیہ کے ہمراہ عمرہ کی سعادت حاصل کرنے جا رہا ہوں، بے انتہا سرکاری اور نجی مصروفیات کے دوران ہی سچی کہانیاں ماہ مئی کے شمارے کا مطالعہ جاری ہے۔ جلوہ جنوب، چشمہ فیض، نور کا ہالہ، شان مولا، ربی اللہ والی، وہ میرا مہرباں، بھر دے جھولی، کا یا پلٹ پڑھ چکا ہوں سبحان اللہ ایمان تازہ ہو گیا روح تروتازہ معطر ہو گئی۔ تمام کہانیاں بہت خوب صورت تھیں۔ سب لکھاریوں نے اپنی محبت اور عقیدتوں کے پھول نچھاور کیے۔ کاشی بھی گزارش ہے کہ سال میں اگر دو بار نہیں تو کم از کم ایک بار روحانی نمبر ضرور شائع کیا کریں۔ خوش رہیے۔ خوشیاں سمیٹے آ باد رہیں شاد رہیں، انشاء اللہ ماہ اگست میں ملاقات ہوگی اگر بے وفائندگی نے ساتھ دیا تو..... تب تک اللہ نگہبان۔

☆ بھیا! خدا تعالیٰ سب کو اُس مقدس سر زمین کی زیارت نصیب کرے (آمین) سلامتی کی ساری دعاؤں کے ساتھ عمرے کی سعادت کی ایذا ناس مبارک ہو۔



✉ مہر پرویز احمد دلو، میاں چنوں سے لکھتے ہیں، محترم جناب ایڈیٹر صاحب سلام مسنون! تبصرہ حاضر خدمت ہے، سرورق بہت خوب صورت تھا۔ پختہ عزم خوب حوصلہ افزائی تھی۔ اپنی باتیں بھی یقین کی قوت سے مالا مال تھیں۔ احوال میں سدرہ انور علی کے حال نے خوف میں مبتلا کر دیا۔ یقیناً آپ کی کوئی نیکی کام آئی اور اوپر والے خصوصی طور پر تم کو انعام صحت سے نوازا۔ جاوید راہی، ممتاز احمد، ملک عاشق ایمان افروز تحریریں لائے۔ صفدر علی حیدری کی کہانی کا کیا کہنا۔ اگر ادھار روٹی کھا لیتا، حرام کھانا اور ایمان چلا جاتا کیا کہنے۔ بشر بھی نے خوب کہانی لکھی، گل رعنا کی پڑوسی خوب کہانی تھی، بجیل میٹلو کی ”رتی“ لا جواب کہانی تھی۔ بے حد پسند آئی، حنا بشری نے عورت ہو کر بڑے دل گردے کا کام کیا ہے اور روح پر ایک خوب صورت تحریر لکھ کر اپنی جواں مردی اور دلیری کا لوہا منوالیا ہے۔ تنویر خالد کی داگنا صاحب کی عنایتوں کی سوغات خوب تھی۔ نسیم سیکینہ صدف کی مرشد کی دعا کتنے ہی بیڑے پار لگا دیتی ہے، سرور شاذ آپ کی کہانی پر سچے کی سرسید تھی۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے، آپ نے لفظوں کے موتی خوبی کے ساتھ بکھیرے ہیں۔

☆ بھائی مہر پرویز۔ دیر سے سنی آپ آئے توج، امید ہے اب آپ کو شکایت نہ ہوگی۔

✉ نسیم آراء صاحبہ، ملیر سٹی کراچی سے احوال میں پہلی بار شریک ہیں، لکھتی ہیں! مدبر علی السلام علیکم، میں بہت عرصے سے سچی کہانیاں پڑھ رہی ہوں تقریباً بیس پچیس سال تو ہو گئے ہوں گے بہت سے پرانے رائٹرز اب نہیں لکھتے کہاں چلے گئے، نئے رائٹرز آ گئے ہیں۔ اچھا ہوا کہ آپ لوگ نئے لوگوں کو جگہ دیتے ہیں۔ میں ہمیشہ لکھنے کا سوچتی تھی لیکن چھوٹے بچوں کی وجہ سے نہیں لکھ سکتی اب بچے بڑے ہوئے شادیاں ہوئیں تو فرصت ملی لیکن اپنی رائٹنگ کی وجہ آڑے آ گئی اور اب تو جوڑوں کے مرض کی وجہ بھی ہے پھر بھی کوشش کی ہے لکھنے کی، اگر آپ کو اچھی لگے تو شائع کر دیں بہت خوشی ہوگی اتنی بھی بہت تیار ہیں ان کی کہانی زندگی میں شائع ہو جائے تو وہ بھی خوش ہو جائیں گی، اللہ امی کو زندگی دے (آمین) ویسے کہانیاں تو بہت ہیں، یہ شائع ہو گئی تو اور کہانیاں لکھنے کی ہمت کروں گی۔

☆ نسیم آراء صاحبہ! خدا آپ کی والدہ کو صحت اور لمبی عمر عطا کرے۔ کہانی ابھی پڑھی نہیں ہے، پڑھ کر جلد فیصلہ کریں گے۔

✉ نازیہ بیول رضا کراچی سے رقم طراز ہیں، محترم ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم اس ماہ کا ”روحانی نمبر“ میرے سامنے ہے، تقریباً آدھا پڑھ چکی ہوں جتنا پڑھا پسند آیا، ہاں لیکن ایک شکایت ہے، وہ یہ کہ چار مہینے ہو چکے ہیں اور میری کہانی آپ کے پاس ہے اس کا کیا بنا؟ میں ہر مہینے شریک نہیں ہو پاتی شاید اس لیے میری کہانی التواء میں پڑی ہے۔ ماشاء اللہ مارچ کے مہینے میں، میں نے اور میرے شوہر نے عمرے کی سعادت حاصل کی ہے۔ سچی کہانیاں سے رشتہ بہت پرانا ہے اور ہر ماہ میں باقاعدگی سے اس کا مطالعہ کرتی ہوں اور اسی طرح رشتہ بنائے رکھنا چاہتی ہوں۔ امید ہے ایسا ہی ہوگا تمام احوالیوں کو سلام اور دعائیں اور مجھے سب دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ اچھی نازیہ جی! عمرے کی بہت بہت مبارک باد قبول کیجیے، کہانی جلد شائع ہو جائے گی۔

✉ لندن ضلع دھاڑی سے منشی محمد عزیز سے رقم طراز ہیں، ڈیر کاشی چوہان جی! السلام علیکم، کیسے ہیں آپ لوگ؟ اللہ تعالیٰ آپ سبھی کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ ہمیشہ ہمیش کے لیے (آمین) کاشی بھائی! پتا نہیں کیا بات ہے میں خط اور کہانیاں وغیرہ لکھنے کی کوشش کرتا ہوں، خط تو گرتے پڑتے مکمل ہو جاتا ہے لیکن کہانیاں مکمل کرنے کو جی نہیں چاہتا، سمجھ نہیں آ رہی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ روحانی نمبر 28 اپریل کو ملا، اس ماہ کا سرورق بالکل ”نمبر“



کے مطابق تھا اور ہر لحاظ سے پسند آیا۔ فہرست سے گزرتے ہوئے کچھ اپنی باتیں میں پہنچے، واقعی کاشی جی! ابھی ابھی میں بھی آپ سیٹ سا ہو جاتا ہوں اپنی روٹین لائف سے۔ محمد اقبال زمان کی والدہ محترمہ کے لیے دعا گو ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں تندرستی اور شفا کے کاملہ عطا فرمائے۔ (آمین) مور شاہد حسین، غلام رسول گل، عادل حسین، امجد علی، سدرہ انور علی، ممتاز احمد، تحسین جو نیجو، صفدر علی حیدری، شمیمہ ناز کہانی ”سنگتے ارمان“ کی پسندیدگی پر بہت شکریہ۔ آپ کے حوصلہ افزائی کے یہ الفاظ میرے لیے قیمتی سرمایہ ہیں۔ رانا محمد شاہد! اس مرتبہ آپ بھی تاخیر سے پہنچے، جی تو یہ شاہ! ویلکم اللہ آپ کی تنگدستی دور فرمائے۔ (آمین) بشیر احمد بھٹی صاحب! کیا حال ہے پیارے؟ ادھر ڈوبے ادھر نکلے، مسز نوید ہاشمی آپ نے تو مذاق مذاق میں ”تڑکا“ لگا دیا، تڑکے تڑکے۔ ریاض حسین شاہد! آپ کا نام کافی عرصے سے رسالوں میں دیکھتے آ رہے ہیں، کہانی پہلی دفعہ دیکھی ہے اور سچ میں بہت زبردست تحریر تھی آپ کی۔ سائیں دیوان غلام ونگیر، جاوید علی! آپ نے بہت اچھی بات کہی ہے۔ انجم فاروق ساحلی! آپ کو بیٹھے بٹھائے ”دو شیزہ“ مل گیا اور کیا چاہیے، منشی سی بہن سدرہ انور علی! اگر آپ سچ پوچھیں تو یہ خط ساٹھ فیصد (60%) میں آپ کے لیے لکھ رہا ہوں۔ چالیس فیصد کاشی چوہان سمیت دیگر ساتھیوں کے لیے۔ ساتھیو! آپ ناراض تو نہیں ہیں ناں اس بات پر، اشتقاق بٹ! اللہ آپ کی بھانجی کو تندرستی اور عمر خضر عنایت فرمائے (آمین) صفدر علی حیدری! خط اور کہانی کی پسندیدگی پر بہت شکریہ، ویسے آپ کی تحریر ”دعا“ بہت پسند آئی اور یہ حقیقت ہے میں آپ کا ادھار نہیں لوٹا رہا ہوں، عبدالغفار عابد! بڑے بے مروت ہو یا ر! فریدہ جاوید فری! ماشاء اللہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے چہرہ بھی ”شاعر“ ٹاپ کا دیا ہے، مور شاہد حسین، عادل حسین، سدرہ انور علی، ممتاز احمد، تحسین جو نیجو، صفدر علی حیدری اور فریدہ جاوید فری کے بھرپور خطوط پسند آئے۔ سخن آباد میں عبدالعزیز جی آ کی آزاد نظم، زربینہ جو نیجو کا ”عشق“ غلام رسول گل کی ”محبت“ اور مور شاہد حسین کی ”وہ“ بہت پسند آئے۔ اب اللہ حافظ، سوری! کہانیاں رہ گئیں، جلوہ جنوب، جاوید راہی، دعا صفدر علی حیدری، وہ سورہ پے بشیر احمد بھٹی، درتو بہ کھلا ہے مجید احمد جانی، رتی اللہ والی بجیل میٹلو، وہ میرا مہرباں حنا بشری اور صم کدہ ہے جہاں ریاض حسین شاہد پسند آئی ہیں۔

☆ بھائی منشی! دوسری نوکری مبارک مگر یوں خالی خولی.....!! مٹھائی کھلاؤ آپ اب۔



✉ لاہور سے ہماری ہرلعزیز شاعرہ فریدہ جاوید فری رقم طراز ہیں، پیارے بھائی کاشی اینڈ سوئیٹ منزہ جی السلام علیکم! منی کا سچی کہانیاں ملا ٹائٹل اچھا لگا، تمام قارئین رائٹرز اور دوستوں کو فری کا پیار بھرا سلام قبول ہو۔ پختہ عزم منزہ جی نے خوب لکھا بلکہ سبق آموز لکھا۔ کاشی نے کچھ اپنی باتیں میں بہت اچھا لکھا۔ کہانیوں میں سلیم فاروقی صاحب کی آتش جنوں، سورہ پے، دعا، شان مولا، درتو بہ کھلا ہے، سبز پیر، اعجاز دعا، یقین کامل، بھر دے جھولی اپنی پیاری دوست نسیم سیکینہ صدف کی مرشد کی دعا بے حد پسند آئی۔ نوٹاں والی سرکار اور سب بے حد اچھی کہانیاں لکھیں، صم کدہ ہے جہاں خاص کہانی تو بہت ہی اچھی تھی، سخن آباد میں اپنی غزل دیکھ کر خوشی ہوئی اور سب کی شاعری دل کو بھائی۔

☆ فریدہ جی! بہت بہت مبارکباد اور ڈیو کی آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہیں۔

✉ احوال میں یہ آمد ہے ہماری بہت اچھی ریکسہ خالدہ صاحبہ کی اسلام آباد سے، لکھتی ہیں بیٹے کاشی چوہان

السلام علیکم، پہلی بار احوال کی محفل میں شریک ہو رہی ہوں، جب سے تم نے نچی کہانیاں سنبھالا ہے یہ روز بروز بہتری کی جانب رواں دواں ہے، ہماری طرف نچی کہانیاں کافی دیر سے پہنچتا ہے اس لیے احوال میں شرکت کا موقع نہیں ملا، لیکن اتفاق سے مئی کا رسالہ 2 تاریخ کو ہی مل گیا تو میں نے سوچا کہ احوال میں شرکت کر ہی لی جائے۔ میں ایک کہانی بھیج رہی ہوں شاید نچی کہانیاں کے قائل ہو۔ یوں تو اس بارگی کہانیاں بھی بہت اچھی ہیں۔ اگر چہ وقت کی کمی کے باعث آخری کچھ کہانیاں نہیں پڑھ سکی ہوں، لیکن جو پڑھ سکی ہوں اس میں مجید احمد جانی کی در توبہ کھلا ہے۔ ممتاز احمد کی نوٹاں والی سرکار، ملک عاشق حسین کی چشمہ فیض، بشیر احمد کی وہ سورویہ بہت پسند آئیں، ان سب لوگوں کا بہت شکریہ جنہوں نے میری کہانی بے جز کے پودے کو پسند کیا۔

☆ رئیسہ خالد جی! خدا آپ کو صحت اور درازی عمر سے سرفراز کرے۔ آپ کو پرچہ پسند آیا ہماری ساری محنت وصول ہوگئی۔



✉ احوال میں یہ شرکت ہمارے بہت پیارے لکھاری دوست ایم اشفاق بٹ لالہ موٹی سے رقم طراز ہیں السلام علیکم کاشی چوہان بھیا اللہ تعالیٰ آپ کو اچھی زندگی اور صحت و تندرستی عطا فرمائے آمین۔ کاشی بھائی 28 اپریل کو ہم اپنی بھانجی کائنات کو لے کر گھر واپس آئے۔ آپ اور نچی کہانیاں پڑھنے والوں کی دعائیں رنگ لائیں کائنات پہلے سے کافی بہتر ہے۔ مئی کا نچی کہانیاں دیکھا دل خوش ہو گیا۔ روحانی نمبر دیکھ کر دو گلاس ٹھنڈے جام شیریں کے پیئے ایریل سے کپڑے دھوئے ڈان بریڈ سے صبح کا ناشتا کیا اور آپ کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔ کاشی بھائی آپ ہر ماہ نچی کہانیاں میں تبدیلی لے کر آ رہے تھے بہت خوشی ہو رہی تھی لیکن اس دفعہ جو آپ نے تبدیلی کی ہے وہ سب سے بڑھ کر ہے۔ پہلے تو سرورق نمونہ جاتا تھا بہت بُرا لگتا تھا ویلڈن۔ منزہ سہام کا پختہ عزم، کیا انداز ہے آپ کا بہت خوب، کاشی بھائی آپ کے بھی کیا کہنے آپ کا بھی جواب نہیں۔ احوال میں مور شاہد حسین، عادل حسین، نوید شاہ، عمران علی، سدرہ انور علی، عظمیٰ شکور، ممتاز احمد، مبشر حسن، شہزاد کنول ان سب نے میری کہانی ہم نام کے لیے دو لفظ تعریف کے لکھے ان سب کا بہت بہت شکریہ۔ روحانی نمبر اس دفعہ دل میں اتر جانے والی تحریریں لے کر آیا، جاوید راہی کی تحریر جلوہ جنوں کی کیا ہی بات ہے۔ ممتاز احمد کی تحریر نوٹاں والی سرکار، ملک عاشق حسین ساجد کی پر نور تحریر چشمہ فیض، صفدر علی حیدری کی دعا، بشیر احمد بھٹی کی تحریر وہ سو روپے گل رعنا کی بڑی، حنا بشری کی تحریر وہ میرا مہربان، مہر پرویز احمد کی اعجاز دعا، تنویر خالد کی بُرا تحریر پر یقین کامل وانا دربار سے واقعی کچھ نہ کچھ ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبوب ہستی ہیں، حضرت علیؓ جو بری سمیت الماس فاطمہ ارمان کی بھر دے جھولی، مسز نوید ہاشمی کی کاپاپلٹ، روحانی نمبر کی خاص کہانی صنم کدہ ہے جہاں، ریاض حسین شاہد کی تحریر سچے عاشق حقیقی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سخن آباد میں اس دفعہ زینہ جو نیو، شاہد فراز، ارم خان، ملک عاشق حسین ساجد، مومنہ بتول، ثانیہ ثانی، مہر نسیم، تمثیلہ لطیف، مور شاہد حسین، فریدہ فری یوسف ان سب نے خوب محفل جمائی ہوئی تھی۔ سدرہ انور علی آپ کے بارے میں پڑھا تو دلی دکھ ہوا اور پھر یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائی اللہ جس کو زندگی دینے پہ آئے تو کون ہے جو کم کر سکتا ہے..... مجھے کاشی بھائی آوازیں دے رہے ہیں کہ بٹ صاحب اب بس بھی کرو، ارے کاشی بھائی آپ کی بات مان لی میں نے اپنا احوال مکمل کیا اس شرط پر کہ اگلی دفعہ پھر حاضری کا موقع دیں گے، سب کو سلام و دعا۔

☆ پیارے اشفاق بٹ آپ کا تبصرہ بہت پسند آیا مگر اب احوال میں غیر حاضری نہیں چلے گی۔

✉ یہ ہنسی مسکراتی احوال میں آمد ہے میری تالیپور کی میر پور خاص سے، جتنی ہیں نچی کہانیاں کا ”روحانی نمبر“ دیکھا۔ زبردست ہے۔ تفصیلی تبصرہ اس لیے نہیں کر سکتی کہ میں دو کام بہت آہستہ آہستہ کرتی ہوں، کھانا کھانا اور کہانیاں پڑھنا کھانا پورے ذائقے سے لطف لے لے کر کھاتی ہوں اور کہانیاں بھی مزے لے لے کر پڑھتی ہوں، یہ نہیں کہ فنا

فت۔ فائنٹ کہانیاں آدمی پڑھیں اور آدمی چھوڑ دیں اور آخر میں تبصرہ کر دیا کہ فلاں کہانی کمال کی تھی مگر..... اور فلاں کہانی بڑی زبردست تھی لیکن..... جب تک میں اس مہینے کا رسالہ ختم کروں گی اگلے ماہ کا رسالہ آچکا ہوگا پھر تبصرہ باسی ہو جائے گا، اس لیے اسے رہنے دیتی ہوں۔

☆ بہت اچھی لیسری! کہانی کے بارے میں ہم آپ کو جلد بتائیں گے، مگر پہلے تبصرہ تازہ کرو۔

✉ یہ احوال میں اولین آمد ہے ہمارے بہت پسندیدہ شاعر دوست حکیم خان حکیم کی کامل پور موسیٰ، تحصیل حضور سے عرض کرتے ہیں، محترم جناب کاشی چوہان صاحب! السلام علیکم، اللہ کرے آپ خیریت سے ہوں ماہنامہ ”نچی کہانیاں“ سے 1997 سے قلمی رشتہ قائم و دائم ہے، محترم محسن بھوپالی صاحب مرحوم میرا کلام ہر ماہ باقاعدگی سے لگا دیا کرتے تھے اللہ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین) نچی کہانیاں ایک معیاری ادب کا ترجمان ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر ماہ باقاعدگی سے خریدتا ہوں اور مجھ سے بہت سے دوست احباب ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں، آپ نے منظوم کلام کے لیے جوا لگ گوشہ ترتیب دیا ہے، خوب صورت ہے، اس سے نہ صرف نئے انجمن ہوتے ہوئے شعراء کی حوصلہ افزائی ہوگی بلکہ پڑھنے والے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ خطوط کا بڑھتا ہوا سلسلہ ”نچی کہانیاں“ کے معیاری ہونے کی دلیل ہے ”نچی کہانیاں“ شروع سے اب تک نو آموز تخلیق کاروں کی جس انداز سے حوصلہ افزائی کر رہا ہے قابل رشک ہے اور نچی کہانیاں کے لیے ایک اعزاز بھی ہے کہ آج بہت سے نامور تخلیق کار ایسے بھی نظر آتے ہیں جو نچی کہانیاں کے پلیٹ فارم سے تربیت پا کر آج مشاہیر کے ساتھ کھڑے ہیں، خدا آپ کو اور آپ کے ادارے کے دیگر احباب کو سلامت رکھے (آمین) تاکہ آپ ادب کی خدمت کے لیے اسی طرح کوشاں رہیں، والسلام۔

☆ حکیم خان حکیم صاحب! یقین جانیے آپ کی احوال میں آمد نے میرے اندر ایک نئی روح بھونک دی ہے، خدا آپ کو صحت و سلامتی دے، آپ جیسی قد آور شخصیات تو ہمارا مان ہیں۔ امید ہے حوصلہ افزائی کا یہ سلسلہ برقرار رہے گا۔



✉ صفدر علی حیدری اپنی محبت لیے آج شریف سے شامل احوال ہیں۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ! سہام نسلی، نچی کہانیاں کی ٹیم، قلم کار ساتھیوں اور قارئین کی خیریت کی امید اور دعا کے ساتھ عرض خدمت ہے کہ اعزاز پرچہ 29 اپریل کو ملنا کسی اعزاز سے کم نہیں لگا۔ پچھلا شمارہ تین دن میں ختم کرنا خاصا مہنگا پڑا کہ بانی کے دن شدت انتظار میں گزرے۔ من پسند چیز کو بچا بچا کر رکھنے کی بیماری بہت پرانی ہے، اس سے انحراف بھاری پڑا۔ ویسے اس بار تو حد ہی ہوگئی، کسی محبوب سے بڑھ کر مئی کے شمارے کا انتظار رہا۔ بیٹابی کا اندازہ اس امر سے لگائیں کہ رسالہ دوسری دن میں پڑھ ڈالا۔ سرورق کے بارے میں یونہی خیال آیا کہ کیا یہ کچھ منفرد ہو سکتا ہے؟ کیا یہ روحانی نمبر سے مماثلت رکھتا ہوگا؟ اور پھر نظر بڑی تو روح سرشار ہوگئی۔ عام سے نقوش کی ایک لڑکی جس نے اسکارف سے خود کا ڈھانپ رکھا تھا، واقعی بہت بھلی لگی۔ ساتھ ہی کسی اللہ والے کا مزار، کاشی بھائی آپ نے واقعی کمال کر ڈالا۔ بہت خوب۔ منزہ آپ کی ”پختہ عزم“ اختصار کے باوجود خاصے کی چیز تھا۔ ”کچھ اپنی باتیں“ پڑھا تو ایک ہی فقرہ ذہن میں ابھرا ”تغیر زندگی ہے اور جو دموت“ آپ نے سوچ کو ایک نیازا دیہ، نیارخ دے ڈالا۔ ”روحانی نمبر نے آج ایک بہت پرانی غلط فہمی دور کر دی۔ اکثر ہم جیسے دور افتادہ اور چھوٹے علاقوں کے لکھاریوں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ہمارے ساتھ سوتیلوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ لیکن آپ نے یہ تاثر زائل کرتے ہوئے یہ بات ثابت کی کہ ”نچی کہانیاں“ کسی گھر کی طرح ہے۔ اور گھر میں نہ کوئی چھوٹا ہوتا ہے اور نہ بڑا۔ اس میں ہر فرد کی اپنی اہمیت ہوتی ہے اور اپنا ایک خاص اور منفرد مقام بھی۔ برادر مرعاش حسین ساجد، مجید احمد جانی، راقم الحروف، مبشر حسن اور سب سے بڑھ کر استاد کرم ریاض حسین شاہد کی تحاریر اور خطوط دیکھ کر یوں لگا جیسے یہ ”جنوبی پنجاب“ نمبر ہو۔ اگر مبشر حسن اور سید مبارک شمش کی تحریریں بروقت مل جاتیں تو پھر تو واقعی کمال ہو جاتا۔ پھر بھی نچی بات ہے یہ نمبر بھلائے نہیں بھولتا۔ یہ بلاشبہ کسی دستاویز سے ہرگز کم نہیں۔ جو ہمیشہ یادوں میں بسا رہے گا۔ اول

تا آخر پڑھ کر ایک ہی روایتی جملہ لکھنے کو دل کرتا ہے "شاندار، زبردست، بہت اعلیٰ، بہت خوب"۔ ویل ڈن کاشی بھائی۔ آپ کی محبت اور محنت نے باہم مل کر اسے یادگار بنا ڈالا۔ مور شاہد بھائی اور ممتاز صاحب کا شکریہ کہ میرے والد کے لیے دعائے مغفرت کی۔ سدرہ النور علی کو حادثہ پیش آیا پڑھ کر دکھ ہوا۔ لیکن یہ دیکھ کر تسلی بھی ہوئی کہ وہ اب رو بہ صحت ہیں۔ اللہ انہیں شفا سے نکلے عطا فرمائے، آمین۔ ڈیئر سسٹرو چنانہیں تو لکھنا نہیں۔ ایم اشفاق بٹ کا خط کیا تھا ایک دکھ بھری داستان تھی اللہ انہیں اس آزمائش سے جلد سرخرو فرمائے۔ ممتاز بھائی کا تبصرہ کافی جاندار تھا۔ ویسے آپس کی بات ہے اس بار سارے ساتھی مکمل فارم میں تھے اور احوال کی رونق کو آٹھ بلکہ سولہ چاند لگا رہے تھے۔ بحیثیت مجموعی اس بار یہ محفل کچھ زیادہ ہی شاندار و جاندار رہی۔ استاد کرم کا محبت نامہ بطور تہنک پڑھا۔ اللہ انہیں سلامت رکھے، آمین۔ جاوید راہی کی "جلوہ جنوں" پڑھ کر اپنے اندر ایک کمی کا احساس ہوا۔ ممتاز احمد ہمیشہ کی طرح متاثر کن تحریر کے ساتھ تشریف لائے۔ "نوناں والی سرکار" زبان و بیان کے لحاظ سے خاصے کی چیز تھی۔ انہیں بہت سی داد۔ "وہ سو روپے" جاندار تحریر تھی۔ جناب عاشق حسین ساجدی "چشمہ فیض" اپنی طرز کی ایک انوکھی کاوش تھی۔ گل رعنا کی مختصری تحریر "پڑوسی" کو مئی کے روحانی نمبر کی خوشبو کہتا ہرگز بے جا نہ ہوگا۔ مجید احمد جانی ہمیشہ کی طرح اپنے مخصوص انداز سے آئے۔ اس بار تحریر مختصر تھی لیکن کافی پراثر۔ ہمارے محترم دوست سلیم اختر صاحب بہت دنوں سے منظر سے غائب ہیں۔ شان مولا اچھا افسانہ تھا۔ "رنی اللہ والی" بہت جاندار تحریر تھی۔ آپ بیتی کے رنگ میں لکھی اس داستان نے خوب رنگ جمایا۔ نیچل آئی کو بہت سی داد۔ یقین کامل سے پیوستہ سچ بیانیاں مختصر مگر پراثر تھیں۔ لکھنے والوں کو مبارک باد! استاد کرم کی تحریر "صنم کدہ ہے جہاں" بجا طور پر روحانی نمبر کی روح بھی تھی اور حسن بھی۔ پہلی بار تشریف لائے اور آتے ہی چھا گئے۔ کاشی بھائی ایک دن لگا کر کمپوز کیا ہے، پلیز فیمنی کی پہنچ سے دور رکھیں۔ جزاک اللہ!

☆ بہت پیارے صندور۔ تبصرہ شاندار تھا۔ قینچی کی پہنچ سے دور کیسے رہ سکتے تھے؟ مکمل پڑھ کر انصاف کرتا۔
✉ اسامہ ندیم کراچی سے پہلی بار شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں! السلام علیکم۔ کاشی بھیا! آپ کا مئی کا شمارہ روحانی نمبر زبردست رہا میں نے میٹرک کلاس کے پرچے دیے ہیں لیکن سچی کہانیاں چوں کہ میرے والدین پڑھتے ہیں تو مجھے بھی شوق پیدا ہوا۔ کاشی سر آپ کے پرچے میں اس بار صنم کدہ ہے جہاں، نوناں والی سرکار، وہ سو روپے، دعا، مرشد کی دعا، یقین کامل، رنی اللہ والی حاصل مطالعہ کہانیاں رہیں، ایمان تازہ کرنی یہ کہانیاں بے مثال رہیں، اس کامیابی پر آپ سب مبارکباد کے مستحق ہیں، اپنا خیال رکھیے گا۔ اگلے ماہ پھر انشاء اللہ حاضر ہوں گا۔

☆ پیارے اسامہ! منے میاں جم جم آؤ مگر پہلے پڑھ تولو۔ یہ تو تمہارا بھی اپنا ہی پرچہ ہو گیا ناب۔ خوش رہو۔
✉ ہمارے بہت پیارے شاعر اور لکھاری دوست عامر زمان عامر، پورے والا سے شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں قابل قدر محترمہ منزہ سہام۔ پیارے کاشی آداب، مئی کا شمارہ ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے سرورق کی پالیسی تبدیل کر کے تو آپ نے ہمارے دل جیت لیے خدارا اب ٹائٹل کے اس حسن کو برقرار رکھیے گا۔ روحانی نمبر اپنی مثال آپ ہے ایمان افروز، روح پرورد دل و دماغ سرشار ہو گیا۔ بزم احوال میں اپنے بڑے بھائی محترم عبدالغفار عابد کو پا کے عہد رفتہ کے کتنے باب کھل گئے۔ منزہ جی آپ کا "پنپنہ عزم" قابل تقلید ہے ہمیشہ خوش رہیے، کاشی چوہان کی اپنی باتیں ہمیشہ کی طرح اپنی باتیں لگتی ہیں بہت خوب غلام حسین، کاشف عبید، سلیم شاہد، محترم ریاض حسین شاہد، شفقت حسین حب چوکی اور شائستہ جمال سمیت تمام نئے نئے چہروں کو خوش آمدید۔ ممتاز قلدکار جاوید راہی کا جلوہ جنوں دل کو چھو گیا زبردست روحانی تحریر ہے۔ ممتاز احمد بھائی معروف برگزیدہ ہستی المعروف نوناں والی سرکار



روحانیت میں قلم ڈبو کے لکھا بہت پسند آیا۔ عاشق حسین ساجد چشمہ فیض، ناقابل فراموش تحریر ہے۔ آج شریف سے دعا کے ساتھ محترم صندور علی حیدری ایمان تازگی کا سامان لائے ہیں۔ بشیر احمد بھٹی نے خوب صورت تحریر سے فیوض و برکات گنج سے روشناس کرایا ہے۔ گل رعنا کی پڑوسی مدینۃ الاولیاء سے پیارے دوست مجید احمد جانی کی تحریر، صدف آصف کی شان مولا، رنی اللہ والی، بشری حنا کی وہ میرا مہرباں، مہر پرویز دولوی کی اعجاز دعا، کنول عمران کی سبز چیر، خالد تنویر کی یقین کامل۔ ندا ہاشمی کی نور کا ہالا، الماس فاطمہ ارمان کی بھڑوے جھولی، مسز نوید ہاشمی کی کایا پلٹ، سلیمہ نسیم کی مرشد کی دعا حیران کن کہانیاں لگی ہیں۔ ناگن کی چھٹی کڑی اچھی تھی، سرور شاہ کی کھٹل ہمارے جدید معاشرے کی واضح جیتی جاگتی تصویر ہے۔ انتہائی نامور راسخ محترم ریاض حسین شاہد کی صنم کدہ ہے جہاں نہ صرف روحانی نمبر کی خاص کہانی ہے میں بڑے فخر سے کہہ سکتا ہوں آپ کی تحریر پرچے کی تمام تحاریر سے ٹاپ آف دی لسٹ ہے، سخن آباد ہمارے کلام کے بغیر کچھ دیران سا ہے، کاشی چوہان سخن آباد کی آباد کاری کے لیے تازہ غزل بھیج رہا ہوں۔ تمام اہل قلم، قارئین کے لیے ڈھیروں دعائیں، خیر اندیش۔

☆ پیارے عامر! ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا والا معاملہ ہے۔ خیر تم کیا سمجھو گے؟؟ ہمارے لیے تو بس یہ اہم ہے کہ تمہارا تبصرہ ہمارے احوال کی زینت بنا۔ خوش ہو۔

ایس ایم ایس کے ذریعے احوال کا حصہ بننے والے قارئین

☆ زابدہ کنول۔ گلستان جوہر ☆ وسیم۔ پی آئی بی کالونی ☆ شہباز۔ ڈیفنس ☆ نعیم وارثی۔ گلستان جوہر ☆ مقبول مغل۔ آزاد کشمیر ☆ ہارون امان۔ اسلام آباد ☆ سلیم خان۔ ڈرگ روڈ ☆ امبرین نعیم۔ گلشن اقبال ☆ جاوید خان۔ حیدر آباد ☆ آصف شاہ۔ میرپور خاص ☆ اشفاق احمد۔ ملتان ☆ ملک سجاد۔ گجرانوالہ ☆ عاشق حسین بھٹی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ ☆ ظہیر گل۔ حویلیاں ☆ لیاقت تنولی۔ ایبٹ آباد ☆ الفتاح۔ کوٹلی ☆ ارباب مہر بلوچ۔ گوبندہ ☆ مشتاق کھوکھر۔ سخی ☆ عمران ملک۔ سکھر ☆ امان خان۔ مردان ☆ یعقوب خان۔ پشاور ☆ خلیل احمد۔ نیوکراچی ☆ سجاد قریشی۔ کورنگی ☆ شاہد رفیع۔ قائد آباد ☆ رستم خان خیل۔ ننڈھہ ☆ مہر عباس۔ لیاقت آباد ☆ سلیم یزدانی۔ سرگودھا ☆ پیارے ساتھیو! ان شاء اللہ اگلے ماہ ان ہی صفحات پر پھر ملاقات ہوگی۔ آپ کی دعاؤں کا طالب

کاشی چوہان

توجہ طلب

اپنی نگارشات کے حوالے سے بات کرنے کے لیے آپ 0307-2089080 پر رابطہ کر کے معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ پیارے ساتھیو! آپ اپنی نگارشات ہمیں ای میل کے ذریعے بھی روانہ کر سکتے ہیں
ای میل: pearlpublications@hotmail.com
ڈاک سے بھیجئے کہے لیے: 110۔ آدم آرکیڈ۔ شہید ملت روڈ، بہادر شاہ ظفر روڈ، کراچی
نوٹ: قارئین اور لکھاری دوستوں سے گزارش ہے کہ آپ اپنی تحریر کاغذ کے ایک طرف، ایک سطر چھوڑ کر لکھیں اور اپنا نام، پتا اور مقام واضح طور پر تحریر کیا کریں۔ (شکریہ)

ایڈیٹر

اس ماہ کی سچ بیانیاں

اپنے دلیں سے، اپنے شہروں سے، موصلاً، وہ سچ بیانیاں
جن کو پڑھ کر اپنی مٹی کی خوشبو، آس پاس محسوس ہوتی ہے۔

حلالہ م۔ ص۔ ایمن روح میں اترتی ایک سچ بیانی، کراچی سے

خواہشات نا آسودہ کرن بشیر مایوس زندگی میں رنگ بھرتی ایک اچھوتی سچ بیانی

خارزار ہے زندگی اتم منابیل خارزار سے بھرپور، دکھوں کی گود میں ملتی ہوئی ایک سچ بیانی

ایک ہی راستہ مریم شاہ بخاری سرگودھا سے ایک معصوم بچی کے انتقام کی جاگتی تصویر

انتقام محمد اسلم آزاد بلوچستان سے ایک نوجوان کے انتقام کی لرزہ خیز داستان

پانچ پریاں فکیل احمد احمدانی ڈیرہ غازی خان سے ایک نوجوان کی عبرت خیز داستان

خواہشوں کا اسیر دنگیر شہزاد چالاکیوں اور مکاریوں سے بھرپور ایک سچ بیانی، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے

بھرم ٹوٹ گیا سورا فلک بیوی کے طعنوں سے تنگ ایک مرد کی سچ بیانی

امیر رنی غلام مصطفیٰ خان مظفر گڑھ سے، مردوں کے ظلم و ستم کی شکار امر کی عبرت انگیز کہانی

معصوم بچیاں مالا فراز معصوم زندگیوں کے گرد گھومتی ایک سبق آموز کہانی

شریک سفر نفیسہ بیٹے لمحات میں قید ایک عورت کی سچ بیانی

پہلی سچ بیانی

حلالہ

م۔ ص۔ ایمن

ایک دو شیزہ کے فریب سے مرشح سچ بیانی، کراچی سے

ایٹ آباد سے آتے آتے اکثر دیر ہو ہی جاتی، البتہ اس کے علاوہ روزانہ فجر کی نماز کے فوراً بعد میں دکان کھول لیا کرتا تھا، جبکہ مارکیٹ بھر کی تمام دکانیں ہنوز بند ہی ہوتی تھیں۔

نماز فجر کے بعد گھر پر میرا کوئی کام تو ہوتا نہیں تھا، بلال جب آتا تو میں کبھی قریبی ہوٹل میں ناشتا کرنے چلا جاتا، کبھی اسے بھیج کر دکان پر ہی منگوا لیتا تھا۔ دوپہر کا کھانا البتہ اکثر ہم دونوں اکٹھے کھایا کرتے تھے۔ رات کے کھانے کا معمول یہ تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد دکان بند کرتے۔ بلال اپنے گھر چلا جاتا اور میں ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھاتا اور پھر گھر جاتا، برسوں سے میرا یہی معمول چلا آ رہا تھا۔

ایک صبح حسب معمول فجر کی نماز پڑھ کر میں اپنی دکان پر پہنچا، تو دور سے ہی مجھے اپنی دکان کے تھڑے پر کوئی سویا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے سوچا کہ ”لو جی اب اسے چکانا بھی پڑے گا“ یہ جی سی موالی یا فقیر قسم کے لوگ عموماً رات کے وقت جہاں موقع دیکھتے ہیں، سو جاتے ہیں اور صبح اٹھ کر کہیں نہ کہیں چلے جاتے ہیں۔

دکان کے تھڑے پر سوئے ہوئے شخص کو دیکھ کر دل سے یہی دعا نکلی کہ ”یا خدا! یہ کوئی فقیر نہ ہوا“ قریب جا کر جب اسے جھنجھوڑنے کا ارادہ کیا تو کچھ عجیب سا لگا۔

یہ کوئی فقیر یا موالی نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے قیمتی شال اوڑھ رکھی تھی۔ یقیناً یہ کوئی مسافر ہوگا جو رات اپنے علاقے

میرا تعلق ایٹ آباد سے ہے، اپنے علاقے میں مناسب روزگار نہ ہونے کے سبب میں نے راولپنڈی میں کرائے کی ایک دکان لے کر کپڑے کا کاروبار شروع کیا، دکان کے قریب ہی ایک کمرے کا چھوٹا سا مکان بھی کرائے پر لے لیا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ جمعرات کی شام دکان ذرا دیر پہلے بند کرتا اور بذریعہ بس، اپنے گھر اپنے بچوں میں چلا جاتا اور ہفتے کی صبح وہیں سے سیدھا دکان پر آ جاتا۔

میں شادی شدہ ہوں اور میرے دو بچے بھی ہیں۔ بیوی بھی ماشاء اللہ بہت سکھڑ ہے۔ میرے والدین کی بہت اچھی طرح خدمت کرتی ہے۔ انہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دیتی، اس لیے گھر سے اپنے بچوں سے طویل دوری مجھے ناگوار نہیں گزرتی۔ میں نے دکان پر ایک ملازم بھی رکھا ہوا تھا، جو میرا ہاتھ بٹاتا۔

بلال، یعنی ملازم کی ضرورت کی اہم وجہ نماز تھی۔ دکان کے باہر بھی ڈسپلے کے لیے مال رکھا ہوتا تھا، نماز کے لیے بار بار دکان بند کرنے سے بہتر تھا کہ ایک سے بھلے دو ہو جائیں۔

جمعہ کے دن دکان بند ہوتی اور بلال کی بھی چھٹی ہی ہوتی، حالانکہ دیگر دکان دار حضرات، جمعہ کے دن بھی دکان کھولتے تھے اور خود چھٹی کر کے تمام دن کے لینے دکان ملازموں کے حوالے کر جاتے تھے۔

ہفتے کی صبح میری دکان قدرے تاخیر سے کھلتی تھی کہ مجھے

کی گاڑی نہ ملنے کے سبب یہیں سو گیا ہوگا، چند ہی لمحوں میں بے شمار خیالات میرے دماغ میں آئے اور گئے، بہر کیف میں کب تک اس کے بیدار ہونے کا انتظار کرتا؟ دکان تو کھولنا ہی تھی۔ میں نے نرمی سے اس کا گھٹنا ہلایا اور کہا۔
”اٹھو بھئی اپنا بستر کہیں اور لگاؤ مجھے دکان کھولنی ہے!“
مسافر یا جو کوئی بھی وہ تھا اس نے کروٹ بدلی اور اٹھ بیٹھا۔
ایک ایک میرے پسینے چھوٹ گئے۔

وہ عورت تھی، بھرپور اور انتہائی خوبصورت جوان عورت۔ میں نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا، دور دور تک کوئی بھی نہیں تھا، البتہ اسٹریٹ لائٹ روشن تھیں، چند دکانوں کے اشتہاری بورڈ بھی روشن تھے، لیکن ان کی روشنی ماند پڑ رہی تھی، کیونکہ سورج طلوع ہونے والا تھا، اچھی خاصی روشنی پھیل چکی تھی۔

اس لمبائی روشنی میں اس عورت کا خوابیدہ حسن عجیب رومان پرور تھا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو میں نے گھبرا کر اس کے چہرے سے نظریں ہٹائیں۔

میرا ملازم بلال بھی دیر سے ہی آیا کرتا تھا۔ بلال کے آنے سے پہلے پہلے میں جھاڑ پونچھ کا کام خود ہی کر لیا کرتا تھا۔ ڈسپلے کا مال ٹانگتا، جھاڑو لگاتا، اور بیٹھ کر تلاوت کیا کرتا تھا، دکانداری کی حالت یہ تھی کہ بعض اوقات تو پہلا

گا بک ہی سہ پہر تین بجے کے بعد آتا۔
”یہ آپ کی دکان ہے؟“ اس نے سوال کیا۔
میں نے ہمت کر کے اسے دیکھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ گول چہرہ، گال جیسے دو سب رکھے ہوئے ہوں، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، دوپٹے سے سر اور پیشانی کو ڈھکا ہوا تھا۔
”جی..... جی..... میری ہے“ میں ہکلا یا۔

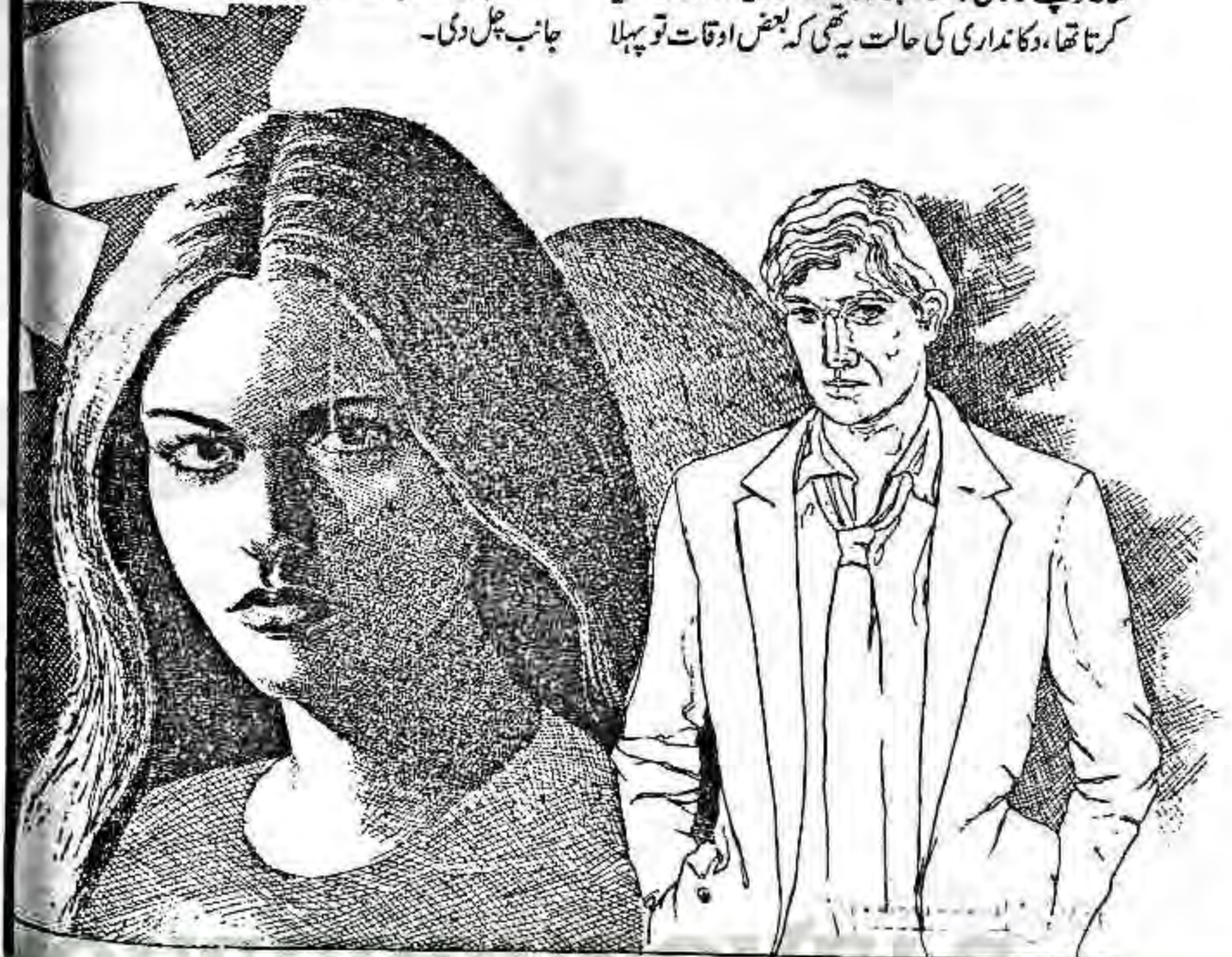
وہ مسکرائی، شاید میری ہکلا ہٹ سے لطف اندوز ہو رہی تھی ”معافی چاہتی ہوں۔ میں پوچھے بغیر آپ کی دکان کے آگے سو گئی تھی“

”کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں“ مجھے سمجھ نہیں آئی کہ مجھے اس موقع پر کیا کہنا چاہیے تھا۔ یہ سب کچھ میرے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔

وہ ٹھڑے سے اتر کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ”آپ دکان کھولیں، میں کہیں اور جا کر سو جاتی ہوں“

”آپ کون ہیں؟ کہاں رہتی ہیں؟“ میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

”میں بھی کہیں رہتی تھی۔“ اس نے ایک گہری یا سیت سے ہڈ سانس خارج کی۔ ”میرا بھی کوئی گھر تھا، اب دیکھیے قسمت کہاں لے جائے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ ایک جانب چل دی۔



”جائے دو..... میرا کیا ہے؟“ میں نے سر جھٹک دیا۔
میں شرماتا کر دکان میں داخل ہوا۔ دکان کے اندر ابھی اندھیرا ہی تھا۔ میں نے پچھلے کے سوچ آن کیے پچھلے حصے کے بلب جلائے، شوکیس پر رکھا ہوا مال باہر لٹکانے کے لیے اٹھایا۔ حسب عادت ساتھ ہی ساتھ تلاوت بھی کرتا رہا۔
☆.....☆

اچانک ہی وہ عورت دوبارہ آ گئی۔
اب کے اس نے شال کا ایک کونا ایک ہاتھ سے اپنی ناک پر روک رکھا تھا، صرف اس کی آنکھیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔

”سینے!..... اس مارکیٹ میں کوئی بیت الخلاء نہیں ہے؟ مجھے ڈرا.....“ اس نے ٹکڑوں میں بات کی، تاہم جملہ پورا ہوئے بغیر میں اس کی بات سمجھ گیا۔

”یہاں قریب ہی میڑھیاں ہیں۔ ان کے نیچے ایک بیت الخلاء ہے تو سبھی، لیکن اس وقت وہ بند ہوگا، پہلے کھلا رہتا تھا، لیکن چری امی گند پھیلا دیتے تھے، اس لیے اب رات کو بند کر دیا جاتا ہے۔“

”اگر آپ کو ضرورت پڑ جائے تو کیا کرتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں..... تو تھوڑی دیر میں کھل جائے گا۔ جس کے پاس چابی ہوتی ہے، اس کی دکان نزدیک ہی ہے۔ نو بجے تک آجائے گا“ میں نے کہا۔

”پھر میں کہاں جاؤں؟“ اس نے کہا
”جی ی ی ی.....“ میں نے حیران ہو کر کہا، کیونکہ میرے خیال میں اس کا یہ سوال بے شک تھا۔ ”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ تم اپنے گھر جاؤ۔“

”گھر.....؟“ وہ ہنسی۔ ”میرا کوئی گھر ہوتا تو ساری رات آپ کی دکان کے ٹھڑے پر نہ گزارتی؟“

مجھے اچانک ہی خیال آیا کہ واقعی اگر اس کا گھر ہوتا تو ایک ہی شال میں میری دکان کے ٹھڑے پر سوئی ہوئی نہ پائی جاتی۔ چونکہ دار نے بھی اگر اسے سویا ہوا دیکھا ہوگا تو چری، امی یا بھکاری سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہوگا کہ اکثر چری موالی دکانوں کے آگے سوئے رہتے ہیں۔ اسٹیشن نزدیک ہونے کی باعث بسا اوقات دوسرے شہر سے آئے ہوئے مسافر بھی یہی کرتے ہیں۔ اسٹیشن سے نکل آتے ہیں اور جب انہیں اپنے علاقے کی کوئی گاڑی نہیں ملتی تو کسی دکان

کے آگے سو جاتے ہیں اور دکانیں کھلنے سے پہلے پہلے خود ہی اٹھ بھی جاتے ہیں یا پھر دکاندار آ کر اٹھا دیتے ہیں۔
”تو تمہارا کوئی گھر نہیں ہے؟“ میں نے کہہ دیا۔

”نہیں! میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میرے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں۔ میرے تین بھائی ہیں۔ شادی شدہ، ان کی بیویاں مجھے نوکرائی سے زیادہ نہیں جانتیں۔ میں سارا سارا دن ان کے آگے سارے کام کرتی ہوں، ان کے، ان کے بچوں کے اور جب رات ہوتی ہے تو سب اپنے اپنے کمروں میں گھس جاتی ہیں۔ میں محض میں بڑی رہتی ہوں، بارش اگر ہو جائے تو ساری میرے اوپر ہوتی ہے، مٹی سکڑی بیٹھ کر رات گزار دیتی ہوں، کوئی بھی مجھے اپنے کمرے میں داخل نہیں ہونے دیتا۔ بھائی بھی مجبور ہیں۔ پرانی عورتوں کے آگے قیامت کی بہن کی بات سننے کی بھی انہیں فرصت نہیں۔ میں بھائیوں کا گھر چھوڑ آئی ہوں، ان سب کو سوتا ہوا چھوڑ آئی ہوں۔“ اس کا لہجہ دل پکھلا دینے والا ہوتا گیا۔

”کہاں ہے تمہارے بھائیوں کا گھر؟“

”میں نے کہا نا کہ میں چھوڑ آئی ہوں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ میں..... چھوڑ آئی ہوں، میں وہاں دوبارہ جانا نہیں چاہتی۔“ اس نے سر ہلایا تو اس کی ناک کی نوک پر ناکا شال کا کونہ ڈھلک گیا اور اس کا دلکش چہرہ نگاہوں کو خیرہ کرنے لگا۔ اس نے بھی دوبارہ چہرہ ڈھانپنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

”پھر بھی کون ہیں تمہارے بھائی؟ کہیں قریب ہی رہتے ہیں؟ کیا میں انہیں جانتا ہوں؟“

”آپ کیوں پوچھ رہے ہیں، کیا مجھے ان کے حوالے کریں گے، مجھے یقین ہے مجھے کوئی بھی تلاش نہیں کرے گا۔“

”نہیں نہیں میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔“

”مجھے اس وقت بیت الخلاء کی شدید ضرورت ہے، آپ کو پتا ہے صبح جاگنے کے بعد سب سے پہلے کیا کام کیا جاتا ہے؟“ وہ زربل مسکرائی

”میں کیا کر سکتا ہوں؟ یہاں تو ایسا کوئی بندوبست نہیں ہے، میں نے بتایا نا کہ جس دکاندار کے پاس اس مارکیٹ کے بیت الخلاء کی چابی ہے، وہ نو بجے تک آئے گا، بلکہ زیادہ تر دکاندار نو بجے کے بعد ہی آتے ہیں۔“

”تو میں نو بجے تک بیٹھی رہوں؟ میں کیسے سمجھاؤں میں؟“ وہ بے بسی سے بولی۔

میں اس کی حالت سے بے خبر نہیں تھا، لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیننگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

چھوڑ دیا اور میرا خیال ہے کہ وہ سمجھتی تھی کہ میں ادھر سے جلتے سے ہی اس کا موقف سمجھ رہا ہوں۔

”نہیں.....! اسپتال دور ہے۔ اسپتال جانے کے لیے گاڑی کا بندوبست کرنا ہوتا ہے۔“

وہ دکان سے باہر نکلی، دائیں بائیں دیکھ کر بولی ”یہاں دور دور تک کوئی بھی نظر نہیں آ رہا، کسی دکان کی آڑ میں بیٹھ جاؤں؟“

وہ ایک مذموم سے کام کے لیے میری اجازت مانگ رہی تھی۔ یہ اس سے بھی بُرا تھا، کیونکہ سب دکاندار جانتے تھے کہ میں سب سے پہلے آتا ہوں، سب مجھ سے ہی پوچھتے اور مجھے جھوٹ بولنا پڑتا۔

”ادھر آؤ!“ میں نے اسے دکان کے اندر بلایا ”دیکھو! میں ایک عزت دار آدمی ہوں۔“

”تو کیا عزت دار آدمی بیت الخلاء کبھی نہیں جاتا؟“ وہ تیزی سے بولی۔

”میرا مطلب ہے کہ میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں اور کسی نے دیکھ لیا تو میں.....“

”کون دیکھے گا؟ کسے اتنی فرصت ہے کہ آپ کی نگرانی کرے۔ آپ چلیں، آپ کی بیوی سے میں خود ہی بات کر لوں گی، اسے اپنی مجبوری بتا دوں گی۔“

”میں اپنے گھر میں چھڑا رہتا ہوں، بیوی بچے نہیں ہیں میرے ساتھ۔“

”پھر کیا ہوا۔ میں کوئی ہمیشہ کے لیے تو آپ کے گھر نہیں جا رہی۔“

”یہ بات نہیں ہے.....“ میں جلدی سے بولا۔ ”اچھا سنو! میں کرتے ہیں تم یہاں سے سیدھی چلی جاؤ بینک بینک۔ بینک تک پہنچو گی تو میں تمہارے قریب سے گزروں گا، ہم راتے میں کوئی بات نہیں کریں گے۔ تم مجھے سمجھتی رہنا اور میرے پیچھے پیچھے آئی رہنا۔ میں جس گھر میں داخل ہوں گا تو تم بھی اپنے آگے پیچھے کیے کر اس گھر میں مسم جانا۔ اگر اس وقت کوئی تیسرا شخص قلی میں موجود ہو تو تم میرے گھر داخل نہ ہونا آگے نکل جانا، سمجھیں؟“

”سمجھ گئی۔“ وہ بولی۔

”ٹھیک ہے تم نکلو! میں چند منٹ میں دکان بند کر کے آتا ہوں۔“

”زیادہ منٹ نہ لگا دینا، میرا مٹانہ پھٹ جائے گا۔“ وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

وہ سست روی سے چلتی ہوئی کچھ آگے نکل گئی تو میں نے

”میں بھی تو پوچھ رہی ہوں کہ اگر اس وقت آپ کو بیت الخلاء جانا پڑ جائے تو کیا کریں گے؟“

”اول تو میں نمٹ نہ سکا کرتا ہوں، پھر بھی کوئی ضرورت پڑ ہی جائے تو میرا گھر دور نہیں ہے۔“

”پھر مہربانی کریں مجھے اپنے گھر لے چلیں صرف ایک لوٹا صرف ایک لوٹا پانی مجھے چاہیے ہوگا بس!“

”لیکن میں..... میں کیسے؟“ میں ہکا کر بولا۔

صورت حال میرے لیے مزید سنگین ہو گئی تھی۔ میں یہاں چھڑا رہتا تھا، چھڑوں کو دیسے بھی کوئی مکان کرائے پر نہیں دیتا۔ یہ تو مجھے جاننے والے جانتے ہیں کہ میں شادی شدہ ہوں اور میرے بیوی بچے ایبٹ آباد میں ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ میں شریف آدمی ہوں۔ اب تک میرے گھر پر کوئی محلے دار، کوئی رشتے دار تک نہیں آیا، جسے کوئی کام ہوتا ہے وہ دن میں کسی بھی وقت دکان پر آ جاتا ہے۔ سب سمجھتے ہیں کہ میرے گھر نہ ٹی وی ہے نہ کوئی باتیں کرنے والا۔ رات کو عشاء کے بعد میں صرف سوتا ہوں۔ اور صبح سویرے اٹھ کر مسجد اور وہاں سے سیدھا دکان پر..... ایسے میں کسی محلے دار نے میرے گھر سے کسی عورت کو نکلتا یا داخل ہوتا دیکھ لیا تو مکان ہی خالی کروادیں گے۔

”نہیں! میں تمہیں اپنے گھر نہیں لے جاسکتا۔“ میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ پتا نہیں کون عورت ہے؟ میں اس کے ساتھ ذرا سی نیکی کروں اور محلے بھر میں بدنام ہو جاؤں۔

”پھر کسی ایسی جگہ کا پتا بتائیں جہاں میں.....“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھر چپ ہو گئی۔ میں سب سمجھ رہا تھا لیکن کیا کرتا؟

”مسجد کے استنجا خانے ہیں، لیکن وہ بھی بند کر دیئے گئے ہوں گے۔“ میں نے بات کی، لیکن اس بات پر مجھے خود ہی افسوس بھی ہوا کہ ایک عورت مسجد کے استنجا خانے میں کیسے جاسکے گی؟

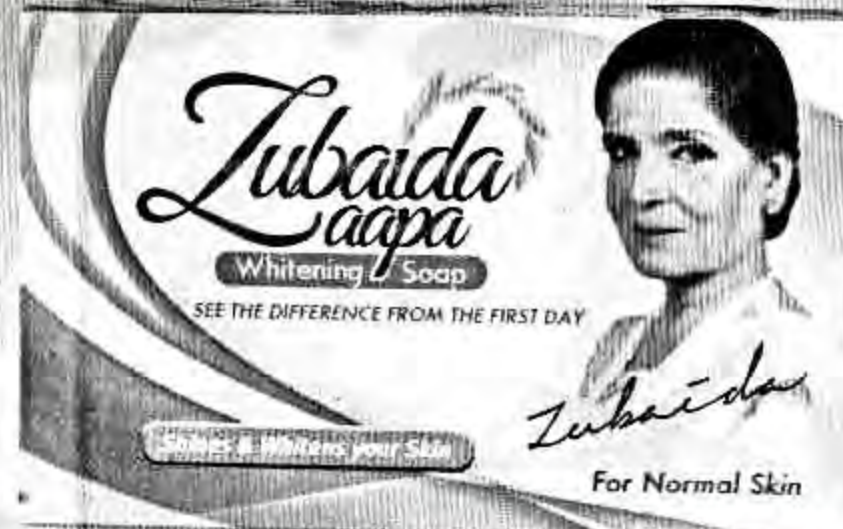
”میرے پاس کپڑوں کا بھی ایک جوڑا ہے جو میں پہنے ہوئے ہوں اور کچھ بھی نہیں ہے، اگر یہ بھی گندا ہو گیا تو اس نے خوفناک صورت حال کا نقشہ کھینچا۔

اس عورت کا میری دکان میں زیادہ دیر تک موجود رہنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اگر چوکیدار نے اسے یہاں صبح ہی صبح دیکھ لیا تو بھی بات کا ہتھکڑ بن جائے گا۔

”مجھے تکلیف ہو رہی ہے..... یہاں کوئی اسپتال وغیرہ بھی قریب نہیں ہے جہاں.....“ اس نے جملہ پھر ادھورا

اب گورا ہوگا پاکستان

زبیدہ آپا واٹکننگ سوپ،
چہرہ چمکائے اور رنگ گورا کرے



جلدی سے ہنگر دوبارہ شوکیں پر رکھ دیے، ایک ہی تالا اٹھایا اور شر کو جتنی الامکان بے آواز نیچے کیا، لیکن وہ شرعی کیا جو آواز نہ کرے۔ وہ عورت پیچھے مڑ کے دیکھے بغیر آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔ شر بند کر کے بھی میں دھڑکتے دل کے ساتھ چند لمحے وہیں کھڑا رہا کہ شر کی آواز سن کر ہی شاید چوکیدار آنکے، لیکن شاید چوکیدار کسی اور جانب نکل گیا تھا یا شاید مسجد سے ہی نہ نکلا ہو۔ بہر کیف میں تیزی سے چلتا ہوا اس عورت سے آگے نکل گیا۔ دو گلیاں چھوڑ تیسری گلی میں میرا گھر تھا۔ چند بجے بستے لکائے اسکول کی جانب رواں دواں تھے۔ کچھ کے ساتھ ان کی ماں، کسی کے ساتھ باپ یا بھائی بھی تھے، لیکن میری گلی خالی ہی تھی۔

میں نے جلدی سے تالا کھولا اور اندر گھسنے میں قطعی دیر نہیں لگائی، کیونکہ اس وقت میرا گھر میں گھستا بھی خلاف معمول تھا۔ کوئی پڑوسی دیکھ لیتا تو سوال کر سکتا تھا۔ اور میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

میرا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ ابھی میری سانسیں اعتدال پر بھی نہیں آئی تھیں کہ وہ عورت گھر میں داخل ہو گئی۔

”تمہیں دیکھا تو کسی نے نہیں؟“ میں نے غلت سے پوچھا۔
”نہیں کوئی بھی نہیں تھا گلی میں“ کہتے ہوئے وہ بیت الخلاء میں گھس گئی۔

☆.....☆

میں نے صراحی سے پانی اٹھایا اور چار پائی پر بٹھ گیا۔ پانی کا گلاس میرے ہاتھ میں تھا لیکن منہ تک لے جانا مشکل ہو رہا تھا، خدشہ تھا کہ پانی سانس کی نالی میں نہ چلا جائے۔

میرے نتھنوں سے شائیں شائیں کی آواز نکل رہی تھی اور دل مجھے اپنے کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

پانی کا گلاس میں نے قریب رہی تپائی پر رکھ دیا۔

وہ عورت بیت الخلاء سے باہر نکلی۔ میری جانب دیکھتے ہوئے خجالت سے مسکرائی۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ! آپ نے بے حد احسان کیا ہے مجھ پر۔“

”تمہارے شکریے کو میں چائوں یا فریم کروا کر دیوار پر لٹکاؤں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ درشت ہو گیا تھا۔

”کیوں؟ کیا ہوا؟“ اس کی مسکراہٹ کا نور ہو گئی۔

”چھڑے آدمی کو کوئی بھی شریف آدمی اپنا مکان کرائے پر نہیں دیتا اور شریف محلے میں تو چھڑے آدمی کو مکان کا ملنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ یہ میری شرافت ہے کہ مجھے یہاں مکان مل گیا ہے“ میں نے کہا۔

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں، میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکی“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”میں کوئی انگریزی تو نہیں بول رہا۔ تم چھڑے کا مطلب نہیں سمجھتیں۔“ میرا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ ”میں

یہاں اکیلا رہتا ہوں، اکیلا۔ تم میرے گھر آ تو گئی ہو، فارغ بھی ہو گئی ہو۔ تمہیں آتے ہوئے تو کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ جو نبی تم باہر قدم نکالو، میرا کوئی پڑوسی بھی عین اسی وقت گھر سے باہر نکلے، یہ سمجھو کہ میری عزت کا جنازہ نکل گیا“

”آپ، آپ میری وجہ سے پریشان نہ ہوں۔ میں خود بہت پریشان ہوں۔ ان شاء اللہ آپ کی عزت پر میری وجہ سے کوئی حرف نہیں آئے گا، یہ میرا وعدہ ہے۔“ وہ ایک عزم سے بولی۔

”تم نہیں سمجھو گی میری پریشانی!“ میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ آدھے کمرے میں چار پائی پکھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک تپائی تھی جس پر روزمرہ ضرورت کے چند برتن بے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے، اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی میز بھی جو چار پائی سے قدرے اونچی تھی۔ اس پر قرآن مجید اور چند اسلامی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔

”آپ نے سچ کہا، میں واقعی آپ کی پریشانی نہیں سمجھ پا رہی تھی، لیکن اب سمجھ آ گئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ گھر بار والے ہیں، آپ کی فیملی ہوگی۔ بیوی بچے ہوں گے، ان کا مسئلہ ہوگا، لیکن آپ صحیح سوچ رہے ہیں۔ اگر مجھے کسی نے آپ کے گھر سے لکھا ہوا دیکھ لیا تو آپ ہی کی نہیں میری عزت بھی“ پتا نہیں، اس کی یہ بیماری تھی یا عادت کہ جملہ ادھورا چھوڑ دیتی تھی۔

”بہر حال آپ پریشان نہ ہوں، اللہ بہتر کرے گا۔“

”پریشان کیسے نہ ہوں۔ مجھے دکان پر جانا ہے، میرا ملازم آنے والا ہے۔ اگر دکان بند ہوئی تو وہ سیدھا گھر آجائے گا اور اسے میں دروازے سے واپس نہیں بھیج سکتا، وہ اندر ضرور آئے گا، اس لیے کہ میں چھڑا ہوں، لیکن تم نہیں سمجھو گی چھڑے کا مطلب۔“

”اگر آپ کو دکان پر جانا ہے، تو چلے جائیں۔ میں رات کے اندھیرے میں یہاں سے نکلوں گی، جب مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ میں اپنی وجہ سے محلے میں آپ کی عزت خراب نہیں ہونے دوں گی۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ترکیب اچھی تھی۔ ”لیکن دن بھر میرے دروازے کو تالا لگا رہتا ہے، کیونکہ میں رات کو گھر پر ہوتا ہوں اور دن کو دکان پر۔ جمعہ کے دن دکان کی چھٹی ہوتی ہے تو میں اپنے بیوی بچوں میں چلا جاتا ہوں۔ اگر کسی نے دن دھاڑے میرا دروازہ کھلا دیکھا تو بغیر دستک دیئے ہی اندر آ جائے گا، اس لیے کہ۔“

”آپ چھڑے ہیں۔“ اس نے میری بات کاٹ کر جملہ پورا کر دیا۔ ”آپ دکان پر جائیں اور باہر سے تالا لگا جائیں، میں آپ کے آنے تک یہیں رہوں گی، بلکہ اپنی نیند بھی پوری کر لوں گی اور پھر رات کے اندھیرے میں چلی جاؤں گی۔“

”کہاں جاؤ گی؟“

”جہاں بھی منہ اٹھا، آپ جائیں آپ کو دیر ہو رہی ہے۔ میری وجہ سے اپنا نقصان نہ کریں۔ مجھے شرمندگی ہے کہ میری وجہ سے آپ دکان بند کر کے گھر آئے ہیں۔“

میں نے چاہتے ہوئے بھی اسے گھر میں بند کر کے تالا لگا کر دکان پر چلا گیا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔

دکان پر جا کر بھی مجھے بار بار یہ خیال ستا رہا کہ میں ایک غیر عورت کو گھر میں بند کر آیا ہوں۔ عورت ہے، آخر زندہ جان ہے، چھینک کھانسی پر انسان کو اختیار نہیں ہے۔ اگر کسی نے اس کی آواز سن لی اور دروازے پر تالا دیکھا تو یہ بھی میری بدنامی ہوگی۔ لوگ کہیں گے، پتا نہیں کب سے عورت کو اندر قید کر رکھا ہے۔ کس مقصد کے لیے قید کیا ہوا ہے۔

בלال آیا اور جب اس نے ناشتے کی بات کی تو یکایک مجھے خیال آیا کہ ناشتا تو اس عورت نے بھی نہیں کیا ہوگا؟ میں نے بلال سے کہا کہ تم دکان پر بیٹھو میں ناشتا گھر پر ہی کر آتا ہوں۔ تھوڑی دیر کمر بھی سیدھی کر لوں گا۔ یہ میرا معمول نہیں تھا، لیکن کبھی میں اس طرح گھر چلا جایا کرتا تھا اور ایسا عموماً بچنے کے دن کیا کرتا تھا کہ سفر کی ٹھکن ہوئی تھی۔

☆.....☆

میں نے نابالائی سے دو افراد کا ناشتا لیا دو وہ، اٹھ رہے،

چینی، چائے کی پتی لی اور گھر کی راہ لی۔

اتنی ہی دیر میں اس عورت نے گھر کا نقشہ ہی بدل رکھ دیا تھا۔ بستر جھاڑ دیا تھا، نئی چادر بچھا دی تھی، دیوار صاف کر کے پورے گھر میں جھاڑ بھی لگا دی تھی۔ کمرے میں کبھی میں نے پونچھا نہیں لگایا تھا اس نے اندر پونچھا لگا کر ساری دھول مٹی دھو ڈالی تھی۔

یہ سب کچھ اس نے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں کر لیا تھا۔ ناشتے سے لدا پھندا دیکھ کر وہ مسکرائی ”یہ کس لیے؟“

”تمہارے لیے۔“ میں نے کہا۔ ”اپنے لیے۔“

”چلیں حساب برابر ہو گیا۔ آپ نے میرا خیال دیکھا، میں نے آپ کا خیال رکھا کہ ایک ”چھڑا“ آدمی اپنے گھر کی صفائی نہیں کرتا، تو میں سارا دن اس گھر میں بند رہ کر کچھ نہیں تو صفائی ہی کر ڈالوں۔“

گھر میں کھستے ہی ہمیشہ عجیب سی بساند میرا استقبال کرتی تھی، آج سب کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ مجھے عورت کچھ اپنی اپنی سی لگنے لگی تھی۔

”چلو ہاتھ دھو لو! ناشتا کریں۔“

”ضرور کروں گی، میں نے رات کا کھانا بھی کھایا۔“ وہ بولی

”ارے تو بتایا کیوں نہیں؟ میں جاتے جاتے دے دیتا ہوں۔“

”مجھے افسوس سا ہوا کہ یہ پونچھنا تو میرا کام تھا۔“

”آپ کو دکان سے دیر ہو رہی تھی۔ آپ کہہ رہے تھے کہ دکان بند ہوئی تو ملازم گھر آ جائے گا!“

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی اس وقت مجھے بلال کا دھڑکانا ہوا تھا۔ بہر کیف ہم نے ایک ہی، بلکہ واحد چار پائی پر بیٹھ کر ناشتا کیا۔ اجنبیت ختم ہوئی تھی۔

”آپ مجھے کپڑے دھونے کا صابن لادیں، میں بستر کی چادر دھو ڈالوں۔ دیکھیں کتنی گندی ہو رہی ہے؟ آپ کو کیسے نیند آ جاتی ہے اس گندے بستر میں؟“ وہ بولی

”میں اس کا عادی ہو گیا ہوں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”آپ مجھے صابن لادیں۔“

اس نے دوبارہ کہا تو میں نے تکلفاً منع کرنے کی بجائے اس کے کہے پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔

جا کر قریبی دکان سے کپڑے دھونے کا صابن لے آیا۔ ”کوئی سبزی وغیرہ بھی لے آتے، میں پکا دیتی، قارن

ہی تو ہوں“ ایک اور فرمائش تیار تھی۔

میں سبزی بھی لے آیا۔ اس نے نہ جانے کہاں کہاں سے میلے کپڑے کھینچ نکالے تھے۔ میں نے کہا ”بانی کے کپڑے رہنے دو، صرف بستر کی چادر دھو ڈالو بس! صابن کم پڑ جائے گا، پھر اور منگواؤ گی۔“

”منگواؤں نہیں تو کیا خود جا کر لاؤں گی؟“ وہ مسکراتی تو جانے کیوں میرا دل اتنی تیزی سے دھڑکتا گویا سینہ توڑ کر باہر آ جائے گا۔

میں نے کہا ”ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں دکان پر، کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو دوپہر میں لے آؤں گا۔“

”کپڑے دھونے کے برتن نہیں ہیں تمہارے ہاں، اس چھوٹے سے برتن میں مشکل سے دھلیں گے“ اس نے غسل خانے کا تب دکھاتے ہوئے کہا۔ وہ آپ سے تم پر آ گئی تھی۔

”تم چند گھنٹوں کی مہمان ہو، پھر چلی جاؤ گی۔ ایسی چیز خریدنے کا مجھے کیا فائدہ؟ جو تمہارے بعد میرے کام نہ آئے؟“

وہ پھر مسکرائی ”میں خرید کر لانے کا نہیں کہہ رہی، میں تو یہ کہہ رہی ہوں، کچھ کہتے ہوئے وہ رکی۔ گویا الفاظ تول رہی ہو۔“ پھر قدرے توقف سے بات بدل کر بولی۔

”چلیں میں گزارا کر لوں گی۔“

ظہر کی نماز کا وقت ہوا تو میں نماز پڑھ کر گھر چلا گیا وہ بھی نماز پڑھ رہی تھی۔ اسے نماز پڑھتا دیکھ کر مجھے یک گونہ روحانی تسکین ہوئی کہ یہ عام عورتوں کی طرح نماز پڑھنے والی نہیں ہے۔ میں چار پائی پر لیٹ گیا اور اسے نماز پڑھتے دیکھتا رہا۔

”ترکاری تو میں نے بنادی ہے“ وہ نماز سے فارغ ہوئی ابھی جائے نماز پر ہی تھی کہ مسکراتے ہوئے بولی ”چج سے کھائیں گے؟“

”کیا مطلب؟“ میں نے حیران ہو کر کہا۔

”مطلب یہ کہ پکانے کے لیے سبزی مسالہ تو آپ نے لادیا۔ میں نے سالن بنا دیا۔ ہمارے ہاں سالن کو روٹی کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔“ وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔ میرا ہاتھ ٹھکا۔ ہوٹل سے پکا پکا کھانا لانا لا کر کھانے کا عادی تھا، ابھی گھر میں آنا گوندھنے اور پکانے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی، میں فوراً اٹھا، قریبی ہوٹل سے چند روٹیاں لے آیا۔ دوپہر کا کھانا بھی ہم نے گھر کی واحد چار پائی پر آنے سے پہلے کھایا، اس نے سالن بھی بہت عمدہ بنایا تھا، یا

شاید میں نے پہلی بار اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھایا تھا۔ رات کو جب میں گھر کی جانب جا رہا تھا تو میرے پاس پھلوں کے دو تھیلے بھی تھے۔

☆.....☆

مطلع شام سے ہی ابر آلود تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی لگتا تھا۔ قریب ہی کہیں بارش ہو رہی ہو، رات کھانا کھا کر ہم فارغ ہوئے تو بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔

”لو! بارش بھی شروع ہو گئی۔“

”تو کیا ہوا؟ یہ تو قدرتی کام ہیں۔“

”قدرتی کام تو ہیں۔ تمہارے لیے مسئلہ ہو جائے گا۔ تم کیسے جاؤ گی؟ برستی بارش میں؟“

”میں؟ میں کل چلی جاؤں گی۔ مجھے کون سی جلدی ہے۔“ وہ اتنی آسانی سے بولی گویا بارش اس کا کچھ بھی نہیں لگا سکتی۔

”تو کیا رات بھی یہیں رہنے کا ارادہ ہے؟“ مجھے غم تھری سی آ گئی۔

”مجبوری ہے! اب بارش میں کہاں جاؤں گی؟ خود سوچیں آپ؟“

”میری بھی مجبوری کو دیکھو نا! میرے گھر میں ایک ہی چار پائی ہے۔ اس پر تم سوؤ گی یا میں؟“

”آپ ہی سو جانا، میں فرش پر ہی لیٹ جاؤں گی۔ مسافر ہوں مجھے تو کہیں بھی نیند آ جائے گی۔“

میں دعا کر رہا تھا کہ بارش تیز نہ ہو، بلکہ ختم ہو جائے تو یہ عورت میری جان چھوڑے، ورنہ کل پھر اسے قید کر کے دکان پر جانا پڑے گا۔ بارش تیز تو نہ ہوئی، لیکن ختم بھی نہ ہوئی، ہلکی ہلکی پھوار پڑتی رہی تھی۔

اس نے اپنے لیے فرش پر ہی ایک چادر بچھالی تھی اور اپنی شمال لے کر لیٹ بھی گئی تھی۔ اسے لیٹے دیکھ کر مجھے غصہ آ رہا تھا کہ یہ عورت مجھے بدنام کرنے کے پروگرام پر پوری طرح عمل کر رہی ہے۔ یہ کب جائے گی اور میری جان میں جان آئے گی۔

”ابھی سو جاؤ! لیکن صبح سویرے حمہیں نکلنا ہوگا جس طرح اندھیرے میں آئی ہو اسی طرح۔ میں اپنی بدنامی نہیں چاہتا۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھے صبح اذان کے وقت جگا دیجئے گا۔ میں نماز پڑھ کر نکل جاؤں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے

کروٹ بدل لی۔

میں نے بھی بتایاں بچا دیں اور چارپائی پر لیٹ گیا۔
”آپ کے بیوی بچے کہاں ہیں؟“ اندھیرے میں اس کی آواز ابھری۔

”وہ ایبٹ آباد میں ہیں“

”انہیں آپ نے ساتھ کیوں نہیں رکھا؟“

”ایبٹ آباد میں میرا ذاتی گھر ہے۔ میرے والدین ہیں، میرے بچے پڑھ رہے ہیں۔ میں جمعرات کی شام کو چلا جاتا ہوں اور دو راتیں اور جمعہ کا ایک دن اپنے بچوں میں گزار کر ہفتے کی صبح واپس آ جاتا ہوں۔“

”آپ کی بیوی یہاں نہیں آتی؟“

”کیسی بات کرنی ہو؟ اسے کیا ضرورت ہے یہاں آنے کی؟ یہاں سارا دن اکیلی رہے گی، خود میں دکان پر رہوں گا، اس کی فرمائشیں کون پوری کرتا پھرے گا؟ اور پھر یہ گھر کوئی دوا فرادے کے رہنے کا ہے؟“
کچھ دیر خاموشی رہی۔

”ایک بات کہوں آپ سے؟“ اسی نے خاموشی کو توڑا۔
”اب تک ساری باتیں بغیر پوچھے کرتی رہی ہو اور اب ایسی کیا بات ہے، جو مجھ سے پوچھ کر کرنا چاہتی ہو؟“
وہ خاموش ہو گئی، پھر یہ خاموشی طویل پکڑ گئی۔
”آپ نے اب تک مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گی؟“

”مجھے کیا ضرورت ہے یہ پوچھنے کی، جہاں تمہاری مرضی ہو چلی جاؤ!“ میں نے فوراً کہا۔ ”یہاں سے جاؤ، جہاں جی چاہے۔“ اس نے شاید میرے لہجے میں بیزاری محسوس کی ہوگی۔

چند منٹ خاموشی رہی۔ میں سمجھا کہ اب سو گئی ہوگی میں نے بھی حسب معمول آیت الکرسی کا ورد شروع کیا، میری عادت سی ہو گئی ہے کہ نیند آتے تک میں آیت الکرسی پڑھتا رہتا ہوں۔

بارش کی وجہ سے ٹھنڈا احساس بڑھ گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے تو اسے بھی ٹھنڈ لگ رہی ہوگی۔ وہ تو ٹھنڈے فرش پر لیٹی ہوئی ہے۔ سو جا کہ اٹھ کر جی جلاؤں اور کھیل نکال کر اسے بھی دوں اور خود بھی کوئی حادہ وغیرہ لے لوں، ورنہ ٹھنڈ کی وجہ سے رات بھر نیند نہیں آئے گی۔

ہاتھ بڑھا کر میں نے بلب کا سوچ آن کیا۔ دیکھا تو وہ

چارپائی سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔

”یہ کیا؟ میں سمجھا کہ تم سو گئی ہوگی۔“

”نیند آئے گی تو سو جاؤں گی۔“ اس نے قدرے رکھائی سے کہا۔

میں نے اس کے لہجے کی قطعی پروا نہیں کی۔ بکس میں سے کھل نکالا میرے پاس وہ ایک ہی کھیل تھا۔ اسے دیتے ہوئے کہا ”یہ لو اس ردی بڑھتی جا رہی ہے“ ایک چادر اپنے لیے بھی نکال لی۔

کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا۔ بارش اگرچہ کمرے میں نہیں آتی تھی، تاہم تیز ہوا کے ساتھ بھی بگی بوجھا رہی جانی تھی۔ نمی کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے دوبارہ جی بچا دی اور چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔

”آپ نے میرا نام بھی نہیں پوچھا ابھی تک؟“

وہ شاید ابھی تک بیٹھی ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند کرنے سے گھب اندھیرا ہو گیا تھا۔

”نام پوچھ کر کیا کروں گا ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس قدر جلد ہو سکے تم میرا پیچھا چھوڑ دو۔“

”مجھے بتائیں میں کہاں جاؤں؟“

”کہیں بھی جاؤ گی تو پچھتاؤ گی۔ بہتر یہ ہے کہ جہاں سے آئی ہو وہیں چلی جاؤ اپنے بھائیوں کے پاس۔“

”بھائی۔“ وہ ہنسی۔ ”میرے بھائی ابھائی نہیں رہے۔ وہ اپنی بیویوں کے شوہر ہیں اور میری بھائیوں کو یہ احساس ہے کہ اگر میں ان کے پاس رہی تو میرے بھائی میری شادی کی فکر کریں گے۔ انہوں نے میری شادی کہیں کرنے کی کوشش بھی کی تو اس میں کچھ نہ کچھ خرچہ ضرور ہوگا۔ اس لیے بھابھیاں مجھے اپنے میاؤں کے نزدیک نہیں دیکھنا چاہئیں۔ میں اپنے گھر میں رہتی ہوں۔ اپنے بھائیوں سے بات کرنے کو ترستی رہی۔ مجھے یقین ہے کہ آج کی رات میری بھابھیاں سکون سے سوئیں گی، کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں نے کہیں اپنا منہ کالا کر لیا ہوگا اور ایک رات گھر سے باہر گزار کر دوبارہ ان کے گھر بھی نہیں آسکتی۔ انہوں نے میرے بھائیوں کو خوب خوب بھڑکادیا ہوگا، میرے خلاف۔“

میں خاموش رہا۔ میں کہتا بھی تو کیا؟

”ایک بات کہوں، اگر برا نہ مانیں تو؟“ وہ بولی۔ میں خاموش ہی رہا۔ ”آپ کا کوئی جاننے والا کوئی دوست

ہے تو اس سے میرا نکاح کروادیں۔“

میں اٹھ بیٹھا۔ کتنی مشکل بات اس نے کس قدر آسانی سے کہہ دی تھی، وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی، لیکن میں نے اندھیرے میں گھورتے ہوئے کہا ”میں چاہتا ہوں کہ میرے جاننے والوں کو خبر ہونے سے پہلے پہلے تم میرے گھر سے چلی جاؤ اور تم چاہتی ہو کہ میں جان بوجھ کر اپنے دوستوں کو تمہارے وجود سے آگاہ کروں؟“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بالکل چپ ہو گئی

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی تو میں پھر لیٹ گیا۔ میرے پاس سونے کا یہی وقت ہوتا تھا، میں دن میں نہیں سو سکتا تھا۔

☆.....☆

غیر کی اذان سے کچھ پہلے میری آنکھ کھلی تو میں نے اٹھ کر بیٹھی جلائی۔

دیکھا تو چارپائی سے نیچے کھیل گرا ہوا تھا اسے اٹھانے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ کوئی ہے۔ معاذ یاد آیا کہ یہ تو وہی عورت ہے جو کل صبح سے میرے گھر میں قید ہے۔

پھر ساری باتیں یاد آئیں۔ کھیل اٹھانے سے وہ بھی بیدار ہو گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی، جواب میں بھی دھیرے سے مسکرایا۔ میں سیدھا مسجد چلا گیا۔

نماز پڑھ کر واپس آیا تو وہ بھی نماز سے فارغ ہو چکی تھی۔ ”ناشتا میں گھر میں ہی بناؤں گی“ وہ بولی صرف سامان لادیں۔

”ابھی تو تمام دکانیں بند ہیں۔ دیر سے کھلیں گی، ناشتا کرتے کرتے دیر ہو جائے گی۔ اس وقت سب لوگ گھروں میں بند ہیں۔ انکا دعا نمازی ہیں، وہ بھی تھوڑی دیر میں اپنے اپنے گھر پہنچ جائیں گے، تم اب دیر بالکل نہ کرو۔ رات تو بارش کی وجہ سے رک گئیں، لیکن اب رکنے والی بات نہ کرنا، جتنا جلدی ہو نکل لو۔“ میں نے دو ٹوک کہا۔

”کیسے آدمی ہیں آپ؟ کوئی گھر سے جا رہا ہو تو کہتے ہیں۔ ٹھہرنا ناشتا کر کے جانا چاہئے پی کر جانا، کھانا کھا کر جانا اور آپ ایسے وقت میں گھر سے نکال رہے ہیں جب کہ ناشتے کا وقت ہے۔“

”تمہیں میرے گھر آئے ہوئے چوبیس گھنٹے ہو چلے ہیں اور یہ چوبیس گھنٹے میرے لیے بڑے بھاری گزرے ہیں، اس لیے کہتا ہوں کہ دیر کیے بغیر نکل لو، ورنہ کل والا مسئلہ پھر پیدا ہو جائے گا۔“

”اگر میں نہ جانا چاہوں تو آپ زبردستی کریں گے؟“
”زبردستی تو نہیں نکال سکتا، لیکن تم میری پوزیشن کو سمجھو، کل کوئی نہیں آتا تو آج ضرور کوئی نہ کوئی آجائے گا، آخر کب تک تم میرے گھر بیڑی رہو گی۔ مجھے سکون سے کوئی کام کرنے دو۔ میرے گلے بندھے معمولات ہیں۔“

”میں نے آپ کو اپنی مجبوری بتا دی ہے، پھر بھی آپ مجھے اپنے گھر سے نکال رہے ہیں۔“

”تم میری ذمہ داری نہیں ہوا“ میں نے فوراً کہا۔
مجھ پر تمہاری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔“

”ایک بات کہوں اگر اجازت ہو تو“ اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

”بولو جلدی بولو“

”مجھے اپنے گھر سے نہ نکالیں! میں آپ کی خدمت کروں گی“

”کیا کہہ رہی ہو تم؟ میں تمہیں کیسے اپنے گھر رکھ سکتا ہوں ایک جوان عورت کو؟ ایک ہی رات میرے لیے غذا ب سے کم نہیں ملے گی اور تم مستقل رہنے کی بات کر رہی ہو؟“

”دیکھیے میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ بھائیوں سے مجھے قطعی بھی امید نہیں ہے کہ وہ مجھے تلاش کریں گے یا میرا گھر بسائیں گے۔ آپ شریف النفس آدمی ہیں۔ آپ کے گھر رات بھر رہ کر مجھے انوکھے تحفظ کا احساس ہوا ہے۔ میں آپ کے گھر سے جانا نہیں چاہتی۔ آپ جیسا شخص مجھے پوری دنیا میں نہیں ملے گا۔“

”لیکن میں تمہیں اپنے گھر کیسے رکھ لوں، کیوں میری عزت کا جنازہ نکال رہی ہو؟“

”آپ مجھے اپنی ذمہ داری میں لیں، مجھ سے خود نکاح کر لیں۔“

”وماغ خراب ہے تمہارا؟ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔ اس مہنگائی میں ایک بیوی کا صحیح طور پر بھی حق ادا کرنا مشکل ہے، دو کا کیسے ادا ہوگا؟“

”میں کچھ بھی نہیں مانگتی صرف پناہ مانگتی ہوں آپ سے“ وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

”میں کوئی شیطان ہوں جو مجھ سے پناہ مانگ رہی ہو“ مجھے یہی سمجھ آئی۔

”میں آپ کی پناہ مانگتی ہوں۔ معاشرے میں بکھرے ہوئے شیطانوں سے۔“ اس نے ’کی‘ پر زور

دیا۔

”میں کوئی شیطان ہوں جو مجھ سے پناہ مانگ رہی ہو“ مجھے یہی سمجھ آئی۔

”میں آپ کی پناہ مانگتی ہوں۔ معاشرے میں بکھرے ہوئے شیطانوں سے۔“ اس نے ’کی‘ پر زور

دیا۔

دے کر وضاحت کی۔
 میں نے کہا۔ ”ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں اسلام میں کسی غیر مرد کے ساتھ عورت کا بغیر نکاح کے اکیلے رہنا، کتنا قبیح فعل شمار ہوتا ہے؟“
 ”اسی لیے کہتی ہوں کہ مجھ سے نکاح کر لیجیے!“
 ”نہیں نہیں یہ مجھ سے نہیں ہوگا، سو سیکلے پیدا ہو جائیں گے، تم جاؤ! بس کہیں اور چلی جاؤ، کسی ایسے شخص کا گھر ساؤ جسے بیوی کی ضرورت ہو، میری ایک بیوی ہے۔ کافی است و معافی است“ میں نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے۔
 ”تو آپ ہی اپنے کسی دوست عزیز سے میرا نکاح پر ہموادیں، میرا کون ہے یہاں جاننے والا، کون ہے میرا سرپرست؟“
 ”پھر وہی بات۔ میں لوگوں کے سوالات سے بچتا چاہتا ہوں، میں نہیں چاہتا کہ جہاں سے گزروں لوگ مجھ پر انگلیاں اٹھائیں۔ مجھ کو کچھ کراپس میں چھ میگوئیاں کریں۔“
 ”آپ کو کیا اندیشہ ہے؟ لوگ کیا سوال کریں گے آپ سے اور آپ کو کس سوال کا جواب دینے میں مشکل پیش آرہی ہے؟“

”کئی سوال ہیں، تم نہیں سمجھو گی۔ چھوڑو ان باتوں کو“
 ”دیکھیے میں آپ کو اپنی آپ بتی سناتی ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اپنی زوجیت میں خود رکھیں یا اسے کسی دوست کی زوجیت میں دے دیں۔ خود نکاح کر لیں گے تو فائدے میں رہیں گے، سوچئے! صبح اٹھتے ہیں ناشتا اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک ہوٹلوں یا تانبائی کی دکان پر تیار نہ ہو جائے، کپڑے دھو بی سے دھلاوتے ہیں۔ دہی استری کر کے دیتا ہے، دوپہر کا کھانا بھی ہوٹل پر رات کا کھانا بھی ہوٹل سے! میرے ہوتے ہوئے آپ کی یہ پریشانیاں ختم ہو جائیں گی آپ صبح سویرے ناشتا کر کے دکان پر جائیں گے، دوپہر کا کھانا تیار ملے گا، رات کو گھر آئیں گے تو میرے ہاتھ کا پکا کھانا کھائیں گے، لباس تیار ملے گا گھر صاف سہرا ملے گا۔“
 ”وہ تو ٹھیک ہے لیکن.....“

”ابھی کچھ نہ کہیں میری بات پوری سن لیں۔ میرے تین بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ میں سب سے چھوٹی ہوں۔ سب کی شادی ہو گئی ہے، بہنیں لاہور بیاہی گئی ہیں۔ میری شادی سے پہلے ہی میرے والدین کا انتقال ہو گیا، اب میں اپنے بھائیوں پر بوجھ ہوں۔ بھائیاں یہ چاہتی ہیں کہ

میں سارا سارا دن ان کے کام کروں، ان کے بچوں کا خیال رکھوں، انہیں کھلاؤں لیکن نہ ان سے کھانا مانگوں نہ لباس۔ یعنی کسی نوکرانی کی طرح صبح سے شام تک ان کے کام کروں اور شام ہوتے ہی گھر سے نکل جاؤں۔ اگر میں ان کے گھر رہی تو میرے بھائی میری شادی کی فکر کریں گے، انہیں کچھ نہ کچھ جہیز میں بھی دینا پڑے گا، رہیں میری بہنیں تو اول انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ میری بھائیوں کا میرے ساتھ کیا سلوک ہے؟ دوسرے یہ کہ میں ان کے پاس بھی نہیں جا سکتی جب بھائی اپنے نہیں ہیں تو بہنوئی کیا کر سکیں گے؟ میری قسمت اچھی ہے کہ رات کے اندھیرے میں گھر سے نکلی اسٹیشن پہنچی، بے ٹکٹ سفر کر کے یہاں پہنچی۔ چلتے چلتے تھکی تو ایک دکان کے تھڑے پہ لیٹ گئی، دن بھر کام کر کے بھی تھکی ہوئی تھی اور بھوک بھی، رات بھر کی جاگی ہوئی بھی تھی آنکھ لگ گئی، پھر آپ نے مجھے جگایا۔ میں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ آپ کے گھر مجھے سکون مل رہا ہے، میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔“
 ”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن میں لوگوں کو کیا جواب دوں گا، تمہارے بارے میں؟“

”کچھ بھی نہیں، آپ کسی دوسرے سے ان کے گھر کے بارے میں ان کی بیوی کے بارے میں کیا سوال کرتے ہیں؟ مجھے بتائیں، لوگ آپ کو کیا جواب دیتے ہیں۔ وہی جواب آپ بھی دے دیتا۔“

”دیکھو تم میرے گھر بیت الخلا کے لیے آئی تھیں، اسے ”بیت الخلا“ نہ سمجھو۔ جاؤ میری جان چھوڑو۔ تم میری بیوی نہیں ہو۔ لوگ جانتے ہیں کہ میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔ یہ مکان دو افراد کے رہنے کے قابل نہیں ہے، اس کمرے میں دوسری چار پائی کی جگہ بھی نہیں ہے، باورچی خانہ نہیں ہے۔ بس کچن میں ایک چولہا رکھا ہوا ہے وہ بھی کھانا پکانے کے لیے نہیں، بلکہ سردی کے موسم میں پانی گرم کرنے کے لیے۔“

”آج مجھے میرے کہنے پر اپنے گھر دن گزارنے دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ جیسے ہی رات کو آپ گھر آئیں گے، میں چلی جاؤں گی، وہ بھی آپ نے اجازت دی تو۔“
 ”میری طرف سے تمہیں ابھی اجازت ہے“ میں فوراً بولا۔
 ”ساری رات میں اس بات پر غور کرتی رہی ہوں، آج دن میں آپ غور کر لیں، پھر جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے منظور

ہوگا۔“ وہ بولی ”میں نے سوچا ہے کہ آپ مجھے اپنے نکاح میں لے لیں، جیسے آپ رہتے رہے ہیں، ویسے ہی اپنے معمولات رکھیں، دکان جاتے ہوئے باہر سے تالا لگا جائیں، میں گھر کے اندر ہی رہوں گی۔ کہیں آنا جانا تو ہوگا نہیں۔“
 ”نکاح اتنا بھی خاموشی سے نہیں ہوتا کہ کسی کو خبر نہ ہو، لوگوں کو محلے داروں کو گواہ بنانا پڑتا ہے۔“

”نکاح کے لیے اپنے دو دوستوں کو رازدار بنالیں، انہیں بتائیں کہ مجھے پریشانی ہے۔ پہلی بیوی میرے ماں باپ کی خدمت کر رہی ہے، تو دوسری کو یہاں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ ہوٹلوں کا کھانا کھا کر بیزار ہو گیا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ بس ان دو افراد کو یہی یہ معلوم ہو کہ میں آپ کی دوسری بیوی ہوں، ورنہ دوسروں کو صرف یہ بتائیں کہ میری بیوی ہے، میرے ساتھ رہتی ہے۔ کسی کو کیا خبر کہ میں آپ کی پہلی بیوی ہوں یا دوسری۔“
 ”تمہیں پتا ہے دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا پڑتی ہے۔“

”میں آپ سے کوئی مطالبہ نہیں رکھتی، جس طرح آپ اپنے بیوی بچوں میں جمعرات کے دن جاتے ہیں، جاتے رہیں۔ باہر سے تالا لگا کر جاتے رہیں۔ میں گھر کے اندر ہی بند رہوں گی، میرا کون ہے؟ کس کے پاس جاؤں گی؟ آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کی بیوی یہاں نہیں آتی اسے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس صورت میں بھی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس کی پلاننگ مکمل تھی۔ وہ ہر طرح سے مجھے گھیر رہی تھی کہ میں اس سے عقد ثانی کروں ہی کروں۔ مجھے سوچنا دیکھ کر بولی۔ ”آج آپ سوچ لیں کہ مجھے یعنی ایک بے بس و بے سہارا لڑکی کو اس طرح لے آ سرائے کیلئے اپنے گھر سے نکالنا بہتر ہے یا مجھے سہارا دینا، اپنا گھر بسا لینا۔ حق مہر کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے بس داہجی سار گھیں میری کوئی شرط نہیں ہے، مجھے صرف ٹھکانہ چاہیے۔“

☆.....☆

میں ناشتے کا سامان لے آیا، اس نے ناشتا بنایا، ہم دونوں نے مل کر ناشتا کیا، پھر میں حسب معمول گھر کو تالا لگا کر دکان پر چلا گیا۔ اس کی پیش کش پر خوب غور کیا۔ مجھے عقد ثانی میں کوئی خرابی دکھائی نہ دی، میں نے سوچا کہ جس طرح میں پہلے جاتا رہا ہوں، اسی طرح اب بھی دو راتوں

اور ایک دن کے لیے چلا جایا کروں گا۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی کہ میں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ میرا ملازم بلال ہی ایک ایسا شخص ہے جو میرے گھر بے شک آتا جاتا ہے۔ اسے بتانا ضروری ہے کہ اب میرے گھر میری بیوی ہوتی ہے، اس طرح بے دھڑک اندر نہ آئے۔ ایک فیصلے پر پہنچ کر میں پرسکون ہو گیا۔ دوسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ گھر جا کر میں نے اس کے سامنے اپنا پلان رکھا، اس نے اتفاق کیا۔ راولپنڈی میں کوئی بھی میرا رشتہ دار یا گرامیں نہیں تھا۔

جمعرات کے دن میں نے بلال کو ہوشیار کر دیا۔ کچھ سامان تو میں نے جمعرات کے دن ہی خرید کر دکان میں رکھ دیا اور یہ کہہ دیا کہ یہ میں پرسوں گھر لے جاؤں گا، اس سے اسے یہ تاثر دیا کہ میں دکان سے رخصت ہو کر سیدھا بس اسٹاپ پر جاؤں گا۔

میں نے اس کے دو دن کے کھانے کا بندوبست یہ کیا کہ چند پیکٹ بسکٹ، دودھ اور جوس کے چند ڈبے خرید کر اس کے حوالے کیئے کہ بھوک نہ رہے۔

اس رات میں خلاف معمول رات تاخیر سے بس میں بیٹھا اور ظاہر ہے کہ ایسٹ آباد بھی دیر سے ہی پہنچا۔ گھر والے پریشان ہو گئے تھے۔ میں نے کہہ دیا کہ کام زیادہ ہے، ہفتے کی صبح کی بجائے میں جمعہ کی نماز کے فوراً بعد ہی چلا جاؤں گا تاکہ ہفتے کی صبح جلدی دکان کھول سکوں۔

اس تاخیر کو جواز بنا کر میں نے دو مقصد حاصل کر لیے تھے۔ چنانچہ ہفتے کی صبح آنے کی بجائے میں رات کو ہی راولپنڈی پہنچ گیا۔

کمرے میں داخل ہو کر بتی جلائی تو وہ چار پائی پر سوئی ہوئی تھی۔ میں نے اسے سونے دیا اور خود فرش پر سو گیا، رات جانے کب اس کی آنکھ کھلی اس نے بتی جلائی تو میں اسے فرش پر ہی دکھائی دیا۔ اس نے مجھے اسی وقت بیدار کر دیا اور اصرار کر کے مجھے چار پائی پر سلا دیا اور خود فرش پر لیٹ گئی۔

صبح ناشتا کر کے میں دکان پر گیا۔ بلال آیا تو اس نے آتے ہی پوچھا کہ بچے آگئے ہیں؟ میں نے کہا۔ ”بچے نہیں آئے، ان کی پڑھائی کا مسئلہ تھا۔ البتہ تمہاری بھابی آگئی ہے۔“ نکاح سے پہلے اسے بلال کی بھابی بنانا کچھ عجیب سا تھا، لیکن کیا کرتا کیا کہتا؟

میں نے اس کے لیے سلائے تین سوٹ لیے ایک

برقعہ لیا۔ دکان میں رکھے ہوئے برتن اٹھائے اور گھر چلا گیا۔ وقت ضائع کیے بغیر اس عورت کو لباس بدلنے کا کہا اور کہا "اب تم مجھے اپنا نام بھی بتاؤ اور اپنے باپ کا نام بھی۔" "میرا نام شریف زادی ہے، باپ کا نام فرہاد ہے۔ اپنے گاؤں کا نام نہیں بتاؤں گی۔ بتانا ہی نہیں چاہتی، اس لیے پوچھیں بھی نہیں۔" مجھے اس سے کوئی غرض بھی نہیں تھی۔ میں نے شریف زادی کو ساتھ لیا اور عدالت پہنچ گئے۔

وہاں نکاح ہو گیا تھا۔ اب وہ میری منکوحہ تھی۔ میں نے کسی کو خبر بھی نہ ہونے دی کہ یہ میری دوسری بیوی ہے۔ اب میرے معمولات یکسر بدل گئے تھے۔ دوپہر کا کھانا بھی میں گھر جا کر کھاتا، بلال کو پہلے بھیج دیتا وہ ہول سے کھا آتا تھا۔

بدھ تک تو خیریت گزری۔ اب ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا، جو میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ اب میں ایبٹ آباد جانے کا کیا کہوں گا؟ کیونکہ بیوی ساتھ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اب میں اسے اکیلا چھوڑ کر کیسے جاؤں؟

اس کا حل یہ نکالا کہ بلال سے کہا کہ وہ دکان اپنے وقت پر ہی بند کرے، میں ذرا جلدی جاؤں گا۔ تمہاری بھابی بھی ساتھ ہوگی، تاکہ روشنی روشنی میں گاؤں پہنچ جاؤں۔ اس طرح میں عصر کے وقت دکان سے رخصت ہو کر شریف زادی کے دودن کے کھانے کا بندوبست کیا اور گھر آ گیا، رات کو حسب معمول گھر کو تالا لگایا، شریف زادی اندر ہی قید تھی۔

اس بار بھی میں ہفتے کی صبح آنے کی بجائے رات کو ہی آ گیا تھا۔ روزمرہ کے معمولات یہی ہو گئے تھے۔

☆.....☆

اس عقد ثانی کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ میری دکان پر دو افراد آئے، یہ دونوں ہی میرے لیے اجنبی تھے، سلام کرنے کے بعد ایک بولا۔

"ہم لاہور سے آئے ہیں، ہمیں آپ سے کوئی بات کرنی ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے بلال کی جانب دیکھا۔ بلال سمجھ گیا کہ میری موجودگی میں بات نہیں کرنا چاہتے۔ وہ دکان کے دروازے تک جا پہنچا جہاں تک اسے ہماری آواز سنائی نہ دے۔

"بڑی مشکل سے پتا چلایا ہے آپ کا۔" ایک بولا "میرا نام سلیم الزماں ہے اور یہ فیاض ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ کی بیوی ہماری سالی ہے۔ وہ اپنی بھابیوں سے ناراض ہو کر آگئی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ غلط باتوں میں پڑنے کی بجائے وہ آپ کے پاس آگئی ہے اور آپ نے اس سے نکاح کر کے عزت دی ہے، اگر مناسب سمجھیں تو ہمیں اس سے ملوادیں، ہم اس سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔"

شریف زادی نے بتایا تھا کہ لاہور میں اس کی دو بہنیں رہتی ہیں۔ وہ ان کے پاس بھی نہیں جانا چاہتی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میری بیوی کے کسی رشتہ دار سے رابطہ ہوا۔

میں انہیں لے کر گھر آ گیا۔ ان سے مل کر شریف زادی نے کوئی خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا، جبکہ وہ دونوں اسے پا کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ اس چھوٹے سے کمرے میں ہم چار افراد تھے۔ چار پائی پر ہم تینوں مرد بیٹھے تھے اور سائے تپائی پر شریف زادی کھڑی ہوئی تھی۔

وہ اس سے گلہ کر رہے تھے کہ اسے یوں نہیں آنا چاہیے تھا، یہ اچھی بات نہیں ہے۔ ہمیں اپنا سمجھ کر ہم سے اپنا مسئلہ کہا ہوتا، وغیرہ وغیرہ۔

میں انہیں پونہی باتیں کرتا چھوڑ کر بازار گیا۔ ان کی خاطر مدارات کے لیے کچھ بسکٹ وغیرہ لیے، چائے کا سامان لیا، شریف زادی نے چائے بنا لی، ہم سب نے پی۔ میں نے کہا کہ "آپ لوگ بیٹھیں باتیں کریں میں دکان پر جا رہا ہوں۔ دوپہر کے کھانے پر بات چیت کی جائے گی۔"

وہ بولے "نہیں ہمارے پاس بھی وقت نہیں ہے ہم جا کر اس کی بہنوں کو خوش خبری سناتے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوں گی اور جب انہیں معلوم ہوگا کہ ایک شریف انفس شخص نے اس سے نکاح کر لیا ہے تو اور بھی خوش ہوں گی۔"

میں انہیں اصرار با تکرار روکتا رہا، لیکن وہ جلد ہی رخصت ہو گئے۔

"انہیں گھر نہیں لانا چاہیے تھا" ان کے جانے کے بعد شریف زادی بولی۔

"کیوں بھی؟ تمہارے رشتے دار ہیں، کیوں نہ گھر میں لاتا؟"

"میں اب اپنے کسی رشتے دار سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتی۔ آج یہ ہمارے گھر آئے ہیں تو کل ہمیں بھی جانا پڑے گا۔ آج یہ آئے ہیں تو کل کسی اور کو پتا تھیں گے۔"

آپ کا پتا تلاش کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس لیے کہتی ہوں، میرا کوئی بھی رشتے دار آئے تو اسے گھر لانے کی بجائے دکان سے ہی رخصت کر دیں۔"

دن حسب معمول گزرتے رہے، میرے عقد ثانی کو یہ دوسرا مہینہ پورا ہونے کو تھا۔

ایک دن صبح ہی صبح شریف زادی کا ایک بہنوئی فیاض آیا، اس کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ فیاض بولا "آپ کے گھر جانا ہے۔ یہ شریف زادی کی بڑی بہنیں ہیں، اس سے ملنا چاہتی ہیں۔"

میں مجبور ہو گیا، یہ ہمت ہی نہ ہو سکی کہ انہیں دکان سے ہی چائے بسکٹ کھلا پلا کر رخصت کر دیتا۔ ان کے ساتھ عورتیں اور وہ بھی میری سالیاں نہ ہوتیں تو شاید میں ایسا کر بھی ڈالتا۔ ناچار میں انہیں گھر لے آیا۔

شریف زادی کے رویے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے میری یہ حرکت بے حد ناگوار گزری ہے۔

طوعاً و کرہاً اس نے انہیں برداشت کیا، لیکن ان کے رخصت ہونے کے بعد وہ مجھ سے خفا خفا ہو گئی، میں نے منانے کی کوشش کی تو بولی "میں نے کہا تھا کہ میرے ان رشتے داروں کو منہ نہ لگائیں۔ ان سے رکھائی سے پیش آئیں، آپ انہیں پھر گھر لے آتے ہیں۔"

"میں کیا کرتا؟ وہ تمہاری بہنیں ہیں۔ لاہور سے اتنا لمبا سفر کر کے آئی ہیں، صرف تم سے ملنے! انہیں دکان سے ہی کیسے ٹھلا دیتا۔ خود ہی سوچو!"

"بہر حال آئندہ کوئی بھی میرا رشتے دار آئے تو اسے گھر لانے سے پہلے مجھے ضرور بتائیں۔ میں ان سے ملنا چاہوں گی تو گھر میں لائیں، ورنہ صاف انکار کر دیں۔ میرا ان رشتے داروں نے بہت جی جلایا ہے، میں ان سے سخت بیزار ہوں۔"

میں نے وعدہ کر لیا کہ آئندہ ایسا ہی ہوگا، اسے بتائے بغیر اس کا کوئی رشتے دار گھر پر نہیں لاؤں گا۔

ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ سلیم الزماں اور فیاض دونوں آئے، ان کے ہاتھ میں کچھ تحائف بھی تھے۔ ایک بولا "یہ ہمیں آپ کی سالیوں نے تحفہ دیا ہے، ہمارے عزیزوں میں شادی ہے آپ دونوں کو دعوت ہے، اگلے جمعہ کو شادی ہوگی۔ آپ لوگ اول تو ابھی چلیں ہمارے ساتھ، وگرنہ بدھ کے دن لازمی پہنچیں، تاکہ مہندی، مایوں وغیرہ میں بھی شرکت کر سکیں۔ ہم خود آئیں گے اور

بدھ کے دن آپ دونوں کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے تاکہ آپ کو انجان راستوں کی پریشانی نہ ہو۔"

اب مجھے پھر مسئلہ درپیش ہوا، واقعی شریف زادی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی، اگر آج وہ ہمارے گھر آئے ہیں تو کل ہمیں بھی جانا پڑے گا۔ غنیمت ہوا کہ انہوں نے گھر تک جانے اور شریف زادی سے ملاقات کا کہا بھی نہیں، میں نے رسماً بھی انہیں گھر آنے کی دعوت نہیں دی۔ بلال کو بھیج کر دکان پر ہی چائے سمو سے منکوا لیے تھے۔ وہ رخصت ہوئے تو میں اسی وقت وہ تحفے لے کر گھر پہنچا۔

شریف زادی نے دیکھا تو پھر ناراضی کا اظہار کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ "اسی لیے میں کہہ رہی تھی کہ میرے رشتے داروں کو گھر تک آنے کی مہلت ہی نہ دیں۔"

تحفے کے پیکٹ کھول کر دیکھے تو وہ قیمتی لباس ثابت ہوئے وہ بجائے خوش ہونے کے بولی "اب یہ تحفہ وصول کر لیا ہے تو کچھ دینا بھی پڑے گا؟"

"ہاں تو کیا ہوا؟ دس دیں گے، کوئی کمی ہے ہمارے پاس؟" "ایسا ہے تو آپ چلے جائے گا۔ میں بتا دوں! میں نہیں جانا چاہتی، اپنے رشتے داروں میں۔"

میں نے سوچا کہ رشتہ داری تو رکھنا پڑے گی جانا ہی پڑے گا، یہ سوچ کر میں نے ایبٹ آباد فون کر دیا کہ اس ہفتے ایک دوست کی شادی ہے میں نہیں آسکوں گا، دوسری جانب میں نے اندر ہی اندر تیاری کر لی تھی۔ بلال سے بھی کہہ دیا تھا کہ میرے عزیزوں میں شادی ہے، شاید مجھے بدھ کے دن جانا پڑے۔

☆.....☆

بدھ کے دن وہ دونوں ہی آ گئے۔ میں انہیں دکان پر بٹھا کر کسی کام کا کہہ کر گھر گیا۔ شریف زادی کو سمجھایا کہ "یہ عزت کی بات ہے کہ وہ ہمیں خود لینے آئے ہیں، چلو تیار ہو جاؤ۔" لیکن وہ کسی صورت نہ مانی۔ یہی کہتی رہی کہ "مجھے شوق ہے شادی میں شرکت کا تو میں اکیلا ہی چلا جاؤں۔ اسے مجبور نہ کروں۔"

"دیکھو ارشتے دار تمہارے ہیں اور تم ہی انکار کر دو گی تو مجھے وہاں کون پہچانے گا؟ تمہاری وجہ سے تو مجھے بھی دعوت دے رہے ہیں ورنہ مجھے کون پہچانتا ہے؟"

"میرا ایک ہی فیصلہ ہے کہ میں اپنے رشتے داروں میں نہیں جاؤں گی" وہ اٹل لہجے میں بولی۔ "مجھے روکنا بھی

آپ کی ذمہ داری ہے، آپ کہہ دیں کہ میں اسے اجازت نہیں دیتا۔

”کیسی بات کر رہی ہو؟ دعوت قبول کرنا تو سنت ہے، میں کیسے منع کر دوں؟“

”میری خاطر منع کر دیں، یہ سوچ کر منع کر دیں کہ میں مگنی تو واپس نہیں آسکوں گی۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے شادی پر جا رہے ہیں کوئی ہمیشہ کے لیے تو نہیں جا رہے؟“ میں نے کہا۔

”آپ نہیں سمجھیں گے اس بات کو۔“

”تم تجھنے کی کوشش کرو، وہ دونوں دکان پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ بڑی معیوب سی بات ہے کہ میں تمہارے رشتے داروں کو گھرانے کی بجائے دکان میں بٹھائے رکھوں۔“

”آپ تو پتا نہیں کیا ہیں، آپ کو فیصلہ کرنا بھی نہیں آتا!“ وہ مجھے سمجھانے لگی۔ ”یوں کریں آپ انہیں گھر لائیں اور ان سے رکھائی سے پیش آئیں، میرے بارے میں صاف صاف کہہ دیں کہ اس نے یہ کہہ کر مجھ سے شادی کی تھی کہ میں اپنے رشتے داروں سے نہیں ملوں گی، اس لیے میری اجازت نہیں ہے کہ یہ اپنے رشتے داروں میں جائے۔ اگر یہ میری اجازت کے بغیر اس گھر سے قدم باہر نکالے گی تو اس پر تین طلاق۔“

”شریف زادی! ہوش میں ہوتی؟ یہ کیا کہہ رہی ہو۔“

میں لرز کر رہ گیا۔

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں، آپ انہیں بلا کر اسی طرح کہیں۔ انہیں میری بھلائی منظور ہوئی تو خاموشی سے چلے جائیں گے، اگر نہیں تو پھر مجھے اور آپ کو ساتھ لے جانے پر اصرار کریں گے۔ کمال ہے! رشتے دار میرے ہیں، میں ان کی اتنی فکر نہیں کر رہی تو آپ کو کیوں اتنی فکر ہے؟“

میں خاموش ہو گیا میں نے سوچا کہ واقعی جب وہ اپنے رشتے داروں میں خود ہی نہیں جانا چاہتی تو میں کیوں اصرار کر رہا ہوں؟

میں فیاض اور سلیم الزماں کو اپنے گھر لے آیا، ان کی خاطر مدارات بھی نہیں کی انہیں چائے پانی کا پوچھا تک نہیں! گھر پہنچتے ہی میں نے اپنا رویہ بدلا اور بولا

”سلیم صاحب! میں نے اس عورت کو بالکل بے سہارا سمجھ کر سہارا دیا ہے۔ شادی سے پہلے اس نے کہا تھا کہ وہ کبھی بھی اپنے کسی رشتے دار کے گھر نہیں جائے گی اور نہ ہی ان

سے ملے گی۔ اس کے بقول یہ اپنے رشتے داروں سے بیزار ہے، اگر یہ اپنی بہنوں کے گھر بھی جائے گی تو وہاں ایسے لوگ بھی ہوں گے جن سے یہ نہیں ملنا چاہتی بلکہ ان کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ آپ ایک بار آئے، میں کچھ نہ بولا، آپ کو عزت دی دوسری بار اس کی ہمیں آئیں، میں نے انہیں بھی عزت دی کہ گھر آئے مہمان سے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟

آپ تیسری بار آئے تھے تحائف لے کر آئے۔ ہمیں دعوت بھی دی اپنے گھر آنے کی اور آج ہمیں لینے بھی آگئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے یہ بات قطعی پسند نہیں ہے کہ میں اپنا کاروبار چھوڑ کر کہیں جاؤں۔ میری رشتے داری ویسے ہی بہت ہے وہاں جانا مشکل ہو جاتا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ شریف زادی نے جیسا کہا تھا کہ میں اپنے کسی رشتے دار سے نہیں ملوں گی تو اسے اپنے وعدے کا پاس کرنا ہوگا۔ آپ لوگ آکر اس سے مل لیں، وہ بات الگ تھی، لیکن یہ خود جا کر اپنے کسی رشتے دار سے نہیں ملے گی، اس کی میں اجازت نہیں دے سکتا، اگر یہ میری اجازت کے بغیر اس گھر سے قدم باہر نکالے گی تو اس پر تین طلاق۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ وہ ہکا بکا ہو کر کھڑے ہو گئے

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“

”آپ ٹھیک نہیں کہہ رہے، آپ اپنے حواس میں نہیں ہیں۔“ سلیم بولا۔

”میں بالکل ہوش و حواس میں ہوں اور آپ لوگوں کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ شریف زادی میری اجازت کے بغیر اس گھر سے باہر قدم نکالے گی تو اس پر تین طلاق۔“

وہ کھڑے ہوئے تو تجھے ہی، بغیر سلام کیے چلے گئے۔

شریف زادی کے چہرے پر طمانیت پھیل گئی تھی ”اب یہ کبھی بھی نہیں آئیں گے نہ ہی کسی کو آپ کا پتا بتائیں گے۔ یہی میں کہہ رہی تھی کہ خود میں جرأت پیدا کریں۔ خواہ مخواہ آپ نے انہیں ڈھیل دے رکھی تھی“ میں دکان پر چلا گیا۔

☆.....☆

اگلی صبح میں سوکر اٹھا تو شریف زادی بستر پر نہیں تھی، میں سمجھا کہ وہ بیت الخلا میں ہوگی، چار پانی پر پیر لٹکا کر کچھ دیر انتظار کیا۔ فجر کی نماز کا وقت جا رہا تھا اور شریف زادی بیت الخلا سے نکل ہی نہیں پاری تھی، قریب پڑی تپانی پر یہ شدہ ایک کاغذ نظر آیا۔ اس کے اوپر پانی کا خالی گلاس سیدھا رکھا ہوا تھا۔ میں نے بے خیالی میں ہی وہ کاغذ اٹھا لیا۔ پڑھنا

شروع کیا تو میرے پیروں تلے سے زمین کھسکتی چلی گئی۔

شریف زادی نے ہی لکھا تھا۔

”پیارے!“

میں تمہارے قریب ہی رہتی ہوں اسی محلے میں ہی، تم مجھے نہیں جانتے لیکن میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتی تھی اور اب کچھ دن ساتھ رہ کر مجھے یقین ہو گیا کہ تم میری توقع سے بھی زیادہ شریف النفس ہو۔ سچ کہتی ہوں اگر تم شادی شدہ نہ ہوتے تو میں ساری زندگی تمہارے ساتھ گزار دیتی۔

بات یہ ہے کہ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔ میرا ایک پیارا سا بچہ بھی ہے، میں جب تک تمہارے گھر ہی اپنے بچے سے دور رہی۔ اب میں اپنے بچے سے ملنے جا رہی ہوں۔

میں اپنی ماں کے گھر گئی ہوئی تھی۔ میرا شوہر مجھ سے بے حد محبت کرتا ہے وہ مجھے لینے گیا تو میں نے کچھ دن اور رکنے کی فرمائش کی وہ نہ مانا اور مجھے ساتھ لانے پر اصرار کرنے لگا۔

میرے بہنوئی اور بہنوں نے بھی اسے کہا لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ بس میرے شوہر نے اس ذرا سی بات پر مجھے طلاق دے دی تھی اور فوراً ہی پچھتاہوا تھا، اس وقت ہمارے گھر کے یہی افراد تھے، جو تم سے ملے اور یہی گواہ ہیں میری طلاق کے۔

مجھے طلاق ہوئی تھی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے ان سب سے کہا کہ یہ بات کسی سے نہ کہیں میں خود سنبھال لوں گی۔ اپنا گھر اجڑنے نہیں دوں گی، اپنے بیٹے کو رکنے نہیں دوں گی۔ شریعت کی رو سے کوئی دوسرا شخص مجھ سے نکاح کر کے طلاق دیتا تو اس کے بعد ہی میں اپنے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کر سکتی تھی۔ اپنے حسن پر مجھے اتنا ہی ناز ہے کہ کوئی بھی شخص مجھ سے نکاح کر کے طلاق نہیں دے سکتا تھا، میری نظر انتخاب تم پر پڑی، میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھ سے نکاح کیا، کم لوگوں کو گواہ بنایا، میرے دو بہنوئیوں کے سامنے مجھے طلاق بھی دے دی، میں تمہاری اجازت کے بغیر تمہارے گھر سے، تمہاری زندگی سے نکل آئی ہوں۔ مجھ پر تمہاری دی ہوئی تینوں طلاقیں لاگو ہو گئی ہیں۔ اب میں عدت گزار کر اپنے سابقہ شوہر کے گھر دوبارہ جا سکوں گی۔ جو اخراجات تم نے مجھ پر کیے وہ میرا شوہر، میرے بچے کا باپ تمہیں لوٹا دے گا یا میں خود عدت گزار کر تمہاری دکان میں آکر دے جاؤں گی۔

اور ہاں! میرا اصل نام شریف زادی ہی ہے، لیکن تمہارے محلے میں مجھے کسی اور عرفیت سے پہچانا جاتا ہے، میں نے کوشش کی تھی کہ تمہاری عزت بھی قائم رہے اور میرا کام بھی

☆.....☆

ہو جائے۔ تمہارے ساتھ گزارا ہوا میرا وقت کم سے کم لوگوں کو معلوم ہو اور کسی کو خبر نہ ہونے پائے کہ میں نے تم سے حلالہ نکلوایا ہے۔ شکر یہ میرے معیار پر پورا اترنے کا۔

والسلام۔ شریف زادی

☆.....☆

میرے لیے جمعہ کا وہ دن گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے گھر بھی اطلاع دے دی تھی کہ میں شادی کی وجہ سے نہیں آؤں گا، دکان بھی بند، گھر پر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اسلام آباد چلا گیا اور رات گئے واپس آیا۔

اس واقعہ کے تین یا چار مہینے گزرے تھے۔ میں ظہر کی نماز پڑھ کر آیا تو بلال نے ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا ”کوئی خاتون یہ دے گئی ہیں۔“

لفافہ کھولا تو اس کے اندر رقم تھی پتا نہیں کتنی تھی۔ اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ میں نے رقم بلال کو دے دی اور خط خود سنبھال لیا۔ بلال حیرت سے مجھے دیکھتا رہ گیا میں نے اشارے سے کہا کہ وہ پیش کرے۔ میں نے جاہا کہ اس خط کو گھر جا کر تسلی سے پڑھوں گا، یہ تو سمجھ آگئی تھی کہ یہ شریف زادی ہی تھی جسے معلوم تھا کہ میں اس وقت دکان پر نہیں ہوتا۔

اس نے وہ قیمت چکانی تھی جو میں نے اس پر خرچ کی تھی اور میری دانست میں یہ رقم میرے لیے حلال نہیں تھی۔ بلال کے سامنے خط پڑھنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ میرے چہرے کے تاثرات سے کوئی نتیجہ اخذ کر سکتا تھا۔ میں نے اس خط کا مطالعہ رات تک کے لیے مؤخر کر دیا۔

رات کا انتظار نہ کر سکا، بلال کسی کام سے دکان سے باہر نکلا تو میں نے خط نکال کر پڑھ لیا۔ لکھا تھا۔

”پیارے!“

تمہاری خرچ کی ہوئی رقم لوٹا رہی ہوں۔ سابقہ شوہر سے میرا نکاح فی الحال نہیں ہو سکتا کہ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ یہ فیصلہ میرا شوہر ہی کرے گا کہ وہ اس بچے کو ”میرا بچہ“ سمجھ کر پرورش کرے یا تمہارا بچہ سمجھ کر تمہارے حوالے کر دے، اگر میرے شوہر نے وہ بچہ رکھنے سے انکار کر دیا تو میں تمہارے حوالے کر جاؤں گی۔ اس کے لیے تیار رہنا۔ خدا حافظ! والسلام شریف زادی۔“

اب مجھے انتظار ہے کہ کب میرا بچہ مجھے ملتا ہے، میرا مطلب ہے کہ ”شریف زادی کا بچہ“

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

خواہشات نا آسودہ

کرن شیر

مایوس زندگی میں رنگ بھرتی ایک اچھوتی سچ بیانی

شوہروں کے ہاتھوں بنتی تھیں، لیکن صبح تک سب کچھ بھول بھال کر وہ پھر شوہر اور بچوں کی خدمت میں لگ جاتی تھیں۔ جب بات زیادہ بڑھی تو میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور اماں سے کہا۔ ”اماں! آپ ہی خاموش ہو جائیں۔“

”ہاں، تو بھی مجھے ہی چپ کرا۔ سب کا زور مجھ ہی پر چلتا ہے۔“ اماں نے کہا۔ ابانے جیب سے مڑا ترا پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اماں کو دینے کے بجائے مجھے دیتے ہوئے بولے۔

”صائمہ بیٹی! یہ پیسے رکھ لے، ان سے دال، چاول اور گھی لے آنا۔“

”اگر یہ پہلے ہی دے دیتے تو.....“

”بس خاموش ہو جا!“ ابانے ورشت لہجے میں

اماں کی بات کاٹ دی اور کہا۔

”تو تو پیسے بھی یوں مانگتی ہے جیسے قرضہ وصول کر رہی ہو، بس مجھے غصہ آ جاتا ہے۔“ یہ کہہ کر ابالپک چھپک گھر سے نکل گئے۔

اماں نے ایک مرتبہ پھر بڑ بڑانا شروع کیا تھا کہ میں نے جلدی سے کہا۔ ”اماں! دال چاول کے ساتھ تھوڑا سا اجار بھی لے آؤں؟“

”بیٹی! ان پانچ روپے میں کیا کیا آ جائے گا؟“

میری آنکھ کھلی تو ابابری طرح اماں پر چیخ رہے تھے، اماں آنسو بہا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ان کی زبان بھی چل رہی تھی۔ ”روز روز کے مرنے سے تو اچھا ہے کہ تم ہمیں ایک ہی دفعہ قتل کر دو۔“

”ایک دن یہی ہوگا زینت!“ ابانے چیخ کر کہا: ”اگر تیری زبان اسی طرح چلتی رہی تو میں تم تینوں کو مار کے خود کو بھی مار لوں گا۔“

”تو پھر مار کیوں نہیں دیتے؟ گھر کے خرچے کے لیے، تم سے پیسے نہیں مانگوں گی تو کیا باہر بھیک مانگوں گی؟“ اماں نے ترخ کر کہا۔ ”میری تو زندگی عذاب ہو گئی ہے۔ اماں یاد آنے نہ جانے کیا سوچ کر میری شادی تمہارے ساتھ کی تھی؟“

”ہاں، تیرے لیے تو کوئی شہزادہ آنے والا تھا نا؟“ ابانے طنز یہ لہجے میں کہا: ”مجھے اسے حسن پر بہت ناز تھا، مجھتی تھی کہ میں کسی گھر کی رانی بنوں گی۔“

روز کا یہی معمول تھا، بھی بات صرف تو تو، میں میں تک محدود رہتی تو، بھی اس حد تک بڑھ جاتی کہ ابابہت بری طرح چیخنے لگتے، لیکن مجھے حیرت ہوئی تھی کہ ابانے بھی اماں پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ ہم جس پس ماندہ آبادی میں رہتے تھے، وہاں کی عورتیں تو آئے دن اپنے

ہونے کی نوبت آتی، اس کے باوجود وہ کچھ نہ کچھ بچا ہی لیتی تھیں جو بے کاری کے دنوں میں کام آتا تھا۔

اتنی غربت اور تنگ دستی کے باوجود ابامجھے اور بلال کو بڑھا رہے تھے، میں ان دنوں تیسری جماعت میں پڑھتی تھی اور بلال پہلی میں تھا۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اباکاتعلق ایک کھاتے پیتے خاندان سے تھا۔ انہوں نے آٹھویں تک تعلیم بھی حاصل کی تھی، پھر ہمارے دادا کا

تو پہلے ضروری چیزیں لے لیتا پھر جو پیسے بچیں، وہ مجھے دے دیتا۔“

اب سے تیس سال پہلے پانچ روپے بھی بہت ہوتے تھے، دال چاول اور گھی خریدنے کے بعد بھی کچھ نہ کچھ پیسے بچ ہی جاتے تھے۔ میں نے تو اماں کا دھیان بنانے کو یہ تذکرہ کیا تھا، ورنہ اچار سے مجھے بھی کوئی دل چسپی نہیں تھی۔



اشتغال ہو گیا تو بھائیوں اور بھائیوں نے اباکو گھر سے نکال دیا۔ ابابہت چھوٹی عمر میں محنت مزدوری کرنے لگے۔ آٹھویں پاس لڑکے کو بھلا کہاں ملازمت ملتی۔

ابا بتاتے تھے کہ جس راج نے کبھی ان کا گھر بنایا تھا، وہ ایک دن ابا کو مل گیا۔ ابا کی حالت دیکھ کر اسے بہت

ابا راج کا کام کرتے تھے، بھی تو وہ دودھ مینے کام کرتے رہتے، کبھی پورا پورا مہینا بے کاری میں گزر جاتا۔

بقول اباکے ”یہ تو ہوائی روزی سے ملی ملی، نہ ملی نہ ملی، اس لیے کہتا ہوں ہاتھ روک کر خرچ کیا کرو؟“

اماں بے چاری ہاتھ تو جب روکتیں، جب ہاتھ کھلا

افسوس ہوا، وہ ابا کو اپنے ساتھ لے گیا، اس نے ابا کو راج مستری کا کام سکھایا، پھر بعد میں اپنی بیٹی سے شادی کر دی۔ وہ راج مستری میرے نانا تھے۔ میں نے بہت بچپن میں انہیں دیکھا تھا، بہت محبت کرنے والے شفیق انسان تھے۔

☆.....☆

ابا کی رگوں میں شریف اور اعلیٰ خاندان کا خون تھا۔ اس لیے نہ تو میں نے بھی ان کے منہ سے گالی سنی تھی، نہ بھی انہوں نے اماں پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اب حالات برتو کسی کا بھی بس نہیں چلکا۔ وہ بے چارے اپنی سی تو ہر ممکن کوشش کرتے تھے، لیکن افلاس اور غربت تھی کہ ہمارا پیچھا ہی نہیں چھوڑتی تھی۔

مجھے اپنی بے بسی پر رونا آتا تھا، میں نے اماں کو ایک ایک پیسے کے لیے سسکتے اور ترستے دیکھا تھا۔ اس لیے اب پیسائی میری ترجیح بن گیا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ میٹرک کرنے کے بعد میں ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھ کر کہیں ملازمت کر لوں گی اور اپنی تمام نہیں تو کم سے کم کچھ خواہشات تو پوری کر ہی لوں گی۔

ہمارے گھر میں ہر طرف غربت و افلاس کے ڈیرے تھے، نہ کھانے کو اچھا ملتا تھا نہ پینے کو، اس کے باوجود میں انتہائی پرکشش اور حسین تھی۔ اس کا احساس مجھے اکثر میری اسکول کی سہیلیاں اور محلے کے لڑکوں کی نظروں سے ہوتا تھا، لیکن میرے نزدیک اس وقت اپنے حسن کی کوئی اہمیت نہیں تھی، پیسے کی طلب اور خواہش سب سے بڑھ کر تھی۔

میں ان دنوں آٹھویں جماعت میں پڑھ رہی تھی، بقول خالہ سعیدہ کہ ”صائمہ نے تو ایسا رنگ روپ نکالا ہے کہ بس دیکھو تو دیکھتے ہی رہ جاؤ۔“

خالہ سعیدہ ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں اور اماں کی بہترین سہیلی تھیں۔

وہ اکثر اماں سے کہتی تھیں۔ ”زینت! اب تم صائمہ کی شادی میں دیر مت کرو، مجھے تو اس کے حسن اور خوب صورتی سے خوف آنے لگا ہے۔“

ان کا یہ جملہ سن کر مجھے بہت حیرانی ہوتی تھی، بھلا حسن اور خوب صورتی سے بھی کوئی خوف کھاتا ہے؟ میں

نے تو کہانیوں میں بھی یہی پڑھا تھا کہ بد صورت اور خوف ناک چہروں کو دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔ خالہ سعیدہ کو میری خوب صورتی سے کیوں خوف آتا ہے؟ ان کی اس بات کا مطلب تو بہت بعد میں میری سمجھ میں آیا۔

اس دن میرا زلٹ پکلا تھا اور میں آٹھویں پاس ہو کر اب نویں کلاس میں آئی تھی۔ بلال بھی ساتویں کلاس میں آ گیا تھا۔

میں خوش خوش گھر آئی اور ابا کا انتظار کرنے لگی، اماں کو تو ان خبروں سے کوئی خوشی نہیں ہوتی تھی، البتہ ابا بہت خوش ہوتے تھے۔

ابا شام ڈھلے گھر لوٹ آئے تھے لیکن اس دن انہوں نے بہت دیر کر دی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی تھی، میں بھاگ کر دروازے پر پہنچی کہ ابا آ گئے۔

دروازے پر ایک اجنبی کو کھڑا دیکھ کر میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”جی فرمائیے؟“

”مستری عبدالرحمن کا گھر یہی ہے نا؟“

”جی ہاں۔“ میں نے کہا۔

”بیٹا! تمہارے گھر میں کوئی بڑا ہے تو اسے بھیجو۔“

”اماں ہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا اور اماں کو جا کر بتایا کہ باہر کوئی آدمی آپ کو بلارہا ہے۔

اماں دروازے پر پہنچیں، میں بھی ان کے پیچھے پیچھے تھی۔

اس اجنبی نے امی سے کہا۔ ”میں ٹھیکے دار ہوں اور عبدالرحمن میرے ہی لیے کام کر رہا تھا۔ وہ کام کرتے ہوئے بہت بلندی سے نیچے گر گیا ہے، وہ اسپتال میں ہے تم چل کر دیکھ لو۔“ اماں کے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔

وہ گھبرا کر خالہ سعیدہ کے گھر کی طرف جانے لگیں تو ٹھیکے دار نے کچھ نوٹ اماں کی طرف بڑھادیے اور بولا۔

”ان پیسوں میں عبدالرحمن کی دیہاڑی کے علاوہ اس کے علاج کے لیے کچھ رقم بھی ہے۔“

میں بھاگ کر خالہ سعیدہ کو بلالائی۔ ان کے ساتھ خالو ابراہیم بھی آ گئے، وہ کسی سرکاری دفتر میں چر اسی تھے۔ انہوں نے ٹھیکے دار سے پوچھا۔ ”عبدالرحمن کس

اسپتال میں ہے؟“

”جناح اسپتال میں.....؟“ ٹھیکے دار نے جواب دیا۔

”ٹھیکے دار صاحب، اصولی طور پر تو آپ کو عبدالرحمن کے علاج معالجے کا تمام خرچ اٹھانا چاہیے۔“

”ہاں تو میں نے کب انکار کیا ہے؟“ ٹھیکے دار نے جلدی سے کہا۔ ”سارا خرچ میں ہی اٹھاؤں گا۔“

اماں اسی وقت خالہ سعیدہ اور خالو کے ساتھ اسپتال چلی گئیں۔

میں ان کے جانے کے بعد بلک بلک کر رونے لگی۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ مجھے ابا سے شدید محبت تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل صبح میں بھی اماں کے ساتھ اسپتال جاؤں گی۔

صبح ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی، ایک گھنٹے بعد اماں، خالہ سعیدہ اور خالو لوٹ آئے، وہ لوگ اپنے ساتھ ابا کو بھی لائے تھے، لیکن ابا اب کچھ کہنے سننے کے قابل نہیں رہے تھے۔ وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بے تھے۔

ذرا سی دیر میں ہمارے گھر میں کھرام مچ گیا۔ میں دھاڑیں مار مار کے رونے لگی۔ اماں تو پہلے ہی پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ ہمیں روتے دیکھ کر بلال بھی رونے لگا۔ محلے کی عورتیں ہمارے گھر میں جمع ہو گئیں اور وہ مجھے اور اماں کو تسلی دینے لگیں۔

اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ اس ٹھیکے دار نے ابا کے علاج کی ہامی اتنی آسانی سے کیسے بھری؟ وہ جانتا تھا کہ ابا اتنے شدید زخمی ہیں کہ اب نہیں بچیں گے، پھر جب زخمی رہے گا ہی نہیں تو اس کا علاج معالجہ کیسا؟

☆.....☆

ابا کی موت کے بعد تو غربت اور افلاس کے ساتھ ساتھ فاقے بھی ہمارے اس تنگ و تنگ گھر میں اتر آئے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ابا ہمارے لیے کتنا بڑا سہارا تھے۔ ان کی موجودگی میں ہم نے کبھی فاقے نہیں کیے تھے۔ روکھی سوکھی ہی سہی، وہ کم سے کم پیٹ بھر کے کھانا تو دیتے تھے۔

اب اماں بے چاری ہی کو کچھ کرنا تھا۔ ہماری اس بچی آبادی سے کچھ فاصلے پر بڑے بڑے بنگلے تھے، اماں کام کی تلاش میں ان ہی بنگلوں کی

طرف نکل گئیں۔

انہیں بنگلوں میں جھاڑو پونچھا اور کپڑے وغیرہ دھونے کا کام مل گیا۔

اماں نے مجھے اسکول سے اٹھالیا۔ وہ تو بلال کو بھی اٹھانا چاہتی تھیں، لیکن میں نے ہی اس کی مخالفت کی، یوں بلال اسکول میں پڑھتا رہا۔

گھر کی دال روٹی پھر کسی نہ کسی طرح چلنے لگی، بلکہ اب تو ہم کچھ اچھی غذا کھانے لگے۔ اماں بنگلوں میں کام کر کے لوٹنے لگتی تھیں تو کسی نہ کسی بنگلے سے انہیں روٹی سالن، کبھی بریانی اور کبھی کبھی مرغی بھی مل جاتی تھی۔ وہ بچا کچھا کھانا گھر لے آتی تھیں۔

اماں کے جانے کے بعد میں دن بھر گھر میں اکیلی رہتی تھی، میں نے اماں سے کہا۔ ”اماں! اس سے تو اچھا ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ کام کروں، اس سے آمدنی بڑھے گی تو میں بھی پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے تعلیم حاصل کر لوں گی۔“

اماں پہلے تو ہچکچائیں پھر مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر راضی ہو گئیں۔

کام پر جاتے ہوئے راستے میں انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”صائمہ! تو کئی گھروں میں کام کرنے کے بجائے صرف ایک ہی گھر میں کام کرنا، وہ گھرانا بہت اچھا ہے جہاں میں تجھے لے کر جا رہی ہوں۔ ایک بڑی بی ہیں اور ان کے دو بیٹے ہیں، بڑی بی کے شوہر کا دو سال پہلے انتقال ہو چکا ہے اور کاروبار اب بڑا بیٹا سنبھالتا ہے۔“

مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ کاروبار کون سنبھالتا ہے، مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ اب میں بھی چار پیسے کمانے لگوں گی۔

بڑی بی کا گھر کیا تھا محل تھا۔ بڑے بڑے کشادہ کمرے، ان میں بچے ہوئے دبیز اور خوب صورت قالین کے پاؤں رکھو تو اندر جنس جائیں، بہت بڑا لان، ہر کمرے میں ایئر کنڈیشنر، غرض دنیا کی ہر نعمت ان کے پاس تھی۔

بڑی بی انتہائی نرم دل اور شفیق تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ”کوئی اتنی امیر کیر عورت اتنی نیک بھی ہو سکتی ہے؟“

انہوں نے اماں سے کہا ”جوان اور اتنی خوب

صورت بنی کو لے کر یوں گھر گھر مت گھومو زینت! آج کل ماحول بہت خراب ہے۔ ویسے تو تمہیں اسے گھر سے لے کر کھانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں اسے پچاس روپے مہینہ کھانا اور کپڑے دے دوں گی۔

اماں کی تو باچھیں کل گئیں، انہوں نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔ ”آپ کی بہت مہربانی بیگم صاحبہ! آپ نے مجھے غریب پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔“

یوں میں اس گھر میں کام کرنے لگی۔ وہاں کام زیادہ نہیں تھا، گھر میں کل تین ہی تو افراد تھے، مجھے صرف جھاڑ پونچھ کرنا پڑتی تھی۔ کھانا پکانے کے لیے الگ سے ایک خانساں تھا۔ وہ ابا کی عمر کا ہوگا۔ وہ بھی میرا بہت خیال رکھتا تھا۔

میں صبح سویرے گھر پر آ جاتی۔ بیگم صاحبہ کے گھر ناشتا کرتی، پھر جھاڑ پونچھ میں مصروف ہو جاتی۔ صبح سے لے کر شام تک تو بڑی بی بالکل اکیلی ہوتی تھیں۔ ان کا بڑا بیٹا عام نو ساڑھے نو بجے تک دفتر چلا جاتا تھا، چھوٹا بیٹا باسرا نجینٹرنگ کالج میں پڑھ رہا تھا۔ وہ عام سے بھی پہلے نکل جاتا تھا۔

☆.....☆

دونوں لڑکے انتہائی نیک اور شریف تھے، اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ میری طرف تو ان دونوں نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

مجھے بھی کبھی اپنی توہین کا احساس ہوتا تھا کہ وہ دونوں کیسے مرد ہیں؟ کئی محلے میں تو لڑکے اور اچھے خاصے مرد بھی مجھے یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے تھے جیسے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں گھما جائیں گے۔

لوگوں کے اس رویے سے مجھے بھی اپنے حسن پر کچھ زیادہ ہی ناز ہو گیا تھا، لیکن یہ عام اور باسرا نہ جانے کس مٹی کے بنے ہوئے تھے کہ ان پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا تھا۔

بیگم صاحبہ کے گھر میں رہنے اور اچھا کھانے سے میرے حسن میں مزید نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے مجھے کئی اچھے اچھے جوڑے بھی بنوا دیے تھے۔

زندگی خاصی بر سکون ہو گئی تھی۔ بلال اب بہت دل لگا کر پڑھ رہا تھا۔ گھر میں اب پہلے جیسی غربت اور تنگ دستی نہیں تھی۔ ہر طرح سے سکون تھا، لیکن مجھے ابھی

تک سکون نہیں ملا تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ پیسا حاصل کرنا چاہتی تھی۔

میں نے ایک دن بیگم صاحبہ سے کہا۔ ”بیگم صاحبہ! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اپنی کتابیں بھی یہاں لے کر آیا کروں؟“

انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولیں ”تم پڑھتی ہو؟“

”جی ہاں، میں نے آٹھویں کلاس پاس کی ہے، اب سوچ رہی ہوں کہ پرائیویٹ طور پر میٹرک کر لوں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ بیگم صاحبہ خوش ہو کر بولیں۔ ”تم اپنی کتابیں شوق سے یہاں لاؤ، بلکہ اگر کوئی کتاب نہ ہو تو مجھے بتانا، میں منگوا دوں گی۔“

میں نے آٹھویں کلاس کا رزلٹ آنے سے پہلے ہی اپنے اسکول کی ایک لڑکی سے پرانا کورس خرید لیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اب مجھے اسکول آنا نصیب نہیں ہوگا۔ اس میں ایک دو کتابیں کم تھیں، میں نے بیگم صاحبہ سے کہا تو وہ بولیں ”تم ایسا کرو، علی شیر کے ساتھ چلی جاؤ اور تمہیں جو کچھ خریدنا ہے خرید لو۔“ انہوں نے مجھے سو روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

”لیکن یہ میسے.....“

”تمہاری تنخواہ میں سے نہیں کاٹوں گی، یہ تمہارا انعام ہے۔“ وہ مسکرا کر بولیں۔

علی شیر ان کا ڈرائیور تھا۔ وہ نوشہرہ کا رہنے والا تھا۔ لمبا ترنگ، سرخ سفید اور انتہائی وجیہ نوجوان تھا، میں نے اکثر اسے گاڑی کے پاس دیکھا تھا۔ عامر نے اسے بیگم صاحبہ کے لیے رکھا تھا کہ اگر انہیں کہیں جانے کی ضرورت ہو تو کسی قسم کی پریشانی نہیں۔

میں نے علی شیر کو نزدیک سے دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس نے بھی مجھے گہری نظروں سے دیکھا پھر میرے لیے گاڑی کا عین دروازہ کھول دیا۔

”کہاں جائیں گی آپ؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے کچھ کتابیں اور کاپیاں لینا ہیں۔“ میں نے کہا۔

علی شیر نے گردن ہلائی اور گاڑی کا انجن اشارت کر دیا۔ راستے بھر وہ مجھے غمتی آئینے میں دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا سحر تھا کہ میں ان میں ڈوبتی جا رہی

تھی۔ اس کی گردن پر نکھرے ہوئے بھورے بال انتہائی خوب صورت لگ رہے تھے۔

مارکیٹ پہنچ کر میں نے کتابیں اور کاپیاں خریدیں، ایک بین اور روشنائی بھی خریدی اور واپس گاڑی میں آ بیگی۔

”گرمی بہت ہے۔“ علی شیر نے کہا ”کچھ پیئیں گی آپ؟ شربت یا ٹھنڈی بوتل یا.....“

”ہاں پیاس تو مجھے بھی لگ رہی ہے لیکن.....“

”جلیے، میں آپ کو ٹھنڈی بوتل پلاتا ہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا اور گاڑی کو لڈ ڈرنک کی ایک دکان کے سامنے روک دی، وہاں سے وہ بھاگ کر دو ٹھنڈی بوتلیں لے آیا، مجھے بوتل دیتے ہوئے اس نے میری آنکھوں میں جھانکا تو میں بالکل ہی پھل گئی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ وہ آپ سے تم پر آ گیا۔

”میرا نام صائمہ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”صائمہ.....! بہت خوب صورت نام ہے، بالکل تمہاری طرح۔“

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، کسی مرد نے پہلی دفعہ میرے حسن کی تعریف کی تھی۔

میں نے جلدی جلدی بوتل ختم کی اور اس سے کہا۔

”اب واپس چلو، بیگم صاحبہ پریشان ہو رہی ہوں گی۔“

”ہمیں کچھ زیادہ ہی دیر ہوئی ہے۔“

میں واپس پہنچی تو بیگم صاحبہ واقعی پریشان تھیں، مجھے دیکھ کر انہوں نے سکون کا سانس لیا اور بولیں۔

”میری بھی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں کہ میں نے ڈرائیور کے ساتھ تمہیں اکیلا بھیج دیا۔ علی شیر قابل اعتبار لڑکا ہے، لیکن برا دقت کہہ کر نہیں آتا بیٹی!“

”علی شیر تو بہت شریف آدمی ہے بیگم صاحبہ!“ میں نے کہا۔

”ہاں، میں نے تمہارے لیے لاؤنج کی ایک الماری خالی کر دی ہے، تم اپنی کتابیں اور دوسرا سامان اس الماری میں رکھ دو۔“

☆.....☆

اب میں کام کے بعد پڑھنے بھی لگی، لیکن جب سے علی شیر سے ملاقات ہوئی تھی، میری راتوں کی نیند اڑ گئی تھی، علی شیر کا کوارٹر وہیں تھا۔ وہ زیادہ وقت اپنے کوارٹر ہی

میں رہتا تھا، صبح یاسر کو کالج چھوڑ کر آتا، پھر چھٹی کے وقت اسے لینے چلا جاتا یا پھر بیگم صاحبہ کو باہر کا کوئی کام ہوتا تو وہ خانساں کو اس کے ساتھ بھیج دیتی تھیں۔

میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ علی شیر سے ملاقات کروں، لیکن میری ہمت نہ پڑی۔

ایک دن میں کام پر آئی تو پیچھے سے کسی نے مجھے آواز دی۔ ”صائمہ!“

میں نے چونک کر دیکھا، وہ علی شیر تھا اور بظاہر گاڑی کی صفائی میں مصروف تھا۔

میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہاں اس کے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا۔ میں آہستگی سے اس کے پاس پہنچ گئی۔

”کیا بات ہے؟“

”تم تو پھر اس دن کے بعد ملیں ہی نہیں۔“ اس نے کہا۔

”میں کیسے مل سکتی ہوں علی شیر!“ میں نے کہا۔

”مجھے بیگم صاحبہ سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

”اچھا، آج تم جب چھٹی کے بعد گھر جاؤ گی تو میں تمہیں جنگلے کے باہر ملوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ پھر گاڑی چمکانے میں مصروف ہو گیا، میں تیزی سے اندر چلی گئی۔

میں بار بار خود سے یہی سوال کرتی رہی کہ آ خراب علی شیر مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟ مجھے اس سے نہیں ملنا چاہیے، لیکن پھر میں نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے دی کہ ایک دفعہ ملنے میں کیا حرج ہے؟

میں چھٹی کے بعد باہر نکلی تو علی شیر جنگلے سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا، وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور بولا۔

”صائمہ، میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے، مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے؟“

”کیسی باتیں کرتے ہو علی شیر!“ میں نے کہا۔

”اگر بیگم صاحبہ کو معلوم ہو گیا تو.....“

”تو کیا، وہ زیادہ سے زیادہ مجھے ملازمت سے نکال دیں گی نا؟“ علی شیر نے کہا۔ ”تو نکال دیں۔“

”وہ مجھے بھی گھر سے نکال دیں گی علی شیر!“ میں نے کہا۔

”میں بہت غریب لڑکی ہوں اور.....“

”صائمہ! بیگم صاحبہ کو کبھی معلوم نہیں ہوگا۔“ علی شیر نے کہا۔ ”اور کبھی معلوم ہو بھی گیا تو میں سارا الزام اپنے سر لے لوں گا۔“

اس دوران میں ہم گھرنیک پہنچ گئے تھے۔ میں نے علی شیر سے کہا۔ ”میرا گھر آ گیا ہے۔“
”تم کل مجھے ملو گی صائمہ؟“ علی شیر نے پوچھا۔
”کل کی کل دیکھی جائے گی۔“ میں نے شوخ لہجے میں کہا اور تیزی سے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔
پھر تو میں روز ہی علی شیر سے ملنے لگی، روزانہ کی یہ ملاقاتیں رنگ لائیں اور ہم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔

پھر ہم نے ملاقات کا ایک اور ذریعہ تلاش کر لیا، میں چھٹی کے بعد بنگلے سے نکلتی اور گھر جانے کے بجائے بنگلے کے عقبی گیٹ پر پہنچ جاتی، وہ دروازہ ہمیشہ بند ہی رہتا تھا، علی شیر اندر سے دروازہ کھول دیتا اور میں خاموشی سے اس کے کوارٹر میں چلی جاتی، پھر ڈھیروں باتیں کرتے۔ علی شیر اپنے گاؤں کی باتیں سنانا، ان پہاڑوں کی کہانیاں سنانا جن میں بھاگتے دوڑتے اس کا بچپن گزرا تھا۔

☆.....☆

میں اب پور پور اس کی محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے وہاں رہتے ہوئے نویں کا پرائیویٹ امتحان دیا اور اچھے نمبروں سے پاس ہو گئی۔ اس موقع پر پہلی دفعہ عامر نے مجھے بلایا۔ لاؤنج میں اس وقت بیگم صاحبہ اور یاسر بھی موجود تھے۔ عامر نے مجھے پانچ سو روپے دیتے ہوئے کہا۔
”صائمہ! یہ تمہاری محنت کا انعام ہے، اگر تم نے میٹرک بھی اچھے نمبروں سے پاس کر لیا تو میں تمہیں اپنے دفتر میں جاب دے دوں گا۔“

”بیٹا! یہ جوڑے اور کچھ چیزیں میری طرف سے۔“ بیگم صاحبہ نے کہا۔ ”ہاں، آج سے تمہاری تنخواہ بھی سو روپے ہو گئی ہے۔“
مارے خوشی کے میں رونے لگی، میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایک مشت پانچ سو روپے نہیں دیکھے تھے۔
”رو کیوں رہی ہو بیٹی!“ بیگم صاحبہ نے محبت بھرے انداز میں پوچھا۔

”بیگم صاحبہ! مجھے اپنے ابا یاد آ گئے تھے، آج اگر وہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے؟“
”تمہارا باپ واقعی بہت اچھا آدمی تھا صائمہ!“

بیگم صاحبہ نے کہا۔ ”ورنہ اتنی غربت اور تنگ دستی میں کون اپنی اولاد کو پڑھاتا ہے۔“
اس دن میں مارے خوشی کے علی شیر سے بھی نہیں ملی اور سیدھی گھر پہنچی۔

بیگم صاحبہ کے دیے ہوئے تحائف دیکھ کر اماں بھی خوشی سے نہال ہو گئیں، ان تحائف میں دو تین قیمتی جوڑے بھی تھے، بہت خوب صورت سینڈل بھی، ایک پین تھا، سونے کا چھوٹا سا ایک لاکٹ تھا اور ایک لفافے میں پانچ سو روپے تھے، مٹھائی کا ایک ڈبّا بھی تھا۔

میں نے جلدی سے مٹھائی کا ڈبّا کھولا اور مٹھائی کا ایک ٹکڑا نکال کر اماں کے منہ میں رکھ دیا۔ اماں کو میرے کپڑوں اور جوتوں سے زیادہ اس نقد رقم کی خوشی تھی جو لفافے میں سے نکلی تھی۔ پانچ سو روپے بھی اس وقت بہت بڑی رقم تھی، مجھے جو پانچ سو روپے عامر نے دیے تھے، میں نے اس کا تذکرہ اماں سے نہیں کیا تھا۔

رات کو میں نے وہ روپے خاموشی سے بلال کو دے دیے اور کہا۔ ”تم اپنے لیے اچھے سے دو چار جوڑے اور جوتے وغیرہ خرید لو، اماں کو مت بتانا۔“
زندگی ایک دم ہی خوب صورت ہو گئی تھی۔ گھر میں ڈھنگ کی چیزیں آ گئی تھیں، روپے پیسے کی بھی اب کوئی تنگی نہیں تھی۔ میں اور بلال دونوں پڑھ بھی رہے تھے۔

☆.....☆

مجھے بیگم صاحبہ کے بنگلے پر کام کرتے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ بیگم صاحبہ اب مجھ پر بہت اعتماد کرنے لگی تھیں۔ میں اب ایک طرح سے ان کی معتمد خاص تھی۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے سیف کھولنے کو کہا۔ میں نے سیف کھولا تو میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں، اس میں زیورات کے کئی سیٹ، چوڑیاں، لاکٹ اور کڑے وغیرہ تھے۔ اس کے علاوہ زیورات کے بہت سے ڈبّے بھی تھے۔ ان ہی ڈبّوں میں سے بیگم صاحبہ نے زیور کا ایک ڈبّا نکالا، اس میں بھی خاصا بھاری سیٹ تھا، وہ ڈبّا نکال کر انہوں نے سب بند کر دیا اور اس کی چابی اپنے کمر بند میں باندھ دی۔ وہ زیورات کا یہ سیٹ خانا یاں کو دینا چاہتی تھیں، کیوں کہ اس کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی۔

میں نے اس کا تذکرہ علی شیر سے کیا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے کہا۔
”صائمہ! اگر تم ہمت کرو تو وہ ساری دولت اور زیورات ہمارے ہو سکتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔
”بھئی مطلب صاف ہے۔“ اس نے کہا۔
”بڑی بی اتنا زیور اور سونا اپنے ساتھ قبر میں تو نہیں لے جائیں گی۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے دونوں بیٹے اسے بیچ ڈالیں گے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ.....“
”ہاں صائمہ!“ علی شیر نے میری بات کاٹ دی۔
”میرا یہی مطلب ہے، زیور لے کر ہم دونوں یہاں سے بہت دور چلے جائیں گے اور شادی کر لیں گے۔“
میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔
”اچھی طرح سوچ لو صائمہ! قسمت میں ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔“

میں اس وقت تو خاموشی سے گھر چلی آئی، لیکن میری آنکھوں میں ابھی تک تجوری ہی کا منظر تھا۔ اس وقت بھی ان زیورات کی قیمت لاکھوں میں ہوگی، اس دولت سے میرے تمام خوابوں کو تعبیر مل سکتی تھی، میری بہت سی خواہشات پوری ہو سکتی تھیں، میں جتنا اس پر غور کرتی گئی، میرا ارادہ اتنا ہی پختہ ہوتا گیا۔

انسان کے پاس لاکھوں روپے ہوں تو وہ ان سے جو چاہے خرید سکتا ہے، میں نے سوچا کہ ہم وہ زیورات لے کر ملک بھی چھوڑ دیں گے اور امریکا جا کر وہاں زندگی نئے سرے سے شروع کریں گے۔ ان دنوں امریکا جانا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا آج ہے، وہاں کا دیزا بہت آسانی سے مل جاتا تھا۔

اس کے دوسرے ہی دن ایک واقعہ اور ہوا، عامر دفتر سے واپسی پر آیا تو اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ اس نے وہ بریف کیس بیگم صاحبہ کے حوالے کر دیا اور بولا۔
”ای! مجھے ایک پارٹی کو بے منت کرنا تھی، لیکن ان کا آدمی پرسوں آئے گا۔ میں نے بینک سے رقم نکال لی تھی اس لیے اسے گھر لے آیا، اسے آپ احتیاط سے سیف میں رکھو ادیس“ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

بیگم صاحبہ نے مجھے آواز دی اور بولیں۔ ”صائمہ! یہ بیگم ذرا سیف میں رکھ دو۔“ انہوں نے اپنے کمر بند سے چابیوں کا گچھا نکال کر میرے حوالے کر دیا۔

میں نے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پایا اور سیف کھول کر بریف کیس اس کے نچلے خانے میں رکھ دیا، پھر سیف بند کر کے اس کی چابی بیگم صاحبہ کو لوٹا دی۔
میں گھر جانے سے پہلے علی شیر سے ملی تو نقد رقم کا سن کر تو وہ پاگل ہی ہو گیا۔

”صائمہ! اب تو تمہیں ہمت کرنا ہی ہوگی، دیکھ نقد یہ بھی زندگی میں صرف ایک موقع دیتی ہے، اگر یہ موقع گنوا دیا جائے تو پھر زندگی بھر کچھ ہاتھ نہیں آتا ہے۔“
”لیکن علی شیر.....“

”ذرا سوچو صائمہ!“ ہمارے پاس بھی اتنی ہی دولت ہوگی جتنی بیگم صاحبہ کے پاس ہے، ہمارے پاس بھی بہترین گاڑی اور بنگلہ ہوگا، ہمارے بچے بھی شہر کے بہترین اسکولوں میں پڑھیں گے۔ بیگم صاحبہ کو زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ ان کا نقصان تو سال بھر میں پورا ہو جائے گا۔“

”میری ایک شرط ہے علی شیر!“ میں نے کہا۔ ”ہم پھر اس ملک میں نہیں رہیں گے، پکڑے جانے کی صورت میں بیگم صاحبہ سے نظریں نہیں ملا سکیں گی میں۔“
”ارے یہی تو میں بھی چاہتا ہوں جان!“ علی شیر پر جوش لہجے میں بولا۔ ”ہم اس وقت تک کہیں چھپے رہیں گے جب تک ہمارے پاسپورٹ وغیرہ کا بندوبست نہیں ہو جاتا، لائنڈی مل ایریا کے علاقے میں میرا ایک دوست رہتا ہے، ہم کچھ دن اپنے گھر میں رہیں گے پھر ملک سے فرار ہو جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے، کل صبح عامر اور یاسر کے جانے کے بعد میں کسی نہ کسی بہانے سے بیگم صاحبہ سے تجوری کی چابیاں لے لوں گی، تم سامنے ہی موجود رہنا، میں تمہیں اشارہ کر دوں گی، تم فوراً اندر آ جانا۔“
علی شیر کے ساتھ پورا منصوبہ طے کرنے کے بعد میں گھر آ گئی۔

رات بھر بے چینی کے باعث مجھے نیند نہیں آئی، میرا ضمیر بار بار مجھے ملامت کر رہا تھا کہ جس گھر سے مجھے اتنی محبت ملی ہے، میں اس گھر کو اجاڑنے جا رہی ہوں۔

بیگم صاحبہ مجھے بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھتی ہیں، میں ان کے اعتماد کا خون کرنے جا رہی ہوں، لیکن دولت کی ہوس اور علی شیر کی محبت، ان سب خیالات پر غالب آئی اور میں نے علی شیر کے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆.....☆

میں ان دنوں میٹرک کا امتحان دے چکی تھی اور رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی۔

میں بنگلے پرناشتا کرنے کے بعد کام میں معروف ہو گئی۔ بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا۔ ”صائمہ بیٹا! رات کو عام کر رہا تھا کہ صائمہ میٹرک کرے تو میں اسے اپنی فرم میں ملازمت دے دوں گا، مجھے امید ہے کہ تم وہاں بھی اسی محنت اور دیانت داری سے کام کرو گی۔“

”میں پوری کوشش کروں گی۔“ میں نے کہا اور برآمدے میں نکل آئی۔

مجھے گاڑی کے پاس علی شیر نظر آیا، وہ اشارے سے پوچھ رہا تھا کہ ”کیا ہوا؟“ میں نے اسے صبر کرنے کا اشارہ دیا اور اندر آ گئی۔

میں سوچ رہی تھی کہ چابی مانگنے کے لیے بیگم صاحبہ سے کیا بہانہ بناؤں؟

اچانک علی شیر اندر داخل ہوا اور اس کی آنکھوں میں اس وقت نہ جانے کیا تھا کہ میں خوف زدہ ہو گئی۔

”کیا بات ہے علی شیر؟“

بیگم صاحبہ نے پوچھا۔ ”کیا چھٹی چاہیے؟“

”جی بیگم صاحبہ! علی شیر نے کہا۔“ مجھے چھٹی بھی چاہیے اور تجوری کی چابیاں بھی۔“

”کیا مطلب.....؟“ بیگم صاحبہ نے تیوری جڑھا کر پوچھا۔

”بڑا بدمست کر بڑھیا؟“ علی شیر نے کہا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا۔

اس کے ہاتھوں میں چاقو دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔

”سیدھی طرح چابیاں نکال بڑھیا!“ علی شیر نے غرا کر کہا۔ ”ورنہ ابھی تجھے کاٹ کر پھینک دوں گا۔“

بیگم صاحبہ کا چہرہ خوف سے ذرہ ہو گیا۔ وہ بری طرح کانپنے لگیں اور بولیں ”دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں پولیس کو بلاؤں گی۔“

”چابیاں نکالتی ہے یا نہیں؟“ علی شیر نے چاقو ان کی گردن پر رکھ دیا۔

”صائمہ! وہ شکستہ لہجے میں بولی، پولیس کو فون کرو۔“

”چابیاں دے دیں بیگم صاحبہ!“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”ورنہ علی شیر آپ کی جان لے لے گا۔“

”صائمہ! تم چابیاں نکالو۔“ علی شیر نے کہا۔

بیگم صاحبہ نے ہمت کر کے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی، لیکن علی شیر نے انہیں دھکا دے کر دوبارہ بیڈ پر گرا دیا۔ وہ دھان پان سی خاتون تھیں۔ اس کے دھکیلنے سے وہ اس بری طرح گر گئیں کہ ان کا سر بیڈ کی پشت سے ٹکرایا اور وہ ایک طرف لڑھک گئیں۔

میں نے جلدی سے چابیاں نکالیں اور سیف کھول لیا، زیور بھرنے کے لیے علی شیر نے تنکے کا غلاف اتار لیا اور اس میں جلدی جلدی زیورات بھرنے لگا۔ تنکے کا غلاف لبالب بھر گیا لیکن زیورات اب بھی موجود تھیں، علی شیر نے دوسرے تنکے کا غلاف بھی اتار لیا اور اس میں زیور بھرنے لگا۔

اس وقت بڑی بی کو پھر ہوش آ گیا۔ وہ بری طرح کراپنے لگیں، علی شیر نے چونک کر انہیں دیکھا، پھر جھنجلا کر چاقو ان کے سینے میں اتار دیا، انہوں نے ایک جھنجکی لی اور ان کی گردن ڈھلک گئی۔

”یہ تم نے کیا کیا؟“ میں نے سہم کر پوچھا۔ ”تم نے..... تم نے.....“

”جلدی کرو صائمہ!“ علی شیر چیخا۔ ”ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔“ اس نے جلدی جلدی دوسرا غلاف بھی بھرا، سیف میں اس بریف کیس کے علاوہ بھی اچھی خاصی نقدی تھی۔

سب کچھ سمیٹنے کے بعد علی شیر وہاں سے نکلا اور ہم لوگ تیزی سے بنگلے سے باہر آ گئے۔

ہم لوگ تیز چڑھو قدموں سے تھوڑی دور پیدل چلتے رہے، پھر ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی، علی شیر اس میں سوار ہو گیا اور ٹیکسی والے سے صدر چلنے کو کہا۔

صدر پہنچ کر اس نے بوہری بازار سے بڑا سا ایک سوٹ کیس خریدا اور دونوں تنکے کے غلاف اور بریف کیس اس سوٹ کیس میں رکھ دیے، پھر اس نے دوسری

ٹیکسی پکڑی اور ہم لوگ وہاں سے لانڈھی کے صنعتی علاقے میں آ گئے۔

☆.....☆

صنعتی علاقے کی ایک چکی آبادی میں علی شیر کا دوست رہتا تھا، ٹیکسی ہم نے روڈ پر ہی چھوڑ دی اور پیدل روانہ ہو گئے، یوں بھی ان پتلی پتلی گلیوں میں ٹیکسی داخل نہیں ہو سکتی تھی۔

علی شیر کا دوست گل زمان گھر میں موجود تھا۔ شاید علی شیر نے اسے پہلے ہی اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی، اس لیے وہ اس وقت گھر میں موجود تھا۔

علی شیر نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں، اس کے گھر والے بھی راضی نہیں تھے اور میرے بھی، اس لیے میں اسے اپنے ساتھ بھاگ کر لے آیا ہوں اور کچھ دن یہیں چھپنا چاہتا ہوں۔

گل زمان کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

سیف میں سے نکلنے والی نقدی میں سے علی شیر نے چھ سات ہزار روپے اپنی جیب میں رکھ لیے تھے، اس نے گل زمان کو پانچ سو روپے دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے لیے بہترین کھانا لے آؤ۔

گل زمان نوٹ لے کر چلا گیا، علی شیر نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور پلنگ پر تنکے کے سہارے نیم دراز ہو گیا۔

گل زمان کے اس مکان میں صرف ایک ہی کمرہ تھا۔ اس نے کہا کہ تم لوگ آرام سے یہاں رہو، میں اپنے ایک دوست کے گھر جا کر سو جاتا ہوں۔

رات کے کھانے کے بعد گل زمان چلا گیا، علی شیر نے مکان کے دروازے کو اچھی طرح بند کیا، پھر کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد زیورات نکال کر سوٹ کیس میں الٹ دیے، لائٹن کی زرد روشنی میں بھی وہ زیورات دکھ رہے تھے، علی شیر ایک ایک زیور کی مالیت کا اندازہ لگا کر اسے الگ رکھتا رہا، پھر اس نے نقد رقم گنتی وہ پورے ایک لاکھ چوالیس ہزار تھے۔

میں اس رقم اور زیورات کو سانس روکے دیکھ رہی تھی، مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ علی شیر نے کہا ”تقریباً چھ لاکھ روپے کا یہ

زیور ہے اور ایک لاکھ چوالیس ہزار یہ ہو گئے تقریباً سات لاکھ چوالیس ہزار!“

میں نے زیورات دوبارہ احتیاط سے دیکھے کے غلافوں میں بھر دیئے، جو زیورات ڈبوں میں تھے، علی شیر نے ان کے ڈبے وہیں چھوڑ دیے تھے اور زیور نکال کر الگ رکھ لیا تھا۔

زیور رکھنے کے بعد علی شیر نے بریف کیس کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ مقفل تھا، علی شیر باورچی خانے سے سبزی کاٹنے کی چھری لے آیا اور بریف کیس کا تالا توڑ دیا، وہ بریف کیس پانچ پانچ سو کے نوٹوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

وہ نوٹ دیکھ کر میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

وہ پچیس لاکھ روپے تھے، علی شیر کے ساتھ ساتھ میری بھی آنکھیں پچیس کی پچیس رہ گئی تھیں۔ اتنا روپیہ آج بھی کافی وقت رکھتا ہے، اس زمانے میں تو لکھ پتی ہونا بہت دولت مندی کی نشانی تھی۔ بڑے بڑے افسروں اور اہل کاروں کی تنخواہیں چار ہندسوں میں ہوا کرتی تھیں وہ بھی ابتدائی چار ہندسے! اتنی نہیں ہوتی تھی کہ اس میں دو چار یا دس بیس ہزار ملانے سے وہ پانچ ہندسوں میں ہو جائے۔

اس زمانے میں میڈیا بھی اتنا برق رفتار نہیں تھا، آج تو کہیں کسی کا معمولی سا جھگڑا بھی ہو جاتا ہے تو خبر فوراً چینل پر آ جاتی ہے۔

ہمیں دوسرے دن کے اخبار سے علم ہوا کہ ہمارے بعد کیا واقعات پیش آئے تھے، وہ اخبارات بھی گل زمان لے کر آتا تھا، علی شیر تو زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا، اس لیے سارے اخبارات میں نے ہی دیے تھے۔ ان میں بڑی بڑی سرخیاں تھیں ”مالدار بیوہ کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔“ دولت نے ایک بوڑھی، نیک دل خاتون کی جان لے لی۔ وغیرہ وغیرہ.....

خبر کی تفصیل کچھ یوں تھی کہ تاہید بیگم اپنے دو بیٹوں عامر اور یاسر کے ساتھ اس وسیع و عریض بنگلے میں رہتی تھیں۔ انہیں پہلے زدو کوب کیا گیا پھر چاقو مار کے ہلاک کر دیا گیا۔ مقتولہ کا سیف کھلا ہوا ملا ہے، اس میں کچھ بھی نہیں ہے، عامر خان کا ایکسپورٹ اور امپورٹ کا خاصا بڑا بزنس ہے، وہ گاڑیوں کے اسپئر پارٹس، دوائیں

اور مشینری امپورٹ کرتے ہیں۔ انہوں نے پولیس کو بتایا کہ ان کی والدہ کی تجوری میں تقریباً چھ لاکھ روپے کی مالیت کے زیورات تھے، خاصی نقدی بھی تھی، لیکن اس کے بارے میں وہ حتمی طور پر نہیں بتا سکتے، گھر کی ملازمہ اور ڈرائیور غائب ہیں، پولیس کو ان ہی دو افراد پر شک ہے اور ان دونوں ملازمین کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔

ایک دوسرے اخبار کی خبر تھی کہ پولیس نے مبینہ ملزمہ صاحبہ کی ماں اور بھائی کو حراست میں لے لیا ہے اور ان سے تفتیش کر رہی ہے۔

یہ خبر پڑھ کر میں بے چین ہو گئی، میں نے علی شیر سے کہا۔ ”پولیس نے اماں اور بلال کو گرفتار کر لیا ہے۔“

میں..... میں واپس جاؤں گی۔
”باگل مت بنو صائمہ!“ علی شیر نے کہا۔ ”پولیس ان لوگوں کو تو پوچھ چکے بعد چھوڑ دے گی لیکن تمہیں قتل اور ڈکیتی کے الزام میں گرفتار کرے گی اور پھانسی پر لٹکا دے گی۔“

”بیگم صاحبہ کو میں نے تو قتل نہیں کیا ہے۔“ میں نے روتے ہوئے کہا۔

”تم بھی اس واردات میں برابر کی شریک ہو، تمہارے یہ کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ تم نے بیگم صاحبہ کا قتل نہیں کیا ہے۔“

میں نے بری طرح روتے ہوئے کہا۔ ”پھر میں..... کیا کروں.....؟ کیا کروں میں؟“

”ذرا حوصلے سے کام لو صائمہ!“ علی شیر نے کہا۔ ”ہم نے جان خطرے میں ڈال کر یہ کام کیا ہے، تمہاری بزدلی سے سب کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، میں رو دھو کر خاموش ہو گئی۔
”بس، اب تو ہمیں کسی نہ کسی طرح پولیس سے بچنا ہے۔“

”اچھا ہے۔“
”پاسپورٹ اتنی آسانی سے نہیں بنتا صائمہ!“ علی شیر نے کہا۔ ”اگر میرے خرچ کر کے پاسپورٹ بنوایا بھی جائے تو اس کے لیے ہم دونوں کو باہر لٹکنا ہوگا اور باہر نکلنے کا مطلب ہے کہ گرفتاری اور جیل؟“

”پھر..... پھر کیا سوچا ہے تم نے؟“ میں نے کہا۔
”جب تک یہ معاملہ گرم ہے، ہمیں اس وقت تک یہیں چھپنا ہوگا، پھر موقع ملے گا تو ہم علاقہ غیر کی طرف نکل جائیں گے۔“

”علاقہ غیر کی طرف؟“ میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔
میں نے پڑھا تو تھا کہ صوبہ سرحد سے آگے کوئی علاقہ ایسا ہے جو علاقہ غیر کہلاتا ہے، لیکن اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی۔

”ہاں، علاقہ غیر!“ علی شیر نے کہا۔ ”بس ہم ایک دفعہ وہاں پہنچ جائیں، پھر پولیس ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔“

”کیوں، وہ علاقہ پاکستان میں نہیں ہے؟“
”پاکستان میں شامل ہے، لیکن وہاں ان کا اپنا قانون چلتا ہے۔ پاکستان کی پولیس وہاں نہیں جاسکتی، اس وقت بھی بہت سے ایسے لوگ وہاں موجود ہیں جو قانون سے بچ کر وہاں پہنچے ہیں اور ان لوگوں کو علاقہ غیر میں پناہ مل گئی ہے۔“

”تو کیا ہم زندگی بھر اسی پہاڑی علاقے میں رہیں گے؟“ میں نے پوچھا۔
”نہیں بھئی، وہاں جا کر ہم پاسپورٹ بھی آسانی سے بنوا لیں گے اور ہمارا ملک سے فرار ہونا بھی آسان ہوگا۔“ علی شیر نے کہا۔

میں مطمئن ہو گئی۔ وہ سرحدی علاقے کا رہنے والا تھا اور علاقہ غیر کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

☆.....☆
دوسرا دن بھی ہمیں وہیں گل زمان کے مکان میں چھپے ہوئے گزر گیا، اب علی شیر کے کہنے پر گل زمان گھر میں باہر سے تالا ڈال دیتا تھا تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ ہم بھی بات چیت کرنے اور چلنے پھرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔ وہ تو اچھا تھا کہ سردیوں کا زمانہ تھا ورنہ ٹھن کی چھت والے اس کمرے میں شاید میں دم گھٹ کر مر جاتی۔ ہمارا مکان بھی چکی آبادی میں تھا، لیکن ہمارا علاقہ اس بستی سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ وہاں بجلی و پانی کی سہولت تھی، کچھ گھروں میں بجلی کے ٹکے بھی موجود تھے۔ یہ تو کچھ زیادہ ہی پسماندہ بستی تھی، پتلی پتلی تنگ دتاریک گلیاں جن میں تعفن زدہ پانی رستا رہتا تھا، چھوٹے چھوٹے ڈربے نما

مکانات تھے، جہاں نہ بجلی تھی نہ پانی تھا۔

گل زمان ہماری ہر طرح سے مدد کر رہا تھا، وہ ہمیں کھانا پہنچاتا تھا، ہمارے لیے پانی بھر کے لاتا تھا اور اخبارات لاتا تھا۔

اس ٹھن زدہ تعفن ماحول میں رہتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں برسوں سے اس تنگ دتاریک کمرے میں قید ہوں۔

میں جب سے فرار ہوئی تھی، میں نے کپڑے نہیں بدلے تھے، کپڑے تھے ہی نہیں تو بدلتی کہاں سے؟ کپڑے بدلنا تو دور کی بات ہے میں تو نہائی بھی نہیں تھی۔

میں نے ایک دن علی شیر سے کہا۔ ”گل زمان سے کہہ کر میرے لیے ریڈی میڈ کپڑوں کا ایک جوڑا تو منگا لو۔“

”ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں، میرے کپڑے بھی بہت میلے ہو رہے ہیں، میں کل ہی گل زمان کو صدر بیچ کر اپنے اور تمہارے لیے کچھ جوڑے منگا لیتا ہوں، ایسا کرو، تمہیں جس چیز کی بھی ضرورت ہے، گل زمان کو ایک پرچے پر لکھ کر دے دو، وہ پڑھا لکھا نہیں ہے، لیکن دکاندار تو پڑھنا جانتا ہوگا، گل زمان کہہ دے گا کہ میں کسی بنگلے پر ملازم ہوں، وہاں کے لیے یہ سامان لے کر جا رہا ہوں۔“

دوسرے دن میں نے گل زمان کو سامان کی لسٹ دے دی۔ اس میں ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ، کنکے، صابن، شیمپو، پرفیوم وغیرہ سب کچھ تھا۔ شام تک گل زمان وہ سامان لے آیا اس زمانے میں ریڈی میڈ کپڑے آج کل کی طرح عام نہیں تھے، لیکن صدر میں مل جاتے تھے۔ وہ کپڑے میرے جسم پر کچھ ڈھیلے تھے، لیکن کام چل سکتا تھا۔ اس دن میں نے خوشامد کر کے گل زمان سے نہانے کے لیے پانی بھی منگوایا۔

نہا دھو کر جب میں نے صاف ستھرے کپڑے پہنے تو مجھے ایسا لگا جیسے مجھ میں نئی زندگی آ گئی ہو۔

گل زمان اخبارات بھی لایا تھا، بیگم صاحبہ کے قتل کی خبر ابھی تک اخباروں میں تھی، کراچی جیسے شہروں میں ایسی واردات کبھی کبھار ہی ہوتی تھیں، اس لیے اخبارات بھی ایسی خبروں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

پولیس نے علی شیر کے کوارٹر کی تلاشی لی تھی اور اسے وہاں سے کچھ سراغ ملا تھا۔

دوسرے دن کے اخبارات میں ایک اور دھماکا خیز خبر تھی، پولیس نے سن رائزر انٹر رائزرز کے مالک اور معروف بزنس مین عامر خان کو گرفتار کر لیا تھا۔

پہلے تو میں نے اس خبر پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اچانک میری نظر عامر کے فوٹو پر پڑی تو میں سکتے میں رہ گئی۔ یہ بیگم صاحبہ کا بڑا بیٹا عامر تھا۔ تفصیلات کے مطابق عامر علی ایکسپورٹ، امپورٹ کی آرڈر میں منشیات اور اسلحہ کی اسمگلنگ میں ملوث تھا، خبر کے آخر میں تھا کہ واضح رہے کہ یہ وہی عامر خان ہے جس کی والدہ کو ایک ہفتہ پہلے قتل کر دیا گیا تھا۔

میں نے وہ خبر علی شیر کو سنائی تو وہ بھی حیران رہ گیا۔ ”اب میں سہا!“ علی شیر نے کہا۔ ”عامر صاحب نے فوٹو سے بھرے ہوئے اس بریف کیس کی رپورٹ کیوں نہیں لکھوائی؟ وہ پیسا ضرور غیر قانونی ہوگا۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ سونے کی اسمگلنگ بھی کرتا تھا۔“

”وہ چور ہیں یا ڈاکو!“ علی شیر نے کہا۔ ”اس سے ہمیں کیا فرق پڑے گا۔“

”ہاں، اس سے ہمیں کیا فرق پڑنے والا تھا۔“ مزید ایک ہفتہ گزرنے والا تھا، اس وقت تک معاملہ خاصا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اب تو اخباروں میں بھی اس واردات کے بارے میں کچھ شائع نہیں ہو رہا تھا۔

میں نے ایک دن علی شیر کی خوشامد کی کہ تم گل زمان یا کسی اور آدمی کو ہمارے محلے میں بھیج کر اماں اور بلال کی خیریت تو معلوم کر ہی سکتے ہو؟

پہلے تو وہ راضی نہ ہوا لیکن جب میں رونے لگی تو اس کا دل بھی کھینچ گیا، اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ میں گل زمان کو تمہارے محلے بھیجوں گا، وہ وہاں سے ساری معلومات کر کے لے آئے گا۔

دوسرے دن شام کو گل زمان آیا اور اس نے بتایا کہ پولیس نے اماں اور بلال سے دو دن تفتیش کرنے کے بعد انہیں چھوڑ دیا تھا، اماں بے چاری کو تو معلوم ہی نہیں تھا تو وہ پولیس کو کیا بتائیں، پولیس نے بلال پر بہت تشدد کیا تھا، لیکن وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اب اماں اور بلال گھر پر تھے۔

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

یہ سن کر مجھے بہت سکون ملا، میں تو ان کو کچھ مہیے بھی بھیجا چاہتی تھی لیکن علی شیر نے سختی سے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ ہم بعد میں منی آرڈر کے ذریعے اماں کو پیسے بھیج دیں گے۔ ابھی انہیں پیسے بھیجا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

ایک دن علی شیر نے وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے کل زمان سے ایک برقع منگوا لیا۔ ہمیں وہاں سے فرار ہوئے چوبیس دن ہو چکے تھے۔ اس دوران میں علی شیر کی شیواتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ پہلی نظر میں پہچانا ہی نہ جاتا تھا اس نے سیفٹی ریزر لے کر خود ہی اپنا خط پتایا تھا اور اب اس کے چہرے پر باقاعدہ داڑھی نظر آ رہی تھی۔ گھبردار شلوار قمیض اور واسکٹ کے ساتھ سر پر سرحدی علاقے والوں کی مخصوص ٹوپی اور پشاور کی چپل پہن کر تو اس کا حلیہ بالکل ہی بدل گیا تھا۔

ہم دونوں رات کے وقت اس آبادی سے باہر نکل آئے۔ علی شیر نے کل زمان کو اس خدمت کے عوض پانچ ہزار روپے دیے تو وہ کھل اٹھا۔ وہ بس ہمیں باہر چھوڑنے آیا تھا اور اس کے ہاتھوں میں وہ سوٹ کیس تھا جس میں ہمارے کپڑوں کے علاوہ تقریباً بیس لاکھ روپے، زیورات اور نقد رقم کی صورت میں موجود تھے، لیکن کل زمان کے فرشتوں کو بھی اس کا علم نہیں تھا ورنہ اس کی نیت خراب ہوتے کتنی دیر لگتی۔ اسے تو صرف یہ معلوم تھا کہ علی شیر مجھے بھگا کر لایا ہے اور اب پولیس کے خوف سے یہاں چھپا ہوا ہے، علی شیر نے کل زمان کو بتایا تھا کہ اس نے فرار ہونے سے پہلے اپنی جمع پونجی بھی نکال لی تھی، وہی پیسا اس کے کام آ رہا ہے۔

کچھ راستہ پیدل چلنے کے بعد ہمیں ٹیکسی مل گئی، علی شیر، کل زمان سے گلے ملی کر ٹیکسی میں سوار ہو گیا، میں پہلے سے ٹیکسی میں بیٹھ چکی تھی۔

علی شیر یہاں سے ایک مرتبہ پھر صدر پہنچا اور وہاں ٹیکسی چھوڑنے کے بعد دوسری ٹیکسی پکڑی اور اس سے کینٹ اسٹیشن چلنے کو کہا۔

ٹیکسی والے نے میٹر سے دو روپے زیادہ لے کر ہمیں کینٹ اسٹیشن پہنچا دیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ پشاور جانے والی گاڑی تو

کب کی جا چکی ہے، اس وقت پنڈی اور لاہور کے لیے بھی کوئی ٹرین نہیں تھی، البتہ ایک پنجر ٹرین حیدر آباد اور میرپور خاص جا رہی تھی، علی شیر نے حیدر آباد ہی کے ٹکٹ خرید لیے اور ہم پلیٹ فارم پر آ گئے۔

ٹرین آنے میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔ ان دنوں ایک اچھی بات یہ تھی کہ سب ٹرینیں وقت پر چلتی تھیں۔ کبھی آدھا، پون گھنٹے کی تاخیر ہو جاتی تھی تو مسافر پریشان ہو جاتے تھے۔

ہم پلیٹ فارم پر آ کر کسی قدر تاریکی میں ایک بیچ پر بیٹھ گئے، اس وقت اسٹیشن پر بہت کم مسافر تھے، کتنی کے جو چند مسافر تھے، وہ بھی شاید اس پنجر ٹرین کے انتظار میں تھے۔

مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی کیوں کہ ہم نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔

میں نے علی شیر سے کھانا لانے کو کہا تو وہ بولا "اسٹیشن پر تو اس وقت تو چائے بسکٹ اور پیسٹری وغیرہ ہی ملے گی، میں وہی لے آتا ہوں، کھانے کے لیے مجھے اسٹیشن سے باہر جانا پڑے گا۔ میں تمہیں تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتا، پھر تمہارے پاس یہ سوٹ کیس بھی تو ہے۔"

"پھر تم یہیں سے کچھ لے آؤ۔" میں نے کہا۔ وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر چائے کا ایک اسٹال تھا، علی شیر وہیں سے یاسی بسکٹ، کیک، پیس اور چائے وغیرہ لے آیا ہر چیز بد مزہ تھی، لیکن پیٹ تو بھرنا ہی تھا۔

آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر مسافروں کی تعداد بڑھ رہی تھی، لیکن وہ چہل پہل نہیں تھی چونکہ اس وقت ہوتی ہے۔ اچانک میں نے دیکھا کہ دو پولیس والے ہر مسافر کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے آ رہے ہیں۔

پولیس والوں کو دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے، میں نے علی شیر سے کہا۔ "دو پولیس والے ہماری طرف آ رہے ہیں۔"

"ہاں، میں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن تم گھبراؤ مت، اب تک تو پولیس بھی اس واردات کو بھول چکی ہے۔"

پولیس والے آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھے اور ہمیں دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔

اچانک علی شیر مجھ پر پشتوں میں چیخنے چلانے لگا۔ ایسا

لگ رہا تھا جیسے اسے کسی بات پر شدید غصہ آ گیا ہو، میں اس کے جواب صرف ہوں، ہوں کر رہی تھی، میری سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے خان صاحب!" ایک پولیس والے نے پوچھا۔ "انتا غصہ کیوں کر رہے ہو؟"

"یہ امارا بی بی اے، ہم غصہ کرے یا نہیں، تم لوگ کیوں پوچھتا اے؟" علی شیر نے سرحدی علاقے کی طرح بگڑی اردو میں کہا، حالاں کہ وہ بہت صاف اور اچھی اردو بولتا تھا۔

"اور یار! تم تو ہم پر ہی ناراض ہونے لگا۔" دوسرا پولیس والا ہنس کر بولا۔

"تو پھر مارے گھر کے معاملے میں دخل مت دیو۔" علی شیر نے اکھڑ مڑا جی سے کہا اور ایک مرتبہ پھر مجھ سے پشتوں میں مخاطب ہو گیا۔

پولیس والے ہنستے ہوئے چلے گئے، ان میں سے ایک بولا۔ "اوجھڑ یار! اسے تے بالکل الٹی کھوپڑی کا بندہ ہے۔" ان کے جانے کے بعد علی شیر ہنس کر بولا۔

"کیسا رہا؟ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس برقع میں ایک خوب صورت لڑکی چھپی ہوئی ہے جو پشتوں کا ایک لفظ بھی نہیں جانتی۔"

میں بھی علی شیر کی ذہانت پر ہنسنے لگی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ "بس یہ ترکیب اچانک ہی مجھے سوچ گئی۔ اگر پولیس والوں کو کسی بھی قسم کا شک بھی ہوگا تو اب دور ہو گیا ہوگا۔"

علی شیر بار بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اس نے قریب سے گزرتے ہوئے ریلوے کے ایک ملازم سے پوچھا۔ "بھائی صاحب! یہ ابھی تک حیدر آباد کا گاڑی کیوں نہیں آیا؟"

"گاڑی پندرہ منٹ لیٹ ہے خان صاحب!" اس نے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

ابھی ہم پوری طرح سکون کا سانس لینے بھی نہیں پائے تھے کہ وہاں مجھے اچانک پولیس کا ایک سب انسپکٹر اور دو سپاہی نظر آئے، وہ خاص طور پر لوگوں سے کچھ پوچھ رہے تھے۔

اس دفعہ علی شیر بھی پریشان ہو گیا، وہ آہستہ سے

بولا۔ "صائمہ! لگتا ہے ان لوگوں کو کسی کی تلاش ہے۔"

"پھر.....؟" میں گھبرا کر بولی۔ "پریشان مت ہو۔" اس نے مجھے تسلی دی اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگالی۔

"تم سگریٹ کب سے پینے لگے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ابھی سے۔" وہ مسکرا کر بولا۔ اس وقت تک پولیس والے ہمارے نزدیک پہنچ چکے تھے۔

اتفاق سے پولیس کا سب انسپکٹر بھی سرحدی علاقے کا تھا۔ اس نے علی شیر سے پشتوں میں کچھ کہا، علی شیر نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "کل زمان!" شاید انسپکٹر نے اس کا نام پوچھا تھا۔

علی شیر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بخت لی بی!"

انسپکٹر نے براہ راست مجھ سے کچھ پشتوں میں پوچھا۔ "میں خاموش رہی۔"

علی شیر نے پشتوں میں کچھ کہا جو سب انسپکٹر تو سمجھ گیا لیکن اس کے ساتھ آنے والا حوالدار نہیں سمجھا۔ وہ مجھ سے بولا۔ "بی بی، نام کیا ہے تمہارا؟"

"یہ بے چاری گوئی ہے۔" سب انسپکٹر نے کہا۔ "صاحب جی! وہ بنگلہ کلرک تو بتا رہا تھا کہ یہ دونوں میاں بیوی اس کے سامنے باتیں کر رہے تھے، سب انسپکٹر نے چونک کر علی شیر کی طرف دیکھا، پھر پشتوں کے بجائے اردو میں بولا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں حیدر آباد جا رہا ہوں۔" علی شیر نے گویا بھلا کر کہا۔ "پہلے تم نے پشاور کی ٹرین کے بارے میں معلوم کیا، پھر پنڈی اور لاہور کی ٹرینوں کے بارے میں پوچھا، جب تمہیں یہ معلوم ہوا کہ اس وقت صرف ایک پنجر ٹرین حیدر آباد جائے گی تو تم نے اس کا ٹکٹ خرید لیا، کیوں؟" سب انسپکٹر کا لہجہ سخت تھا۔

"جناب عالی! کیا حیدر آباد جانا جرم ہے یا دوسری ٹرینوں کا نام پوچھنا جرم ہے؟" علی شیر بہت اعتماد سے بول رہا تھا، البتہ سرحدی کے باوجود میں پسینا پسینا ہو رہی تھی۔

"تمہارے انداز سے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم فوری

طور پر کراچی سے جانا چاہتے ہو، ایسی کیا ایمر جنسی ہے؟“
 ”مجھے جانا تو مردان ہے۔“ علی شیر نے کہا لیکن
 حیدر آباد میں میرا ایک دوست رہتا ہے، میں نے سوچا
 کہ اس سے میں ملاقات کرنا جاؤں۔“
 ”تم مردان میں رہتے ہو؟“ سب انسپکٹر نے پوچھا۔
 ”جی ہاں، میں مردان میں رہتا ہوں، کراچی اپنے
 ایک دوست کے پاس آیا تھا۔“
 ”اس سے پہلے کب کراچی آئے تھے؟“ انسپکٹر
 مسلسل جرح کر رہا تھا۔
 ”میں تمباکو کی تجارت کرتا ہوں اس لیے اکثر
 کراچی، حیدر آباد اور آتا رہتا ہوں۔“ علی شیر جھوٹ
 پر جھوٹ بول رہا تھا۔
 ”اور تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ پشاور کی گاڑی کس
 وقت یہاں سے جاتی ہے؟“
 ”معلوم ہے جناب..... بس اس دفعہ کچھ دیر ہوگئی۔“
 ”اس سوٹ کیس میں کیا ہے۔“ سب انسپکٹر نے
 سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔
 ”ہمارے کپڑے ہیں صاحب!“ علی شیر آہستہ
 آہستہ اعتماد کر رہا تھا۔
 ”اے کھولو۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔
 یہ سن کر مجھے چکر سا آ گیا۔ سوٹ کیس کھلتے ہی
 پولیس والوں کو معلوم ہو جاتا کہ اس میں لاکھوں روپے کی
 نقد رقم اور زیورات ہیں۔
 ”یہ تمہاری بیوی ہے؟“ سب انسپکٹر نے پوچھا۔
 ”جی ہاں صاحب!“ علی شیر نے جواب دیا لیکن
 اب ان کا لہجہ کھوکھلا تھا۔
 ”یہ بھی مردان کی رہنے والی ہے؟“ اس نے پوچھا۔
 ”جی ہاں صاحب! یہ تو کراچی کی رہنے والی ہے؟“
 ”اس سوٹ کیس کو کھولو۔“ اس مرتبہ سب انسپکٹر کا
 لہجہ بہت درشت تھا۔
 ”لاؤ چالی دو۔“ علی شیر نے شکرت لہجے میں مجھ سے کہا۔
 ”چالی تو تمہارے ہی پاس ہے۔“ میں نے آہستہ
 سے جواب دیا۔
 علی شیر نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کے ہاتھ
 کانپ رہے تھے۔

اس نے چابی نکال کر سوٹ کیس کھولنے کی کوشش
 کی لیکن گھبراہٹ میں چابی نہیں لگ رہی تھی۔
 سب انسپکٹر نے خود اس سے چابی لے کر سوٹ
 کیس کھول دیا۔ پھر اس نے اپنے ایک ماتحت سے
 ٹارچ مانگی کیوں کہ روشنی وہاں ناکافی تھی۔ اس نے
 اوپر کے کپڑے ہٹا کر اندر نظر ڈالی اور چیخ کر بولا۔
 ”گرفتار کر لو ان دونوں کو۔“
 ایک پولیس والے نے جھپٹ کر علی شیر کو پکڑ لیا اور
 اس کے ہاتھ میں پھنکڑی ڈال دی۔ اس نے مجھ سے کہا۔
 ”بی بی! اگر تم بھاگنے کی کوشش کرو گی تو بھاگ نہیں سکو
 گی۔ ہمارے ساتھ اس وقت لیڈی پولیس نہیں ہے ورنہ
 تمہیں بھی پھنکڑی لگا دیتے، چلو اٹھو۔“
 میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے
 میری ٹانگوں میں جان ہی نہ رہی ہو۔ میں بمشکل تمام اٹھ کر
 کھڑی ہوئی اور گرتی پڑتی ان لوگوں کے ساتھ چلنے لگی۔
 سب انسپکٹر علی شیر سے کہہ رہا تھا ”تم اگر بگنگ
 کلرک سے ساری گاڑیوں کے بارے میں نہ پوچھتے تو
 اسے ذرا بھی شک نہیں ہوتا، لیکن تمہاری گھبراہٹ اور جلد
 بازی دیکھ کر اس نے ہمیں اطلاع دے دی۔ ہم نے اس
 سے کہہ رکھا تھا کہ ایسے جوڑوں پر نظر رکھے جو تباہ ہوں
 یعنی ان دونوں کے سوا ان کے ساتھ کوئی نہ ہو۔
 وہ لوگ ہمیں ٹیکسی میں بٹھا کر پولیس اسٹیشن لے
 گئے۔ اب پکڑے ہی گئے تھے تو جھوٹ بولنا فضول تھا۔
 میں نے پولیس کو اپنا بیان دیا تو شروع سے لے کر
 آخر تک سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ میرا بیان لینے کے فوراً بعد
 پولیس والوں نے مجھے جیل بھیج دیا۔ مجھے بعد میں معلوم
 ہوا کہ پولیس کی حراست میں عورتوں کو نہیں رکھا جاتا،
 انہیں فوراً جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ پھر
 پولیس نے علی شیر کا کیا حشر کیا۔
 میں نے تو جیل میں تین دن تک شدید اذیت
 برداشت کی، وہاں کی زمانہ پولیس بھی مردوں سے زیادہ
 سخت اور بدنام تھی۔
 پھر ایک سال تک کیس چلتا رہا۔
 مجھ سے ملنے نہ اماں آئیں، نہ بلال آیا، میں
 نے انہیں بلوایا تھا، لیکن انہوں نے کہہ دیا کہ میری کوئی

بٹی نہیں ہے، صائمہ تو اسی روز مرگئی تھی جس روز نیگم
 صاحبہ کا قتل ہوا تھا۔
 وکیل بھی مجھے سرکاری طرف سے مہیا کیا گیا تھا۔
 وہ بہت ذہین اور اچھا آدمی تھا۔ اس نے جج کو قائل کر لیا
 تھا کہ اصل قصور وار علی شیر ہے، اس نے صائمہ کو ورغلا یا
 بلکہ زبردستی اس سے یہ کام کروایا، اس نے نیگم صاحبہ کو قتل
 بھی کیا، ان کے سینے میں جو چاقو پیوست تھا، اس پر علی شیر
 کی انگلیوں کے نشانات تھے۔
 عدالت نے علی شیر کو عمر قید اور مجھے اعانت جرم میں
 سات سال کی قید بامشقت سزا سنائی۔
 اخباروں نے اس خبر کو بھی بہت اچھا لایا لیکن اماں
 پھر بھی نہ آئیں۔
 میرے فرار ہونے کے بعد میٹرک کا رزلٹ بھی آ گیا
 تھا۔ میں میٹرک میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوگئی تھی۔
 میں قیدی عورتوں میں پڑھی لکھی تھی اس لیے
 جیل کے عملے نے مجھے لکھنے پڑھنے کی ذمہ داری سونپ
 دی۔ میرا طرز عمل جیل میں بہت اچھا رہا تھا اس لیے
 میں سات سال کے بجائے ساڑھے پانچ سال ہی
 میں رہا ہوگئی تھی۔
 رہا ہونے کے بعد میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ
 میں کہاں جاؤں؟
 پھر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ کسی بنگلے میں جھاڑو،
 برتن کی نوکری تو مل ہی جائے گی۔
 میں پیدل ہی اک طرف روانہ ہوگئی۔
 اچانک ایک موٹر سائیکل میرے نزدیک آ کر رکی۔
 میں نے حیرت سے موٹر سائیکل سوار کو دیکھا اور
 پہلی ہی نظر میں اسے پہچان گئی..... وہ سرکاری وکیل
 اعجاز احمد تھا، جس نے میرا مقدمہ لڑا تھا اور مجھے کم سے
 کم سزا ہوئی تھی۔
 میں نے جلدی سے اسے سلام کیا۔
 اس نے پوچھا۔ ”میں صائمہ! کیسی ہیں آپ؟“
 ”مس صائمہ!“ میں تلخ لہجے میں دہرایا۔
 ”ایک سزا یافتہ عورت اتنی عزت کے قابل کب ہوتی
 ہے وکیل صاحب!“
 ”تم نے جو گناہ کیا تھا، اس کی سزا بھگت چکی ہو،

اب تو تم قابل عزت ہو، کہاں جا رہی ہو؟“
 ”کسی ٹھکانے کی تلاش میں۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”اگر مجھ پر اعتماد ہے تو میرے ساتھ چلو۔“
 مجھے تو اس وقت معمولی سا سہارا بھی بہت تھا، میں
 نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر
 سوار ہوگئی۔
 اعجاز وہاں سے مجھے شاہ فیصل کالونی لے گیا۔ وہ
 ان دنوں وہیں رہتا تھا۔
 اس نے مجھے اپنی ماں سے ملوایا۔ اس کی والدہ بھی
 مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔
 پھر شاید اللہ نے بھی مجھے معاف کر دیا تھا، اس کے
 بعد میری زندگی میں کبھی خزاں نہیں آئی۔
 میں آج مسز اعجاز ہوں، ہم اب ڈیفنس کے ایک
 بنگلے میں رہتے ہیں۔ میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے،
 میں بیٹی کی شادی کر چکی ہوں اور دونوں بیٹے امریکا میں
 پڑھ رہے ہیں۔
 اعجاز نے بعد میں اپنی محنت اور صلاحیت سے
 اتنی ترقی کی کہ ہائی کورٹ کے جسٹس کی حیثیت سے
 ریٹائر ہوئے۔
 بس میرے سینے میں ایک ہی غلطی ہے کہ اماں
 نے اس کے بعد کبھی میری شکل نہ دیکھی، میں نے ایک
 دفعہ ان سے ملنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن انہوں نے مجھے
 بری طرح دھتکار دیا۔
 اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ وہ اب اس
 دنیا میں نہیں ہیں، بلال بھی مجھ سے ملنا پسند نہیں کرتا۔
 وہ کسی سرکاری محکمے میں گریڈ سترہ کا ملازم ہے۔ اللہ
 تعالیٰ اسے خوش رکھے اور مجھے معاف فرمائے کہ نیگم
 صاحبہ کا قتل ابھی تک ذہن پر سوار ہے میرے۔
 حالاں کہ میں نے انہیں قتل نہیں کیا اور ایسا سوچا بھی
 نہیں تھا، اس کے باوجود میں ان کی امانت میں
 خیانت کی گنہگار تو ہوں۔
 میں نے اپنے دل کا بوجھ اعتراف کی
 صورت کاغذ پر منتقل کر دیا ہے۔ شاید اس طرح
 مجھے کچھ قرار آ جائے۔

☆.....☆

ایک ہی راستہ

مریم شاہ بخاری

سرگودھا سے، ایک معصوم بچی کے انتقام کی جاگتی کہانی

☆ ☆ ☆

یہ میری بیٹی ساریہ ہے..... بیگم شہباز اعوان نے نہایت محبت سے اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے اپنی سہیلی بیگم مصطفیٰ کمال سے متعارف کروایا تھا۔ دونوں خواتین کے ہونٹوں پر تبسم بکھرا ہوا تھا، جب کہ بیگم شہباز اعوان کی بانہوں میں مقید بھی ساریہ کو اس بل بہت حیرت ہو رہی تھی..... آخر یہ عنایت آج کس لیے.....؟ اس کے دل و دماغ میں جھکڑے چل رہے تھے۔ وہ حال سے ماضی میں پہنچ گئی۔ اسے ایک پل لگا تھا کہ جیسے بیگم شہباز اعوان کی بانہوں سے نکلنے میں..... اس کے چہرے پر اس قدر نفرت کے آثار تھے کہ بیگم مصطفیٰ کمال بھی ٹھنک گئیں..... میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں..... نہیں ہوں آپ کی بیٹی..... سنا آپ نے..... وہ زور سے چلائی اور وہاں سے دوڑ کر باہر نکل گئی۔ بیگم مصطفیٰ کمال نے حیرت سے اپنی دوست کو دیکھا تھا، جس کے چہرے پہ اذیت کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ دیکھا تم نے..... میں اس سے جس قدر قریب ہونا چاہتی ہوں، یہ اس قدر ہی مجھ سے دور ہوتی جاتی ہے۔ اس کا رویہ مجھے بہت تکلیف دیتا ہے..... بیگم شہباز کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ بیگم مصطفیٰ کمال اپنی جگہ سے اٹھ کر بیگم شہباز اعوان کے پاس آ گئیں..... حوصلہ

آنکھوں میں ہلکورے لے رہا تھا۔ کیا بات ہے بیٹی؟ تم کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ رحمان بابا کے شفقت بھرے انداز سے اس کی وحشت میں ذرا کمی ہوئی تھی۔ ساریہ..... وہ مختصر سا بولی تھی..... اسے یہ نام تو بہت پیارا ہے بالکل آپ کی ہی طرح..... اچھا اب بتاؤ آپ کے بابا کا کیا نام ہے؟ شہباز اعوان..... ایک بار پھر مختصر سا جواب ملا تھا..... رحمان بابا کے ہونٹوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔ ساریہ ہنوز اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔

جاؤں گی..... وہ خود سری سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی، مگر بیٹی..... اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتے، ساریہ دوڑتی ہوئی قبرستان سے نکل گئی، اس کا گھر قبرستان سے قریب دس ہندوہ منٹ کے فاصلے پر تھا..... وہ پھولی سانسوں سے گھر میں داخل ہوئی تو اس کا سامنا بیگم شہباز اعوان سے ہوا، جو نہایت غصے اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات لیے اس کی طرف بڑھی تھیں، کہاں تھیں تم..... جانتی ہو کس قدر پریشان تھی میں..... میری جان عذاب



اچھا وہی شہباز اعوان، جو خیمہ میں ہوتے ہیں..... ڈاکٹر فیروز اعوان کے صاحبزادے..... رحمان بابا نے گویا اس سے تائید چاہتی تھی۔ جی ہاں..... وہ خفگی سے بولی تھی، چلو آؤ میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں..... آپ کے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے، آؤ میرے ساتھ شاباش..... انہوں نے اسے محبت سے پکارتا تھا، نہیں میں خود ہی چلی

میں ڈال رکھی ہے تم نے..... باپ باہر بیٹھا عیاں شیاں کر رہا ہے اور مجھے چھوڑ گیا ہے اپنی بیٹی کی نگرانی کے لیے..... کہاں گئی تھی تم..... بولو..... وہ سختی سے اس کا بازو تھامتے ہوئے بولی، مگر ساریہ کے ہونٹوں پہ تو قفل پڑ گئے تھے، البتہ آنکھوں اور چہرے سے خوف صاف ظاہر ہو رہا تھا..... تبھی ملازمہ چلی آئی، بی بی جی آپ کا فون ہے۔

بیگم شہباز اعوان نے ایک جھکے سے اس کا بازو چھوڑا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ساریہ کو کچا چبا جائیں۔ وہ خون کے گھونٹ جیتی وہاں سے چلی گئیں تو ساریہ بھی اپنے روم میں آگئی، جبکہ بوڑھی ملازمہ سیکنہ بی نے اک سر د آہ بھری تھی۔

☆.....☆

رحمان بابا "اعوان فیملی" کو شہباز اعوان کے مرحوم والد ڈاکٹر فیروز اعوان کے توسط سے جانتے تھے۔ فیروز اعوان کو وہ اپنا محسن مانتے تھے۔ انہیں نے ہی رحمان بابا کو بیروزگاری کے وقت میں یہاں گورن کی حیثیت سے رکھ دیا تھا، جس سے ان کی زندگی کی گاڑی کھینچنے لگی تھی۔ کم میں ہی سہی لیکن گزارا ہو رہا تھا۔ کچھ عرصہ قبل ڈاکٹر فیروز اعوان کا انتقال ہو گیا تھا۔

رحمان بابا کو ان کی موت کا بہت صدمہ تھا، مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے؟ جب شہباز اعوان بیگم روانہ ہونے لگے، تو انہوں نے خاص طور پر رحمان بابا کو بلا کر اپنے والدین کی قبروں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی تھی، جس کے بدلے میں انہیں ہر ماہ معقول معاوضہ بھی ملتا تھا۔ وہ اپنی پوری دیانت داری سے اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے، جس قبر پر انہوں نے ساریہ کو آسو بہاتے دیکھا تھا، وہ شہباز اعوان کی دوسری بیوی "تہنیت بی بی" کی قبر تھی، جن کا انتقال دو سال قبل حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ہوا تھا۔ "تہنیت" کون تھی؟ کہاں سے آئی؟ یہ تو وہ نہیں جانتے تھے، ہاں مگر تہنیت بی بی جب سے شہباز اعوان کی زندگی میں آئی تھیں، انہوں نے اسے بہت خوش دیکھا تھا، پھر نہ جانے ان کی خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی۔ "تہنیت بی بی" خاموشی سے ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

رحمان بابا نے سنا تھا کہ شہباز اعوان اور تہنیت بی بی کی ایک بیٹی بھی ہے، جو کہ اس وقت قریباً 6 برس کی تھی۔ انہوں نے ساریہ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا، وہ بھی اپنی ماں کی قبر پر آسو بہاتے۔!! شہباز اعوان کی پہلی بیوی "صہبا امروزی" تھی، جو کہ فیروز اعوان کے چچا زاد بھائی کی اولاد تھی۔

"صہبا" ایک خود سر اور مغرور عورت تھی جو اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتی۔ یونیورسٹی کے زمانے میں اسے کسی "آفتاب خان" نامی شخص کو دل دے بیٹھی، مگر پھر انہوں نے ایک اور آفتاب خان ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ ایک تو ان کے اسٹینڈرڈ کا نہیں تھا، دوسرا وہ شکل ہی سے خیانت سے بڑے اور لاپرواہی شخص لگتا تھا، سو امروزی خان نے بیٹھی مرضی کے خلاف اس کی شادی شہباز اعوان سے کر دی۔ "صہبا" کو انہوں نے خود کو ختم کرنے کی دھمکی دے کر راضی کر لیا، یوں وہ دلہن بن کر "اعوان فیملی" آگئی۔ ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ شہباز اعوان کو اولاد کا تحفہ نہ دے سکی۔ شوہر کی دوسری شادی نے انہیں دھچکا ضرور لگایا تھا، مگر وہ حالت سے سمجھوتا کر گئی تھی۔ رحمان بابا نے اڑتی اڑتی یہ خبر بھی سنی تھی کہ وہ شہباز سے علیحدگی چاہتی ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ وہ بے خبر تھے۔ اب ساریہ کی آنکھوں میں آنسو اٹھیں بے چین کر گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں انہوں نے عجیب خالی پن محسوس کیا تھا، جانے کیوں ان کے دل میں خدشات سر اُبھارنے لگے تھے۔

☆.....☆

"بہلو ہاں..... کیسے ہو آفتاب ڈارنگ!" بیگم شہباز اعوان کی آواز میں خود بخود خمار اُتر آیا تھا۔ "میں ٹھیک ہوں تم سناؤ..... خوب عیش ہو رہے ہیں، مجھے تو تم بالکل بھول ہی گئی ہو....." دوسری جانب سے شکوہ کیا گیا تھا۔ بیگم شہباز اعوان کے ہونٹوں پہ بڑی دلچسپ سی مسکراہٹ اُبھری تھی۔ اوہو بھئی..... تم تو خفا ہونے لگے..... ایسی بات نہیں ہے میری جان..... میں بھلا تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں، بس اس سختی کے کاموں میں لگی رہتی ہوں..... سچ میرا بس چلے تو میں اُڑ کر تمہارے پاس آ جاؤں..... بیگم شہباز اعوان نے محبت سے پورے لہجے میں کہا تو آفتاب خان کا زوردار قبضہ بلند ہوا تھا۔ تو پھر چلی آؤ نا..... دیر کس بات کی ہے؟ ویسے بھی شہباز سے تو تم پیچھا چھڑانے والی ہو..... جیسے اپنی سوتن سے چھڑوایا تھا..... ہے نا..... جواب میں بیگم شہباز اعوان بھی ہنسنے لگی..... او ڈیر..... تم بھی تو اس پلان کا حصہ تھے، پھر تمہیں تو پتا ہے میں شراکت داری کسی بھی

محافل میں پسند نہیں کرتی، خواہ وہ شوہر ہو یا پھر..... اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ میں خوب سمجھتا ہوں صہبا ڈارنگ..... بس اب تم اس ڈرامے کو جلد سے جلد ختم کرو..... میں تو کہتا ہوں شہباز سے طلاق لے لو..... بجائے اس کے کہ..... ہرگز نہیں..... بیگم شہباز نے تیزی سے اس کی بات کاٹی تھی، نہیں..... آفتاب..... طلاق کی صورت میں تو میرے حصے میں صرف چند لاکھ اور صرف ایک بنگلہ آئے گا، جب کہ میں تو سب کچھ حاصل کرنا چاہتی ہوں..... سب کچھ..... ویسے بھی فکر مت کرو..... شہباز کے لیے بھی وہی حربہ استعمال کروں گی، یعنی اوٹلی ٹو ڈراپس وائزن..... ڈاکٹر پیچارے وجہ جان ہی نہ پائیں گے کہ یہ موت زہر سے ہوئی ہے یا پھر حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے..... جیسے پیچاری تہنیت کے ساتھ ہوا۔ آہ..... آئی تھی میرے ساتھ مالکن بن کر رہنے..... لیکن اسے کیا پتا تھا کہ موت اس کے تعاقب میں ہے..... میں نے بھی تو شہباز کو رام کیا تھا کہ وہ تہنیت کو یہاں لے آئے، میری ذات سے اسے کوئی تکلیف نہ ہوگی..... ہائے رے قسمت، بے چاری تہنیت..... صہبا نے ایک سر د آہ بھری تھی جب کہ مہتاب خان کا قبضہ بہت بلند تھا۔

☆.....☆

سیکنہ کے قدموں سے زمین نکل گئی تھی..... اوہ میرے خدا..... اتنا سب کچھ ہو گیا اور خبر تک نہ ہوئی..... یہ مکروہ عورت..... وہ جلدی سے ڈرائنگ روم کے دروازے سے پیچھے ہٹ گئی، مبادا وہ دیکھ نہ لے..... سیکنہ بی اور بیگم شہباز اعوان کے باہر نکل جانے کے بعد صوفے کے پیچھے سے ساریہ بھی حق دق کی برآمد ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ننھا سا شیپ ریکارڈ بھی موجود تھا.....

☆.....☆

رات کے پچھلے پہر ساریہ ایک دم گھبرا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پہ خوف و بے بسی کے تاثرات تھے، وہ اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی کوشش میں ہی سسک اٹھی تھی..... اس

کے ہونٹ کپکپا رہے تھے..... ممما..... ممما..... مم..... مم..... مجھے کیوں تنہا کر گئیں آپ.....؟ مجھے ڈر لگتا ہے..... وہ..... وہ مجھے بھی مار ڈالے گی..... اس نے آپ کو بھی مار دیا..... وہ بابا کو بھی نہیں چھوڑے گی..... مم..... مم..... میں کیا کروں..... اس کی نظروں میں اپنی "ماں" کا چہرہ گھوم گیا، جس کا صرف اتنا تصور تھا کہ وہ شہباز اعوان کی شریک حیات بن کر اس گھر میں آئی تھی اور انہیں وہ سب کچھ دیا تھا جو "صہبا" انہیں بارہ برسوں میں نہ دے سکی تھی.....

وہ رو رہی تھی پھر ایک دم نہ جانے کیوں اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے..... ممما..... اب میں بالکل نہیں روؤں گی..... ہاں..... میں بہادر بیٹی ہوں آپ کی..... نہیں روؤں گی..... بالکل نہیں..... مم..... میں بدلہ لوں گی آپ کی موت کا..... اپنے بابا کو بجاؤں گی..... وہ ناگن ہے..... وہ قاتل ہے..... وہ مسکتے ہوئے بڑ بڑا رہی تھی..... اس کی آنکھوں میں اب آنسوؤں کی جگہ عجیب سی چمک آن ٹھہری تھی.....

☆.....☆

اسکول سے گھر آنے کے بعد وہ بہت بے چین تھی..... بیٹی کھانا کھالو..... سیکنہ نے اسے ادھر ادھر ٹپکتے ہوئے دیکھا تو کھانے کا پوچھ لیا..... نہیں مجھے بھوک نہیں..... آنٹی کہاں ہیں؟ اس کا اشارہ بیگم شاہناز کی طرف تھا..... وہ تو گاڑی لے کر باہر گئی ہیں..... سیکنہ نے بتایا تو اس نے سر ہلا دیا..... ٹھیک ہے آپ جائیں..... سیکنہ بی کے جانے کے بعد وہ چپکے سے بیگم شہباز اعوان کے کمرے میں آئی تھی، وہ تیزی سے الماری کی طرف بڑھی اور جلدی جلدی ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگی، آخر جلد ہی اسے اپنی مطلوبہ چیز مل گئی۔ اس کے نازک سے لبوں پہ بڑی زہریلی مسکراہٹ اُبھری تھی۔

☆.....☆

شام کو بیگم شہباز اعوان شاپنگ بیگز سے لدی پھندی گھر آئی تھیں..... راستے میں انہیں شہباز اعوان کی کال آئی تھی کہ وہ کل شام کی فلائٹ سے واپس آرہے ہیں..... اس کا ذہن ان میں الجھا ہوا تھا۔ اتنی جلدی حالاں کہ انہیں ابھی ایک ماہ مزید رکنا تھا.....

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ٹائمہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

بہر حال وہ جیسا بھی سہی، مگر ”سہبا“ کا سچا عاشق تھا۔
☆.....☆

ملک شہباز اعوان ساریہ کو اپنی ہانہوں میں سیٹھ بلک رہے تھے، خود ساریہ بھی رورہی تھی۔ بابا..... وہ قاتل تھی اور قاتل کی سزا موت ہی ہوتی ہے۔ سو میں نے مار دیا..... بالکل ویسے ہی جیسے انہوں نے آپ کی ”تہنیت“ اور میری ماں کو مارا تھا..... اگر ایسا نہ کرتی وہ آپ کو بھی مار دیتی اور کوئی کچھ نہ کر سکتا۔ بابا مجھے معاف کر دیں..... ساریہ نے ملک شہباز اعوان سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ سہبا بیگم کے چالیسویں کے بعد وہ خود پر اختیار کھو بیٹھی تھی۔ آخر گئی تھی..... اس نے ملک شہباز اعوان کو سہبا بیگم اور مہتاب خان کی ریکارڈ شدہ گفتگو بھی سنائی تھی، مگر سیکینہ بی نے بھی ملک شہباز اعوان کو حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ میں بھی قاتل ہوں نا..... آپ..... آپ مجھے پولیس کے حوالے کر دیں گے..... وہ روتے ہوئے بولی۔ نہیں..... نہیں میری جان..... میری بیٹی..... ہرگز نہیں..... وہ تڑپ اٹھے تھے..... میں نہیں یہاں سے دور لے جاؤں گا، کوئی کسی کو کچھ نہیں بتائے گا..... وہ اس کا ماتھا اور سر بار بار چوم رہے تھے..... ہاں صاحب..... یہ راز راز ہی رہے گا..... آپ بے بی کو اپنے ساتھ لے جائیں..... سیکینہ بی روتے ہوئے بولی تھی۔ ملک شہباز اعوان نے فوراً فیصلہ کر لیا اور یوں کچھ روز بعد ساریہ ہمیشہ کے لیے اپنے بابا کے ساتھ پیچھے روانہ ہو گئی۔

جاتے جاتے وہ اپنی ماں کی قبر پر کچھ دیر کے لیے رکی تھی اور رحمان بابا کو ماں کی قبر کی دیکھ بھال کی خصوصی تاکید کی تھی..... ساریہ چلی گئی..... رحمان بابا آج بھی ”تہنیت“ کی قبر کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور ساریہ کے لیے دعا گو رہتے ہیں..... انہیں یقین ہے کہ وہ بہت جلد آئے گی اپنی ماں سے ملنے..... آپ بھی ساریہ اور اس کی ماں کے لیے ضرور دعا کیجیے گا۔
☆.....☆

پھر..... خیر چھوڑو..... جتنا جلدی یہ قصہ ختم ہوا اتنا ہی اچھا ہے..... ان کا ذہن منصوبہ تیار کر چکا تھا..... سیکینہ بی سیکینہ بی..... پلیز چائے بنا کر لے آئے..... آج تو میں بہت تھک گئی ہوں..... سر میں درد بھی ہے..... سیکینہ بی کو آرڈر دے کر وہ اپنے کمرے میں چلی آئیں..... سیکینہ بی آپ کیا کر رہی ہیں..... ساریہ نے بچن میں جھانکا..... وہ بڑی بیگم صاحبہ نے چائے مانگی ہے، انہیں دینے جا رہی تھی..... اچھا یہ چائے میں دے آتی ہوں، آپ ذرا میری کتابیں سیٹ کر کے رکھ دیں اور ہاں میری پرل کلر کی فراک بھی نکال کر پریس کر دیں۔ ساریہ نے چائے کی ٹرے سیکینہ بی کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا تھا..... جی بہت اچھا..... سیکینہ بی چلی گئیں تو ساریہ نے تیزی سے اپنی پاکٹ سے شیشی نکالی اور چائے میں دو بوند ڈکادی.....

لو بیگم شہباز اعوان..... تمہاری چال تم ہی پر الٹ دی..... ایسے ہی مارا تھا تا تم نے میری ماں کو..... اس نے نفرت بھرے انداز میں سوچا تھا اور چائے کا کپ اٹھا کر بیگم شہباز اعوان کے سامنے آکھڑی ہوئی، وہ اپنی خریدی ہوئی اشیاء کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان کی نظر ساریہ پر پڑی تو اس نے جلدی سے چائے کا کپ آگے کر دیا..... یہ چائے.....

اچھا ٹھیک ہے رکھ دو..... انہوں نے لا پرواہ سے انداز میں کہا تو ساریہ نے آگے بڑھ کر سائینڈ ٹیبل پر کپ رکھ دیا اور بیگم شہباز اعوان کو عجیب سی نظروں سے دیکھتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس کے جانے کے بعد بیگم شہباز اعوان نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔
☆.....☆

چند ہی گھنٹوں بعد بیگم شہباز اعوان کی طبیعت بگڑ گئی۔ انہیں فوراً ایمر جنسی میں لے جایا گیا، جہاں ڈاکٹر زکی سر توڑ کوششوں کے باوجود وہ زندگی کی بازی ہار گئی۔ رپورٹ میں موت کی وجہ ”حرکت قلب“ بند ہونے کی تحریر کی گئی۔ شہباز اعوان اگلی شام کو واپس آ گئے تھے۔ کوئی بھی نہ جان سکا کہ بیگم شہباز اعوان مری نہیں، بلکہ انہیں مارا گیا ہے..... دوسری طرف ان کا آشنا مہتاب خان ان کی موت کی خبر سن کر ذہنی توازن کھو بیٹھا،

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

چوتھی سچ بیانی

خارزار ہے زندگی

آتم منہاں

خارزار سے بھرپور، دکھوں کی گود میں پلتی ہوئی ایک سچ بیانی

گئے تھے اور اب صدیاں بیتنے کے بعد یہاں کے قبائلیوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان قبائلیوں میں شادی ایک طرح کا سودا ہوتی ہے۔ شادی کے موقع پر حق مہر کے نام پر تولوں کے حساب سے سونا اور کنال کے حساب سے زمین لکھوائی جاتی ہے۔ جائداد کا یہی عالم جہیز کے نام پر بھی ہوتا ہے۔

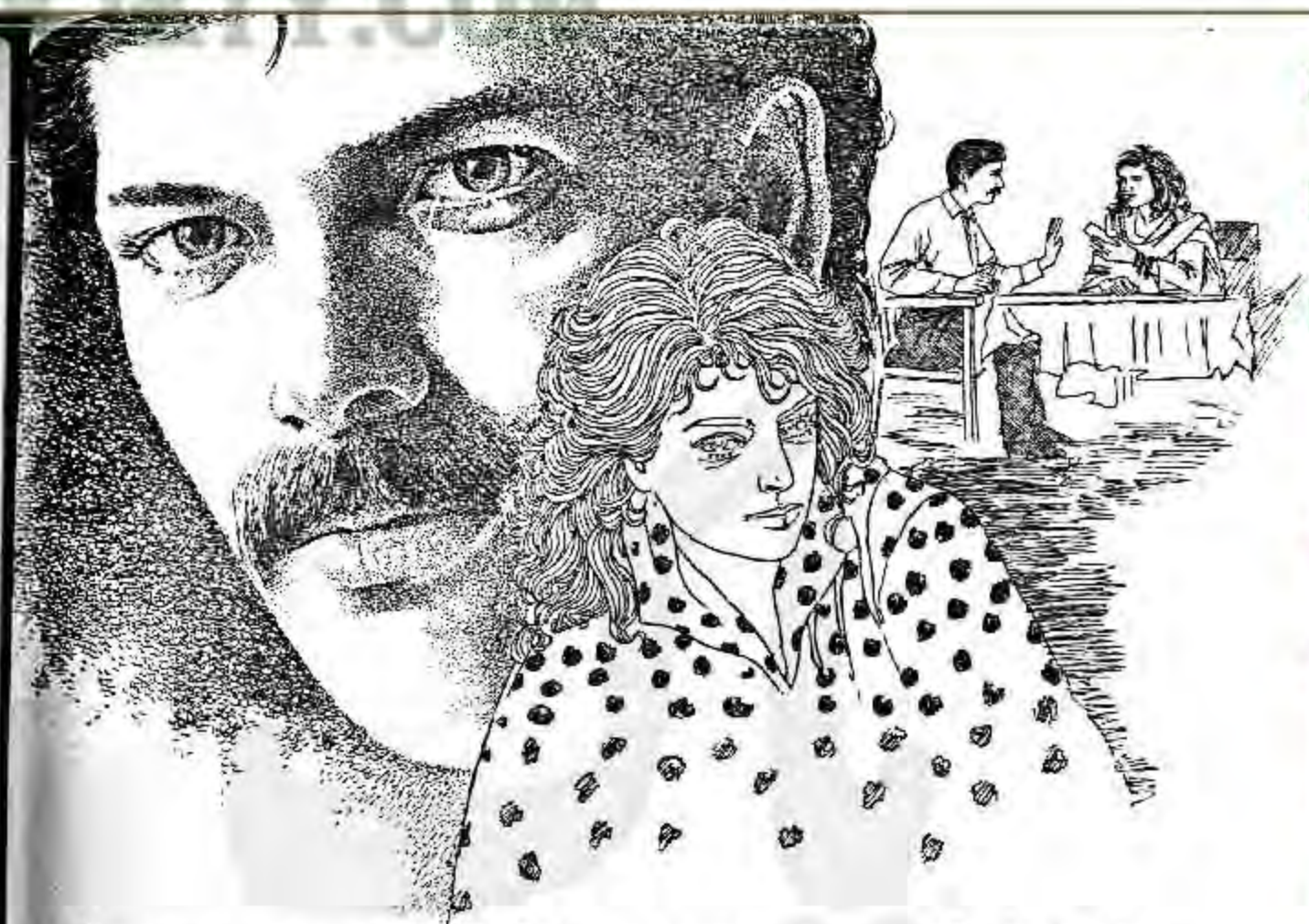
بہر حال نری جہیز کی وبا تو اب ہر جگہ ہی پھیلی ہوئی ہے اور ہندوستان کے رواج کے مطابق بھاری بھر کم جہیز نہ لے کر آنے والی لڑکی کو کھانا پکاتے ہوئے آگ لگنے اور فرش دھوتے ہوئے کرنٹ لگنے کی روایت تو پاکستان کے ہر دوسرے گھر میں عام ہو گئی ہے۔

بعض قبائل میں وہ حق مہر لڑکی کے ماں باپ کی ملکیت ہوتا ہے اور بھاری بھر کم جہیز لے کر جانے والی لڑکی اپنے سسرال میں بھاری رہتی ہے۔ زمین اور جائیداد کی مالک کی نظر میں اپنے مجازی خدا کی حیثیت گھر کے نوکر کی طرح ہوتی ہے۔ یہاں پر لڑکی کی بجائے لڑکے کا رشتہ دیا جاتا ہے اور لڑکی کی پیدائش سے لے کر شادی تک اس کے نان نفقہ پر جو رقم خرچ ہوئی ہوتی ہے، وہ سب نکاح کے وقت

آج جو میں آپ کے لیے کہانی لائی ہوں، وہ ہزارہ ڈویژن کی ایک عام سی اور ہر دوسرے گھر کی کہانی ہے، مگر اس میں بہت بڑا اور خاص سبق ہے۔ یہ کہانی صرف میری ہی نہیں ہے، بلکہ سرحدی قبیلوں کی ہر اس لڑکی ہے، جسے ماں باپ کمائی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اپنی کہانی سننے سے پہلے میں سرحد کے قبائلی علاقوں کے رسم و رواج بتا دوں، تاکہ آپ کو میری اس کہانی کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

سرحد کے بہت سے علاقوں میں اب بھی قبائلی رسم و رواج قائم ہیں اور یہ واقعات زیادہ تر ان ہی قبائلوں میں پیش آتے ہیں۔ ان قبائلوں میں مختلف قبائلوں اور قومیت کے لوگ آباد ہیں۔ ان میں دو کی اکثریت ہے، مقامی اور کابلی۔

کابلی افغانستان سے آئی ہوئی قوم ہے اور مقامی میں زیادہ تر ہندکو اور پشتو بولنے والے لوگ ہیں۔ ہندکو میں اعوان، مملک، جدون، تنولی، یہ ذاتیں شامل ہیں، جب کہ پشتو میں زئی قبائل، مہمند، خٹک، ہوتی، دل آفاق پٹھان ہیں۔ ان میں دل آفاق وہ پٹھان ہیں، جب نادر شاہ نے دلی کو لوٹا تھا، تو یہ اپنی جانیں بچا کر وزیرستان کی پہاڑیوں میں آ کر چھپ



لڑکے کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے سرحدی علاقوں میں زیادہ تر ازدواجی زندگی بد حال ہوتی ہے اور میاں بیوی میں آن بن رہتی ہے۔ گھر بھی بہت کم بس پاتے ہیں۔ بات لڑائی دنگوں کے بعد طلاق کی نوبت تک آ جاتی ہے۔ اب جس لڑکی کا حق مہر زیادہ ہوتا ہے، اسے تو طلاق میں فائدہ ہی فائدہ نظر آتا ہے، کیوں کہ حق مہر کا وہ مال اس کے دوبارہ شادی کرنے پر جہیز کے طور پر کام آتا ہے، مگر لڑکے کو طلاق دینا مشکل ہو جاتا ہے، کیوں کہ شادی کر کے وہ بے حال تو ہو ہی چکا ہوتا ہے، طلاق کے بعد بالکل ہی کنگال ہو جاتا ہے۔ شادی کر کے جب لڑکا کنگال ہوتا ہے تو اس کا خراج ساری زندگی اپنی بیوی کو تنگ کر کے وصول کرتا ہے، جو سیدھی سادی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ روز کے طعنے بیٹنے ان کا مقدر بن جاتے ہیں اور شوہر انہیں اپنی جوتی کی نوک پر رکھتا ہے۔ اس طرح کسی معاملے میں عورت مرد کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن جاتی ہیں تو کہیں مرد اپنی بیوی کا زرخیز غلام۔ ان تمام باتوں کا اثر ان کے بچوں پر بھی پڑتا ہے یا تو وہ جوانی کی حدود میں داخل ہونے تک اپنے ماں باپ

کو جھگڑا کرتے دیکھتے رہتے ہیں یا پھر ساری زندگی ماں سے اپنے باپ کے بارے میں اور باپ سے اپنی ماں کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ یونہی زندگی کی گاڑی چلتی رہتی ہے اور وہ ایسے ہی بڑے ہو جاتے ہیں، مگر یہ صرف قبائلی علاقوں میں ہوتا ہے اور کوہستان تو ہے ہی مختلف قبائلوں میں بٹا ہوا۔ بہت سے خاندانی لوگ ایسے بھی ہیں جو جان تو دے دیتے ہیں، مگر عزت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کا وہی طریقہ ہے جو اسلام کے اصولوں پر قائم ہے۔ میرا تعلق بھی اسی قبائل قبیلے کے خاندان ملک سے تھا۔

☆.....☆

میں ہزارہ ڈویژن کے شہر حویلیاں کے ایک رہائشی خدا بخش علی داد کے گھر 1960ء میں پیدا ہوئی۔ میں اپنے والدین کی گود میں چوٹی بیٹی تھی۔ امی بتاتی تھیں کہ میری پیدائش پر میری پھوپھی بہت روئی تھی۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ ہم صرف چار بہنیں ہی تھیں، بلکہ مجھ سے بڑے چار بھائی بھی تھے، مگر ابو کی پتلی حالت، کسمپرسی میں گھر کا خرچہ چلنے کی وجہ بچوں کی کثرت اور

پھر چار بیٹیوں کا بوجھ ابو کے ناتواں کندھوں پر آ گیا۔ اس بات کے کارن میری پیدائش میرے والدین کے لیے کوئی خوشی کا باعث نہیں بنی۔ میں اکثر اپنے آپ سے یہ سوال کرتی ہوں کہ ہمیشہ غریب کے ہی بچے کیوں زیادہ ہوتے ہیں۔ میری آمد میری پھوپھی کے لیے اتنے بڑے غم کا سبب بنی کہ وہ یہ صدمہ دل سے لگائے سال بھر کے اندر دنیا سے چل بسی، شاید یہ ان کے حق میں بہتری ہو، ورنہ میرے بعد چھوٹی بہن کی خبر تو ان کے لیے مزید باعثِ رحمت بنتی، پھر اسے زیادہ اذیت سے مرنا پڑتا۔ چھوٹی بہن کے بعد میرا ایک اور بھائی دیا میں آیا، اس طرح دس بہن بھائی کی طویل لائن اور ایک تہا پاپ کمانے والا صحیح تان کر زندگی کی کہانی چلتی رہی۔

☆.....☆

اسی کسمپرسی کی حالت میں گزارا کرتے ہوئے میری دوسرے نمبر کی بہن شائہ باجی کا رشتہ بہت امیر گھرانے سے آ گیا۔ اگر عالم بھائی حسین، خوبرو اور دولت مند تھے تو شائہ باجی بھی کم حسین نہیں تھیں۔ عالم بھائی نے انہیں برادری کی ایک شادی کی تقریب میں دیکھا اور دل ہار بیٹھے۔ ان دنوں شائہ باجی آنکھوں کلاس میں اور شاہانہ باجی انٹر میں پڑھتی تھیں۔ ابو نے اچھا رشتہ دیکھ کر فوراً ہاں کر دی۔ سب سے پہلے شاہانہ باجی اس رشتے کے خلاف ہوئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ شائہ کی عمر ابھی بہت کم ہے۔ اس سال وہ تیرہ سال کی ہوئی ہے، مگر ابو کا کہنا تھا کہ جس کا اچھا رشتہ آ جائے، اس کا کردار ملے گا۔ میرے اوپر ابھی چار اور بیٹیاں ہیں۔ یہاں ابو کی ضد کے آگے باجی ہار گئیں اور شائہ باجی کو رخصت ہو کر عالم بھائی کے گھر چلی گئیں، مگر باجی کو سکون نہیں ملا۔ وہ ہر ریل اپنی ہار پر کڑھتی رہتی تھیں، کیوں کہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان سے پہلے چھوٹی بہن گھر سے رخصت ہو۔ وہ ہر وقت شائہ باجی کو تنگ کرنے کے منصوبے بناتی۔ جب بھی شائہ باجی میکے آتیں، باجی لڑنے کا کوئی موقع محل ہاتھ سے نہ جانے دیتیں۔ شائہ باجی پر طنز کے تیر چلا تیں۔ بات بے بات ای سے لڑتیں۔ گھر میں ہنگامہ کھڑا کر دیتیں۔

عالم بھائی کے سامنے شائہ باجی کی ذات کو نشانہ بنا کر انہیں سسرال کے طعنے مارتیں۔ عالم بھائی یہاں تو سن کر چلے جاتے، مگر گھر جا کر شائہ باجی کو سخت سناتے۔ ظاہر ہے لاکھ شائہ باجی خوب صورت تھیں، مگر عالم بھائی بھی ہر لحاظ سے ایک مکمل انسان تھے اور پھر غیرت مند بھی۔ وہ کیسے سسرال میں اپنی تذلیل برداشت کرتے۔ بے چاری شائہ باجی دہری مصیبت میں گرفتار ہو جاتی۔ میکے آتیں تو باجی ان کا بیٹھنا دو بھر کر دیتیں اور سسرال میں عالم بھائی کی باتیں برداشت کرتیں، پھر جب چار سال گزر جانے کی باوجود بھی شائہ باجی ماں نہ بن سکیں تو ساس مندوں نے بھی انہیں ستانا شروع کر دیا۔ شادی کے پانچویں سال اولاد نہ ہونے کی وجہ سے شائہ باجی طلاق کا داغ لگائے صرف اٹھارہ سال کی عمر میں واپس باپ کی دہلیز پر آ بیٹھیں، تو بھی باجی نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور مسلسل اپنے جملہ بازی سے انہیں ستائے رکھتیں۔

☆.....☆

شائہ باجی کی طلاق میں کچھ تو ان کے اولاد نہ ہونے کا قصور تھا اور بہت کچھ باجی کی حرکتوں کا، کیوں کہ باجی کی باتوں سے تنگ آ کر عالم بھائی نے تو سسرال آنا چھوڑ ہی دیا تھا، مگر باجی بہانے سے شائہ باجی کے گھر جانا شروع ہو گئی تھیں، پھر جب سال بھر بعد ہی شائہ باجی چھوٹے کا ٹھیلہ لگانے والے زلیل بھائی کے ساتھ ان کے مٹی مٹی کے پے ہوئے گھر میں بیاہ کر چلی گئیں، تب باجی کے ماتھے کے تل کچھ کم ہوئے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔

مگر انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ خدائی کا دعویٰ کرنے والے فرعون، نمرود اور شدا کو غرق کرنے والی صرف ایک اللہ کی ذات تھی، جس کی طاقت کے آگے کسی طاقتور کا زور نہیں چلتا۔

☆.....☆

شائہ باجی کی پہلی شادی کے بعد ہی ابو نے اپنے ایک دوست کے مشورے پر کاروبار کرنے کا سوچا اور بینک سے لون لے کر ایک جھینس خرید لی اور اس کے دودھ سے کاروبار کرنا شروع کیا۔ ”نیت

ثابت منزل آسان“ والی کہادت ابو کو بڑی موافق آئی۔ اللہ نے کاروبار میں برکت دی، یوں اک سے دو اور دو سے چار بھینسیں ہوئیں اور ایک دن ہمارا بھینسوں کا باڑہ ہو گیا۔ باجی نے انٹر کے بعد قریبی پرائیویٹ اسکول میں ٹیچری کی جاب کر لی، جس سے ہماری گزر اوقات اچھی ہونے لگی، اس کے ساتھ ساتھ نرسنگ کا کورس بھی کرتی گئیں۔ گھر کے حالات میں بہتری آئی تو ابو کا رو بار کے ساتھ ساتھ زمینیں بھی خریدنے لگے، جو اس زمانے میں بہت سستی ہو کر تھیں۔ گھر میں فراوانی آئی تو ہماری ماں کی آنکھوں پر لالچ کی پٹی چڑھ گئی۔ انہوں نے اچھے دنوں میں کھو کر اپنے برے دنوں کو فراموش کر دیا۔ غرور کا نشہ ان کے سر چڑھ کر بولنے لگا۔ خاندان میں اپنے آپ کو بہت اعلیٰ تصور کرنے لگیں اور اپنے بچوں کے رشتے کے لیے ایسے گھرانے دیکھنے لگیں، جو ان کے مد مقابل سے بھی کہیں بڑھ کر ہوں۔

☆.....☆

ابو نے اپنی حیثیت کے مطابق اپنی اولاد کو تعلیم دلوائی، مگر بڑے بھائی ابو کے لیے ہمیشہ مصیبت کا سبب بنے رہے، کیوں کہ ابو جو پسیا ان کی پڑھائی لکھائی پر لگاتے، وہ ان کی محنت سے کمایا ہوا ہوتا۔ لاکھ کوششوں کے باوجود بھائی میٹرک سے آگے تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ آج کل کے دور میں جب اعلیٰ تعلیم یافتہ کو کوئی نوکری نہیں دیتا تو میٹرک پاس کو کیا ملنی ہے، مگر اس وقت بھی میٹرک پاس کو نوکری میرٹ کی بنیاد پر ملتی تھی اور بھائی نے تو میٹرک بھی بس رو دھو کر کیا تھا۔ نوکری کی طرف سے مایوس ہو کر ابو نے بھائی کو کاروبار کرایا، مگر ہر دفعہ بھائی نے کاروبار میں لگایا ہوا پسیا پانی میں ڈبو دیا، نتیجہ وہی لکیر کے فقیر۔

بھائی کو پیسے کی اہمیت اس وقت پہنچ چکی جب ابو نے ان کی حرکتوں سے عاجز آ کر مجبوراً انہیں گھر سے نکال دیا، تب انہیں احساس ہوا کہ پسیا کتنی محنت سے کمایا جاتا ہے۔ جب اپنے سر پر سورج کی پیش پڑی تو باپ کے محنت سے بنائے ہوئے ساتیان کا احساس ہوا، مگر گھر سے نکالے جانے کی وجہ سے بھائی ابو سے

ہمیشہ خائف رہتے۔ انہوں نے کراچی جا کر اپنی قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ شوکی قسمت کراچی پہنچ کر بھائی کو میٹرک کی ڈگری کی بنیاد پر ایک اچھے اور بڑے ادارے میں چپراسی (نائب قاصد) کی نوکری مل گئی۔ ان کی گزر اوقات اچھی ہونے لگی تو انہوں نے وہیں کراچی کی لڑکی سے شادی کر کے اپنا گھر بسالیا، یوں ای ابو کی ان کی طرف سے فکر ختم ہوئی، مگر بھائی ہمیشہ اسی ابو کے خلاف رہے اور امی بھائی کے خلاف رہیں، کیوں کہ وہ اپنی پسند کی بہو نہ لائیں۔

☆.....☆

امی نے پانچ بیٹیوں کے ساتھ پانچ بیٹے بھی پیدا کیے تھے، یوں وہ اپنے سسرال اور میکے دونوں میں بھاری رہیں اور ابو پر ان کا زور بھی بہت چلتا تھا۔ امی کے فیصلے کے آگے ابو کی ایک بات نہیں چلتی تھی، جس کی وجہ سے امی نے اپنے بچوں کے رشتے کرتے وقت اپنی من مانی کی۔ امی کی ضد اور لالچی طبیعت کی وجہ سے ان کے بچوں کی زندگی ہمیشہ جہنم بنی رہی۔ بھائیوں کی شادیاں ان کی مرضی کے خلاف امی نے اپنی منشاء سے اپنی ان بھانجی بھتیجیوں سے کیں، جو جہیز کے نام پر ٹرک کے ٹرک اور زمین و جائیدادیں لے کر آئیں۔ اب چاہے وہ بھائیوں سے دس دس سال بڑی تھیں، امی کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہاں وہ اسلام کی ہدایت دیتیں کہ ہمارے پیارے رسول ﷺ نے بھی تو بڑی عمر کی عورت سے شادی کی تھی۔ اس معاملے میں انہیں اسلام خوب نظر آتا، مگر جب اولاد کی مرضی معلوم کرنے کا وقت آتا تو نہ جانے ان کا اسلام کہاں سو جاتا۔ انہیں یہ خبر نہیں ہوتی کہ ہمارے رسول ﷺ نے بے سہارا عورت کو سہارا دینے کے لیے بڑی عمر کی عورت اور بیوہ، طلاق یافتہ سے شادی کی تھی، نہ کہ ان کی دولت کے لالچ میں اور اسلام نے نکاح کے لیے لڑکی کی ہاں کو کتنی اہمیت دی ہے کہ پہلے لڑکی کی مرضی معلوم کی جاتی ہے، پھر لڑکے سے اقرار لیا جاتا ہے۔

جب باجی کا نرسنگ کا کورس مکمل ہوا تو انہوں نے پشاور کے ریڈی لیڈنگ اسپتال میں نرس کے فرائض

انجام دینے کے لیے ٹیچری کو خیر باد کہہ دیا۔ اسی جاب کے دوران باجی کی ملاقات اشتیاق نامی ڈاکٹر سے ہوئی۔ وہ زمیندار خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اپنے ماں باپ کی دو اولادوں میں بڑا تھا۔ اس سے چھوٹا اشتیاق تھا۔ باجی اور اشتیاق محبت کے رشتے سے گزر کر شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ باجی نے دس برس نوکری کی، یوں گھر کے حالات میں بہتری آئی تو باجی کی اہمیت ماں کی نظر میں اور بھی اعلیٰ ہو گئی، پھر جب باجی نے اشتیاق سے شادی کی ضد کی تو ابو باجی کی شادی کے خلاف ہوتے ہوئے بھی بے چوں و چرا مان گئے، کیوں کہ پسیا اچھے اچھوں کی زبان بند کر دیتا ہے۔ باجی کی شادی کے ابو اس لیے خلاف تھے کہ اشتیاق غیر برادری سے تعلق رکھتا تھا، مگر پھر بھی باجی کا پسیا ابو کے ارادوں پر حاوی ہو گیا اور امی کو تو نہ غیر برادری پر اعتراض تھا اور نہ ہی پسند کی شادی پر، کیوں کہ امی کو صرف اشتیاق بھائی کا پسنا نظر آیا تھا۔ امی کا خیال تھا کہ اتنے میسے والے آدمی کو باکر شاہانہ یقیناً خوش رہے گی، مگر امی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ماں باپ اپنی اولاد کو پیسے سے ہر چیز خرید کر دے سکتے ہیں، مگر ان کا نصیب نہیں خرید سکتے۔ باجی تو شادی کے وقت سولہ سال کی نوخیز کلی تھی اور میٹرک کا امتحان دے رہی تھی۔ میرے کچے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے پسیا بہت اہمیت کا حامل ہے، جوں جوں میں بڑی ہوتی گئی، میرے دماغ میں یہ بات جڑ پکڑتی گئی۔

شادی کے پانچ سال بعد اشتیاق بھائی کو ان کے دوست کے توسط سے دہلی میں اعلیٰ عہدے پر جاب مل گئی۔ اشتیاق بھائی نے یہ سنہری موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا، فوراً ہی اس آفر کو قبول کر کے پاکستان کی نوکری چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔ ان پانچ سالوں میں باجی دو بیٹیوں کی ماں بن چکی تھیں اور ان دنوں تیسرے بچے کی آمد کے انتظار میں تھیں کہ انہیں اشتیاق بھائی کی دوسری شادی کی خبر ملی اور اس بیوی سے ان کا ایک بیٹا بھی ہے۔ دو بیٹیوں کے بعد شاید اشتیاق بھائی کو بیٹے کی خواہش ہو اور ان کی خواہش ضرورت بن گئی ہو۔ بہر حال باجی پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ وہ دن رات رونی

رہتیں۔ ابو امی انہیں سمجھاتے، مگر ان کی ایک ہی رٹ تھی کہ ”مجھے ہر حال میں دینی جانا ہے۔“ بہر حال ابو اور بھائیوں نے کوشش کر کے باجی کو دینی بھیج دیا۔ وہاں جا کر واقعی یہ بات درست ثابت ہوئی کہ اشتیاق نے وہاں دوسری شادی کی ہوئی ہے۔ اگر باجی چاہتی تو دل سے اس عورت کو قبول کر سکتی تھیں، مگر یہ عورت کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ ہر چیز برداشت کر لیتی ہے، مگر اپنے شوہر کی محبت کی تقسیم برداشت نہیں کر پاتی۔ باجی بھی ایک عورت تھیں، وہ بھی دوسری عورت کو برداشت نہیں کر پائیں۔ دوسری عورت بھی وہ جوان کی سوتن ہو، لہذا باجی نے ابو اور بھائیوں کے رعب و دبدبہ کو بنیاد بنا کر اشتیاق پر اپنی دوسری بیوی کو طلاق دینے کے لیے زور ڈالا۔ اشتیاق بھائی نے باجی سے کہا۔

”میں اس عورت کو طلاق نہیں دوں گا۔ وہ میرے بیٹے کی ماں ہے۔ تم ساتھ رہنا چاہتی ہو تو رہو، میں تمہارا بھی خرچہ برداشت کروں گا۔ اگر نہیں رہنا چاہتیں تو بے شک طلاق لے لو۔“

جب اشتیاق بھائی نہیں مانے تو باجی نے دھمکیوں سے کام چلانا چاہا، مگر ان دھمکیوں کا بھی اشتیاق بھائی پر کوئی اثر نہیں ہوا، آخر تھک ہار کر باجی خاموش ہو گئیں، کیوں کہ بچیوں کی خاطر طلاق کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ اس وجہ سے دہلی جانے کے بعد بھی کبھی سکون سے بیٹھ نہ پائیں۔

میاں بیوی گاڑی کے دو پیسے ہوتے ہیں، جو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، لہذا دونوں میں سے کسی ایک میں چلک آ جائے تو پھر گاڑی اپنی روانی سے نہیں چلتی۔ اس طرح میاں بیوی میں سے کوئی ایک دورے کو دھوکہ دے دے تو پھر دوسرے کا اس پر سے اعتبار ختم ہو جاتا ہے، یہی کچھ باجی کے ساتھ ہوا۔ اشتیاق بھائی کی اس حرکت کے بعد وہ پاکستان آنا نہیں چاہتی تھیں، مگر بچیوں کی تعلیم کا مسئلہ تھا، کیوں کہ وہاں رہ کر وہ پاکستانی ماحول اور زبان سے بالکل ہی کٹ جاتیں۔

جب امی نے اشتیاق بھائی کو اتنا پیسے والا دیکھا تو لالچ میں آ کر میری تیسری بہن رضوانہ کا رشتہ

اشتیاق بھائی کے چھوٹے بھائی اشفاق کے لیے دے دیا۔ رضوانہ اس بات کے لیے بالکل تیار نہیں تھی اور نہ ہی اشفاق سے شادی کرنا چاہتی تھی، مگر وہی امی کی لالچ طبیعت جس کے آگے رضوانہ کی ایک نہ چلی۔ اشتیاق بھائی کی حقیقت معلوم ہو جانے کی باوجود امی نے رضوانہ کا سودا کرنے میں دیر نہ کی۔ اشفاق کو نوکری ملے چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ وہ شادی کا اتنا خرچہ برداشت نہ کر سکا۔ شادی پر کنگال ہو جانے کی باعث وہ رضوانہ کو تنگ رکھتا۔ رضوانہ کو طعنے دیتا کہ ”تمہاری ماں نے تمہارے بدلے حق مہر کے نام پر لاکھوں روپے مجھ سے اینٹھ لیے۔“ کیوں کہ وہ بھی امی کی لالچی طبیعت کو سمجھ گیا تھا۔ بات لڑائی دنگوں کے بعد طلاق تک جا پہنچی۔ ایک دن غصے میں آکر اشفاق نے رضوانہ کو ایک طلاق دے ڈالی، جس سے ناراض ہو کر رضوانہ واپس میکے آئی تھی۔ رضوانہ نے امی کے خوب لٹے لیے۔ اپنی زندگی پر یاد ہو جانے کی وجہ سے رضوانہ امی سے خائف رہنے لگی تھی۔ شادی کا بندھن اسی کی زندگی میں بھی کوئی خوشی کا پیغام لے کر نہیں آیا اور یہ سب کچھ امی کی لالچی نظر کی وجہ سے ہوا تھا، پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ وہ بھی اتنے عرصے میں دو بیٹیوں کی ماں بن چکی تھی۔ ایسی حالت میں طلاق لینا اور شوہر کے ساتھ رہنا، دونوں ہی عذاب ہوتے ہیں۔ مرد کی قسمت سے اولاد ہوتی ہے اور قصور وار عورت کو ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ یہ تو دنیا کا دستور ہے۔ اشفاق بھی اشتیاق کا ہی بھائی تھا، وہ کیسے بیٹے کی چاہ نہیں رکھتا، مگر رضوانہ کی فطرت باجی کی طرح نہیں تھی۔ باجی کے بعد رضوانہ کی یہ حالت دیکھ کر مجھے امی پر بہت غصہ آتا۔ باجی نے تو اپنی پسند سے شادی کی تھی اور پھر شبانہ باجی کے ساتھ انہوں نے جو کچھ کیا، شاید اس کی انہوں نے سزا بھگتی، مگر رضوانہ کا کیا قصور تھا کہ امی نے اسے بھی اپنی خواہش کی سمیٹ چڑھا دیا۔ رضوانہ کی حالت دیکھ کر میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا، کہ ”میں اپنی زندگی کو امی کے ہاتھوں برباد نہیں ہونے دوں گی اور اپنی پسند سے ہی شادی کروں گی، چاہے مجھے امی کے کتنا ہی خلاف جانا پڑے۔“ رضوانہ نے اشفاق سے

عارضی طور پر علیحدہ ہو کر پشاور کے ریڈی لیڈنگ اسپتال میں ریسپنڈنٹ کی جاب کر لی تھی، ساتھ ہی وہ نرسنگ کا کورس بھی کرتی گئی، تاکہ بعد میں اگر اشفاق کی طرف سے کوئی پریشانی ہو تو اپنا اور اپنی بچیوں کا پیٹ تو پال سکے۔ اس کی قسمت کہ اسے رہنے کے لیے اسپتال کے اندر ہی جگہ مل گئی تھی۔

☆.....☆

زندگی کے اتنے سال میں، میں ماسٹرز میں پہنچ چکی تھی۔ میرے سامنے گھر کے سارے حالات تھے۔ میں بچپن سے ہی اپنی ماں کی جو حالت دیکھ رہی تھی، وہ میرے لیے ناقابل قبول تھی۔

اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور سے ماسٹرز کرنے کے بعد جب میں نکلی تو میرے پاس ماسٹرز کی ڈگری کے ساتھ ساتھ شاہ زیب کی محبت کی یادیں بھی تھیں اور ساتھ ہی جینے کے وعدے اور ساتھ مرنے کی قسمیں بھی تھیں۔ شاہ زیب اور میرا شعیب ایک ہی تھا۔ اسے بھی پولیٹیکل سائنس بہت پسند تھی اور میرا فیورٹ سبجیکٹ بھی یہی تھا۔ ہم لوگ گھنٹوں اس موضوع پر بحث کیا کرتے تھے۔ کبھی اس کی جیت ہوتی اور کبھی میری، اسی ہار جیت کی وجہ سے میرے من میں شاہ زیب کی محبت کی میٹھی میٹھی انگڑائیاں جنم لیتیں۔ ہم دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ شاہ زیب میرا دور پڑے کا رشتے دار تھا، مگر ایک ہی محلے میں رہنے اور ساتھ اسکول آنے جانے کی وجہ سے بھی ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح سے جانتے تھے۔ ہماری یہ بچپن کی دوستی کب محبت میں بدلی پتا ہی نہ چلا۔ جب انٹر کرنے کے بعد ہم نے ایک ساتھ یونیورسٹی میں قدم رکھا تو ہمیں احساس ہوا ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے، یوں ہماری دوستی محبت کے مضبوط بندھن میں بندھ گئی۔ ہمارا ماسٹرز تک ساتھ رہا۔ ماسٹرز کرنے کے بعد میں نے ایل ایل بی میں اینڈیشن لے لیا، جب کہ شاہ زیب نے ایک ملٹی میشل کمپنی میں جاب کر لی اور اسلام آباد شفٹ ہو گیا، یوں ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ کم ہو گیا، مگر فون پر بات روزانہ ہوتی تھی۔

☆.....☆

شاہ زیب کو جب بھی مجھ سے ملنا ہوتا، وہ ویک اینڈ پر پشاور چلا آتا۔ میرے گھر والے تو حویلیاں میں تھے، اس لیے شاہ زیب کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ ان دنوں میں ایل ایل بی کے دوسرے سال میں بھی کہ مجھ پر شاہ زیب کی شادی کا انکشاف ہوا۔ مجھ پر تو غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میں نے غم و غصہ کی حالت میں کئی مرتبہ شاہ زیب کا نمبر ملا یا، مگر ہر دفعہ یا تو آنکھ ملتا یا پھر کوئی اٹھاتا نہیں۔ اس کے بعد کافی مرتبہ میں نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی، مگر کبھی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ سال پر سال بیتتے رہے۔ میں اپنی محبت کا ماتم کر کے دل بھر کر کرتی رہی۔ اس کے بعد میرے کافی رشتے آئے، مگر میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اپنی زندگی کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ شاہ زیب کے دھوکہ دینے اور امی کا اپنی اولاد سے ایسا رویہ رکھنے کی وجہ سے میرا رشتوں پر سے اعتبار ہی اٹھ گیا تھا۔ اس واقعے کے بعد میری انجکشن انٹی متاثر ہوئی کہ کہاں کا ایل ایل بی اور کیسی ڈگری، پڑھائی سے دل ہی اچاٹ ہو گیا۔ ذہن ہر وقت مختلف سوچوں کی طرف بھٹکتا رہتا۔ زندگی میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ میری زندگی میں ایسا آندھی طوفان آیا کہ میرا سب کچھ اڑا کر لے گیا۔ ان مسائل میں گھر کر میری تعلیم ادھوری رہ گئی۔ زندگی کے پانچ برس یوں بیت گئے کہ پتا ہی نہ چلا، مگر یہ پانچ برس میرے لیے پانچ صدیاں ثابت ہوئے۔ میں لکھ لکھ مرنی اور لکھ لکھ جیتی۔ ان پانچ برسوں میں شاہ زیب دو بچوں کا باپ بن چکا تھا، مگر میں نے سنا تھا وہ اپنی زندگی سے خوش نہیں ہے۔ میں نہ اس بات سے خوش ہوئی تھی اور نہ افسردہ، مگر خاموش ہو کر رہ گئی اور اپنی زندگی سے سمجھوتا کر لیا تھا کہ ان ہی دنوں ہمارے یہاں ٹیلی فون لگ گیا۔ یہ بھی باجی نے اپنے خرچے سے لگوا دیا تھا۔ ٹیلی فون کی آمد نے ہماری پھمڑی ہوئی محبت کو دوبارہ ملا کر پرانی یادوں کو تازہ کر دیا اور اسی طرح محبت کی وہ چنگاری جو پانچ سال کی گرد میں دب کر ٹھنڈی ہو چکی تھی، بھڑک کر شعلہ بن گئی۔ ہوا کچھ یوں کہ اس دن میں ناشتے سے فارغ ہو کر چھت پر بیٹھی اپنے ماضی کو کرید رہی تھی کہ

چھوٹی بہن نے آکر کہا۔ ”شرمین تمہاری سہیلی کا فون ہے۔“ میں سوچوں کے تانے بانے بچھوٹی چچے آئی کہ اتنے سال بعد میری کس سہیلی نے مجھے یاد کیا ہے، لیکن دوسری طرف کی آواز سن کر میرے ہونٹوں کی روگی ہوئی تھی دوبارہ آباد ہو گئی اور میرے مردہ وجود میں ایک دفعہ پھر جان آ گئی۔ اس آواز کو تو میں لاکھوں میں پہچان سکتی تھی، کیوں کہ وہ آواز کسی اور کی نہیں، شاہ زیب کی تھی۔ شاہ زیب اپنے کیے پر بہت شرمندہ تھا۔ اس نے مجھ سے معافی مانگنی تھی۔ گلے شکوے کے بعد اس نے بتایا کہ ”میں اپنی بیوی سے خوش نہیں ہوں۔ میرے ماں باپ نے یہ شادی زبردستی کر دی تھی۔ اب میں تم سے شادی کا خواہش مند ہوں۔ اگر تم راضی ہو جاؤ تو میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں گا۔“

☆.....☆

ملنے کا راستہ کھلا تو پھر کھلتا ہی چلا گیا اور میں اپنے انجام اور اس بات سے بے نیاز کہ شاہ زیب اب شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے، اپنی محبت کی اندھی راہوں پر چلنا شروع ہو گئی، مگر اس کے لیے مجھے کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے گھر سے نکلتا پڑتا، کیوں کہ روزانہ تو میں گھر سے اسے فون نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے کبھی گھر سے اور کبھی پی سی او سے کرتی۔ کبھی وہ گھر کے نمبر پر خودی فون کر لیتا۔ ایک دن امی نے مجھے اس سے باتیں کرتے ہوئے میری باتیں سن لیں۔ انہوں نے مجھے بہت برا بھلا کہا۔ اس واقعے کے بعد میں محتاط ہو گئی اور کچھ عرصہ اس سے بات نہیں کی، تاکہ امی کا مجھ پر سے اعتبار ختم نہ ہو۔ جب امی کو اطمینان ہو گیا تو میں آئندہ کا لاکھ مل سوچنے لگی اور ایسے منصوبے بنائی، جس میں مجھے مسلسل گھر سے باہر رہنا پڑے یا پھر صبح سے شام تک کی کوئی ایسی جاب ہو، جس میں گھر میں گھر یہ کم ٹائم دے سکوں، پھر میں نے اپنی ایل ایل بی کی تعلیم مکمل کرنے کا سوچا، تاکہ ساتھ میں پریکٹس کے بہانے زیادہ سے زیادہ باہر رہ سکوں۔ یہ میری تقدیر کہ ان ہی دنوں باجی کی بچیوں کا مسئلہ درپیش آ گیا۔ اس طرح مجھے اپنے مسئلے کا حل نظر آیا، مگر میں اپنے دل کی بات زبان تک نہ لاسکی، پھر جب امی نے باجی کے مسئلے کو حل کرتے ہوئے کہا کہ ”تم اپنے

خرچ پر اپنے بھائیوں کو دینی شفت کراؤ اور بدلے میں شرمین تمہاری بچیوں کی ذمہ داری اٹھائے گی۔ تم بچیوں کی طرف سے بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ امی کی اس بات سے ایک طرف تو مجھے اپنا منصوبہ کامیاب ہوتا نظر آیا، دوسری طرف امی پر بے انتہا غصہ آیا کہ یہاں پر بھی امی نے لالچ کی ہی بات کی۔

میری عمر تیس کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ اس عمر میں ماں اپنی بیٹیوں کی شادی کی بات سوچتی ہیں نہ کہ انہیں کمانی کا ذریعہ بنانے کا۔ امی نے اپنے بچوں کی اگر پروا کی بھی تو صرف پیسے کے حصول کے لیے اور اولاد کو صرف پیسا بنانے کی مشین سمجھا۔ میرے لیے امی نے یہ نہیں سوچا کہ اس کی عمر کل گئی تو کون ہوگا جو مجھے قبول کرے گا۔ ماں تو بیٹیاں پیدا کرتے ہی ان کے بیاہ کے خواب دیکھنے لگتی ہیں اور لڑکیوں کے جوان ہوتے ہی پاؤں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں، مگر یہ ہماری کیسی ماں تھی جسے صرف پیسے کی ہوس تھی۔ اولاد کی خوشی ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ امی کے اسی رویے کی وجہ سے میں نے شاہ زیب کی خاطر اپنی ماں سے ٹکر لینے کا سوچ لیا تھا اور کیوں ٹکر نہ لیتی۔ جب ماں کو ہمارا خیال نہیں تو پھر اولاد کو تو باغی ہونا ہی تھا۔ گھر میں جوان بیٹیاں بیٹھی تھیں اور ہماری ماں مزے سے خواب خرگوش کی نیند لے کر امیر بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ میں نے امی کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں امی کے اس فیصلے کو خوشی خوشی قبول کر کے بچیوں کو لے کر پشاور باجی کے اس گھر میں شفت ہو گئی، جو باجی نے اپنی جاب کے درمیان بنایا تھا۔ وہاں میں نے ایل ایل بی میں داخلہ بھی لے لیا اور شاہ زیب سے ملنے کا راستہ بھی نکال لیا۔

☆.....☆

میں یہ سوچ کر مطمئن تھی کہ کبھی تو امی کا دل میری خدمات دیکھ کر سوج جائے گا، مگر امی بھی نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھیں کہ انہیں پیسے کے آگے اور نوٹوں کے پیچھے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اب شاہ زیب اسلام آباد سے ہر ویک اینڈ کی رات کو مجھ سے ملنے آتا اور چھٹی گزار کر صبح چلا جاتا۔ یہ لمحات میرے لیے عید سے کم نہیں ہوتے۔

ہمیں اس طرح ملتے ہوئے تقریباً دو سال ہو چکے تھے۔ ایک دن میں نے امی سے شاہ زیب کے لیے بات کی تو امی یہ بات سن کر آگ بگولہ ہو گئیں۔ انہیں اعتراض اس بات پر تھا کہ شاہ زیب شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے۔ میں نے امی کو ہر ممکن طریقے سے یقین دلایا کہ شاہ زیب میری خاطر اپنی پہلی بیوی کو چھوڑنے کے لیے تیار ہے۔ اس کی شادی ماں باپ نے زبردستی اس کی مرضی کے خلاف کر دی تھی، مگر امی اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھیں ان کا کہنا تھا کہ ”کسی بھی طرح سے کی تھی، اب وہ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے، اس لیے تمہیں اس کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے۔“ مگر میں اپنی ہاری ہوئی محبت کو، جو جیت کی صورت میں ایک بار پھر مجھے ملنے والی تھی، اسے دوبارہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔ امی کے منع کرنے کی باوجود میں نے اپنی روش قائم رکھی اور باتوں باتوں میں امی کو شاہ زیب کے لیے راضی کرتی، مگر امی بھی اپنی ضد کی پکی عورت تھیں۔ وہ میری باتیں سنیں ان سنی کر دیتیں، بلکہ میرے رشتے کے لیے ایسے گھرانوں میں ہاتھ پیر مارتیں، جہاں سے انہیں حق مہر میں لاکھوں کی جائیداد ملے، شاید وہ اپنے فیصلے میں سچ ہوں، کیوں کہ بیوی بچے والے مرد کو تو کوئی بھی اپنی بیٹی نہیں دے سکتا، لیکن میں امی کی ہی اولاد تھی۔ میں بھی اپنی ضد سے بٹنے کو تیار نہیں تھی۔ میرا امی سے صرف ایک ہی مطالبہ تھا کہ ”میری شادی کر دو اور وہاں کرو جہاں میں چاہتی ہوں۔“ امی کسی قیمت پر بھی اس رشتے پر راضی نہیں تھیں۔ میری باتیں سن کر کہیں کہ ”تمہاری انہی اتنی عمر نہیں ہوئی ہے کہ تم ماں کو مشورے دو۔ جب وقت آئے گا تو ہم خود تمہارے لیے رشتہ دیکھ لیں گے۔“ امی تو یہ کہہ کر چھوٹ جاتیں، مگر میں ہر بل انکاروں پر لوٹی رہتی۔

☆.....☆

وقت گزرتا رہا میں اپنی روش پر قائم رہی۔ میں نے اپنے منصوبے میں رضوانہ اور بڑے بھائی کو بھی شامل کر لیا تھا۔ وہ دونوں تو تھے ہی امی کے خلاف، فوراً میرے منصوبے میں شامل ہو گئے اور ایک دن میں نے امی ابو سے چھپ کر رضوانہ اور بھیا کی ہمراہی میں خفیہ طور

پر شاہ زیب سے نکاح کر لیا، کیوں کہ اس کے بعد امی کو انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ بڑے بھائی صرف میری خاطر کراچی سے آ گئے، مگر انہوں نے میرے نکاح کا گواہ بننے سے انکار کر دیا، شاید اب تک ان کے دل میں امی ابو کا خوف تھا، لہذا گواہوں کا انتظام بھی رضوانہ نے ہی کیا، یوں رضوانہ پر میرا اعتماد مزید بڑھ گیا۔ میں نے عہد کر لیا تھا کہ اگر امی نے مجھے شاہ زیب کے ساتھ قبول نہیں کیا، تو میں اپنے گھر میں سوائے رضوانہ کے کسی سے رشتہ نہیں رکھوں گی۔ رضوانہ نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ اس کے مشورے پر ہی میں نے باجی سے کہا: ”مجھے کچھ رقم بھیجو، میں یہاں گھر کی مرمت کروانا چاہتی ہوں۔“ باجی نے دینی سے مجھے 50 ہزار روپے بھیجے، جو پاکستانی تقریباً لاکھوں میں بنے۔ میں نے ان پیسوں سے اپنے جہیز کے لیے مختلف چیزیں خریدیں، کیوں کہ مجھے ڈر تھا کہ جب امی کو میرے اس اقدام کا پتا چلے گا تو وہ کسی بھی قیمت پر مجھے جہیز نہیں دیں گی اور جہیز کے بغیر لڑکی کی سسرال میں کیا عزت ہوتی ہے، یہ تو سب ہی جانتے ہیں، پھر میں گا ہے بگا ہے کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے باجی سے پیسے اٹھاتی اور اپنا اچھے سے اچھا جہیز بناتی، اس طرح کچھ وقت اور آگے سرکا۔

☆.....☆

میں جب بھی شاہ زیب سے پہلی بیوی کو طلاق دینے کی بات کرتی، شاہ زیب کہتے میں کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہوں، کوئی بات ہو تو میں اسے طلاق دے دوں۔ ادھر میں یہ سوچتی کہ کسی صورت سے بھائی میرے نکاح کی بات امی ابو کو بتادیں، مگر بھائی بھی ایک ڈر پوک مرد ثابت ہوئے۔ میں نکاح کر کے بڑی مشکل میں پھنس گئی تھی۔ نہ میں شاہ زیب کو چھوڑ سکتی تھی اور نہ وہ مجھے عزت سے مل سکتا تھا۔ ادھر شاہ زیب کے گھر والوں کو جب اس کے نکاح کا پتا چلا تو انہوں نے کہرام مچا دیا۔ اس کی بیوی روٹھ کر میکے چلی گئی۔ میں نے موقع غیبت جانا اور شاہ زیب سے طلاق کی بات کی، مگر نہ جانے کیوں شاہ زیب ٹال مٹول کرتا رہا، پھر شاہ زیب کے سمجھانے پر گھر والے راضی ہو گئے اور بیوی بھی واپس آ گئی۔ نہ جانے شاہ زیب نے کس طرح انہیں منایا اور

آئندہ کا کیا لائحہ عمل سوچا ہوا تھا۔ جب امی کسی طور نہیں مانیں تو میں نے شاہ زیب کی بات پر عمل کرنے کا سوچا۔ اس کا مشورہ تھا کہ نکاح تو ہو ہی چکا ہے۔ بچیوں کو چھوڑ کر اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر میرے ساتھ اسلام آباد شفت ہو جاؤ، مگر میں چاہتی تھی کہ امی کے ساتھ صبح کی کوئی صورت نکل آئے۔ مجھے اپنی ناؤ کنارے لگتے نظر نہیں آتی تھی۔ میں بچ بھنور میں تھی اور چاروں طرف طوفان تھا۔ جب مجھے بات کسی صورت بنتی نظر نہیں آئی تو میں نے ایک دن بچیوں کو اسکول بھیج کر شاہ زیب کو فون کیا کہ ”تم آ جاؤ، میں تمہاری بات ماننے کو تیار ہوں۔“

شاہ زیب اسلام آباد سے کئی گھنٹے کی مسافت طے کر کے جب پشاور پہنچا تو دوپہر کے بارہ بج رہے تھے، میں نے کھانا اور اپنے جانے کی تیاری تو پہلے ہی کر لی تھی۔ اپنے جانے کی اطلاع رضوانہ کو دی اور گھر کو تالا لگا کر پڑوس میں چابی دے کر کہا۔ اگر بچیاں آئیں تو کہنا میں بازار تک گئی ہوں، تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی اور شاہ زیب کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر حالات اور مستقبل کی پروا کیے بغیر اپنے نئے سفر پر روانہ ہو گئی۔ یہاں پر بھی رضوانہ نے ہی میرا ساتھ دیا اور میرے جہیز کا سامان اسپتال کے پیون سے کہہ کر ٹرک پر لا کر اسلام آباد پہنچا دیا۔ اسلام آباد پہنچ کر میں نے بی سی او سے فون کر کے گھر پر اپنے نکاح اور شاہ زیب کے ساتھ جانے کی اطلاع دے دی۔ میں آنے والے حالات سے مطمئن تھی، کیوں کہ میں نے اسلام آباد کی بجائے جان بوجھ کر لاہور کا نام لیا تھا، تاکہ گھر والے مجھ تک نہ پہنچ سکیں، مگر میرے نکاح میں جو دوسرا گواہ تھا، اس نے میرے والدین کو میرے اسلام آباد میں قیام کا بتا دیا۔

امی ابو میرے گھر آئے، اس وقت میں بھی ہمت و جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے والدین کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی اور مضبوط لہجے میں بولی۔ ”امی جب میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے عزت سے شاہ زیب کے ساتھ رخصت کر دیں، مگر آپ اپنی ضد پر اڑی رہیں، اب میں اپنی ضد سے نہیں ہٹ سکتی۔ میں نے شاہ زیب سے نکاح کر لیا ہے۔ اگر آپ کا دل چاہے تو مجھے قبول کر لیں۔ اگر نہ چاہیں تو یہ آپ کی مرضی، میں شاہ زیب کو

نہیں چھوڑ سکتی۔“

میری دو ٹوک بات سن کر امی نے بھی دو ٹوک جواب دیا۔

”ٹھیک ہے تم نے جو چاہا، وہ کرلو۔ اب میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں، ابھی ملنے کا دل چاہے تو خوابوں میں ملاقات کر لینا۔ آج سے ہم اور تم ایک دوسرے کے لیے مر گئے، ہم تمہیں مار کر قتل کا گناہ نہیں کر سکتے، مگر بد دعا ضرور دیتے ہیں کہ تم کبھی سکھ چین نہ پاسکو اور اولاد کے ہاتھ اسی طرح رسوا ہو، جس طرح تم نے ہماری عزت مٹی میں ملائی ہے۔ تم بھی ماں بنو اور وہ بھی بیٹے اور بیٹی دونوں کی، تب تمہیں احساس ہوگا کہ ماں کی ممتا کیا ہوتی ہے۔“ امی تو کہہ کر چلی گئیں، لیکن میرے لیے آزماتش کے دروازے کھول گئیں۔

تقدیر انسان کے لیے کیا سوچے بیٹھی ہے، اس کی مجھے تو کیا کسی کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ ہم سوچتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ ہے۔ اپنے غرور اور بدلے کی آگ میں جل کر یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے وقت کی لگام ہمارے ہاتھ میں دے رکھی ہے، لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ دروازہ کی تکلیف کو برداشت کر کے ایک عورت جو ایک انسان کو جنم دیتی ہے اور ایک تخلیق کار بن جاتی ہے، وہ بھی اپنی اداؤں کی تقدیر اپنے ہاتھ سے نہیں لکھ سکتی۔

ہوا کچھ یوں کہ شاہ زیب نے میرے لاکھ کہنے کی باوجود اپنی پہلی بیوی کو طلاق نہیں دی۔ شادی کے بعد اس نے تو اپنا رنگ ہی بدل لیا۔ جو محبت اور مٹھاس شادی سے پہلے ان کے لہجے سے پختی تھی، وہ نہ جانے کہاں سو گئی تھی، شاید اس وقت انہیں احساس ہوا ہوگا کہ وہ کتنی بڑی حماقت کر بیٹھے ہیں۔ میں شاہ زیب سے جب بھی اپنی سوکن کے متعلق بات کرتی، تو وہ کہہ کر خاموش کر دیتے کہ تم بھی رہو اور وہ بھی رہے گی۔ میں اسے طلاق دے کر بچوں کی زندگی برباد نہیں کر سکتا۔“ شاہ زیب کی وہ بات جو انہوں نے مجھ سے کہی تھی کہ میں اپنی بیوی سے خوش نہیں ہوں، مگر میں یہ نہ جان سکی اور نہ جاننے کی کوشش کی کہ کیا شاہ زیب اپنے بچوں سے بھی خوش نہیں ہے۔ میں جب بھی اپنے سسرال جاتی، وہاں ہر کوئی مجھے حقارت کی

نظر سے دیکھتا۔ کسی کے بھی دل میں میرے لیے نہ تو کوئی عزت تھی نہ ہی کوئی احترام۔ تنگ آ کر میں نے سسرال چھوڑ دیا۔ ویسے بھی میرے جانے یا نہ جانے سے کسی پر کون سا فرق پڑتا تھا۔ میری حیثیت ایک ایسی عورت کے جیسی تھی، جسے مرد صرف اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرتا ہے۔ مجھے نہ رات کو سکون تھا نہ دن کو چین۔ ایسی حالت میں مجھے اپنی ماں بہت یاد آتی تھی۔ اس کی وہ بدعا کہ ”تم کبھی چین نہ پاسکو“ میں ہر پل روتی، اپنے کہے پر نادم ہوتی، مگر ”اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چک گئیں کھیت۔“

☆.....☆

ایک دن میں نے شاہ زیب سے حتی بات کرنے کا سوچا۔ وہ جب آفس سے گھر آئے تو اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں نے اتنی دیر سے گھر آنے کی وجہ پوچھی تو کام کی زیادتی کا بہانہ بنا کر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ میں نے کھانے کا پوچھا تو بولے کہ ”آفس کے کولیک کے ساتھ کھالیا تھا۔“ میں نے چیتے ہوئے لہجے میں کہا کہ ”بہانہ تو بہت اچھا بنایا ہے تم نے۔“ تب وہ بھی غصے سے بولے۔ ”مطلب کیا ہے شہنار!۔“ مجھے بھی بہت شدید غصہ آیا اور میں چلا کر بولی۔ ”آفس کے کولیک کے ساتھ کھالیا یا پھر رخسار کے ساتھ۔“ تب وہ بڑے اطمینان کے ساتھ بولے۔ ”اگر رخسار کے ساتھ کھالیا تو کون سی قیمت آگئی، وہ میری پہلی بیوی سے اور تم دوسری اور دو نمبر کبھی بھی ایک نمبر کی جگہ نہیں لے سکتا۔“ میں نے بھی ذہن بدو جواب دیا۔ ”اور پہلی محبت کون ہے۔“ وہ میری بات کو انکسور کرتے ہوئے بولے۔ ”محبت کوئی بھی ہو، بس یہ سمجھ لو کہ وہ میرے بچوں کی ماں ہے۔ اس کے آگے میں اب کچھ سننے کا روادار نہیں ہوں۔ اگر تم نے زیادہ زبردستی کی تو تمہیں طلاق دینا میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔ ویسے بھی جو غلطی میں کر بیٹھا ہوں، اس کی بہت بڑی سزا تجھت رہا ہوں۔“ اس دن ہمارے درمیان بہت تلخ کلامی ہوئی۔ جب بات طلاق تک پہنچی تو میں نے چپ رہنے میں ہی عافیت جانی۔ اس دن کے بعد سے میں نے چپ رہنا سیکھ لیا۔ اس موضوع پر یہ گفتگو ہمارے درمیان آخری تھی۔ شاہ زیب کی یہ بات

سن کر میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ وہی شاہ زیب تھا، جو میری محبت کا بھرم بھرتا تھا، آج کیسے منہ پھیر کر بات کر رہا تھا۔ میرے من میں شدت سے یہ خواہش جاگی، ”کاش اللہ مجھے بھی ایک بچہ عطا کر دے۔“ اس کے لیے میں نے جدوجہد کرنی شروع کر دی۔ اپنی خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے شاہ زیب کو اپنے اعتماد میں لینا بہت ضروری تھا۔ شاہ زیب کے ساتھ تلخ کلامی کے بعد میں یہ تو جان ہی چکی تھی کہ آج تک میں ان کو امپرلین نہیں کر سکی ہوں۔ میں نے ان سے الگنا چھوڑ دیا تھا اور ان کی روزمرہ کی روٹین کو بھی انکسور کرنا شروع کر دیا۔

☆.....☆

شاہ زیب تو دو کشتیوں میں سفر کر رہے تھے، مگر مجھے بھی اپنی کشتی کنارے لگتی نظر نہ آتی تھی۔ میں بچ بھنور میں تھی اور چاروں طرف شدید طوفان، جس کی زد میں آ کر مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ ان دنوں میری حالت جلع پیر کی بیٹی جیسی تھی، جسے کسی کل چین نہیں ہوتا۔ رضوانہ سے جب بھی بات کرتی، وہ بھی صبر کرنے کا مشورہ دیتی۔ اسی سے مجھے امی کے گھر کے حالات کا پتا چلتا رہتا کہ وہاں کوئی بھی میرے لیے اچھے تاثرات نہیں رکھتا اور اس گھر میں میرے لیے اب کوئی جگہ نہیں ہے۔ ایسے حالات میں، میں صبر کے سوا کبھی کیا سکتی تھی، تب میں نے نماز اور روزے کا سہارا لے کر اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنا شروع کی اور اولاد کے حصول کے لیے ہر وقت دعائیں مانگا کرتی، لیکن ماں باپ کو ناراض کرنے والے سے تو اللہ بھی ناراض رہتا ہے، اس لیے مجھے اولاد ملی بھی تو سزا کی صورت میں۔

☆.....☆

ماں بننے کی خبر میرے لیے خوشیاں لے کر آئی اور جڑواں بچوں کی آمد میرے لیے خوشی کا باعث بنی۔ وہ دن میری زندگی کا سب سے خوب صورت دن تھا، جب اللہ نے مجھے جڑواں بیٹا اور بیٹی سے نوازا تھا۔ ماں کی ممتا کا احساس مجھے اس وقت ہوا، جب دونوں بچے میری گود میں آئے۔ اس وقت مجھے امی کی

وہ بدعا یاد آئی کہ ”تم بھی ماں بنو اور وہ بھی بیٹے اور بیٹی دونوں کی۔“ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک ساتھ جڑواں بچوں کی ماں بنا دیا تھا۔ میں نے دونوں بچوں کو گود میں لے کر عہد کیا کہ کبھی بھی اپنے بچوں کو لالچ کی بھیشت نہیں چڑھاؤں گی، لیکن ماں باپ اپنی اولاد کے لیے خواب تو بہت اونچے اونچے دیکھتے ہیں، مگر ان کی تکمیل صرف نصیب کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ گلاب کی تمنا جب ہی کرنی چاہیے، جب گلاب کی قلم لگائی ہو۔ بچوں کو پا کر میں تو بہت خوش تھی، مگر شاہ زیب نے صرف اپنی فارمیٹی پوری کی اور کرتے بھی کیا۔ بیٹے بیٹی کی خوشی تو وہ پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ بچوں کے نام بھی میں نے ہی رکھے ساحرہ اور دانیال۔

☆.....☆

میں نے ایک دفعہ پھر شاہ زیب پر پہلی بیوی کو طلاق دینے کا زور ڈالا۔ ان کا آج بھی وہی جواب تھا۔ کاش شاہ زیب کی شادی کے بعد میں بھی شادی نہ کرنے کے فیصلے پر ڈٹی رہتی تو آج اس طرح بے بس نہ ہوتی۔ میرے بہن بھائی سب اپنی اپنی زندگیوں میں خوش تھے سوائے ایک میرے۔

میرے والدین کا انتقال ہوا تو میری بد نصیبی میں اپنے ماں باپ کا آخری دیدار بھی نہ کر سکی، وہ مجھ سے ایسے ناراض ہوئے کہ انہیں یہ غرض نہیں کہ میں آؤں یا نا آؤں، میرے آنے کا انتظار کرے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آخری وقت میں انہوں نے مجھ سے ملنے کی تمنا بھی نہیں کی۔ ایسی صورت حال میں مجھ سے زیادہ بد نصیب کون ہوگا۔

جب میرے اندر احساس ندامت جاگا تو بہت دیر ہو چکی تھی اور پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ اس وقت ہاتھ پیر مارنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں کسی بھی قیمت پر اپنے اس نقصان کا ازالہ نہیں کر سکتی تھی، جو انجانے میں کر چکی تھی اس وقت میں اچھے بُرے کی تمیز نہ کر پائی یا میں کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اس میں میرا اپنا قصور تھا، کیوں کہ نکاح کرتے وقت اور گھر سے چلتے وقت میں سولہ سال کی نو خیز کلی نہیں 35 سال کی بھرپور سمجھ دار عورت تھی۔

تھایہ ساحرہ نہیں، میرا خون بول رہا ہے اور خون کا اثر خون میں ضرور آتا ہے۔“

☆.....☆

ایک دفعہ تو میں نے سوچا کہ ساحرہ کو رخصت کر کے اپنی زندگی سے بے دخل کر دوں، مگر پھر میں ایسا نہ کر سکی، کیوں کہ میں اپنی ماں کی طرح کنز دل اور لاپرواہی طبیعت کی مالک نہیں تھی اور ماضی کو ہرانا نہیں چاہتی تھی، لہذا شاہ زیب کو بلا کر تمام واقعات ان کے گوش گوار کیے۔ وہ تو میرے اوپر ایسے بگڑے کہ جیسے تمام واقعے کی ذمہ داری اکیلے میں ہوں۔

مرد کچھ بھی کرتا پھرے، کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا، مگر عورت کی ذرا سی بات پر پورا معاشرہ دست سوال بن کر کھڑا ہو جاتا ہے، چاہے قصور کسی کا بھی ہو۔ یہاں میں نے ٹھنڈے دماغ کے کام لیتے ہوئے شاہ زیب سے کہا۔ ”اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا، تم اس کی رخصتی سادگی سے کر دو، ورنہ یہ لوگ بھی شاہ زیب اور شرمین بن جائیں گے۔“ تب انہوں نے افضل کے گھر والوں کو برات لے کر آنے کی اجازت دے دی۔ میری طرف سے کون تھا، ایک رضوانہ کو ہی بلانا تھا، وہ اپنے بچے لے کر آگئی تو گھر میں تھوڑی بہت رونق لگ گئی اور میری بیٹی ماں باپ کے ساتھ ساتھ خالہ کے بھی شفقت بھرے سائے اور محبت بھری دعاؤں کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ وہ اپنی زندگی میں خوش تھی۔ افضل نے اسے بہت اچھی طرح سے رکھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میں مطمئن تھی کہ میرے ایک فیصلے نے دو لوگوں کو برباد ہونے سے بچا لیا تھا، مگر پھر ایک طرف بے چین ہو جاتی تھی کہ میرے ایک غلط ہی فیصلے نے کتنے لوگوں کو برباد کرنے میں کتنا اہم کردار ادا کیا تھا۔ میں بیٹی کی طرف سے مطمئن ہوئی تو بیٹے نے آزمائش کے دروازے کھول دیے۔ پٹا بھی اپنی بہن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بے غیرتی کی تاریخ رقم کر رہا تھا۔ اسے مختلف لڑکیوں کے ساتھ افیسر اور غلط لڑکوں کی صحبت نے کب بگاڑا، مجھے پتا ہی نہ چلا۔ میری آنکھیں تو اس دن کھلیں، جب وہ بکتے قدموں کے ساتھ نشے میں دھت گھر میں داخل ہوا۔ میرے تو

بچیس سال گزر گئے، رضوانہ مجھ سے ملنے آتی تو میکے کا احساس جاگ اٹھتا۔ ہم دونوں ہمیشہ اپنے ماضی کو یاد کر کے کبھی ہنستے تو کبھی روتے۔ زندگی ایسے ہی چلتی رہی۔ 25 سال میں بچے دونوں بڑے ہو گئے، لیکن شاہ زیب کی اپنی وہی روشن رہی اور میں..... میں تو کبھی برباد! ادھر وقت بے لگام گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگتا رہا، ادھر بچے دونوں بے لگام ہوئے جا رہے تھے۔ دونوں اپنی مرضی کے مالک تھے۔ میری نصیحت تو وہ ایک کان سے سن کر اسی کان سے نکال دیتے، دوسرے تک پہنچنے ہی نہیں دیتے۔ نہ جانے میری تربیت میں کہاں کی رہ گئی تھی کہ بیٹا تو بیٹا، بیٹی بھی مجھے اپنی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ میری بربادی کی ذمہ داری میری تربیت تھی یا میری حرکت، یہ میں کبھی سمجھ نہ پائی۔

سمجھ تو اس دن آئی جب ساحرہ میرے لاکھ منع کرنے کی باوجود افضل سے کورٹ میرج کرنے کے بعد میرے سامنے کھڑی اپنے حسین کارنامے کی خبر دے رہی تھی۔ شاید اللہ تعالیٰ ہم جیسے لوگوں کو اولاد اسی لیے دیتا ہے کہ وہ ہمیں ہمارے ماضی کی یادوں کا آئینہ دکھاسکیں۔ ساحرہ تو نکاح کر کے واپس آ بھی گئی تھی، مگر میں نے تو اپنے اوپر اپنے باپ کے گھر کے ہر دروازے کو بند کر دیا تھا۔ میں سب کچھ حاصل کر کے بھی خالی دامن تھی۔ شاہ زیب کو میرے ان حالات سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ وہ اپنی اس زندگی میں گمن تھے۔ میرے گھر مینے میں ایک دفعہ صرف اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے آتے تھے۔ ساحرہ کی اس حرکت کے بعد میں بہت پشیمان ہوئی۔ میرا تو نہ میکہ تھا نہ سسرال والے ملتے تھے، تب اتنی بدنامی ہوئی تھی۔ جب میں نے یہ انتہائی قدم اٹھایا ہوگا، تب میرے ماں باپ نے اپنے بھرے پڑے خاندان کا کس طرح سامنا کیا ہوگا۔ یہ سوچ سوچ کر میں پاگل سی ہو جاتی۔ ماضی ایک دردناک عذاب بن کر میرے سامنے کھڑا تھا، جب ساحرہ نے مجھ سے کہا کہ اسی نکاح میں نے کر لیا ہے۔ رخصتی آپ کر دو، تب مجھے ساحرہ پر طیش تو بہت آیا، مگر اس وقت میں نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالا، کیوں کہ مجھے معلوم

پیر لڑ کر رہ گئے۔ میرے لیے ایک دفعہ پھر امتحان کی گھڑیاں شروع ہوئیں۔ میں نے شاہ زیب سے اس سے متعلق بات کی تو انہوں نے تو یہ کہہ کر اپنی جان چھڑائی کہ ”میں پیسے بیچ دیتا ہوں تم اس کا علاج کرالو اور اس پر کڑی نگاہ رکھنا، کیوں کہ میں آفس سے اتنی لمبی چھٹی نہیں لے سکتا۔ یہ سب تمہاری غلط تربیت کا نتیجہ ہے، پہلے ساحرہ اور اب دانیال۔“

☆.....☆

ایک دفعہ پھر میں قصور وار ٹھہرا دی گئی۔ شاہ زیب کا تو اتنا ہی احسان کافی تھا کہ وہ ہمارا خرچہ اٹھا رہے تھے اور انہوں نے ہمیں اپنی زندگی سے بے دخل نہیں کیا تھا۔ بروقت علاج اور محنت کی بدولت دانیال آہستہ آہستہ زندگی کی طرف لوٹنے لگا۔ میں بہت خوش تھی کہ میری محنت رنگ لارہی تھی، مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری یہ خوشی عارضی ثابت ہوگی۔ دانیال سچ تو ہو گیا، مگر اس نے لڑکیوں سے عشق کرنے کی عادت نہ چھوڑی اور پھر ایک دفعہ اپنے ان دوستوں کی بدولت دانیال اپنی اسی راہ پر لگ گیا، جس سے بچانے کی خاطر میں نے کہاں کہاں دھکے نہیں کھائے تھے۔ شاہ زیب کی ناراضگی مول لی، اب دانیال کی یہ حالت ہے کہ صرف ضرورت کے تحت گھر آتا ہے، ورنہ میں اکیلی جان گھر میں پڑے بلکان ہوتی رہتی ہوں۔ میں اب کہاں اس کے لیے ماری ماری پھرتی رہوں۔ اپنی قسمت پر مبر کر کے بیٹھ گئی ہوں۔ شادی میں اس کی اس حالت میں کر نہیں سکتی، کیوں کہ میں اتنی کٹھور نہیں ہوں کہ اپنی اولاد کے معاملے میں کہ میں کسی شریف لڑکی کی زندگی برباد کروں، کیوں کہ کم از کم اپنے ماضی کو یاد کر کے مجھے اتنا تو یقین ہے کہ وہ بھی کسی دن ساحرہ والی حرکت کرے گا اور اپنے ہی قماش کی کوئی لڑکی بھگالے آئے گا۔ اب میری گلی ہڈیوں میں اتنا دم نہیں ہے کہ بدنامی کا بوجھ اٹھاؤں، اس لیے اپنے معاملے کو اللہ کے سپرد کر دیا ہے، وہ جو کرے گا بہتر کرے گا۔

☆.....☆

آج میں سوچتی ہوں اگر امی اپنی جگہ صحیح نہیں تھیں تو میں بھی تو غلط ہی تھی، کیوں کہ میں نے ایک شادی شدہ

عورت کی زندگی برباد کی کہ اس کی زو میں آ کر میں بھی آباد نہ رہ سکی۔ اگر میں اس وقت ہی مبر کر کے بیٹھ گئی ہوتی تو آج مجھے ذلت، تنہائی اور بربادی کا اتنا کڑوا کھونٹ نہ پینا پڑتا، صرف رات کے اندھیروں میں گھر سے بھاگنے والی لڑکیاں ہی راستہ نہیں بھٹکتی ہیں، بلکہ دن کی روشنی میں گھر سے غلط مقصد کے لیے نکلنے والی لڑکیاں بھی راستے کا صحیح تعین نہیں کر پاتیں، اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ غلطی پر ہوتی ہیں۔

زندگی کے وہ پُر پیچ راستے جو میری زندگی کی راہوں میں سولہ برس کی عمر میں آئے تھے۔ ان پر سفر کرتے ہوئے میں کہاں تک پہنچ گئی۔ آج میں خالی دامن کہاں جاؤں، کس کا سہارا تلاش کروں۔ میری کوئی منزل نہیں، میرا کوئی نشان نہیں، میری کوئی زندگی نہیں، میرا کوئی مقام نہیں۔

میری زندگی میں صرف خاردار چھاڑیاں ہیں اور آج بھی منزل کی تلاش ہے۔ میں روتی ہوں اور میری تقدیر مجھ پر ہستی ہے۔ میں رات بھر جاگتی ہوں اور میرے نصیب کی خوشیاں نہ جانے کہاں سو رہی ہوتی ہیں۔ شاہ زیب سے شادی کر کے میں کس بُری طرح سے زلی ہوں، یہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ زندگی کی آخری عمر میں مجھے جس ہم سفر کی تلاش ہے، وہ میرا ہوتے ہوئے بھی مجھ سے کوسوں دور اپنی پرسکون زندگی میں گمن ہے اور میں تنہا بیٹھی اپنی عمر کی منزلیں پوری کر رہی ہوں اور بہتے اشکوں کے ساتھ اپنی زندگی کی کہانی لکھ رہی ہوں۔

آپ قارئین سے التماس ہے مجھے بتائیں کہ میری بربادی میں سب سے بڑا ہاتھ کس کا تھا۔ میرے باپ کا، جو گھر کا سربراہ اور ایک مرد ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ ایک عورت کے آگے جھکے رہے۔ امی کا جو دولت کے پلڑے میں اولاد کو تولتی رہیں، کیوں کہ جس گھر کے بڑے سچ نیت نہیں رکھتے، اس گھر میں کبھی محبت نہیں ہوتی یا پھر میرا، جو صرف اپنی دنیا آباد کرنے چلی تھی یا پھر شاہ زیب کا، جنہوں نے شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی مجھے اپنا زندگی کا ساتھی بننا۔

☆.....☆

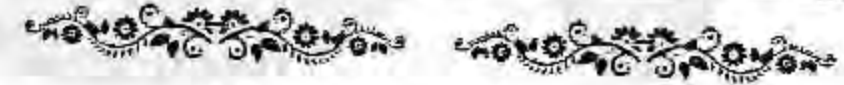
پانچویں سچ بیانی

انتقام

محمد اسلم آزاد



بلوچستان سے ایک نوجوان کے انتقام کی لرزہ خیز داستان



ادھر کر کے آگے کی جانب بڑھ رہے ہیں، کیوں کہ انہیں بھی پیاس نے نڈھال کر دیا ہے۔ وہ سامنے مٹی کا اڑتا ہوا غبار شاید کسی ریوڑ کا ہے جو اس راستے سے پانی کی تلاش میں گیا تھا یا پھر واپس لوٹ رہا ہے۔ میں بھی اب اس کے قریب ہی پہنچنے والی ہوں۔ دور سے تو اس کی بھیڑ بکریاں ہشاش بشاش دوڑتی آرہی ہیں، ضرور یہ پانی پی کر آرہی ہیں اور شاید قریب ہی کسی ندی یا بند (گھیت) میں یہ پانی کھڑا ہوگا۔ تبھی تو دور سے پانی کی ٹھنڈی ٹھنڈی خوشبو میرے لیے آ رہی ہے۔ اب جی بھر کے پہلے میں خوب نہالوں گی، پھر مشکیزوں میں پانی بھروں گی، مگر ذرا ادھر ادھر دیکھ تو لوں کہ آس پاس کوئی چرواہا یا کوئی اور مرد ٹھہرا ہوا تو نہیں ہے.....؟

شکر ہے..... یہاں دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔

ٹھیک ہے..... اب میں جی بھر کے پہلے خوب نہالوں گی پھر، اس کے بعد میں پانی بھروں گی۔ اب ہر روز میں یہاں سے ہی پانی بھرنے آؤں گی، مگر یہ جگہ تو میرے گھر سے بہت دور ہے اور پھر یہاں تک آتے آتے دوپہر ہو جاتی ہے، پھر مجھے واپس گھر

میرے لیے کیسی عیدیں، کیسی خوشیاں اور کیسی محبتیں.....؟ مجھے تو تن پر سرخ جوڑا، ہاتھوں میں رملین چوڑیاں اور پیروں میں یازیب پہنے بڑی مدت ہو گئی ہے۔ اب تو عید کا دن ہو یا خوشی کا یا اور کوئی تہوار، میرے ہاتھوں میں مہندی اور ماتھے پر ہندیا نہیں جاتی۔ اگرچہ آج عید کا دن ہے، ہر طرف خوشیوں کا سماں ہے، مگر میں اکیلی عورت ہوں..... تنہا.....!

تپتی دھوپ میں سرمئی ریت کی تیش اور ذہن پر سوچوں کا حصار، پاؤں میں بھاری بھر کم جوتے، سینے سے شرابور چند گدھوں پر مشکیزے لادے پانی کی تلاش میں کب تک اس بیابان میں ماری ماری پھرتی رہوں گی۔ ایک دو جگہ پر پہلے جہاں تھوڑا بہت پانی کھڑا تھا، اب وہ بھی سخت گرمی اور سورج کی تیش سے سوکھ گیا ہے اور اس جگہ پر بہت سی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں بے جان سی پڑی دیکھ کر میرے قدموں سے بھی جان نکلتی جا رہی ہے اور جب میں آگے کی طرف قدم بڑھاتی ہوں تو از خود میرے قدم پیچھے کی طرف اٹھ جاتے ہیں۔ شدت پیاس سے میرا حلق اتنا خشک ہو گیا ہے کہ اب گدھوں کو ہانکنے کی بھی مجھ میں سکت نہیں رہی ہے اور وہ بھی اپنے منہ ادھر

”آگنی بختو بیٹی.....؟ آج تو بڑی دیر لگادی تو نے.....!“

”ہاں سا سو جی بس کیا پوچھتی ہو.....؟ پانی کی تلاش میں! ادھر ادھر گھوم گھوم کر تو مجھے بخار سا ہو گیا ہے، وہ تو شکر ہے کہ پرانی ندی کے قریب پانی کھڑا تھا، ورنہ تو بس میری جان ہی چلی گئی تھی، پانی ڈھونڈتے ڈھونڈتے.....“

جا کر بیمار ساس کا خیال رکھنا اور اس کے لیے کھانے پینے کا بندوبست بھی کرنا ہے اور بھیڑ بکریوں کے لیے چارہ کاٹ کر لانا ہے، یہ تو بہت ہی مشکل اور بڑا کام ہے، پھر ان سب کاموں سے بڑا مشکل کام تو وہ ہے کہ جب میرے شوہر صاحب صبح کے نکلے شام کو گھوڑے پر واپس آتے ہیں اور اپنا خوب رعب جھاتے ہیں، لیکن آج تو میرا بدن ٹھکن سے پھر پھر



”خیر ہے بیٹی! اب تو ذرا آرام کر لے اور پھر کٹورے میں ڈھانپی ہوئی سوتیاں کھا لینا، ٹھیک ہے سا سو جی..... میں ذرا آرام کرتی ہوں، مگر شاید میری زندگی میں چین و سکون کا نام نہیں ہے اور نہ ہی سکھ کی غیند.....“

ہے، بھلا اتنے سارے کام میں کیسے کروں گی اور رات گئے تک اپنے میاں کے پیڑ کیسے دباؤں گی، کیوں کہ آج تو مجھے خود بھی بخار سا محسوس ہو رہا ہے..... خیر کوئی بات نہیں، چلو اب مشکیزے بھر کر واپس گھر جانے کی تیاری کرتے ہیں۔

ہردن کی طرح آج بھی میرا بدن ٹوٹ رہا ہے، مگر
نہیں ہے کہ کوسوں دور.....!

ہردن کی ہر ہر کوٹ پر میری نظر جھٹکی کے
ٹوٹے ہوئے بانسوں میں ایک گھونسلے پر پڑتی ہے تو
اس میں بیٹھے ہوئے دو پرندوں پر نظر ٹھہر جاتی ہے۔
انہیں دیکھ کر مجھے اپنی محبت یاد آ جاتی ہے، اپنا پیارا یاد
آ جاتا ہے اور میرے کانوں میں اس کی پیاری سی
آواز آتی ہے۔

”ارے بچی یہ تم کیا کر رہی ہو.....؟ ذرا اپنا ہاتھ
میرے ہاتھ سے اٹھا دو اور یہ تم کس انتقام کی بات کر رہی
ہو.....؟ ان جبر کے رشتوں اور فرسودہ رسموں کے انتقام
کی، جاگیرداروں کے غلط فیصلوں یا اس محبت کے انتقام
کی، جو ہمارے اور تمہارے دلوں میں بس رہی ہے۔ کیا
تم اپنی ذرا سی بھول سے اس محبت کو فنا کر دینا چاہتی
ہو.....؟ اور کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہارے اس انتقام سے
تمہارے دل کی آگ بجھ جائے گی؟“

”نہیں..... ایسا ہرگز نہیں ہوگا، بلکہ یہ آگ تمہارے
سارے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی کہ جسے بجھانے کے
لیے تم ہر کسی کا ہاتھ پکڑنے میں ذرا سی بھی شرم محسوس نہیں کرو
گی۔ میرا کیا ہے.....؟ میں تو ایک اجنبی ہوں، جو یہاں
اتفاق سے اپنی امی کو علاج کے لیے لایا تھا اور تم اپنی ساس
کے ہمراہ اس ہسپتال میں آئی ہو.....“

کل یا برسوں ہم آخر کو جدا ہو جائیں گے، پھر تم اپنے
گاؤں جا کر اپنے سنگدل شوہر کی بے رخی اور بے دردی کا
انتقام کس سے لوگی.....؟ کیا کسی راہ چلتے چرواہے سے مل
کر..... یا کسی بھی گھڑسوار سے گھل کر.....“

”نہیں، نہیں شہری بابو! تم تو ایسی بری باتیں مت
کرو۔ میں اتنی بھی گندی اور بے غیرت عورت..... نہیں
ہوں، جو تم مجھے اتنا برا بھلا کہہ رہے ہو.....؟“

”اگر ایسا ہوتا تو میں نے پہلے بھی تم کو بتایا ہے کہ جب
میں سات سال کی تھی، تو میرے باپ اور بھائیوں کا میرے
شوہر کے باپ سے جھگڑا ہو گیا تھا، جس میں وہ فوت ہو گیا تو
میرے بھائی اور باپ کچھ عرصہ گھر سے غائب رہے، پھر
چند مہینوں کی منت ساجت کے بعد وڈیرہ صاحب نے یہ
فیصلہ کیا کہ میرا ہاتھ شکر خان کو دے دیا جائے اور مزید 5

لاکھ روپے بھی ان پر جرمانہ عائد کیا گیا تھا۔ جب میری
شادی کم سن میں ہوئی تو میں اپنے ہاتھوں میں مہندی اور
ریگ برنگی چوڑیاں اور تن پر سرخ جوڑا دیکھ کر بہت خوش ہوئی
تھی، مگر رفتہ رفتہ یہ خوشی غم میں بدلتی چلی گئی۔

پہلے دنوں میں تو مجھے گھر کا ٹھوڑا کام کرنا پڑتا تھا،
لیکن جب ساسو جی بیمار ہو گئیں تو گھر کی ساری ذمے
داری میرے کاندھوں پر آ گئی، پھر جب میں جوانی میں
قدم رکھنے لگی تو مجھے اپنے شوہر کی بے رخی کا احساس ہوا
اور میں ہر ممکن طور پر اس کے قریب رہنے کی کوشش کرنے
لگی، مگر ہر بار مجھے وہ مایوس کر جاتا تھا۔

ایک رات میں نے ہمت کر کے اس کی چارپائی پر
اس کے ساتھ سونے کی کوشش کی اور نصف شب کو اس
کے پہلو میں سو گئی، مگر چند ہی لمحوں کے بعد جب اس کی
آنکھ کھلی تو وہ بھڑک سا اٹھا اور پھر میرے ہاتھ پکڑ کر مجھے
اپنی چارپائی پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ ”آج کے بعد اگر تم
نے میری چارپائی پر قدم رکھا تو میں تمہارے ہاتھ پاؤں
توڑ دوں گا۔“

اس کی یہ بات سن کر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں اس
کے پیروں پر گر کر رونے لگی، اور اس سے کہنے لگی ”تم تو
میرے شوہر ہو اور تم پر میرا پورا حق ہے کہ میں تمہارے
ساتھ اٹھوں اور بیٹھوں.....؟“

وہ میرے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا تھا کہ ”آئندہ
میرے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے بارے میں مت سوچو، کیوں
کہ میں تمہیں روز تر پتا، سسکتا اور روتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں،
کیوں کہ میں جب بھی تم کو دیکھتا ہوں تو مجھے میرا باپ یاد
آتا ہے۔ مجھے اس کی خون سے لت پت تر تھی ہوئی لاش
یاد آتی ہے اور پھر اس وقت میرا خون کھولنے لگتا ہے کہ تم
میرے باپ کے قاتلوں کی بیٹی اور بہن ہو، جن سے میں
اس وقت تو بدلہ نہ لے سکتا تھا، مگر اب میں ان سے اور تم
سے اپنے باپ کے خون کے انتقام لیتا رہوں گا اور ساری
عمر میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا اور اگر اس بارے میں
تم نے ذرا بھی اپنا منہ کھولا تو اس سے پہلے میں کسی راہ چلتے
محسوس کے ساتھ تمہیں کاروکاری کے نام پر قتل کر دوں گا اور
مجھے کوئی بھی برا بھلا نہیں کہے گا۔“

ہاں شہری بابو! اتنا ظلم و ستم ہو جانے کے بعد بھی میں

نے آج تک اپنا منہ نہیں کھولا، وہ صرف اس لیے نہیں کہ
وہ مجھے مار دے گا، بلکہ اس لیے کہ وہ کاروکاری کے نام پر
مجھے ذلت آمیز موت دینے میں ذرا بھی دیر نہیں کرے گا،
میں بے بسی، محرومی کی زندگی تو بھینچا چاہتی ہوں، مگر ایسی
موت بھی نہ چاہوں گی کہ کل مجھ پر انگلیاں اٹھتی رہیں
کہ ایسی بدکار عورت تھی، بس اسی سیاہ کلنگ (دھبے) کی
وجہ سے میں اتنے برسوں سے خاموش ہوں اور ابھی تک
کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کہ کہیں بدنامی
اور رسوائی میری زندگی کو مزید اجیرن کر دے۔ یہ تو قسمت
کی بات ہے کہ میری ساس کی طبیعت خراب ہوئی اور
میرے شوہر اسے اس ہسپتال میں لے آئے، جہاں
تمہاری ماں زیر علاج تھیں۔ تمہیں دیکھ کر نہ جانے کیوں
میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور آنکھیں تمہیں دیکھنے
کو تے تاب سی رہنے لگیں، تو میں تمہارے قریب ہوتی
گئی۔ اگر سچ مانو تو مجھے تم سے سچی محبت ہو گئی اور میں تم پر
دل و جان سے فدا ہو گئی ہوں۔ میری یہ دیوانگی ہے یا اور
کچھ کہ میں چند لمحوں کے لیے بہک سی گئی تھی اور برسوں
سے بیاسی سمندر کو دیکھ کر اپنی پیاس بجھانے چلی آئی تھی،
مگر یہ بھول گئی تھی کہ میں جس کی عزت و آبرو ہوں، میں
جس کی شریک حیات ہوں، وہ تو مجھے دھتکار رہا ہے اور جو
اجنبی ہے وہ مجھے اتنا عزیز کیوں رکھ رہا ہے.....؟ میری
عزت و آبرو اور خوشیوں کا خیال کیوں رکھ رہا ہے؟ شاید
یہ بھی انتقام لینا چاہتا ہے، جو میری محبت، میری چاہت
اس سنگدل سے لے رہی ہے اور اسی محبت کے دم سے
میں اب تک جی رہی ہوں۔

جھٹکی کے ٹوٹے بانسوں کے درمیان گھونسلے میں دو
پیار کرنے والے پیچھے دیکھ کر میں پُر غم آنکھوں سے یہ دعا
مانگ رہی ہوں کہ ہر پیار کرنے والوں کی طرح یہ جوڑی
بھی سلامت رہے۔

ہاں میں تو وہ جبر کے رشتوں کی ماری ہوں کہ جس
کے دامن میں نہ پھول ہیں، نہ خوشبو ہے اور نہ چاہت
ہے۔ اس عید پر بھی میری آنکھوں میں اشکوں کا ایک
سیلاب ہے اور غموں کا طوفان ہے۔ اب میری تنہا زندگی
ہے میں ہوں اور میری محبت کا انتقام ہے۔

☆.....☆

...دور



کاشی چوہان

نوجوان شاعر کاشی چوہان کا خوبصورت
شاعری سے سجا مجموعہ کلام.....

شائع ہو چکا ہے



تم نے سونا بنا کے مٹی سے
مجھ کو مٹی کے بھاؤ بیچ دیا
دو شیزہ اور جی کہانیاں کے قارئین کے لیے خصوصی
ڈسکاؤنٹ۔ کتاب کی قیمت میں کتاب آپ کے
ہاتھ میں۔ نہ کوئی ڈاک خرچ اور نہ کوئی دوسرا خرچ۔
پاکستان بھر سے صرف ایک S.M.S یا فون کال
مجھے، کتاب آپ کی دلہیز تک پہنچادی جائے گی۔

کتاب ملے کے

الفرید پبلشرز اردو بازار۔ کراچی

البلال اردو بازار۔ کراچی

سٹی بک پوائنٹ اردو بازار۔ کراچی

0307-2089080

رابطے کے لیے

پانچ پریاں

نگیل احمد احمدانی

ڈیرہ غازی خان سے ایک نوجوان کی عبرت خیز داستان

مزار پر مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ اس جگہ آ کر مجھے بے حد سکون ملتا تھا۔ اس لیے میں دو چار دن رہنے کے لیے شعیب کے ساتھ اس کے گاؤں چلا آتا تھا۔ مزار کے قریب یہ جگہ جہاں ایک ہوٹل تھا، بہت پرسکون تھی، کیوں کہ مزار اور ہوٹل گاؤں سے خاصے فاصلے پر تھے اس لیے اس طرف اٹکاؤٹکا لوگ ہی آتے تھے۔

میں اور شعیب دونوں کلاس فیلو تھے۔ شعیب گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اور شہر میں وہ کالج کے ہاسٹل میں رہتا تھا۔ اس کا گاؤں بہت سرسبز تھا، جو بھی کالج سے گرمیوں کی چھٹیاں ہوتیں، میں بھی اس کے ساتھ ہی اس کے گاؤں چلا آتا۔ ہوٹل کا مالک ایک بوڑھا شخص تھا۔ وہ چائے بہت اچھی بناتا تھا، میں جتنے دن بھی گاؤں میں رہتا، جائے یہاں سے ہی پیتا تھا۔ میں اور شعیب باتوں میں گمن پینچ پر بیٹھے تھے کہ ایک چار پانچ سال کی بچی ہمارے پاس آ کے کھڑی ہوئی اور منگنی باندھے ہمیں دیکھنے لگی۔ شعیب نے اسے دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ”دفع ہو جاؤ یہاں سے، کیوں آئی ہو یہاں۔“ اس نے غصے سے کہا۔ بچی سہم گئی۔ کیوں ڈانٹ رہے ہو بچی کو، شعیب کی یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی۔ ”ہونہہ بچی، مجھے نفرت ہے اس بچی سے۔ چلو یہاں سے، سارا موڈ خراب

اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ بھاگ گئی۔ اسی وقت شعیب اندر داخل ہوا۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں آیا ہوا ہوں؟ میں نے اسے آتے دیکھا تو پوچھا۔ شعیب مسکرایا اور بولا۔ ”ہوٹل والے چچا نے بتایا تھا کہ تمہارا دوست آیا ہوا ہے۔“

”اچھا آؤ گرم گرم چائے پیتے ہیں۔“

”ہاں کیوں نہیں ضرور۔“ ہم دونوں اپنی مخصوص جگہ پر آ گئے۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ وہ بچی بھی آ گئی۔ شعیب نے اسے دیکھتے ہی رخ پھیر لیا۔ ”آخر تمہیں اس معصوم بچی سے نفرت کیوں ہے۔“ میں نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔

”پاگل ہے پاگل اور پاگل لوگوں سے نفرت ہے مجھے، اس کا باپ اس کو پری کہتا ہے پری، ہونہہ ایسی پاگل اولاد سے تو بندہ بے اولاد ہی بہتر ہے۔“ شعیب نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ اس کے خیالات جان کر مجھے

بہت دکھ ہوا۔ شعیب یا ایسا نہ کہو، یہ تو رب کے کام ہیں، کسی کو نارمل اولاد دیتا ہے اور کسی کو ایب نارمل۔

”پری بیٹا، میرے بچے، چلو گھر چلو، آ جاؤ شاپاش میرے بچے۔“ میں نے آواز کی سمت دیکھا تو ایک شخص اس بچی کو پیار سے کہہ رہا تھا، جو یقیناً اس کا باپ ہوگا۔ وہ پری کو لے کر چلا گیا۔ شعیب نے اُن کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”دیکھو کیسا پاگل باپ ہے۔ اس پاگل پری کو پیار کر رہا ہے۔“

”شعیب اولاد تو اولاد ہوتی ہے اور پھر ایب نارمل بچوں کو پیار کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، پلیز اپنے خیالات بدل ڈالو۔“ میں نے اس سے کہا، لیکن شعیب نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہا۔ اس کے پاس پانچ دن رہنے کے بعد میں واپس آ گیا۔ وہ دن چھی آ گیا جب مجھے انگینڈ جانا تھا۔ شعیب مجھے الوداع کہنے آیا تھا۔ اب ہمارے رابطے کا ذریعہ خطوط



سپا توپس سچ بیانی

خواہشوں کا اسیر



دستگیر شہزاد

چالاکیوں اور مکاریوں سے بھرپور ایک انوکھی سچ بیانی

چونیس مارچ 2012ء کی صبح تڑکے تقریباً پانچ بجے کی بات ہے۔ نواب پور میں رہنے والا ذیشان بستر سے اٹھنے کی تیاری کر رہی رہا تھا کہ اسے اپنے گھر میں کسی بچے کی دردناک چیخ نے چونکا دیا۔ ذیشان جلدی سے بستر سے نیچے اُترا۔ بچے کی وہ چیخ اس کے بیٹے احمد نے بھی سنی تھی۔ چیخ سنتے ہی احمد والد کے کمرے میں آ گیا۔ آواز ان کے کرائے دار اسد کے کمرے سے آئی تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اسد ڈیری کے کاروبار سے جڑا ہوا تھا اور



آفس میں نہ کر سکا۔
”واہ میرے مولا! تو نے میرے دوست کی ذرا سی خطا کی اتنی بڑی سزا دی۔ اتنی بڑی آزمائش دی۔“ ماں نے اپنے دل میں سوچا اور پھر میں مزید وہاں نہ بیٹھ سکا اور بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے چلا آیا مزار کی طرف، کیوں کہ سکون تو مجھے وہیں جا کے ملتا تھا۔
☆.....☆

برصغیر کی عظیم ڈرامہ نویس

فاطمہ ثریا بجیا کی زندگی کی کہانی

سیدہ عفت حسن رضوی کی زبانی

ایک معرکہ الاراء کتاب



شانع ہو گئی ہے

تھے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں کمی آتی رہی۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ”وقت اور فاصلے محبت کم کر دیتے ہیں۔“ مصروفیت میں اضافہ ہو گیا تو ہمارا ایک دوسرے سے رابطہ بھی ختم ہو گیا اور یوں پندرہ سال بیت گئے۔

میں باہر کی زندگی سے گھبرا کر پاکستان آیا تو مجھے شعیب، اس کا گاؤں اور مزار بڑی شدت سے یاد آئے۔ میں مزار پر آیا تو سب کچھ ویسے کا دیا تھا، کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔ ہاں ہول والے چچا کی جگہ ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا، جس نے اپنے باپ کی جگہ سنبھال لی تھی۔ یہ بھی نظام قدرت ہے کہ باپ کی جگہ پر اس کا بیٹا اور اس کی جگہ پر پھر اس کا بیٹا۔

مزار پر چہل پہل نظر آ رہی تھی، لیکن اب وہ پہلے والا سکون و سکوت نہ تھا، جو میں چھوڑ گیا تھا۔ شعیب مجھے دیکھ کر حیران سا رہ گیا۔ ”ارے یار جنید تم یوں اچانک۔“

بدلتے زمانے نے ہمارے خال و خد بھی کافی تبدیل کر دیے تھے، ہمیں بھی بدل دیا تھا، لیکن ہم نے ایک دوسرے کو پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہیں کی۔

ہم نے ڈھیروں باتیں کیں، گلے شکوے کیے، شعیب نے مجھے اپنی شادی کے بارے میں بتایا۔ پتا نہیں وہ اس ذکر پر کچھ اُداس لگ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”یار اپنے بچوں سے تو ملا واؤ۔“ وہ گھر کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس نے ایک بچی کو گود میں اٹھایا ہوا تھا اور اس کے پیچھے مختلف عمر کی چار بچیاں تھیں۔ شعیب نے اپنی گود میں لی بچی کے رخسار کو چومنا اور عجیب سے لہجے میں بولا۔

”جنید یہ میری پریاں ہیں، پانچ پریاں۔ لوگ مجھے کہتے ہیں، تم ان سے اتنا پیار کیوں کرتے ہو، یہ تو پاگل ہیں، لیکن میں کیا کروں جنید یہ تو میری اولاد ہیں۔ تم ہی نے تو کہا تھا کہ اولاد تو اولاد ہوتی ہے۔ یہ بچیاں مجھے بہت عزیز ہیں جنید، بہت زیادہ پیاری، شاید اس بچی پر ہی کا باپ اس سے اتنی محبت نہ کرتا ہوگا، جتنا مجھے اپنی ان پانچ پریوں سے ہے۔“ یہ کہہ کر شعیب پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ میں بھی اپنے

پچھلے سالوں سے ان کے یہاں کرائے پر رہ رہا تھا۔ صبح اس کے کمرے سے چیخ نے ڈیٹان اور اس کے بیٹے کو اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ دونوں ہی فوراً اسد کے کمرے میں پہنچ گئے۔ کمرے کے اندر سے ایسی آواز آرہی تھی، جیسے کوئی کراہتے ہوئے آخری سانس لے رہا ہو۔ ڈیٹان نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے اسد کے رونے کی آواز آنے لگی۔ اس سے ڈیٹان اور احمد کو لگا کہ ضرور کوئی حادثہ ہوا ہے۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا تو انہوں نے دیکھا کہ اسد گود میں اپنی چھ سال کی بیٹی خوشی کو لیے ہوئے کھڑا تھا اور وہ لمبی لمبی سانس لے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر غم تھا اور آنکھوں میں آنسو۔ اسد نے راستہ دیا تو ڈیٹان اور احمد دھڑکتے ہوئے دل سے کمرے میں داخل ہوئے۔ اندر کا نظارہ اور بھی رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔ اسد کی بیوی آمنہ اور بیٹا انعام بستر پر بے سندھ پڑے ہوئے تھے۔

”کیا ہوا اسد؟“ ڈیٹان نے حیرت بھرے لفظوں میں پوچھا۔

”کچھ نہیں بچا ماسٹر جی۔“ اسد روتے ہوئے بولا۔

”میرا سب کچھ برباد ہو گیا ہے۔ آمنہ اور انعام، دونوں کی موت ہو گئی ہے، خوشی بھی شاید ہی بچے۔ بیماری نے میرا گھر اجاڑ دیا ہے۔ اب میں اکیلا جی کر کیا کروں گا۔“ اسد کی بات سن کر ڈیٹان کے تو جیسے ہوش ہی اڑ گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے گھر میں اس طرح دو موتیں ہو جائیں گی۔ اسد خوشی کو بستر پر لٹا کر سر تھام کر گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا۔ ڈیٹان اور احمد نے اسد کو حوصلہ دیا، ساتھ ہی اس کی اطلاع پاس بڑوں کے لوگوں کو بھی دے دی، کچھ ہی دیر میں وہاں تمام لوگ اکٹھے ہو گئے۔ آنا فانا آمنہ، انعام اور خوشی کو ایک پرائیویٹ اسپتال میں لے جایا گیا۔ ان تینوں کو دیکھنے کے بعد ڈاکٹروں نے انہیں مردہ قرار دے دیا۔ اسد بیوی اور بچوں کی بیماری کی بات تو بتاتا تھا، لیکن اس طرح ایک ہی رات میں اس کی دنیا ویران ہو جائے گی، ایسا کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اسد کا رورور کرنا حال تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو تھننے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ جسے گھر کی سجاوٹ کہا جاتا ہے۔ وہ محض دکان کی سجاوٹ ہے، گھر کی سجاوٹ اس میں بسنے والے رشتے ہیں، جن کی حفاظت سے بے خبر

ہماری توجہ درود یار پر لگی جی اشیاء کی حفاظت و اہمیت پر رہتی ہے۔ آخر میں یہ سمجھنا محال ہوتا ہے کہ اصل سجاوٹ مانند کیوں پڑ گئی، ضائع کیوں ہو گئی اور دکانوں سے خریدی بیش قیمت اشیاء نے اپنی چمک دمک قائم رکھتے ہوئے بھی خوشی اور سکون دینے سے ہاتھ کیوں سنج لیا۔

اسد آبائی طور پر پیر محل کا رہنے والا تھا۔ اس کے والد ہارون علی کی گاؤں میں کھیتی باڑی تھی۔ ان کے خاندان میں بیوی عکاشہ کے علاوہ اسد سے چھوٹی تین بیٹیاں حدیقہ، طیبہ، ثناء اور دو بیٹے اظہر احمد اور طاہر احمد تھے۔ اسد کی بیوی آمنہ رستم پور کے علی اکبر کی بیٹی تھی۔ اسد نے فون کر کے بیوی و بچوں کے مرنے کی خبر دونوں جگہ دی تو وہاں بھی کہرام مچ گیا۔

اسد آخری رسم ادا کرنے کے لیے بیوی اور بچوں کی لاشوں کو گاؤں لے گیا۔ ایک ساتھ تین لاشوں کو دیکھ کر پورا گاؤں غم میں ڈوب گیا۔ جس نے بھی دیکھا، اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ خبر ملتے ہی حدیقہ کے میکے والے بھی پیر محل پہنچ گئے۔ بیماری سے ایک رات میں اچانک تین موتوں کی بات آمنہ کے والد کے گلے سے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔ ان کے دماغ میں شک کا کیرا بڑی طرح سے کھیلنے لگا تھا۔ کلیوں کا مرجھا کر سوکھ جانا افسوس ناک ہے۔ تازگی اور حسن برقرار رکھتے ہوئے بھی، کلیوں کا کھل کر پھول نہ بننا ایک بڑا المیہ ہے۔ آمنہ کبھی کبھار بیمار رہتی تھی۔ یہ بات انہیں معلوم تھی، لیکن غصہ اس بات پر آ رہا تھا کہ اگر اس کی حالت اتنی ہی خراب تھی تو اسد نے یہ بات انہیں کیوں نہیں بتائی تھی؟ اس کے ساتھ ہی انہیں یہ بات بھی بڑی عجیب سی لگ رہی تھی کہ جب آمنہ اور بیٹے اتنے زیادہ بیمار تھے تو وہ انہیں اسپتال کیوں نہیں لے کر گیا تھا۔ علی اکبر کے دونوں بیٹے، شان، ایمان اور وہاں موجود دیگر رشتے دار بھی یہی سوچ رہے تھے۔ ماحول بھلے ہی ممکن تھا، لیکن وہ لوگ یہ صدمہ برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔ اس لیے انہوں نے فوری طور پر اسد سے پوری بات جاننا چاہتی تھی۔

بے اصرار پوچھنے پر اسد نے یہ بتایا کہ عید کے بعد سے ہی وہ تینوں لٹی، دست، بخار اور پیٹ کے درد سے پریشان تھے۔ ان کا علاج بھی چل رہا تھا۔ بیٹی شام چاروں جلد کھانا کھا کر سو گئے تھے۔ اسد نے آگے بتایا کہ رات میں آمنہ

پیٹ درد اور سردی سے کرا رہی تھی۔ وہ بے چین سی ہو رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میں نے اسے انجکشن دے دیا تھا۔ جس کے بعد وہ آرام سے سو گئی تھی، لیکن جب صبح کو میں نے انعام کو اٹھانے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ وہ تو مر چکا ہے، پھر میں نے آمنہ کو جگانا چاہا، لیکن وہ بھی دنیا چھوڑ چکی تھی۔ خوشی بھی مجھے بے چین سی لگ رہی تھی۔ لیکن میں اسے بھی نہیں بچا سکا۔ اسد نے جو کچھ بھی بتایا تھا، اس قدر گہرے صدمے کے باوجود علی اکبر اور ان کے رشتے دار چاہ کر بھی اس پر یقین نہیں کر پا رہے تھے۔ علی اکبر نے مکان مالک سے بھی بات کی، تو پتا چلا کہ انہیں اس بات کی اطلاع صبح ملی تھی۔ یہ بات سبھی کو بڑی عجیب سی لگ رہی تھی کہ جب اتنی بڑی مصیبت آئی تھی، تو اسد نے کسی کو مدد کے لیے کیوں نہیں بلایا تھا۔ جب بیوی اور بیٹے کی موت ہو چکی تھی تو اسے کم از کم مکان مالک کو تو بتا ہی دینا چاہیے تھا۔ ان باتوں نے ان کے دل میں شک پیدا کر دیا تھا۔ شک کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آمنہ کی گھریلو زندگی ٹھیک نہیں تھی۔

اسد کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اسد بڑھا لکھا بھی تھا اور سمجھ دار بھی، لیکن اس سے ایسی امید نہیں تھی کہ وہ بچوں کو اسپتال لے جانے میں کوئی کوتاہی کرے گا۔

علی اکبر کے دل میں بہت سارے سوالیہ نشان تھے۔ اپنے ان سوالوں کے ساتھ وہ چپ نہیں بیٹھنا چاہتے تھے۔ اسد کو جتنا بتانا تھا، وہ بتا چکا تھا، اس لیے انہوں نے اس کے باپ سے بات کی اور پھر انہوں نے اپنا شک ظاہر کرتے ہوئے صاف کہہ دیا تھا کہ آمنہ اور دونوں بچوں کی ایک ساتھ موت اتفاق نہیں ہو سکتی، ان تینوں کا قتل کیا گیا ہے اور قاتل ہے ان کا بیٹا اسد۔

اس بات پر دونوں خاندانوں کے بیچ گرما گرمی ہونے لگی۔ جب بات حد سے زیادہ بڑھ گئی تو علی اکبر نے اس کی اطلاع تھانہ شورو کو دے دی۔ اطلاع ملنے ہی انسپکٹر عباس خان پولیس نفری کے ساتھ موقع پر پہنچ گئے۔ علی اکبر اور ان کے رشتے دار اسد پر سیدھے قتل کا الزام لگا رہے تھے۔ اے ایس بی سول لائن ماجد علی کو بھی یہ معاملہ نہایت سنگین لگا تھا، لہذا وہ بھی پیر محل پہنچ گئے۔ پولیس نے اسد سے پوچھ گچھ کی تو وہ دھاڑیں مار کر وہی پرانے جملے دہرانے لگا۔

”صاحب! دیکھیے میری بیوی اور پھول سے دو بچے مر گئے اور یہ لوگ ہیں کہ جھوٹے الزام لگا کر مجھے پریشان کر رہے ہیں۔ پتا نہیں یہ کیسے والدین ہیں، جو اپنی بیٹی کی موت کو تماشا بنا دینا چاہتے ہیں۔ ایسی باتیں سننے سے اچھا تھا کہ میں بھی مر جاتا۔“

”تم خود کو سنبھالو اور ہمیں بتاؤ کہ یہ سب کیسے ہوا؟“ انسپکٹر نے اسے تسلی دے کر پوچھا تو کچھ دیر خاموشی کے بعد اس نے وہی بات دہرا دی، جو اس نے علی اکبر کو بتائی تھی۔ پولیس کو بھی یہ بات بڑی عجیب سی لگی کہ ایک ہی رات میں تین اموات ہو جانے پر بھی اسد نے نہ تو رات میں کسی کو بتایا اور نہ ہی مرنے والوں کو اسپتال لے جانے کی ضرورت سمجھی۔ ان باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے پولیس نے اس معاملے کی جانچ کر لینا ضروری سمجھا۔

انسپکٹر عباس کان نے نواب پور جا کر لوگوں سے اسد کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو وہاں لوگوں نے اسد کے بارے میں جو بتایا، اس سے پولیس کو بھی اس پر پورا پورا شک ہونے لگا۔ پولیس کو پتا چلا کہ اسد خواہش پسند اور ایک غصہ ور مزاج رکھنے والا شخص تھا۔ اس کے علاوہ بھی لوگوں سے اس کے بارے میں کئی طرح کی باتیں سننے کو ملیں۔ علی اکبر سازش کے تحت قتل کیے جانے کی بات پر اڑے بیٹھے تھے اور انہوں نے پولیس کو اسد کے خلاف کئی ثبوت بھی دے دیے تھے۔ حالات شک والے تھے، اس لیے پولیس نے گھما پھرا کر اسد سے پوچھنا چھ کی، تو وہ کئی سوالوں کے جواب تسلی بخش تا دے پایا۔ سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ بیوی بچوں کے بیمار ہونے پر وہ انہیں رات میں ہی اسپتال کیوں نہ لے گیا اور ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود اس نے مالک مکان کو کچھ کیوں نہیں بتایا تھا۔ پولیس نے اس پر جواب کے لیے دباؤ ڈالا، تو وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ اسد کی باتوں اور رونے سے پولیس اتنا تو سمجھ گئی کہ وہ رونے کا نالک کر کے بات کو گھمانے کی پار بار کوشش کر رہا ہے۔ پوچھنا چھ میں اس کے چہرے پر اڑتی ہوئی ہوائیوں نے بھی پولیس والوں کے شک کو اور گہرا کر دیا تھا۔ اب پولیس نے اسد کو تفتیش کی چمکی میں پس کر رکھ دیا تھا، جسے وہ برداشت نہ کر سکا اور اس نے ایک ایسا خوفناک انکشاف کیا، جسے سن کر ہر کسی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر دھرم تھام کر رو تار، پھر اچانک بولا۔

”میں نے سبھی کو زہر کا انجکشن لگایا تھا۔“
اس کی بات سن کر پولیس بھی حیرت میں رہ گئی۔ کوئی انسان اتنا حیوان ہو سکتا ہے، یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔
پولیس نے اسے فوراً حراست میں لے لیا اور تینوں لاشوں کو اپنے قبضے میں کر کے ان کا بیچ نامہ بنایا اور انہیں پوسٹ مارٹم کے لیے ڈسٹرکٹ اسپتال بھجوا دیا، اس کے ساتھ ہی آمنہ کے والد کی تحریر پر اسد کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کر لیا گیا۔ اسد کے حیوانیت بھرے اس کروت سے سبھی حیرت میں تھے۔ تھرے قتل کی اطلاع پا کر آرپی او حافظ نعمان اور ڈی پی او حسن سردار بھی اسد سے معلومات کرنے پہنچ گئے تھے۔ پولیس اسے لے کر نواب پور میں واقع اس کمرے میں پہنچی تو اس نے وہ انجکشن برآمد کر دیا جس سے اس نے تینوں کو زہر دیا تھا۔
دو چار ٹکڑے ہوں تو جوڑے جاسکتے ہیں۔ کرچیاں پرانی شکل کو واپس نہیں لاسکتیں۔ لاشیں آمنہ کے والد کے حوالے کر دی گئیں۔ انہوں نے تینوں لاشوں کو گاؤں لے جا کر گرم زدہ ماحول میں ان کی آخری رسوم ادا کیں۔ اس رسم میں شامل ہر ایک شخص بھونچکا تھا، کسی کو بھی اسد کے کروت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ادھر پولیس نے اسد سے تھانے میں تفصیل سے پوچھ تاچھ کی تو اس نے کئی چونکا دینے والے راز اُگلے۔ اس نے اپنی بیوی اور بچوں کے قتل کی ایک نہیں، کئی وجوہ بتائیں، جس میں آمنہ اور اس کے بچوں کا کوئی گناہ نہیں تھا، بلکہ اپنی اپنی خواہشوں اور انتہا پسند مزاج کی وجہ سے وہ ایسے لوگوں میں شامل ہو گیا تھا جو زندگی میں کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔
اس نے بتایا کہ قتل کی پلاننگ وہ کافی پہلے کر چکا تھا۔ اسد بچپن سے خواہش پسند تھا۔ وہ پڑھ لکھ کر اونچا مقام حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چھ بھائی بہنوں میں وہ چوں کہ سب سے بڑا تھا، اس لیے اس پر ذمے داریاں بھی بہت زیادہ تھیں۔ اسد نے انہیں اے کرنے کے بعد ایل ایل بی کی پڑھائی شروع کر دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اچھی پڑھائی کر کے سول سروس کی تیاری کرے، لیکن اس سے پہلے کہ وہ یہ مقام حاصل کر پاتا اس کے لیے پہلے سے ہی رشتے آنے شروع ہو گئے تھے۔ اس کے والد ہارون علی چاہتے تھے کہ بیٹے کی شادی ہو جائے، پھر ایک دن اس کے لیے رسم پور سے علی اکبر کی بیٹی سدرہ کا رشتہ آیا۔ ان

کی بیٹی جوان تھی، اس لیے وہ لڑکے کی تلاش کر رہے تھے، تاکہ وہ جلد از جلد اپنے فرض سے سبک دوش ہو سکیں۔ دونوں خاندانوں کی بات چیت کے بعد اسد کا رشتہ سدرہ کے ساتھ پکا کر دیا گیا۔ رشتہ تو ہو گیا، لیکن کچھ دن بعد ہی سدرہ کی طبیعت خراب ہو گئی اور علاج کے باوجود دس بارہ دن بعد اس کی موت واقع ہو گئی۔ غم کے اس دور میں اسد کا خاندان بھی سدرہ کے خاندان کے ساتھ تھا۔ اس درمیان دونوں خاندان آپس میں محل مل گئے تھے اور ان میں آپس میں لگاؤ بھی گہرا پیدا ہو گیا تھا۔
اسد کا خاندان بھی ٹھیک تھا اور وہ محنتی لڑکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ علی اکبر نے سوچا کہ اپنی پھیلی بیٹی آمنہ کا رشتہ بھی اس کے ساتھ ہی کر دینا چاہیے۔ اسد کا خاندان خود بھی یہی چاہتا تھا۔ ایک بار پھر دونوں خاندانوں میں اسد اور آمنہ کے رشتے پر آپس میں رضامند ہو گئے۔ سب کچھ طے ہو جانے کے بعد آمنہ اور اسد کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد دونوں کے دن ہنسی خوشی بہتے گئے۔ اس درمیان نواب پور کی ایک ہسپتال فیکٹری کے کیمیکل شعبے میں اسد کی نوکری بہ طور سپروائزر لگ گئی۔
شادی کے ایک سال بعد ہی آمنہ نے بیٹے کو جنم دیا تو اسد کے خاندان میں خوب خوشیاں منائی گئیں۔ اس درمیان اس نے نواب پور میں ہی اپنا مکان بنالیا اور بیوی بچوں کے ساتھ وہاں رہنے لگا۔ نوکری کے ساتھ ساتھ اسد سول سروس میں جانے کے لیے امتحانات بھی دیتا رہا۔ یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ اس کا نمبر نہ آ سکا۔ اسد اس کمپنی سے اتنا کما نہیں پاتا تھا کہ خاندان کی گاڑی آرام سے چل سکے، جبکہ اس کی خواہشات بہت اونچی تھیں، مگر کمزور لوگوں کے ہر جذبے اور ہر خواہش کا پورا ہونا شاید بہت مشکل ہے، کیوں کہ انسان میں منفی صفات کی قوت بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اسد بیٹے کے بعد ایک بیٹی کا باپ بن گیا، تو اس کی ذمہ داریوں کا بوجھ اور بھی بڑھ گیا۔ کمائی کم اور خرچ زیادہ ہو گئے تو وہ بے چین سا رہنے لگا۔
چار سال پہلے کی بات ہے، ایک دن اسد گھر آیا تو اس کے چہرے پر کافی تناؤ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر آمنہ نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے۔ آج آپ پریشان سے لگ

رہے ہیں۔“
”ہاں، یہ تو میری قسمت سی بن گئی ہے۔“ اسد نے بھک کر جواب دیا۔
”ایسا کیوں سوچتے ہیں آپ۔“ آمنہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔
”اور کروں بھی تو کیا؟“ وہ غصے میں بولا۔ ”جو بننا چاہتا تھا وہ بن نہیں سکا، بن کر رہ گیا۔ سپروائزر آج میں نے سپروائزر کی نوکری بھی چھوڑ دی ہے۔“ اس کی بات سن کر آمنہ چونکی۔ وہ کچھ بہتی سنتی، اس سے پہلے ہی اسد سر پکڑ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”اگر میں نے جلدی شادی نہ کی ہوتی تو شاید کچھ بن گیا ہوتا۔“
آمنہ کو اسد کی یہ بات قطعی اچھی نہیں لگی۔ یہ کہہ کر وہ ایک طرح سے اپنے بیوی بچوں کو بوجھ کی طرح جان رہا تھا۔ اس لیے وہ شکایتی لہجے میں بولی۔
”اگر ہستی کو بوجھ جان رہے ہو۔“
”بوجھ تو نہیں جان رہا، لیکن جلدی میں یہ سب کچھ ہو گیا۔“ اتنا کہہ کر اسد چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر اسی طرح کی بات چیت کرنے کے بعد اسد کھانا کھا کر سو گیا۔ نوکری تو وہ پہلے ہی چھوڑ ہی چکا تھا، لیکن اب آنے والے میں اسے کیا کرنا تھا، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، پھر وہ نئے کام کی تلاش میں بھٹ گیا۔ جب اسے کام اپنی پسند کا نہیں ملا، تو اس نے اپنا ہی کام کرنے کا ارادہ کر لیا۔ کافی غور و فکر کے بعد اس نے دودھ کی ڈیری کھولنے کا فیصلہ کیا۔ بھینس خریدنے کے لیے اسے لاکھوں روپے کی ضرورت تھی۔ ہارون بھی بیٹے کو اتنی مدد دینے میں ناکام تھے۔ اسد کئی دنوں تک پریشان رہا، پھر سوچتے سوچتے اچانک اسے ایک راستہ نظر آیا، یہ راستہ تھا مکان بیچنے کا۔ مکان بیچ کر وہ بھینس خرید سکتا تھا، پھر اس نے اپنے دل کی بات آمنہ کو بتائی۔
”مکان بیچ دو گے تو ہم رہیں گے کہاں۔“ آمنہ نے اس سے پوچھا۔
کرائے پر مکان لے کر کہیں بھی رہ لیں گے۔ میرا کام شروع ہو جائے تو پیسوں کی پریشانی نہیں ہوگی۔ اسد نے آمنہ کو سمجھانے کی کوشش کی، گو کہ آمنہ کو اسد کا یہ فیصلہ اچھا تو نہیں لگ رہا تھا، لیکن وہ کہہ ہی کیا سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اسد نے اگر مکان بیچنے کی ٹھان لی ہے تو وہ مانے گا

نہیں، ویسے بھی ہر عورت چاہتی ہے کہ اس کا شوہر ٹھیک پیسے کما رہا ہے، تاکہ اس کا خاندان ٹھیک رہے۔ بہر حال اسد نے اپنا مکان بیچ دیا۔ یہ چار سال پہلے کی بات ہے۔ مکان بیچ کر اسد نے نواب پور میں رہنے والے ایک اسکول ٹیچر نیل کے یہاں دو کمرے کرائے پر لے لیے اور بیوی اور بچوں کے ساتھ وہاں رہنے لگا۔ اس کے بعد اس نے کچھ بھینسیں خرید کر ڈیری کھول لی۔ کام چل لگا تو دھیرے دھیرے وہ معاشی تنگی کے دور سے بھی نکل گیا۔ اسد چاہتا تو اپنے اس کام کو بڑھا بھی سکتا تھا، لیکن خواہش پسند ہونے کی وجہ سے اس لگتا تھا کہ اتنا پڑھا لکھا ہونے کے باوجود اسے ان پڑھوں جیسا کام کرنا پڑ رہا ہے۔ اس لیے وہ اس کام کے ساتھ ساتھ کسی اچھی نوکری کی تلاش بھی کرتا رہا۔ اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے اسد کسی بھی طرح زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے کی جگت میں لگا رہتا تھا۔ اسی جگہ میں گھومتے گھومتے اس کے دماغ میں آیا کہ وہ کسی بیمہ کمپنی کو چونا لگا کر موٹی رقم ایٹھ سکتا ہے۔ یہ بات دماغ میں آتے ہی اس نے ایک پلان بنالیا۔ اپنے پلان کے مطابق اس نے ساری بھینسوں کا بیمہ کروا دیا۔ بیمہ کرائے ابھی اسے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ ایک دن اچانک اس کی کئی بھینسوں کی موت واقع ہو گئی۔ بھینسوں کی موت ہو جانے سے اسد کو موٹی رقم مل سکتی تھی۔ اسد کو جاننے والے لوگ اس سے افسوس جتا رہے تھے۔ اسد نے بیمہ کمپنی کو اس بابت بتایا، تاکہ آگے کی کارروائی ہو سکے۔
ایسے معاملوں میں بیمہ کمپنیوں کے اپنے طور طریقے ہوتے ہیں۔ بیمہ کمپنی نے اپنے حساب سے اس کی کارروائی شروع کی، لیکن اسی درمیان کسی نے بیمہ کمپنی کے ملازموں کو اطلاع دے دی کہ اسد کی بھینسوں کی موت قدرتی طور پر نہیں ہوئی تھی، بلکہ اس نے بیسے کی رقم حاصل کرنے کے لیے انہیں زہر دے کر مارا تھا۔ جب انہیں شک ہوا تو بیمہ کمپنی نے ایک بھینس کا پوسٹ مارٹم کرا لیا۔ پوسٹ مارٹم میں ثابت ہو گیا کہ بھینسوں کو زہر دیا گیا ہے۔ بھید کھلنے کے بعد اسد کے جیل جانے کی نوبت آ گئی۔ وہ جیل چلا بھی جاتا، لیکن لوگوں کے درمیان میں آنے کی وجہ سے وہ بیچ گیا۔ اسد نے سوچا تھا کہ بیمہ کے پیسے سے حالات سدھر جائیں گے، لیکن اس کے لالچ نے اسے معاشی طور سے اور بھی

گہری چوٹ پہنچائی۔ اس کے بعد وہ کسی نہ کسی طرح وقت کاٹنے لگا۔ اسد پہلے ہی گھر سے الگ رہ رہا تھا، لیکن والد کے بعد گھر میں بڑا ہونے کے ناتے گھر کی ذمہ داری بھی اس پر تھی۔ گھر میں اس کی تین بہنیں جوان ہو رہی تھیں، جبکہ اس کے دونوں بھائی ابھی پڑھ رہے تھے۔ بھائیوں کی پڑھائی میں بھی وہ بیسوں سے مدد کرتا تھا اور خاندان کے بھی معاشی مسائل حل کرنے میں ہاتھ بٹاتا تھا، لیکن آمنہ کو یہ سب قطعاً پسند نہیں تھا۔ اس کے لیے وہ اسے نوکری بھی رہتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اور اس کے بچے ہر وقت محرومیوں میں گھرے رہتے تھے۔ گاؤں میں لڑکیوں کے جوان ہوتے ہی والدین کو ان کی شادی کی فکر ستانے لگتی ہے، اسد کی دونوں بہنیں بھی جوان ہو چکی تھیں۔ اس کے والد ہارون نے اس بارے میں اسد سے بات کی تو اس نے یہ کہہ کر چچا چھڑا لیا کہ اس کی اپنی معاشی حالت ٹھیک نہیں ہے، پھر بھی جو ہو سکے گا وہ کرے گا، لیکن ایسا نہیں تھا کہ اسد کو بہنوں کی شادی کی فکر نہیں تھی۔ اسد کا دماغ خرافاتی تھا۔ ایک سال بیتتے بیتتے اس نے ایک اور کارنامے کو انجام دے دیا۔ ہوا یہ کہ ایک شام راہ چلتے لوگوں کو اسد کی ڈیرہ سے شور کی آواز سنائی دی۔ لوگوں کا دھیان اس طرف گیا تو انہوں نے دیکھا کہ دکان کا آدھا شگر اہوا تھا۔ لوگوں نے شراٹھا کر دیکھا تو اسد دکان کے اندر تھا اور اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ اس نے بتایا کہ کچھ بد معاش آئے اور اس کا سامان لوٹ کر چلے گئے۔ بد معاشوں نے دیوار توڑ کر سامان نکالا تھا اور اسد کو شور نہ مچانے کی دھمکی دیتے ہوئے باغیچہ گئے تھے۔ جب اسے لگا کہ بد معاش کافی دور چلے گئے ہوں گے تو اس نے شور مچا دیا۔ لوٹ مار کی اطلاع پر پولیس بھی موقع پر آ گئی۔ پولیس کو یہ بات بڑی عجیب سی لگی کہ جب بد معاش لوٹنے ہی آئے تھے تو وہ سامان سامنے کے راستے سے بھی لے جاسکتے تھے۔ وہ بھلا دیوار توڑنے میں کیوں اپنا وقت برباد کرتے۔ ایک بات اور غور طلب تھی کہ بد معاشوں نے اسد کے ہاتھ پیروں کے ساتھ منہ نہیں باغیچہ تھا۔ ایسی حالت میں ان کے جانے کے بعد وہ شور مچا سکتا تھا۔ پولیس نے جب اسد سے سوال جواب کیے تو وہ زیادہ دیر تک نہیں نک پایا۔ دراصل اسد نے دکان کا سامان خود ہی ایک رشتے دار کے یہاں جا کر رکھ دیا تھا اور پھر دیوار

توڑ کر اپنے ہاتھ پیروں میں رسی الجھا کر ڈکیتی کی جھوٹی کہانی گھڑ لی تھی۔ اسے امید تھی کہ پولیس اس واردات کو سچ مان کر رپورٹ لکھ لے گی اور اسے بیسے کی رقم مل جائے گی۔ اس بار بھی وہ کسی طرح جیل جانے سے بچ گیا۔ اسد نے جیسے خود ہی پریشانیوں سے اپنا مکمل ناتا بنالیا تھا۔ ڈیری چلانے کے ساتھ ساتھ اسد کچھ بچوں کو ان کے گھر جا کر ریوٹن پڑھاتا تھا۔ اسی دوران ایک لڑکی کو لے کر اسد کے دل میں پیار کے بیج پھوٹ گئے۔ طالبہ بھی اس کی طرف سے متاثر ہوئی۔ تو دونوں کا عشق پروان چڑھنے لگا۔ اس سے گھریلو پریشانیوں کے بیچ اسے سکون کے کچھ لمبے مل جاتے تھے۔ جلد ہی ہی اسد اور اس کی اسٹوڈنٹ کے پیار کے چرچے شروع ہو گئے۔ یہ بات آمنہ کے کانوں تک پہنچی تو اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس نے اسد کو خوب کھری کھری سنائیں۔ کسی عورت کے دل میں ایک بار شک گھر جائے تو اس کے دماغ سے اس شک کا ٹکنا مشکل ہوتا ہے۔ اسد نے آمنہ کو بہلانے کی بہت کوشش کی، لیکن اب چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کے درمیان اختلافات کڑواہٹ میں بدلنے لگے تھے۔ دوران گفتگو ایک ایسا مقام بھی آ جاتا ہے جب الفاظ کرداروں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور لہجہ ان کا محافظ ہوتا ہے۔ باوقار کرداروں کا احترام کرتے ہوئے، ہم بہت کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ گھٹیا کرداروں کے قریب ٹھہر کر گناہ گار ہوتے ہوئے ہم اپنا وقار بھی گنوا بیٹھتے ہیں۔ آمنہ ہنس کھنسی۔ جب اسد کے کردار میں کھوٹ آئی تو اس نے اپنے بچاؤ کے لیے بیوی کے کردار پر انگلیاں اٹھانا شروع کر دیں۔ ایسا اس نے اس لیے کیا تاکہ آمنہ اس سے جھگڑ نہ سکے۔ مسکرا کر باتیں کرنا آمنہ کی عادت میں شمار تھا، جبکہ اسد اس کی اس عادت کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ روز روز کے جھگڑے شوہر کی ناقدری اور گھٹ گھٹ کر جینے کی وجہ سے آمنہ بیمار رہنے لگی تھی۔ اسد نے اس کا علاج بھی کرایا، لیکن اسے جو بیماریاں تھیں ان کا علاج آسان نہیں تھا۔ ادھر اسد اس کی بیماری پر ہونے والے خرچ، خاندان کے خرچ اور بہنوں کی شادی۔ بڑے بڑے کو لے کر وہ کافی پریشان رہنے لگا تھا۔ اسی سبب اس کے دماغ میں یہ بات گھر گھرنی کہ اگر وہ کسی طرح بیوی اور بچوں سے آزاد ہو جائے تو کسی امتحان وغیرہ کی تیاری کر کے کسی اچھی سروس میں نکل جائے گا اور دوبارہ شادی کر کے گھر بھی بسالے گا۔ یہ

بات دماغ میں آتے ہی اس نے ایک خطرناک فیصلہ لے لیا اور اسد نے کیمیکل کے ذریعے خاندان کا صفایا کرنے کی ٹھان لی۔ اپنے اس پلان کو وہ دھیرے دھیرے انجام دینا چاہتا تھا۔ عید کے دن اس نے خود کھانا کھانے کے بعد سبزی میں زہریلے کیمیکل کی کچھ بوتلیں ملا دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آمنہ اور اس کے دونوں بچوں کو الٹی دست ہونے لگے۔ اسد ڈاکٹروں سے ان کا علاج کراتا رہا، چوں کہ وہ لمبی پلاننگ کر رہا تھا، اس لیے اس نے اس بیماری کی بات اپنے گھر سے لے کر سسرال ورشتے داروں تک خوب بیان کی۔ ایسا ہوا اس لیے کہ رہا تھا تاکہ اپنے پلان کو انجام دینے پر کوئی اچانک اس پر شک نہ کر سکے۔ آمنہ کا جسم ایک تو پہلے ہی کمزور تھا، بیمار ہونے کے بعد وہ اور بھی کمزور ہو گئی تھی۔ کمزوری کی وجہ سے اسے طاقت کے انجکشن لگوانے کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑتا تھا۔ چوں کہ یہ آئے دن کی بات تھی، اس لیے اسد نے خود انجکشن لگانا سیکھ لیا اور جب بھی ضرورت ہوتی، وہ گھر میں ہی آمنہ کو انجکشن لگا دیتا تھا۔ کچھ انسانی کیفیات الفاظ و اظہار سے ماورا ہیں۔ اگر ہم بیان کریں تو سننے والے اسے فضول کی بک بک بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان اتنا تنہا ہو جاتا ہے کہ اس کی اعلیٰ صلاحیتیں اور ذہنی رسائیاں ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ چوتیس مارچ کی رات کو اسد کے سر پر حیوانیت سوار ہو گئی۔ اس نے آمنہ اور دونوں بچوں کو موت کی نیند سلانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے لیے وہ زہریلی لے آیا۔ اس نے زہر اور کیمیکل ایک شیشی میں گھول کر رکھ لیا۔ رات میں جب آمنہ بچوں کے ساتھ سونے کی تیاری کرنے لگی تو اس نے سردرد کی شکایت کی۔

”سردرد کمزوری کی وجہ سے ہی ہو رہا ہوگا۔“ اسد نے کہا۔ ”میں تمہیں انجکشن لگا دیتا ہوں، ایسا نہ ہو کہ طبیعت خراب ہو جائے، رات میں کوئی ڈاکٹر بھی نہیں ملے گا۔“ اسد جو کہہ رہا تھا وہ ٹھیک ہی تھا، لیکن آمنہ کو کیا پتا تھا کہ اس کا وہی سہاگ اسے موت کی نیند سلانے کی سوچ رہا تھا، جس کے لیے وہ لمبی عمر کی تنہا کرتی ہے۔ انعام اور خوشی پہلے ہی سوچے تھے۔

”ٹھیک ہے تم مجھے انجکشن لگا دو، میں کل ڈاکٹر سے مل لوں گی۔“ آمنہ نے کہا تو اسد نے زہریلی شیشی میں سے سرخ مگر آمنہ کو انجکشن لگا دیا۔ انجکشن نے بہت تیزی سے اثر کیا۔ لینے کے کچھ دیر بعد ہی آمنہ کی سانسوں کی ڈور ٹوٹ گئی۔ جب

اسد کو بھرپور ہوا گیا کہ آمنہ مر چکی ہے تو وہ اگلی تدبیر کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہی سوچتے سوچتے اسے نیند بھی آ گئی۔ تڑکے آنکھ کھلتے ہی اسد نے بیٹے انعام کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے انجکشن لگا دیا، کچھ دیر تڑپ کر اس کی بھی موت ہو گئی۔ ایسا کرتے ہوئے اسے ذرا بھی رحم نہیں آیا۔ اس وقت پانچ بجتے کو تھے۔ اس نے ایک بار پھر سرخ مگر بھی اور خوشی کو لگانے کے لیے آگے بڑھا۔ معصوم بچی گہری نیند میں تھی۔ اسد نے اسے انجکشن لگایا تو وہ درد سے جلا اٹھی۔ وہ چلائی تو اس نے انجکشن ایک طرف رکھ دیا، تب تک زہر اس کی نسلوں میں دوڑ چکا تھا۔ وہ پھر پھڑانے لگی۔ خوشی کی چیخ سن کر ماسٹر نیبل نے دروازہ کھٹکھٹایا تو مجبوراً اس نے دکھاوا کرنے کے لیے خوشی کو گود میں اٹھالیا اور دروازہ کھول دیا، جبکہ اس کا پلان یہ تھا کہ صبح لوگوں کو بتائے گا کہ رات میں تینوں سوتے میں ہی مر گئے، لیکن خوشی کے چیخنے سے وقت سے پہلے ہی سب کو ہتا چل گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے شاطر دماغ سے سبھی کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی حیوانیت شاید ہمیشہ کے لیے راز بن کے دفن بھی ہو جاتی، لیکن آمنہ کے خاندان نے شک ظاہر کیا تو معاملہ کھل گیا۔ اس کی حیوانیت کو جان کر ہر کوئی سکتے میں تھا۔ تفصیلی پوچھ تاچھ کے بعد پولیس نے اسد کو عدالت میں پیش کیا۔ سارے دیکھنے والوں کی وہاں بھیڑ لگ گئی تھی۔ اس نے عدالت میں کہا کہ وہ دماغی طور پر پریشان تھا، اس لیے اس نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ عدالت نے اسے چودہ دن کی قانونی حراست میں جیل بھیج دیا۔ اسد بہت خواہش پرست، بغاوتی مزاج والا اور لاپچی نہ ہوتا تو شاید وہ خاندان ایسا درد جھیلنے کو مجبور نہ ہوتے۔ تاہم تحریر اسد کی ضمانت نہیں ہو سکی تھی۔ جیل میں وہ خود کو دماغی مریض بتا کر دن کاٹ رہا ہے۔ عدالت کیا سزا دے گی۔ یہ تو وقت بتائے گا، لیکن معاشرہ اسے اس درندگی کے لیے بھی معاف نہیں کرے گا۔ پیسے بے شک زندگی کی اہم ضرورت ہوتا ہے، مگر اس کی خاطر ضمیر بیچنے والا بہت ہی بڑا بد قسمت ہوتا ہے۔ دنیا کی عدالت اسے جو بھی سزا دے۔ وہ بھگت ہی لے گا، لیکن کل روز حساب اللہ کی عدالت میں جب میزان قائم کی جائے گی تو کیا اس کا یہ عمل گناہوں کے پلڑے کو جھکا نہیں دے گا؟

☆.....☆

بھرم ٹوٹ گیا

سوریا فلک

بیوی کے طعنوں سے تنگ ایک قاتل شوہر کی سچ بیانی

”رحیم بابا ذرا آج کا اخبار تو لے آئیے۔“ میں تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچا تو میں نے اپنے ملازم رحیم بابا کو آواز لگائی۔

”لا رہا ہوں صاحب۔ آپ بھی اخبار کے بغیر ناشتا شروع ہی نہیں کرتے، یہ لیں۔“ رحیم بابا نے چائے میز پر رکھی اور اخبار میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

رحیم بابا میرے سرکاری ملازم تھے۔ میں ایک سرکاری ادارے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ میرا آبائی شہر تھیرو حیدر آباد کن تھا، مگر پھر میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لندن چلا گیا اور پھر جب وہاں سے واپس آیا تو ایک شاندار مستقبل نے میرا استقبال کیا۔ سرکاری ملازمت کے ساتھ مجھے اعزازی گاڑی، گھر اور ملازم بھی دیے گئے تھے۔

میں اپنے والدین کی اکلونی اولاد تھا اور بد قسمتی سے میرے والدین حیات نہیں تھے۔ مجھے رحیم بابا کے ساتھ سال بھر ہو گیا تھا اور وہ بھی مجھے بیٹے جیسا ہی سمجھنے لگے تھے، اس لیے مالک و نوکر والے رشتے کو میں نے کبھی فروغ نہیں دیا اور ہمیشہ انہیں اپنا بزرگ ہی سمجھا۔

”بیٹا ناشتا سکون اور اطمینان سے کیا کرو۔ یوں اخبار پڑھتے اور ٹی وی دیکھتے ہوئے غذا جسم کو نہیں لگتی اور ذہن کو طاقت بھی نہیں دیتی۔ ناشتا تمام کھانوں کا سردار

ہے اور تم اسے اخبار کی نذر کر دیتے ہو۔“ انہوں نے مجھے بڑے رمان سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”کیا کریں بابا، سارا دن اتنی مصروفیت رہتی ہے کہ اس کے بعد نہ لگ کر ٹی وی دیکھنے کا ٹائم ملتا ہے اور نہ ہی صبح سے اخبار پڑھنے کا۔ ویسے بھی جو مزہ اخبار پڑھنے میں ہے، وہ انہی بھی ٹی وی کی بریکنگ نیوز اور تیز و تند آوازوں والے ٹاک شوز میں کہاں۔ آرام، سکون اور تسلسل سے مطالعے کا لطف کچھ الگ ہی ہے، کیوں.....؟“ میں نے مسکراتے ہوئے سوالیہ نظروں سے رحیم بابا کو دیکھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ناشتے کے برتن سمیٹنے لگے۔ میں دوبارہ اخبار کی جانب متوجہ ہو گیا۔ شہ سرخیوں پر نظر ڈال کر میں نے اندرونی صفحہ کھولا تو ایک تصویر کے ساتھ لگی خبر نے مجھے چو

”شوہر نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔“

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ایسی خبریں تو آئے دن اخبار میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس میں چونکنے والی کیا بات ہے۔ وہ تصویر میرے بچپن کے دوست عامر سے متعلق تھی، مگر میں عامر کی تصویر دیکھ کر نہیں، حقیقتاً خیر دیکھ کر ہی چونکا تھا، کیوں کہ یہ خبر میرے لیے ناقابل یقین تھی۔

عامر کی سال بھر پہلے عالیہ سے محبت اور پسند کی

شادی ہوئی تھی۔ عالیہ کو عامر نے کسی شادی میں دیکھ کر پسند کیا تھا۔ خوش قسمتی سے ان کا خاندان بھی ان کے لیے ساج کی دیوار نہ بنا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ عامر کے والد اور عالیہ کی والدہ دور کے رشتے دار نکلے، پھر اس کے علاوہ عامر ایک نیک اور برسر روزگار لڑکا تھا، جبکہ عالیہ خود بھی ایک باحیا، پردہ دار اور شریف لڑکی تھی۔ عامر اپنی محبت باکرے حد خوش تھا، پھر ایسا کیا ہوا کہ یہ ناخوشگوار حادثہ پیش آیا۔ شاید کسی کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو یا پھر کسی

آج اس کی بڑھی ہوئی شیواور وحشت ناک آنکھیں دیکھ کر مجھے اسے پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔

”اس نے میرا من توڑ دیا ہاشم، میری محبت کا بھرم نہ رکھ پائی وہ۔“ عامر نے میرے اصرار پر خاموشی کا قفل توڑا۔

”کیا مطلب ہے تیرا؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ بھابی تو بہت جاہلی تھیں تجھے اور وہ تو بہت باحیا اور پردہ دار تھیں اور تو خود ان کی شرافت کے گن گایا کرتا تھا۔“

کھل کر پوچھ بھی نہیں پارہا تھا کہ کیا وہ کسی اور کے



ساتھ انوالو ہو گئی تھیں۔

”وہ مرتے وقت تک پاکباز تھی۔ میں اس بات کا گواہ ہوں۔“ عامر نے میرے خیال کی تردید کی۔

”پھر کیا کسی نے کوئی چال چلی ہے۔ تجھے پھنسیا ہے جھوٹے الزام میں۔ مجھے بتائیں وکیل کرنا ہوں۔“

”میں اعتراف جرم کر چکا ہوں۔ میں نے ہی اسے گلا گھونٹ کر مارا ہے۔“ عامر نے ہنوز اسی سہجے لہجے میں جواب دیا۔

”ایسا کیا ہو گیا تھا، تو کیوں مجھے الجھا رہا ہے۔ صاف صاف بتا آخر کیا ہوا تھا جو تو نے یہ قدم اٹھالیا؟“

”عامر میرے دوست یہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ مجھے بتا کسی نے چال چل کر تجھے پھنسیا ہے؟“

عامر میرے روبرو سر جھکائے کھڑا تھا۔ میں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ ایک خوب روٹو جوان تھا، مگر

منظر گڑھ سے، مردوں کے ظلم و ستم کی شکار، امر کی عبرت انگیز کہانی

رشتہ بحال رکھنے کے لیے دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہوں، وہ بھلا کسی کی صحت کا خیال کیسے رکھے؟ انہی حالات میں امر کی پرورش ہو رہی تھی۔ جب بھی عید کا موقع آتا تو وہ گلی محلے میں بچوں کو رنگ برنگے کپڑوں میں دیکھ کر اپنے امی ابو سے کپڑوں اور نئے جوتوں کا مطالبہ کرتی تو ہمیشہ ایک ہی جواب ملتا کہ بس اپنی بچی کو اگلی عید پر لادوں گا۔ اگر وہ ضد کرتی تو ہمیشہ اسے ڈانٹ ڈپٹ اور آنکھوں سے آشکوں کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا۔

حسب معمول انور آج بھی پرانے امرود اور پرانی سبزیاں سائیکل پر لادے صبح سویرے ہی گلیوں اور محلوں میں بیچنے نکل گیا، لیکن بہت ہی کم لوگ اس سے پرانی سبزیاں اور پھل خریدتے تھے۔ وہ روزانہ منڈی سے تازہ سبزیاں اور پھل لاتا، وہ تو وہی چیزیں خریدتا جو اسے سستے داموں مل جاتیں، چاہے وہ کسی ہی کیوں نہ ہوں۔ سارا دن آوازیں لگا لگا کر وہ تھک چکا تھا، لیکن اس کی جیب میں اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ شام کے کھانے کے لیے آنا خریدتا۔ آج وہ بہت ہی اداس گھر لوٹا اور سامان اتار کے رکھا تو امر نے ایک امرود اٹھا لیا تو اس دن اسے باپ کا جوتانے دار پھڑپھڑاتا تھا، وہ اسے بھی نہیں بھولے گا۔

☆.....☆

بہار کا موسم، ہر سو ہریالی، ہر طرف پھول، کوئل کی خوش رائی، چڑیوں کی چچھار عروج پر تھی۔ خوشگوار موسم اور صبح کی کھجی بھینجی خوشبو والی باد صبا میں پرندوں کے غول درغول مستیاں اور آنکھیلیاں کیر رہے تھے۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل ہوا کے دوش پر محو رقص تھے۔ سورج بھی اپنی ہلکی ہلکی کرنیں نکھیر رہا تھا اور وقت کا گھوڑا حسب معمول سر پٹ دوڑا جا رہا تھا۔ امران سب چیزوں سے بے نیاز مرغھٹوں میں دبائے زار و قطار رہ رہی تھی۔ اس طرح کے موسم کی وہ رسیا تھی، لیکن آج بھی سب کچھ ویسے کا ویسا تھا، مگر انہوں نے پہلے جاگنے والی امر آج جاگ تو پتا نہیں کب سے رہی تھی، لیکن آج وہ سب کاموں اور وقت سے لاپرواہ ہو کے رو رہی تھی۔ روٹی بھی کیوں نہ، مصائب کا مقابلہ کرتے کرتے آج وہ خود ٹوٹ چکی تھی، اس کی آخری امید کی کرن بھی دور افق میں روپوش ہو چکی تھی۔

امر ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کا باپ انور ایک معمولی پھیری والا تھا، جو گلی سڑی سبزیاں اور پھل بیچ کے گھر کا چولہا جلاتا تھا اور اس کی امی نہنپ بھی محلے والوں کے کام کاج کر کے زندگی کا پیہر گھما رہی تھی۔ اسی زبوں حالی کے دور میں امر کی صحت کا خیال رکھنے والا کوئی نہ تھا۔ زندگی مہی پٹی ڈگر پر چل رہی تھی۔ جسے جسم اور سانسوں کا

کیا پڑی ہے جو جان جو کھوں میں ڈال کر تمہارے لیے ہانڈی چولہا کروں اور تمہارے گھر کو گزر گزر چکاؤں۔“ اتنا کہہ کر وہ پیر پختی ہوئی چلی گئی اور اس دن کے بعد گویا اس نے اپنا رنگ ڈھنگ ہی بدل لیا۔ یا تو وہ کھانا بناتی ہی نہیں تھی یا پھر انتہائی بد مزہ اور جلا ہوا۔ گھر کی حالت بھی ابتر رہنے لگی تھی۔ اب وہ مجھ سے بھی کئی گنی رہنے لگی تھی اور کبھی کوئی ضروری بات کرتی بھی تو ایسے جھڑک کر جیسے کسی نوکر یا غلام سے بات کر رہی ہو۔

گھر کی پریشانیوں اور آئے دن کی ناچاقیوں کے باعث آفس میں میری کارکردگی خراب ہونے لگی اور پھر ایک دن بے دھیانی میں کی گئی غلطی کے سبب مجھے نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔ میں لٹا لٹایا، قسمت کو روٹا پیٹتا گھرا آیا اور اسے اپنی پتلا سنائی تو اس عورت نے شوہر سے ہمدردی کرنے کے بجائے تمام حدیں ایک ہی جست میں عبور کر لیں۔

”یا اللہ! تو نے کہاں میری قسمت پھوڑ دی۔ ارے میں کیسے کھاتے پیتے گھر سے آئی تھی اور میرا کس کتھوں اور کنگال آدمی سے پالا پڑ گیا۔ ارے جب تم شادی کر کے بال بچوں کا بوجھ اٹھا ہی نہیں سکتے تھے تو شادی کرنے کی کیا بڑی تھی۔ ہائے اماں کیسے بھوکے منگے کے سنگ باندھ دیا مجھے؟ نہ خاندان، نہ ذات پات، نہ رہنے اور مرنے کا سلیقہ، ناہنجار کہیں کے۔ بیوی کیوں لائے، باندی خرید لاتے۔“

اس کا بین اور دہانیاں سن کر میرا سر پھٹنے لگا تھا اور اس کا خوب صورت چہرہ مجھے کسی ناگن کی مانند دکھائی دینے لگا تھا جس کی گز بھر لمبی زہریلی زبان شعلے اگل رہی ہو، پھر میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلہ دبا ڈالا، تاکہ اس کی آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید میرا اپنا دل بند ہو جاتا۔ خبیث عورت.....!“

دانت کچکا کر کہا۔ وہ جذبات کی شدت سے ہانپنے لگا اور میں اس کا شانہ پھٹکتے ہوئے سوچنے لگا۔

”ہر خبر کا پس منظر ہمیشہ ایک ہی نہیں ہوتا۔ ہر مرد اپنی عورت کو اس لیے نہیں مارتا کہ وہ بد چلن ہے، بلکہ مرد نا فرمان اور بد زبان عورت سے بھی بیزار ہو جاتا ہے اور یہ تو آپ نے بھی سنا ہوگا کہ جب عورت کی زبان چلتی ہے تو مرد کا ہاتھ اٹھتا ہے۔“

☆.....☆

میری جھنجھلاہٹ پر عامر نے مجھے نظر بھر دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری اور پھر کہنے لگا۔

”ہاشم ضروری نہیں کہ ایک شوہر اپنی بیوی سے صرف اسی لیے نفرت کرے، اسے قتل کرے کہ وہ پاک دامن نہیں۔ عالیہ بہت اچھی عورت تھی۔ باحیا اور ہا کر دار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سلیقہ مند بھی تھی۔ شادی کے بعد اس کے ہاتھ کے ذائقے دار کھانے کھا کھا کر اور گھر کیلے امور میں اس کی مہارت دیکھ کر اس کا اور بھی شیدائی ہو گیا تھا۔ ایک شوہر کو اور کیا چاہیے کہ جب اس کی محبت اس کی بیوی بن کر اپنے شوہر کی زندگی اور گھر دونوں کو جنت بنا دے۔ عالیہ کو اچھے اچھے کھانے بنانے کا بے حد شوق تھا۔ وہ خوب صورت تو تھی، مگر ساتھ ہی اس کو خود کو اور گھر کو بھی سجانے کا بے حد شوق تھا۔ وہ آئے دن مجھے لٹیں تھما دیتی تھی کہ یہ لادو، وہ لادو۔ شروع شروع میں تو میں بھی بخوشی اسے تمام من پسند اشیاء فراہم کرتا رہا، مگر جب محض چھ ماہ میں ہی میرا سارا بینک بیلنس ختم ہو گیا تو میں نے پریشان ہو کر عالیہ سے اس کا تذکرہ کیا۔

”عالیہ ہمیں اپنے اخراجات کو کچھ کنٹرول کرنا ہوگا، ورنہ بصورت دیگر ہمارے لیے بڑے مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔ اللہ نے چاہا تو کل کو ہم صاحب اولاد بھی ہو جائیں گے، تب تو بچت کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس لیے ہمیں ابھی سے ہی سنبھل کر چلنا ہوگا۔“

میری بات سن کر عالیہ نے میری تائید کرنے کے بجائے التلا بحث شروع کر دی۔

”کیا مطلب ہے؟ میں فضول خرچی کرتی ہوں؟ ارے جو کچھ کرتی ہوں، تمہارے اور تمہارے گھر کے لیے کرتی ہوں۔“

مجھے اس کی بات سن کر غصہ تو آیا اور اس کا یہ روپ میرا دل بھی دکھا گیا، مگر پھر بھی میں نے محل سے کام لیا اور کہا۔

”یہ گھر ہم دونوں کا ہے اور ہمیں ہی مل جل کر چلانا ہے۔ ہم ڈکھ سکے کے سامنے ہیں۔ زندگی میں اچھا وقت تو آتا ہی ہے۔ ٹھنڈی اسی میں ہے کہ کل کے لیے آج ہی کچھ بچا کر رکھا جائے۔“

مگر عالیہ نے میرے ضبط اور سمجھانے کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا اور غصے سے بولی۔

”ہاں تم ہی تو عقل مند ہو، میں بے وقوف ہوں۔ مجھے

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں ”دم“



پاکستان کی اہم خاتون شخصیات کی زندگی اور جدوجہد سے مربوط ایک خاص سلسلہ جس میں آپ آج کی عورت کا اصل مقام اُس کی اس معاشرے میں ثابت قدمی سے منزل کو پانے کی کہانی اور ملکی تاریخ میں اپنا لوہا منوانے کے عزم کو آپ کے لیے اُن ہی کی زبانی پیش کیا جاتا ہے۔

اُن مایہ ناز خواتین کی کہانی جن سے ہماری آج کی عورت بہت کچھ سیکھ رہی ہے۔

دو شہزادہ ڈائجسٹ کی روایات سے مربوط آج کی عورت کی عظمت کا آئینہ

”وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں ”دم“



پاؤں مارے کہ بیٹی کا رشتہ اچھی جگہ ہو جائے لیکن کوئی بات نہ بنی۔ رات بھر میاں بیوی یہی سوچتے کہ بیٹی کا کیا بنے گا۔ بیٹی اب انہیں رحمت کی بجائے زحمت لگنے لگی تھی۔ انور تو دل ہی دل میں دعا کیا کرتا کہ اے اللہ تو اگر اس کا رشتہ نہیں بھیجتا تو اسے سنبھال لے۔

امر جوانی کی دہلیز پر کب کی پاؤں رکھ چکی تھی، تمام لڑکیوں کی طرح اس کے دل میں بھی شادی کے سہانے خیال آتے تھے اور وہ دل ہی دل میں مسکراتی تھی۔ اب اس کا انتظار طویل پکڑتا جا رہا تھا۔ جب پہلی بار کہیں سے دو، ایک رشتے والے آئے تھے تو وہ کتنا نہال تھی، لیکن جب وہ جہیز کا مطالبہ کرتے تو اس کے ماں باپ کا دل دھک سے ڈوب جاتا اور پھر ناامیدی اور باپوسی کے سائے اور بھی گہرے ہو جاتے۔ ادھر امر کی جوانی گزری جا رہی تھی۔ اب انور اور زینب کو اچھے رشتے تو کیا کسی بھی رشتے کی تلاش تھی، لیکن کوئی بھی ان کی بیٹی کا رشتہ لینے کے لیے رضامند نہ ہوا اور ادھر امر کے بالوں میں چاندی دیکھ کر زینب کتنا روئی اور چلائی تھی، مگر انور بھی کرتا تو کیا، وہ بھی تو سارے جتن کر چکا تھا۔

ایک دن دونوں میاں بیوی چولہے کے پاس بیٹھے تھے۔ امر اندر ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر لیٹی پڑی تھی کہ انور نے زینب کو اپنا فیصلہ سنایا کہ زینب سنو، میں نے امر کی شادی نیر سے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ سنتے ہی زینب کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی، آسمان چکراتا ہوا محسوس ہوا، بے چاری بہت چلائی، مگر ہوتا کیا تھا کچھ بھی نہیں، کیوں کہ اس کا متبادل تو کچھ بھی نہیں تھا۔ رودھو کے اسے شوہر کی بات سے متفق ہونا پڑا۔ وہ اور کرتی بھی تو کیا۔ امر کو جب اس بات کا پتا چلا تو وہ چوری چوری کتنا روئی تھی۔ وہی نیر جسے وہ ایک آنکھ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تھی، وہ آج اس کے سر کا تاج بننے جا رہا تھا۔ وہی نشی جس کے منہ سے ہمیشہ رال نکلتی رہتی ہے جسے نہ صبح کا پتا ہوتا ہے نہ شام کا، یہ سوچ کے بھی وہ لرز جاتی۔

زینب اور انور نے پیٹ کاٹ کاٹ کے امر کے لیے تین چار سوٹ کپڑوں کے خریدے اور چند پرانے کپڑے زینب جہاں سے کام کرتی تھی، وہاں سے لے آئی اور ایک پرانا جوتا بھی تھا۔ یہ تھا امر کے جہیز کا کل سامان۔ انور نیر کو ڈھونڈ کے اس کے گھر لایا، گھر کیا تھا

نیر اس کا چچا زاد بھائی تھا جس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ دوسرے بہن بھائی بھی نہ تھے۔ وہ شروع ہی سے بڑی صحبت میں پڑ گیا تھا اور کم عمری میں ہی نشہ شروع کر دیا تھا۔ اسے کسی کی کوئی خبر اور بردا نہیں تھی اور نہ اسے اپنا ہوش تھا۔ کبھی نشے میں دھت کہیں پڑا ہے تو کبھی نہیں۔ جب نشے کے لیے کچھ نہ ملتا تو چوری اور ڈاکے بھی ڈالتا تھا۔ کئی بار جیل کاٹ چکا تھا۔ اتنے بڑے بڑے بال، گھنی میکی ٹیکلی اور بے ڈھنگی بڑھی ہوئی داڑھی اور سرخ سرخ آنکھیں امر کو تو اسے دیکھ کے بھی ڈر لگتا تھا اور وہ اس کے منہ سے ٹپکتی رال دیکھ کر ڈر سی جاتی تھی۔

جب امر کچھ بڑی ہوئی تو اسے بھی اپنی ماں کے ساتھ لوگوں کے کام کاج کرنے کے لیے جانا پڑتا تھا۔ کسی گھر میں وہ لوگوں کے کپڑے دھوئی تو کہیں جھاڑو لگاتی اور کہیں اسے برتن صاف کرنے پڑتے جس کے بدلے میں اسے چند روپوں کے ساتھ ساتھ بہت سے طعنے تشنے بھی سہنے پڑے تھے۔ کپڑے صاف نہیں دھلے، داغ دیے کے دیے ہیں۔ برتنوں پر چکنائی کے داغ بھی نہیں اترے، حرام کے میسے لیتی ہو، حرام کی کھائی کھاتی ہو، سچ طریقے سے کام نہیں کر سکتی ہو حرام زادی کہیں کی۔ ایسے الفاظ سن کر اس کا دل بھرا آتا اور وہاں نہ کام کرنے کا تہہ کرتی، لیکن مجبوراً اسے صبح آنا پڑتا، کیوں کہ انہی کے گھر کے بچے ہوئے مکڑوں سے تو اس کا پیٹ پلٹا تھا، ورنہ اپنے گھر میں اور کیا رکھا تھا۔

وقت گزرتا رہا اور وقت کے ساتھ امر بھی بڑی ہوتی رہتی۔ اب انور اور زینب کو گھر کے ساتھ ساتھ ایک اور فکر لاحق ہوئی تھی کہ اب امر کی شادی بھی کرتی تھی، لیکن گھر میں تو کچھ بھی نہیں تھا اور لوگ بھی ان کی غربت کی وجہ سے ان سے نفرت کرتے تھے۔ زینب کی راتوں کی نینداڑ گئی تھی۔ وہ دن کو کام میں تو لگی رہتی، لیکن اس کا خیال امر کے بارے میں لگا رہتا کہ کیا میری بچی کی عمر بھی میری طرح گزرے گی، لیکن پھر ایک موہوم سی امید پیدا ہوئی اور خدا سے دل ہی دل میں گڑگڑا کے دعا مانگتی کہ میری بچی کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ آ جائے، لیکن اس بے چاری کو اتنا پتا نہیں تھا کہ لوگ ان کے گھر سے رشتہ تو کیا، انہیں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ انور نے بہت ہاتھ



27 واں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

انتظار کی گھڑیاں ختم

وہ تقریب

جس کا انتظار کیا جاتا ہے



ملک بھر سے.....

قلم قبیلے کے درخشاں.....

نئے اور پرانے ستاروں کا کارواں.....

ایک ایسی تقریب جو یادگار ہوتی ہے۔

سہام مرزا کے مشن اور ہماری کوششوں ہی کے تحت

ہم اس تقریب کا انعقاد اسی باوقار انداز میں کر رہے ہیں۔

تقسیم ایوارڈز کی یہ تقریب انشاء اللہ

ماہ مئی 2014 میں منعقد کی جا رہی ہے



تقریب کے انعقاد کے حوالے سے معلومات کے لیے ادارے میں فون کر کے رجوع کریں

ایک کچی جھونپڑی تھی جو مدتوں سے ویران اور سسنان پڑی تھی۔ درودیوار میں گھاس آگ آئی تھی۔ زنب اور انور نے مل کے اس کے گھر کی صفائی کی جہاں جہاں دیواریں ٹوٹ چکی تھیں وہاں گارے سے لپائی کی گھاس کالی۔ نیر کا حلیہ ٹھیک کیا۔ وہ چند روز نشے سے دور رہنے کی وجہ سے نارمل حالت میں آیا تھا۔ انور نے اسے شادی کے بارے میں بتایا تو وہ خوش ہو گیا۔ چند دنوں بعد انور نے چند اپنے طرح کے لوگوں کی موجودگی میں امر کا نکاح نیر سے کر کے اپنے سر سے بوجھ اتار دیا۔

امر کی شادی کیا ہوئی تھی، اس پر تو مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ نیر تو کسی کام کو ہاتھ تک نہ لگاتا تھا، تو مجبوراً امر کو شادی کے تیسرے دن دوبارہ لوگوں کے گھروں میں کام کے لیے جانا پڑا۔ اب اس کے کندھوں پر دوہری ذمے داری تھی، اپنے ساتھ ساتھ اسے نیر کا پیٹ بھی پالنا پڑتا تھا۔

امر سچ سویرے گھر سے نکلتی اور رات کو گھر واپس آتی تھی۔ جب وہ واپس آتی تو اس کے سر پر پرانے اخباروں اور کاغذوں کی گھڑی ہوتی تھی اور ہاتھ میں پرانے ٹین کے ڈبے ہوتے تھے جنہیں وہ کباڑ میں فروخت کرتی تھی اور روپیہ روپیہ اکٹھا کرتی تھی۔ نیر اس سے دوسرے چوتھے دن پیسوں کا مطالبہ کرتا تھا، کیوں کہ وہ نشہ کرتا تھا اور کوئی بھی کام نہیں کرتا تھا۔ اگر وہ پیسے دینے سے انکار کرتی تو وہ اسے بری طرح مارتا تھا، آخر مجبوراً اسے پیسے دینا پڑتے تھے۔

وقت گزرتا رہا، اب امر کو خدا نے دو چاند جیسے بیٹے بھی عطا کیے تھے، جن کی امر اچھی پرورش کرنا چاہتی تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ یہ بڑے ہو کر تعلیم حاصل کریں اور کسی بڑے اسٹور میں کلرک بن جائیں۔ اب اسے اپنا مستقبل روشن نظر آنے لگا تھا اور اس نے اور زیادہ کام کرنا اور پیسے جوڑنا شروع کر دیے تھے۔ اب اس کی زندگی میں کوئی آرام نہیں تھا، سوائے اتوار والے دن۔ وہ اتوار کو کام پر نہیں جاتی تھی، بلکہ پرانے اخبار اٹھا کر بیٹھ جاتی اور تصویریں دیکھا کرتی تھی۔ اب اس نے ایک ایک روپیہ بچا کے اکٹھا کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ ان روپوں کو ایک ٹین کے ڈبے میں ڈال دیتی تھی اور اس

ٹین کے ڈبے کو وہ اس کے چار پائی پر پڑے سامان میں چھپا رکھا تھا، تاکہ نیر کی اس پر نظر نہ پڑے۔ وہ ہر روز انہیں گنا کرتی تھی۔ وہ ہزار روپے پورے کرنا چاہتی تھی جو امر کے خیال میں اس کے بچوں کے مستقبل کے لیے لازمی تھے۔ آج پیسے گنتے ہوئے وہ کتنا خوش تھی، کیوں کہ آج ڈبے میں 988 روپے تھے۔ وہ ہدف پورا کرنے میں صرف بارہ قدم بچے تھے۔ اسے اپنا دل خوشی سے جھومتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی محنت رنگ لارہی تھی، وہ سہانے مستقبل کے سننے دیکھ رہی تھی، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شام کو وہ جب کام سے ٹھکی ہاری کام سے لوٹی تو نیر حسب عادت ابھی گھر نہیں آیا تھا، وہ عموماً دیر سے آنے کا عادی تھا۔ دن بھر تو وہ آوارہ اور نشی دوستوں کے ساتھ نشے میں دھت رہتا اور رات گئے گھر واپس آتا تھا۔ اس نے بچوں سے پیار کیا، لوگوں کے گھروں سے بچا کھچا کھانا بچوں کو کھلایا اور انہیں سلا دیا۔ وہ کافی دیر تک نیر کے انتظار میں جاگتی رہی۔ وہ جیسا بھی تھا اس کے سر کا سر براہ تھا۔ اس کے گھر کا تاج تھا، لیکن کافی دیر تک وہ واپس نہ آیا تو اس کی پریشانی میں اضافہ ہونے لگا۔ نہ جانے کہاں ہوگا اور کس حال میں ہوگا؟ یہی سوچ بھار کرتے ہوئے دن بھر کی تھکاوٹ کی وجہ سے اس کی آنکھ لگ گئی، صبح جب وہ جاگی تو گھر کے باہر لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ قریبی گھر میں رات کو ڈاکو گھس آئے تھے۔ وہ قینبی سامان اور زیورات بھی اٹھا کر لے گئے اور مالک مکان کو بھی قتل کر دیا اور ان میں سے ایک آدمی کو پولیس نے گرفتار بھی کر لیا ہے۔ یہ سنتے ہی اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ وہ مرغ بکسل کی طرح تڑپ رہی تھی اور دل ہی دل میں دعا بھی کر رہی تھی کہ خدا اس کا سہاگ سلامت رکھے، کہیں نیر تو اس واردات میں شامل نہیں تھا۔ اس نے بچوں کو گھر پر چھوڑا اور بھاگتے ہوئے قریبی تھانے میں گئی تو پتا چلا کہ نیر تو قتل اور چوری کی واردات میں حوالات میں بند تھا۔ اسے حوالات میں بند دیکھ کر اس کا دماغ چکر اٹھا گیا۔ وہ کافی دیر تک اس سے حقیقت دریافت کرنے کی کوشش میں لگی رہی کہ آیا کہ وہ اس واردات میں ملوث بھی تھا یا شک کی بنیاد پر پولیس نے اسے گرفتار کیا تھا، لیکن نیر نے اسے کچھ بھی نہ بتایا۔

وہ اسے چھوڑ کر گھر واپس آ گئی۔

گھر آتے ہی ایک اور مصیبت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے رقم والا ڈبہ اٹھایا تو وہ خالی تھا۔ اس کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکل گئی۔ اس کی زندگی کی جمع پونجی لٹ چکی تھی۔ اس نے کیسے بچوں کے روشن مستقبل کی خاطر بڑی محنت مشقت سے رقم جوڑی تھی۔ اس پر دونوں طرف سے مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ چکے تھے۔ اس کا روشن مستقبل اسے تاریک نظر آ رہا تھا۔ اسے شک گزرا کہ یہ رقم نیر نے چرائی ہوگی۔ وہ پھر اپنے قدم بھاگتے ہوئے تھانے میں گئی اور نیر سے اس رقم کے بارے میں پوچھا، لیکن اس نے کچھ بھی نہ بتایا تو اس نے پولیس والوں سے کہا کہ قتل اور چوری کے ساتھ ساتھ اس سے وہ میری رقم کے بارے میں بھی تحقیق کریں، یہ میرا چور ہے، اس سے میری رقم واپس دلوا دیں۔

زندگی بھر کی کمائی کے لٹ جانے سے اسے اب تھکاوٹ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کی زندگی کا مقصد ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ مزید کام کرنے سے بیزار ہو چکی تھی۔ وہ ہر روز تھانے جاتی، لیکن نیر سے رقم کا کوئی پتا نہ چلا اور اس پر قتل اور چوری کا الزام ثابت ہو چکا تھا جس کے نتیجے میں اسے سزائے موت سنائی گئی تھی۔ اس نے ہر طرف سے ہاتھ پاؤں مارے جن لوگوں کے ہاں وہ کام کرتی تھی ان سے مدد کی درخواست کی، مگر کسی نے بھی اس کی مدد نہ کی۔ جس دن اس کو پھانسی ہوئی اور میت گھر پہنچی تو گھر میں کھرام مچ گیا۔ بچے رو رو کر تڑکھال ہو گئے۔ اس پر بھی سکتہ طاری ہو گیا تھا اور دورے پر دورے پڑ رہے تھے۔ محلے کے چند لوگوں نے مل جل کر اس کی جھینڑ وٹھن کی تھی، ورنہ اس کے پلے کیا تھا۔

اس غم میں وہ تین چار دن تک کام پر بھی نہیں گئی تھی۔ زندگی اور موت کی شکش میں مبتلا رہی۔ وہ زندہ رہنے کی تنہا ہار چکی تھی۔ اسے زندگی سے کوئی محبت نہیں رہی تھی، سب کچھ لٹا کے بھی اسے چین نہیں ملا تھا۔ اس نے خودکشی کرنے کی ٹھان لی تھی، لیکن گود میں پڑے لڑتے اور سکتے اور ہلکتے بچوں کو دیکھ کر اس کا دل بھرا آیا۔ اس نے تو اس ظالم دنیا سے جان چھڑالوں مگر میرے ان بچوں کا کیا ہوگا۔ اگر میں مر گئی تو ان کو کون کھلائے گا،

پلائے گا، ان کی کفالت کون کرے گا۔ اگر میں نے بھی ان کی تربیت نہ کی تو ان کا انجام بھی باپ جیسا ہوگا؟ یہ بھی نشی بن کے زندگی گزاریں گے؟ کیا ان کو بھی زمانہ حقارت کی نگاہ سے دیکھے گا؟ یہ سوچتے ہی اس میں زندگی کا حوصلہ پیدا ہوا، نہیں میں خودکشی نہیں کروں گی مجھے جینا ہوگا، مجھے اپنی اولاد کی خاطر جینا ہوگا۔ مجھے یہ دکھ درد برداشت کرنا ہوں گے۔ مجھے اپنے بچوں کو سہارا دینا ہوگا۔ ان کی مشکلات کو اپنے سر پر اٹھانا ہوگا، لیکن انہیں ہر حال میں خوش رکھنا ہوگا۔ یہی سوچ کر اس نے زندگی کی روٹیں کو دوبارہ شروع کیا اور اپنے بچوں کی خاطر دوبارہ کام کرنا اور لوگوں کے گھروں پر برتن اور کپڑے صاف کرنا شروع کر دیے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ محنت اور زیادہ کام کر رہی تھی، کیوں کہ بچے اب بڑے ہو رہے تھے اور ان کی ضروریات میں بھی اضافہ ہو چکا تھا اور اب ان کی پڑھائی اور روشن مستقبل کی خاطر پھر سے روپیہ روپیہ جوڑنا تھا اور انہیں پھر سے ٹین کے ڈبے میں ڈال کر پرانی پٹی پرانی رضائی کے نیچے چھپا کے رکھنا تھا۔ وقت گزر رہا تھا۔ وقت اور مشکلات سے مرجھایا ہوا جسم کسی مرل نیل کی طرح زندگی کے چکر پورے کر رہا تھا، لیکن دل میں امید کی چنگاری سیلگ رہی تھی جو بچوں کے روشن مستقبل کی صورت میں تھی، بھی تو وہ سب مشکلات اور دکھوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کر رہی تھی۔

امر ایک چٹان کی مانند سینہ سپر بنی ہوئی تھی۔ وہ گردش روزگار کے ہاتھوں تنگ تو تھی، مگر اپنے بچوں کو احساس تک نہیں ہونے دیتی تھی۔ وہ ہر روز جیتی اور ہر روز ہی مرتی تھی، لیکن اس نے اپنے بچوں کو زندہ رکھا ہوا تھا۔ روٹی سوٹی جو کچھ بھی میسر ہوتا، پیار و محبت سے بچوں پر نچھاور کر رہی تھی۔

آج امر کو زندگی کی پہلی خوشی میسر ہو رہی تھی اور آج وہ وقت سے پہلے ہی اٹھ گئی تھی۔ آج اس کا مرجھایا ہوا گلاب سا چہرہ پھر سے کھل اٹھا تھا، کیوں کہ آج اس کے بڑے بیٹے طلحہ نے پہلی بار اسکول جانا تھا اور وہ اس کے اسکول جانے کا انتظام کر رہی تھی۔ چاہت سے خریدی ہوئی یونیفارم کی سلوٹیں درست کر رہی تھی، پھر جلدی سے انھی، کسی کے گھر سے لائی ہوئی گندم کو اٹھایا، گندم کیا تھی

آدھے سے زیادہ اس میں جوتھے، پھر بھی وہ خوش تھی۔ آج کافی مدت بعد اس کے اپنے گھر میں چلے جاتے۔ آج اس کے گھر سے بھی دھواں اٹھے گا۔ وہ اس برائے نام گندم کو ہاتھ کی چکی پر پیس رہی تھی اور دل ہی دل میں اللہ پاک کا شکر بھی ادا کر رہی تھی، تھوڑی دیر میں آٹا تیار ہو چکا تھا اور وہ اس آٹے کو جھونپڑی میں بیٹھی گوندھ رہی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر بھاگ کر باہر سے سوکھے سرکنڈے لے آئی اور روٹی پکنا شروع ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ادھ جلی دو روٹیاں تیار تھیں اور کھانے کے لیے ساتھ نمک کی نعمت بھی ساتھ تھی اور جلدی سے طلحہ کو محبت اور مان سے چٹایا اور اس کا ہاتھ منہ دھلایا اور کھانا پیش کیا۔ طلحہ آج بہت ہی خوش تھا، کیوں کہ وہ گھر کی پکی روٹی کھا رہا تھا اور خوشی سے پھولے نہ سار ہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد طلحہ یونی فارم میں ملبوس تھا اور ہاتھ سے بنا کپڑے کا تھیلا جس میں ایک قاعدہ اور تختی تھی، تھامے مسکر رہا تھا۔ امر اسے سمجھا رہی تھی کہ بیٹا وہاں پر لڑائی جھگڑا نہ کرنا، محنت اور جی لگا کر تعلیم حاصل کرنا اور اعلیٰ نوکری حاصل کرنا، دیکھا نہیں ہے نوابوں کے بچے کیسے بنے سنوے ٹہل رہے ہوتے ہیں، تو بھی ایک دن ویسا ہی ہوگا۔

امر بچے کی انگلی تھامے اسکول چھوڑنے کے لیے باہر نکل تو ایک معصوم بچی لگی صدا میں دینے۔ "خدا آپ کے بچے کو سلامت رکھے، اللہ کے نام پر کچھ دے دو، امر کے پاس تو اور کچھ نہ تھا جب اس نے بچے کا نام کا صدقہ مانگا تو اس نے اسے اپنے سر سے چنری اتار کے دے دی، جو اسے کام کرنے والوں کے ہاں سے کسی کی شادی کے موقع پر ملی تھی اور خود پھٹی پرانی چنری اوڑھے بچے کو اسکول چھوڑ آئی۔ زندگی کے کچھ اچھے لمحات گزر رہے تھے اور طلحہ اسے چھوٹا بیٹا عدیل بھی کچھ بڑا ہو گیا تھا اور اسے بھی اسکول میں داخل کرنا تھا۔ وہ جب کام پر جاتی تو عدیل اکیلا رہتا تھا۔ جب وہ واپس آتی تو مختلف گھروں سے بچا کچا سالن اور روٹی بھی لاتی تھی۔ ایک دن جب وہ کام سے واپس آئی، دیکھا کہ طلحہ اکیلا گھر میں تھا اور عدیل موجود نہیں تھا۔ اس نے طلحہ سے عدیل کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ میں تو جب آیا عدیل گھر میں نہیں تھا۔ میں سمجھا آج تمہارے ساتھ گیا ہوگا۔ اب امر

تھی کہ اس کا ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا تھا، لگی وہ اسے تلاش کرنے اور ادھر ادھر، کلی محلے سے پتا کیا، مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اس کا کلیجہ باہر آنے لگا تھا۔ رات بھی ہو گئی تھی، مگر عدیل کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ مصیبت پر مصیبت اور طوفانوں پر طوفان، وہ روٹی رہی، چلائی رہی، پاگل ہو رہی تھی، اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کسے کہے کہ آدھی رات گزر چکی تھی۔ وہ بیٹھی رو رہی تھی کہ اچانک دو بڑی بڑی موٹھوں والے آدمی اندر داخل ہوئے۔ گھر کا دروازہ تو تھا ہی نہیں۔ دروازے کی جگہ پر ایک پرانا کپڑا لٹکا رہتا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ ڈر گئی اور پوچھا۔ "کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟" ان میں سے ایک نے گرج دار آواز میں کہا۔ "ان باتوں کو چھوڑو، تیرا بیٹا ہمارے قبضے میں ہے، پچاس ہزار روپے کا انتظام کرو، ورنہ تیرے بیٹے کو قتل کر دیا جائے گا۔" بے چاری رو رو کر اور چلا چلا کر پیچھے سے پکاری رہی۔ خدا کے واسطے میرے بچے کو کچھ نہ کہنا۔ میں رقم کا بندوبست کروں گی۔ وہ تو چلے گئے اور اس بات کا یقین دلا گئے کہ رقم کا انتظام کرنا اور اپنا بچہ واپس لینا اور ہاں اگر تو نے کسی کو بتایا یا پولیس کو خبر کی تو بچے سے ہاتھ دھوئے ٹھوگی۔ بے چاری بہت روٹی، چلائی، بہت ہاتھ پاؤں مارے، مگر پچاس ہزار تو کیا پانچ سو کا بھی انتظام نہ ہو سکا، لیکن خالص کو کیا پتا کہ بڑی بڑی کوٹھیوں میں کام کرنے والی کے پاس بڑی رقم بھی ہوگی۔ اس کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے دو دن کی مہلت دی گئی تھی کہ رقم لے کر فلاح روڈ کے پاس آ جانا اور بچہ لے جانا۔ اگر زیادہ چالاکی دکھائی تو انجام بد ہوگا۔

دو دن بعد امر اس روڈ کے پاس پہنچ گئی، لیکن ہاتھ میں چند روپوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ وہاں کھڑی روٹی رہی۔ عدیل کی جدائی نے اسے نڈھال کر دیا تھا اور وہ یہ سوچ کر بلکان ہو رہی تھی کہ پتا نہیں وہ اس کے بچے کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، کیوں کہ اس کے پاس رقم تو تھی نہیں، وہ خود میں ہی گم تھی کہ ایک کار آ کر رہی اور آدمی نے شیشے سے باہر سر نکال کر کہا کہ کہاں ہے رقم۔ وہ گم سم کھڑی رہی اور اندر سے عدیل کے چلانے کی آواز آئی۔ "امی مجھے ان سے چھڑاؤ، مجھے ان کے پاس نہیں رہنا، مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے۔"

امر کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ وہ بھاگ کے کار کے پاس مئی اور اندر ہاتھ ڈال کر بچے کو اٹھانا چاہا، مگر ایک مضبوط ہاتھ نے اس کی کمر در کلائی پکڑ لی اور کہا۔

"پہلے پیسے بعد میں بچہ۔"

پھر زوردار آواز میں پوچھا۔ "کہاں ہے پیسا؟" امر نے کہا۔ "پیسے نہیں ہیں، مجھے مار ڈالو مگر میرے بیٹے کو رہا کر دو۔" ابھی بات مکمل ہی نہیں کر پائی تھی کہ ایک زوردار پھٹاس کے رخسار پر بڑا، وہ خود کو نہ سنبھال سکی اور وہیں سرک پر گر پڑی۔ کار چل دی اور وہ پاگلوں کی طرح کار کے پیچھے بھاگتی رہی، مگر کار تو نہ جانے کہاں جا چکی تھی۔ وہ زار و قطار روتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہی تھی۔ نہ اسے اپنا خیال تھا نہ گھر کا کہ ایک معصوم تو گھر میں بھی اکیلا پڑا ہے۔ وہ کس حال میں ہوگا۔ کافی دیر بعد وہ گھر واپس لوٹی۔ طلحہ بھی رو رو کے بے ہوش ہو چکا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر اور زیادہ گھبرا گئی اور اس کو گود میں اٹھالیا۔ اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالے، تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آیا تو ماں کے گلے سے لپٹ کے رونے لگا۔ ماما اور زیادہ جوش میں آئی۔ کسی بچے کی طرح جو بھوک سے چلا رہا ہو، چیخ چیخ کر رو رہی تھی، نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ آنکھ تو سولی پر بھی لگ جاتی ہے۔ تین چار دن تک وہ اسی طرح گھر میں بے سدھ پڑی رہی۔ اگلے دن جب وہ صبح باہر نکل تو باہر کھیتوں میں پرندے شور کر رہے تھے۔ وہ وہاں گئی تو جو کچھ اس نے وہاں دیکھا وہ ناقابل بیان تھا، کیا دیکھتی ہے کہ عدیل کا سر دھڑ سے جدا ہے اور معصوم کے نازک جسم کو پرندے نوچ رہے تھے۔ وہ یہ دیکھ کر بے ہوش ہو گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک اسپتال میں تھی۔ نہ جانے اسے کون اسپتال میں لایا تھا اور کیوں لایا تھا۔ وہ پاگل ہو چکی تھی۔ اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ابھی وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی تو بھی رونے لگتی اور بھی گم سم سی ہو جاتی تو بھی بال نوچنے لگتی۔ چند دنوں بعد اسے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا اور وہ واپس آ گئی۔ طلحہ امر کی امی کے گھر تھا اور اس کی امی امر کو بھی اپنے گھر لے آئی اور طلحہ کی دیکھ بھال زینب کر رہی تھی۔ طلحہ ماں کی حالت دیکھ کر بہت ہی اداس اور پریشان تھا، مگر کچھ معمول کے مطابق اسکول آتا جاتا تھا۔

ایک دن طلحہ اسکول گیا ہوا تھا کہ اسکول میں ایک خود کش دھماکہ ہوا اور کافی بچوں کی جانیں چلی گئی تھیں۔ زینب کو جب اس بات کا پتا چلا تو وہ بھاگتے ہوئے اسکول گئی۔ ہر طرف معصوم بچوں کے اعضاء بکھرے پڑے تھے۔ جگہ جگہ پر بچوں کا اور اعضاء بکھرے پڑے تھے۔ کافی دیر تک زینب ادھر ادھر دیوانہ وار بھاگتی رہی۔ ایک جگہ پر اس کے قدم رک سے گئے۔ اس نے غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ طلحہ کچھلا ہوا جسم پڑا تھا جسے دیکھ کر وہ منہ کے بل گری اور اللہ کو پکاری ہوئی اور ہمیشہ کے لیے اس دنیاوی دکھ اور مصائب سے نجات پا گئی۔ جب دولاشیں گھر پہنچیں تو انور دیواروں کو ٹکریں مار مار کر رو رہا تھا، مگر امر ان سب باتوں سے بے نیاز پتھر کے بت کی طرح چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی اور ہر آنے والے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ گھر میں بہرام بچا ہوا تھا۔ آسمان لٹکا تھا کہ اس صدمے پر اٹک رہا تھا، مگر امر بت بنی بیٹھی تھی۔ شاید پچھلے صدموں سے اس کا دماغ چل بسا تھا۔ تجھیز و تکھیز ہو گئی، مگر امر کی آنکھوں سے ایک اشک بھی نہ نکلا، لٹکتا بھی کیسے، آنسو تو رو رو کر کب کے ختم ہو چکے تھے۔ اعصاب جواب دے چکے تھے۔ پہاڑ کا حوصلہ رکھنے والی زمانے کی نظر میں پاگل ہو چکی تھی، مگر اصل میں وہ ٹوٹ چکی تھی۔ اس کے اندر آنسوؤں کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ رو رو کر بینائی بھی کمزور ہو چکی تھی۔ ہر کوئی اسے پاگل پاگل کہتا تھا، مگر وہ پاگل تو نہیں تھی۔ پاگل تو اسے پاگل کہنے والے تھے۔ اگر اتنے مصائب پتھر پر بھی پڑتے تو وہ بھی پھٹ پڑتا، وہ تو پھر بھی انسان تھی۔

ایک رات وہ چپکے سے اٹھی اور اپنی پرانی چنری کو چھت سے باندھ کر خود کشی کرنا چاہی، کیوں کہ اب اس کی زندگی کا مقصد ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ مزید برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی دنیا لٹ چکی تھی، جس نے شوہر، دو بچوں اور ماں کے جنازے دیکھے ہوں، اس کے غم کا بھلا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ چنری کو گردن میں ڈالا اور جھول گئی، مگر پرانی چنری اس کا وزن برداشت نہ کر سکی اور وہ ٹوٹ گئی اور امر کو موت بھی نہ مل سکی اور آج اس لیے وہ بیٹھی سوچ رہی تھی کہ خدا نے اسے ابھی کون سا دن دکھانے کے لیے زندہ بچالیا ہے.....؟؟؟

☆.....☆

معصوم بچیاں

مالا فراز

معصوم زندگیوں کے گرد گھومتی ایک سبق آموز سچ بیانی

مجھے بٹھایا اور چائے بنانے چلی گئی، جب وہ چائے لے کر آئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ آسیہ کی کون ہے۔ تو مجھے شازیہ نے بتایا کہ وہ آسیہ کی کوئی رشتہ دار نہیں ہے بلکہ اس کے شوہر کی پہلی بیوی ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت زیادہ حیرت ہوئی کہ وہ اس کے شوہر کی پہلی بیوی ہے، کیوں کہ فلیٹ تو آپس میں بہت ملے ہوئے ہوتے ہیں اور کسی کو بھی اس بات کی خبر نہیں۔ پوری بلندنگ والے اس کو آسیہ کا رشتہ دار ہی سمجھتے ہیں۔

میں نے شازیہ سے پوچھا کہ وہ اگر پہلی بیوی ہے تو اس نے اپنے شوہر کی دوسری شادی کیوں ہونے دی۔ میری بات سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر اپنی بچیوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ ہیں میرے شوہر کی دوسری شادی کی ذمہ دار۔“

اس نے بتایا کہ ساجد سے اس کی شادی چھ سال پہلے ہوئی تھی اور وہ دونوں آپس میں بہت محبت سے رہتے تھے۔ ساجد اس کے بغیر کھانا نہیں کھاتا تھا اور نہ ہی وہ اپنے ماں باپ کے گھر زیادہ جاتی تھی، کیوں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ شازیہ کے گھر والے کہتے تھے کہ تم تو ہمیں بھول ہی گئی ہو۔ ایک

میں ان دنوں چھٹیاں گزارنے اپنی پھوپھو کے گھر گئی۔ وہ فلیٹ میں رہائش پذیر ہیں۔ ان ہی فلیٹوں میں ایک فلیٹ آسیہ کا بھی تھا۔ آسیہ ایک بہت ہی خاموش رہنے والی لڑکی تھی۔ میری ملاقات اس سے پھوپھو کے فلیٹ پر ہوئی تھی، پھر آہستہ آہستہ ہماری بات چیت شروع ہو گئی، مگر وہ پھر بھی کم بولتی تھی۔ میں کچھ دن پھوپھو کے گھر گزار کر واپس آ گئی پھر کچھ عرصے بعد دوبارہ پھوپھو کے گھر جانا ہوا تو میں آسیہ سے ملنے گئی، وہاں دیکھا تو ایک نوجوان لڑکی بھی تھی اور دو چھوٹی بچیاں بھی جو کہ بہت ہی پیاری تھیں۔ میں نے آسیہ سے پوچھا، یہ کون ہیں تو اس نے کہا کہ وہ ان کے ہاں مہمان آتی ہیں۔ اس لڑکی نے چائے بنا کر دی، پھر کچن میں چلی گئی، وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی، مگر وہ زیادہ دیر نہیں بیٹھی اور اٹھ کر چلی گئی۔ میں بھی تھوڑی دیر آسیہ کے پاس بیٹھی اور واپس آ گئی۔ میں پھوپھو کے پاس ایک ہفتہ رہی۔ اس دوران آسیہ مجھ سے ملنے آئی۔ میں نے آسیہ سے اس لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ آسیہ نے بتایا اس کا نام شازیہ ہے۔ ایک روز میں آسیہ کے گھر گئی تو وہ گھر پر نہیں تھی، البتہ شازیہ بھی جو کچن میں کھانا بنا رہی تھی۔ اس نے



پریشان ہے۔ ساجد بتا نہیں کہاں ہے۔ ساس نے جی انجان بننے ہوئے کہا کہ وہ نہیں جانتی کہ ساجد کہاں ہے۔ کئی دنوں بعد ان کے ایک عزیز نے بتایا کہ انہوں نے ساجد کو ایک عورت کے ساتھ ایک گھر سے نکلے دیکھا ہے۔ شازیہ یہ سنتے ہی اپنے والد کے ساتھ وہاں پہنچ گئی تو اسے پتا چلا کہ ساجد دوسری شادی کر چکا ہے اور وہ لڑکی شازیہ کی ساس کی رشتہ دار ہے۔ اس کی یہ شادی ساس نے کروائی ہے، کیوں کہ انہیں بیٹا چاہیے تھا، اس لیے شازیہ کو ساجد نے واپس بھیج دیا تھا۔ شازیہ اپنی کہانی سناتی جا رہی تھی اور اس کے آنسو بہتے جا رہے تھے۔

میں نے پوچھا کہ پھر وہ ساجد کے پاس کس طرح آئی اور آج اس فلیٹ میں کیسے ہے۔ شازیہ نے بتایا کہ ساجد کی دوسری بیوی آسیہ سے بیٹا ہوا، جب یہ بات ہمیں پتا چلی تو والد صاحب خاندان کے کچھ لوگوں کو لے کر ساجد کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ وہ شازیہ کو اپنے پاس رکھے اور دونوں بیٹیوں کو بھی، کیوں کہ وہ ساجد کی ذمہ داری ہیں۔ اس طرح ساجد نے اسے اپنے گھر

رات بھی نہیں آ کر رہتی۔ دن اسی طرح گزر رہے تھے، پھر شازیہ نے ایک پیاری سی بیٹی کو جنم دیا، مگر ساجد کو زیادہ خوشی نہیں ہوئی، جب شازیہ کی ساس کو پتا چلا کہ شازیہ نے بیٹی کو جنم دیا ہے تو وہ ان کے گھر آئیں اور شازیہ کو بہت برا بھلا سنایا اور فوراً ہی چل گئیں۔

دن اسی طرح ساجد کی بے رخی میں گزرتے رہے اور وہ ایک بار پھر ماں بنی۔ اس بار بھی اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ اس بار ساجد نے اس سے بات تک نہیں کی۔ ساس دیکھنے تک نہیں آئیں۔ شازیہ اپنی بیٹی کو لے کر اسپتال سے گھر آ گئی، ان دنوں ساجد کا موڈ بہت خراب رہنے لگا تھا۔ ساجد نے کچھ دنوں کے لیے شازیہ کو اس کے ابو کے گھر بھجوا دیا۔ شازیہ نے بتایا اس کو معلوم نہیں تھا کہ اس کو اس کے والد کے گھر کیوں بھیجا جا رہا ہے۔ والدین کے گھر رہتے ہوئے اسے 4 مہینے گزر گئے تھے اور ساجد نے اس کی کوئی خبر نہیں لی۔ والد صاحب ساجد کے گھر بھی گئے مگر وہ نہیں ملا۔ تب شازیہ خود ہی اپنے سسرال پہنچ گئی اور اپنی ساس کو بتایا کہ وہ بہت

گیارہویں سچ بیانی

نثر ایک سفر

نفسہ فضل



بیتے لمحات میں قید ایک عورت کی سچ بیانی

ساڑھے بارہ بجے کا عمل تھا اور ریلوے بھانک بند تھا، کیوں کہ ملیر کینٹ جانے والی مال گاڑی گزر رہی تھی۔ اس وقت ریل گاڑیوں کی آمد و رفت کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ فضل صاحب کو سخت حاجت محسوس ہوئی تو وہ قریب ہی اُگی ہوئی جھاڑیوں میں جہاں آج کل ہفتہ بازار لگتا ہے، بیٹھ گئے، پھر گیٹ کھلنے پر گھر آ کر سو گئے۔ صبح جب میں ان کو بڈنی دینے لگی تو انہوں نے مجھے بڑی عجب سی نظروں سے گھور کر دیکھا اور چائے نہیں لی، پھر وہ غسل کرنے چلے گئے۔ واپس آنے پر میں نے انہیں ناشتہ دیا تو وہ بھی نہیں کیا، بلکہ کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔ ان کے اس رویے سے میں اور میری بہن پریشان ہو گئے۔ میری بہن عشرت کی ساس نے دیکھا تو بولیں۔ ”اس پر تو کسی نے کچھ کرادیا ہے۔“ اور قرآن پاک لا کر اس کی ہوا دینے لگیں تو فضل صاحب نے پاس پڑی دوائی کی بوتل ان کے اوپر دے ماری، جو کسی گولگی تو نہیں لیکن دیوار سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئی۔ اسی اثناء میں، میں نے اپنے بڑے بھائی کے گھر فون کر دیا۔ بھابی نے بتایا کہ بھائی جان تو آفس کے لیے نکل چکے ہیں، پھر میں نے اپنے بیٹے طاہر کو فون کیا، جو اپنے دوست کے گھر گیا ہوا تھا۔ اس نے عطلندی یہ کہی کہ

یہ قصہ جو آپ کے گوش گزار کر رہی ہوں، سو فیصد سچ ہے اور اس کے چشم دید گواہ ہمارے خاندان کے علاوہ اہل محلہ بھی ہیں۔ یہ واقعہ 1987ء کا ہے، جب ہم لاہور میں رہتے تھے، لیکن رشتے داروں سے ملنے کراچی آئے ہوئے تھے۔ اس وقت ہم ملیر کالا بورڈ میں اپنی بہن کے یہاں قیام پذیر تھے۔ کسی ولاد میں میرے بڑے بھائی اور کورنگی میں چھوٹے بھائی اور والدہ، جبکہ بھیلے بھائی رفاہ عام میں رہتے تھے۔

جنوری کے سرد دن تھے۔ میرے شوہر (مرحوم) فضل محمود میری کزن کے گھر، جو کہ پی آئی اے اسٹاف کالونی میں رہتی تھیں، میرے شوہر کی رضائی بہن بھی ہیں اور ان کے شوہر مرتضیٰ بیگ (مرحوم) میرے شوہر کے بچپن کے دوست تھے۔ مرتضیٰ بھائی کے بڑے بھائی ملا میٹیا سے آئے ہوئے تھے۔ وہ لوگ تاش کھیلنے کے بہت شوقین تھے، وہ ان کے گھر گئے ہوئے تھے، ملاقات کی غرض سے، جہاں ان کے بھائی مرزا حبیب جان بیگ (مرحوم) نے ضد کر کے انہیں تاش کھیلنے کے لیے روک لیا تھا۔

رات بارہ بجے تو میرے شوہر بمشکل ان سے اجازت لے کر واپس ہوئے۔ جب وہ ملیر ہالٹ پہنچے تو

گزار رہی ہے کہ شاید کبھی ساجد کو خیال آ جائے اور اس کے دل میں باپ کی محبت جاگ اٹھے۔ آج شازیہ کو اپنی امی بہت یاد آتی ہیں۔ کاش وہ زندہ ہوتیں، وہ اپنا غم انہیں بتاتی اور اسے اک ڈھارس تو ہوتی کہ کوئی تو ہے دنیا میں اس کا اپنا۔ شازیہ نے بتایا کہ وہ اپنے اچھے دنوں کو یاد کرتی ہے اور روتی ہے۔

اولاد تو اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ یہ انسان کے اپنے ہاتھ میں تو نہیں ہے کہ بیٹا یا بیٹی پیدا کرے، پھر اسے کس وجہ سے اتنی ذلت بھری زندگی گزارنی پڑ رہی ہے۔ یہ سب سن کر میں سوائے افسوس کہ کیا کہہ سکتی تھی۔ اس کی معصوم بچیوں کو دیکھا جو اپنا کھیل رہی تھیں۔ میرا بہت دل چاہا کہ شازیہ کو دنیا کی سب خوشیاں دلا دوں۔ مجھ سے اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے جا رہے تھے۔ اس کی عمر بھی ابھی کم ہی تھی اور ایک لمبی زندگی اس کے سامنے تھی جسے اس نے گزارنی تھی۔ میں شازیہ کی کہانی سن کر واپس آ گئی، کیوں کہ میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی خوشی تو ساجد میں تھی، جو کہ اس سے بات بھی کرنا گوارا نہیں کرتا اور یہ خوشی دینا میرے بس میں نہیں تھا۔ مجھے ان معصوم بچیوں پر ترس آ رہا تھا جو باپ کے ہوتے ہوئے اس کی شفقت اور پیار سے محروم تھیں۔ کہیں وہ بڑے ہونے کے ساتھ احساس محرومی کا شکار نہ ہو جائیں۔ ایسے بچے بہت زیادہ حساس ہو جاتے ہیں اور وہ ٹھہری لڑکی ذات، کہیں حالات کا شکار نہ ہو جائیں۔

میرا پھر دور بارہ جانا نہیں ہوا شازیہ کے پاس۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ آج بھی مجھے وہ بچیاں بہت یاد آتی ہیں۔ کاش ساجد کو یہ احساس ہو جائے کہ لڑکیاں بہت حساس ہوتی ہیں۔ وہ انہیں ایک باپ کی محبت دے، توجہ اور پیار دے۔ ان کو بھی وقت دے تاکہ وہ ٹوٹنے سے بچ جائیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ آسہ کے دل میں بھی رحم ڈال دے اور ساجد اپنی پہلی بیوی اور بچیوں سے محبت کرے۔ ان کا خیال رکھے۔

قارئین آپ بھی شازیہ کے لیے دعا کریں کہ وہ جہاں ہو خیریت سے ہو اور زندگی کی خوشیاں اسے بھی حاصل ہوں۔ (آمین)

☆.....☆

بلالیا، مگر اس کا رویہ شازیہ کے ساتھ اچھا نہیں ہے۔ شازیہ کو یقین نہیں آتا ہے کہ وہ یہی ساجد ہے جو اس سے اتنی محبت کرتا تھا اور آج دفتر سے آ کر سیدھا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ دوسری بیوی کے پاس اور اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں ہے، نہ ہی اس کی کسی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اگر بیٹیاں اس کے پاس جائیں تو انہیں کمرے سے آسیر نکال دیتی ہے۔

شازیہ نے بتایا کہ وہ میٹرک پاس ہے، کہیں جاب بھی نہیں کر سکتی۔ شازیہ کو تعلیم نہ حاصل کرنے کا بھی بہت افسوس ہے۔ اگر بڑھی لکھی ہوتی تو کہیں جاب کر کے اپنی ضرورتیں پوری کر لیتی۔ اب آسیر اس سے گھر کے سارے کام کرواتی ہے اور خود اپنے بیٹے کو سنبھالتی ہے۔ ساجد بھی آسیر کی ہی بات مانتا ہے، کیوں کہ وہ بیٹے کی ماں ہے۔

شازیہ اب اپنے گھر دونوں بچیوں کے لے کر نہیں جاسکتی، کیوں کہ اس کی امی کا انتقال ہو چکا ہے، والد بوڑھے ہیں اور گھر میں بھابھیاں ہیں جو زیادہ دن تک اسے برداشت نہیں کریں گی۔ شازیہ نے کہا کہ اس ساری صورتحال کی ذمہ دار اس کی ساس ہیں۔ اگر وہ یہ سب نہ کرتیں اور ساجد کو سمجھاتیں تو وہ آج اتنی ذلت کی زندگی نہیں جی رہی ہوتی۔ آج ایک ٹیبلٹ خریدنے کے لیے بھی اس کے پاس نہیں ہوتے۔ آسیر نے ساجد سے کہا رکھا ہے کہ اگر اس نے کبھی شازیہ سے بات چیت کی تو وہ یہاں سے چلی جائے گی۔ اس لیے ساجد دفتر سے آ کر سیدھا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔

شازیہ نے کہا کہ میں نے کئی بار سوچا کہ زہر کھا کے مر جاؤں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے، مگر اپنی معصوم بچیوں کا خیال آتا ہے، آسیر کیوں کر ان بچیوں کو رکھے گی۔ وہ تو باپ سے بات بھی کرنے نہیں دیتی۔ کمرے سے نکال دیتی ہے اور نہ ہی ساجد کو آنے دیتی ہے۔ شازیہ نے کہا، اب یہی میرا ٹھکانہ ہے۔ اس نے کہا کہ میں تو اپنی زندگی جیسے تیسے گزار رہی ہوں، مگر ان بچیوں کا کیا تصور ہے؟ جو باپ کے ہوتے ہوئے بھی باپ کی شفقت و محبت سے محروم ہیں۔ وہ ایک آس کے سہارے زندگی



میرے بھائی منیر کو اس کے آس سے بیٹا ہوا آیا۔ منیر آتے ہوئے اپنے ساتھ کسی حافظہ جی کو لیتے آئے جو ایک پیر سے معذور تھے۔ انہوں نے آکر پڑھائی شروع کی تو فضل صاحب غصہ کرنے لگے۔

”او، حافظہ کے بچے چلا جا، ورنہ تیری دوسری ٹانگ بھی توڑ دوں گا۔“ اور انہیں گالیاں دینے لگے۔ سب حیران تھے کہ اتنے مہذب انسان کو ایک دم یہ کیا ہو گیا ہے۔ غرض حافظہ صاحب تعویذ وغیرہ دے کر چلے گئے۔

شام کو سب لوگ ان کی مزاج پرسی کرنے کے لیے آئے تو وہ گھر سے نکل کر جانے لگے اور بولے۔

”میں تو ریلوے کی پٹریوں پر جاؤں گا۔“ ہم نے رات بھر ان کا پہرہ دیا کہ کہیں وہ رات کو نکل کر نہ چلے جائیں۔ دوسرے دن گھر سے باہر نکل کر گلیوں میں بھاگنے لگے، پاگلوں کی طرح۔ پھر اٹھا کر لوگوں کو مارتے۔ بہن کے گھر کے آگے ایک بڑا سادرخت تھا، اس کی طرف دیکھ کر گالیاں دیتے، پتھر مارتے، درخت کے تنے کو پکڑ کر زور زور سے ہلاتے، پھر جب ہوش میں آئے تو ان سے پوچھا، کہنے لگے۔ یہ سب کیا تھا، تو وہ بولے۔ ”ایک

پہلوان ہے، بھیگا ہے، دھوٹی اور بنیان پہنا ہوا ہے۔ مجھ سے کہتا ہے کہ میرے ساتھ چل اور بھی کہتا ہے کہ مجھ سے دوستی کر لے۔ ساری رات مجھ سے کشتی کرتا رہا تھا۔“

ہم نے بھائی جان سے گاڑی منگوائی کہ انہیں ان کے گھر لے جائیں۔ بڑی مشکل سے پچھلی سیٹ پر لٹایا، پھر جیسے ہی میں بیٹھنے لگی تو کسی نے ان کے دونوں پیر پکڑ کر انہیں گاڑی باہر کھینچ لیا اور وہ ایک چھلانگ میں کمرے میں جا کر بیڈ پر لیٹ گئے اور انٹی سگریٹ سلگا کر پیر پر پیر رکھ کر بولے۔

”میں یہاں ہی رہوں گا۔“

فضل صاحب ہینڈسم اور دنیا دار آدمی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ پھانک کے پاس جو پیٹرول پمپ ہے، وہاں پہلے نرسری ہوا کرتی تھی۔ وہاں پہلوان کا اکھاڑا ہے۔ گھر میں وہ گھنٹوں بے ہوش سے رہتے، مگر نجانے پہلوان کس طرح انہیں اپنے اکھاڑے میں لے جاتا تھا اور اپنے سامنے بٹھا کر اپنے داؤچ انہیں دکھاتا تھا۔

ایک روز چھوٹا بھائی صابر آیا تو اس نے کہا۔

”باجی! بھائی کو میرے گھر لے چلیں۔“ وہ فوراً

راضی ہو گئے۔ صابر نے موقع سے فائدہ اٹھا کر فوراً ٹیکسی منگوائی اور کورنگی اس کے گھر چلے گئے۔ صابر ہر سال 27 ذی الحج کو اپنے گھر پر تو الیاں کراتے تھے۔ ہم تو چوں کہ لاہور میں رہتے تھے۔ اس لیے ہمیں کچھ پتا نہیں تھا۔ والدہ صاحبہ نے بتایا تھا کہ صابر کو حال آتے ہیں۔ جب ٹھیک تھے تو اس کا مذاق اڑاتے تھے کہ میرے سامنے تھیلے تو میں سوئی چھانڈوں گا اور مرچوں کی دھوئی دوں گا۔ کورنگی 2 نمبر پر کوئی صاحب تھے، وہ انہیں بھائی جی کہتے تھے۔ صابر انہیں ان کے پاس لے گئے تو وہ وہاں سے اٹھ کر آ گئے۔ سارا دن لیٹے رہتے، نہ کسی کام کے نہ کاج کے۔ ہم اپنے گھر بھی جانا چاہتے تھے۔ ایک روز صابر کسی مولوی صاحب کو گھر لائے اور انہوں نے فضل صاحب کی حاضری کرا دی، تو وہ پہلوان بولا۔

آپ نے بلایا ہے تو میں گھر کے اندر آ گیا ہوں۔ میں صرف اس سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔“ یہ سب باتیں میرے شوہر کر رہے تھے۔ اس وقت وہ بھیگے ہوئے تھے۔ میری نندا اور نندوئی ان کی طبیعت کا سن کر لاہور سے آ گئے تھے۔ جب وہ لوگ ان سے ملنے آئے تو اس وقت وہ فرج سے کیونو کال نکال کر کھارہے تھے۔ جب پہلوان آتا تھا تو یہ کسی کو نہیں پہچانتے تھے اور بہت کھاتے تھے، پھر بعد میں کہتے۔

”میں نے کچھ نہیں کھایا ہے، مجھے بموک لگی ہے۔“

غرض اس وقت انہوں نے بہن کو بھی نہیں پہچانا اور جب ٹھیک ہوئے تو بہن سے لپٹ گئے کہ تم کب آئیں۔

اسی طرح حلقہ میری بھائی بچن میں شامی کباب بنارہی تھی۔ یہ گھڑی گھڑی جاتے اور اس سے گرم گرم کباب لے کر خوب کھاتے، پھر جب سب کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تو حلقہ سے بولے۔ ”کباب تو کھلاؤ۔“ وہ بہت حیران ہوئی کہ ابھی تو اتنے سارے کباب کھائے ہیں۔ دوسرے دن میرے بھتیجے آ گئے۔ ان کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ گئے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے ہلاتے رہے تو اٹھے ہی نہیں، اتفاقاً میری بڑی بھائی آ گئیں۔ انہوں نے ان کا سر پکڑ کر اپنی طرف جو گھمایا تو غضب ہی ہو گیا۔ فضل صاحب نے تاش چھینکے اور بھائی کی گردن دبوچ لی۔ سب لوگ گھبرا گئے کہ یہ کیا ہو گیا اور پھر ان

سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے، جبکہ گھر میں صرف چار مرد تھے۔ کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہاں کون ہے، جس نے اس پہلوان کو قابو کیا، البتہ وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ جب وہ ہوش آئے تو ان کی ایک آنکھ سوچ رہی تھی اور کالی پڑ گئی تھی، جبکہ ان کی آنکھیں بھوری اور خوب صورت تھیں۔ ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر خوف آرہا تھا۔ دو ماہ تک ان کی آنکھ کا ٹیل نہیں گیا تھا۔ میری نندا میرے بھائی منیر کی ساس بھی ہیں۔ وہ ان دنوں کراچی آئی ہوئی تھیں۔ میرے شوہر اپنے، پرانے، بچے، بوڑھوں میں بے انتہا ہر دل عزیز تھے۔ آج جبکہ انہیں اس دنیا سے گئے ہوئے 18 برس گزر گئے ہیں۔ ہر چھوٹا بڑا اور اپنا پرایا، بہت عزت و احترام سے انہیں یاد کرتا ہے۔ اللہ پاک انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

مجھ سے فضل صاحب نے کہا کہ جا کے منیر کو بلا کے لاؤ۔ آج کہیں جانا ہے؟ ہم سب خوش ہو گئے کہ فضل صاحب ٹھیک ہو گئے ہیں۔ شام کو منیر مع اپنی بیوی صائمہ، سر اور ساس کے ساتھ آ گئے۔ سب لوگ بیٹھے ہوئے تھے، خوش گیمیاں ہو رہی تھیں۔ میری نندا بولیں۔

”میں نے تو کوئی پہلوان شہلوان نہیں دیکھا۔ ٹھیک ہے میرا بھائی۔“ منیر نے کہا۔

”ہاں تو بھائی فضل کہاں چلنا ہے؟“

صابر نے کہا۔ ”عبداللہ شاہ غازی۔“ اتنا کہتا تھا کہ فضل صاحب صابر پر جھپٹ پڑے اور بھیگے ہو گئے۔ صابر باہر بھاگا تو وہ بھی اس کے پیچھے بھاگے اور محن میں جا کر اسے گردن سے دبوچ کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ سب انہیں چھڑانے لگے، مگر ان میں نجانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ اچانک منیر کو جلال سا آ گیا۔ اس نے فضل صاحب کے بال پکڑ کر نعرہ لگایا۔ ”حق فرید یا فرید۔“ اتنا کہتے ہی لگا، گویا کسی نے جھٹکا دے کر انہیں نیچے گرا دیا ہو۔

دراصل میرے والد مرحوم اور بھائیوں کا سلسلہ چشتیہ ہے اور منیر بابا فرید کے عقیدت مندوں میں سے ہیں۔ ہر سال وہ آپ کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ میری نندا اور سب لوگ سکتے میں آ گئے۔ دراصل جب

میری نند نے کہا تھا کہ میں نے تو کوئی پہلوان نہیں دیکھا، تو اسی وقت پہلوان آگیا تھا اور اس نے آکر بتایا تھا کہ مجھے پاکستان بننے سے پہلے اس جگہ پر قتل کیا گیا تھا۔ جب سے میں یہاں ہی رہتا ہوں اور میرا ہالٹ سے میر 15 نمبر (میرٹی) کے درمیان تک جو بھی ایکسی ڈنٹ ہوتے ہیں، وہ میں ہی کرتا ہوں۔ جب کوئی لڑکا اپنی شوخی میں بائیک چلاتا ہے تو میں اس کا ہاتھ ہلا دیتا ہوں۔ منیر نے چلتے ہوئے مجھے توایوں کی ایک کیسٹ دی کہ جب ان کی طبیعت خراب ہو تو یہ کیسٹ لگا دیتا۔ دوسرے دن میرے خالہ زاد اپنی بیوی کے ساتھ ایئر پورٹ کسی کام سے جا رہے تھے تو انہوں نے ہمیں بھی ساتھ لے لیا۔ ہم ندی کے راستے آگئے۔ واپسی پر ناصر نے کہا۔ ”بھائی بوتل پیس گے۔“ بڑے لہک کر بولے۔ ”ہاں۔“

اس نے شمع پر گاڑی روکی اور بوتل منکوائی، سردی ویسے ہی تھی، بوتل ٹھنکی ہوئی تھی، مگر ہم تو یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ ایک سانس میں بوتل خالی تھی۔ جب ہم چلے تو کہنے لگے۔ ”پھانک کی طرف سے چلو۔“ میں نے ناصر کو منج کر دیا کہ اُدھر نہ جانا۔ ہمارے آگے بائیک پر نو بیاتہتا جوڑا جا رہا تھا۔ کہنے لگے۔ ”اس پر گاڑی چڑھا دو۔ میں نے دل ہی دل میں بڑھنا شروع کر دیا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہم پھانک کی طرف سے نہیں گئے۔

اسی طرح ایک دن جب ہم بڑے بھائی کے گھر تھے، تو گھر سے باہر نکل گئے۔ میرے بھتیجے ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ دائر لیس گیٹ پر پہنچے تو فرین گزر رہی تھی۔ کہنے لگے۔

”کھڑے کیوں ہو، اس کے نیچے سے نکلو۔“ سب ان کی حالت سے پریشان تھے۔ ہمارے نیچے الگ پریشان، اسکول کھل چکے تھے، کام کا الگ نقصان تھا۔ لاہور میں ان کا پنٹ کا چھوٹا سا برنس تھا۔ ایک مڑے کی بات یہ تھی کہ صابر گھر پر ہوتے تو پہلوان ظاہر نہیں ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ میری بیٹی بھی رہنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔ منج نوبے کا وقت تھا۔ صابر ہمیں اپنے بڑے کمرے میں سلاتے تھے۔ اسی کمرے میں توایاں بھی

ہوتی تھیں، جیسے ہی صابر دفتر کے لیے نکلے، میں انہیں چائے دینے لگی تو دیکھا وہ دروازے کی طرف دیکھ کر عجیب سی آواز نکال رہے ہیں۔ میں نے پوچھا، ”کیا ہوا؟“ بولے۔ ”وہ پہلوان کھڑا ہے۔“

میں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ ”آج صابر آجائے، میں اسے سید صاحب، جو صابر کے ساتھ ہیں، ان بزرگ کے حوالے کروں گی۔“ اتنا سنتے ہی میرے میاں نے ایک ہاتھ میں میرے بال اور دوسرے سے گلا پکڑ لیا، جبکہ میرے کئے ہوئے کھلے بال اتنے گھنے تھے کہ ایک ہاتھ میں نہیں آتے تھے، میں جو چیخی تو میری امی (مرحومہ) اور بیٹی، بھابی، سب لوگ بھاگے، اُدھر میرے گلے پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ امی قرآن پاک لائیں۔ اچانک مجھے خیال آیا تو میں چلائی۔

”سید صاحب، بابا صاحب! جو کوئی بھی ہیں انہیں سنبھالیں۔“ ایک دم لگا کسی نے جھٹکے سے انہیں اپنی طرف کھینچا اور وہ فرش پر گرے اور بے ہوش ہو گئے۔

اس سے پہلے صابر انہیں دو اور مولویوں کے پاس لے کر جا چکے تھے۔ ایک محمود آباد میں رہتے تھے۔ انہوں نے آگ سامنے جلا کر انہیں بٹھا دیا اور ان کے سر پر دف بجانا شروع کر دی۔ کچھ دیر تو وہ خاموشی سے بیٹھے رہے، پھر صابر کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ بولے۔ ”قابو ہی نہ کر لے، یہ تو خود ڈراما ہے۔“ باہر آ کر کباب کی دکان سے ایک درجن کباب کھا گئے۔ وہ پہلوان کھانے اور گھومنے کا بہت شوقین تھا۔ سب پریشان تھے کہ کیا کریں۔ ہم اس حال میں اپنے گھر جانے سے رہے۔ لاہور جا کر انہیں کون سنبھالے؟ یہاں تو میرے سب بہن بھائی، بھانجے بھتیجے تھے۔ اس حال میں یہ سب بھی ہمیں نہ جانے دیتے تھے۔ شام ہوئی تو صابر کے آنے پر منج کا واقعہ انہیں سنایا گیا۔ صابر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”آج ہم گھر میں ہی بھائی کا علاج کرتے ہیں۔“

شام کو مغرب سے کچھ دیر قبل کمرے میں جائے نماز بچائی، اگر بتیاں، لوہان سلاک کر صابر پڑھنے بیٹھ گئے۔ اس وقت صابر کی عمر چھبیس ستائیس برس ہوئی۔ چہرے پر بلا کا نور آگیا تھا۔ فضل صاحب دوسرے کمرے میں

میرے بھتیجے ندیم کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے۔ اچانک بڑے کمرے سے ایک پر جلال آواز آئی۔

”بلاؤ اسے!“ ہم سب نے گھبرا کر دیکھا تو صابر کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ہاتھ کے اشارے سے کہہ رہے تھے۔ ”اُدھر آؤ۔“ ندیم نے فضل صاحب سے کہا۔

”آپ کو بلا رہے ہیں۔“ اتنا سنتے ہی انہوں نے تاش کے پتے پھینکے۔ ندیم کو ایک گھونسا سننے پر مارا، وہ بے چارہ اس ناگہانی آفت پر گھبرا کر پیچھے گر گیا اور یہ ایک جست میں دوسرے کمرے میں جا کے صابر کے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے۔

صابر کی حاضری ہو چکی تھی۔ وہ سید صاحب تھے۔ سید صاحب نے السلام علیکم کہہ کر ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے اپنا ہاتھ سید صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ سید صاحب نے ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے بٹھالیا اور بولے۔

”تم کیوں تنگ کر رہے ہو؟ یہ بے چارہ اپنے گھر اور کام پر جانے کے لیے بیٹھا ہے، اس کا پیچھا چھوڑو۔“ وہ بولا۔

”دوستی کی ہے، نہیں جاؤں گا۔“ سید صاحب نے قریب رکھی مرچیں اٹھا کر آگ میں ڈالیں، وہیں وہ جھٹکا دے کر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ فضل صاحب بے ہوش ہو کر گر چکے تھے۔ سید صاحب نے انہیں دم کیا۔

اسی دن رات کو صابر کے گھر مہمان آئے ہوئے تھے۔ صابر وغیرہ وہاں پر مصروف تھے۔ میں فضل صاحب کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اچانک میری نظر ان کی طرف گئی تو محسوس کیا کہ اب پہلوان آگیا ہے۔ میں نے جلدی سے توالی لگا دی۔ غلام فرید صابری کی توالی۔ ”عرس میں انبیاء اولیاء آئے ہیں“ شروع ہوئی تو وہ پاؤں سنبھل کر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی دوسری توالی نصرت فتح علی کی ”بابا تیری جوگن ہوں“ شروع ہوئی تو انہوں نے حال کھیلنا شروع کر دیا۔ میں نے صابر کو بلایا۔ جلدی آؤ، پہلوان ڈراما کر رہا ہے، مگر فضل صاحب کا چہرہ اور انداز اتنا پیارا لگ رہا تھا۔ خوب صورت تو وہ تھے ہی، مگر ان پر بے انتہا نور تھا۔ سب دیکھنے والے حیران تھے۔ جب وہ ٹھیک ہو گئے تو مجھ سے کہنے لگے۔

”جب میری طبیعت خراب ہوتی ہے تو دم کا پانی نہ پلایا کرو، اب پہلوان نہیں آ رہا بلکہ اب ایک بابا آتے

ہیں۔ یہاں کی پر بیٹھے ہوتے ہیں۔“ ہم نے سوچا کہ پہلوان ڈراما کر رہا ہے تاکہ اس کا علاج نہ ہو سکے۔ دوسرے دن صابر کسی مولوی کے پاس انہیں کورنگی 2 نمبر لے کر گئے۔ یہ وہاں کچھ دیر بیٹھے، پھر صابر سے بولے۔

”چلو یہاں سے یہ 2 نمبر آدمی ہے۔ اندر جا کے دیکھو، یہ عورتوں کے ساتھ نازیبا حرکات کر رہا ہے۔ دم درود کے بہانے اور ہاں میرا علاج تمہارے گھر سے ہوگا، کہیں نہیں ہوگا۔“

پھر ہم دو دن بعد کسی کے مشورے پر انہیں بابا شاہ عقیق کے مزار پر لے گئے۔ ہمارے ساتھ آٹھ دس لوگ تھے اور ہم نے رات وہیں گزارنی تھی، بہر حال رات ہم سب نے وہاں چھپر ہوئے میں گزاری۔ منج منج فضل صاحب نے سب کو جگا کر کہا۔ ”رات میرے پاس بابا شاہ عقیق آئے تھے۔ انہوں نے گلے میں اسٹیکھو اسکوپ پہنا ہوا تھا۔ دو آدمی ان کے ساتھ تھے۔ منج نوبے بلایا ہے۔“ یہ کہہ کر خود فوراً چلے گئے۔ میرے بڑے بھائی ساتھ تھے۔ ان کے دونوں پیرو پر تک پک رہے تھے، کسی علاج سے ٹھیک نہیں ہوتے تھے۔ ہم سب ناشتے سے فارغ ہو کر مزار پر پہنچے۔ ہم اندر داخل ہو رہے تھے اور وہ مزار شریف کے احاطے سے باہر جا رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

”کہاں چلے گئے تھے؟“ مجھے کسی انجینی کی طرح دیکھتے ہوئے باہر چلے گئے۔ شام کو ہم سب گھر واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھے سب باتیں کر رہے تھے مگر فضل صاحب تمام رات خاموش بیٹھے رہے۔

گھر آ کر صاحب نے کہا کہ ہم توایاں کراتے ہیں۔ بھائی کی بیٹھک دینی ہے۔ شاید قارئین کرام جانتے ہوں گے کہ بیٹھک کی توایاں کرانے سے جو کسی کے ساتھ ہوتا ہے، کھل جاتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا مسئلہ ہے۔ غرض میں چاروں بعد گھر میں توایاں کرائی گئیں۔

صابر کی تو حاضری ہوتی ہی ہے، توایاں شروع ہوتے ہی فضل صاحب نے بھی حال کھیلنا شروع کر دیے۔ بہت پیارے انداز میں کھیل رہے تھے۔

دل کرتا ہے کاش میں ان کا انداز پھر دیکھوں۔ جب توایوں میں چائے کا وقفہ ہوا تو میں اندر کمرے میں

ان کے پاس گئی، بعد سلام کے پوچھا۔

”آپ کون صاحب ہیں کہاں سے تشریف لائے ہیں؟“ میرے پوچھنے پر جب جواب نہیں ملا تو سید صاحب (صابر) مجھ سے مخاطب ہوئے۔

”آپ بات کریں بابا صاحب سن رہے ہیں، مگر بابا صاحب جواب نہیں دیں گے، کیوں کہ یہ بول نہیں سکتے!“ اس کے بعد ہم صابر کے گھر مزید دو ماہ رہے۔ اب پہلوان نہیں آتا تھا۔ میں جگ آچکی تھی، میں اپنے گھر جانا چاہتی تھی۔ میں نے فضل صاحب سے گھر جانے کو کہا تو وہ بولے۔

”تم جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔“ بچے بھی ہم سے دور تھے اور پریشان تھے۔ فضل صاحب بولے۔

”ابھی میرا علاج ہو رہا ہے۔ باباجی نے کہا ہے، ابھی دو ماہ یہاں رہو۔“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”باباجی تو بول نہیں سکتے؟“ وہ کہنے لگے۔ ”ہاں یہ بات ٹھیک ہے، مگر جب بھی باباجی آتے ہیں، ان کے ساتھ تین چار بزرگ ہوتے ہیں، وہ مجھے بتاتے ہیں۔“ اب فضل صاحب نماز عشاء کے بعد ہر روز وہی تو الیاں سنتے تھے۔ ہم تو الیوں کے بعد باباجی سے ملاقات کرتے تھے۔ باباجی ہاتھ کے اشاروں سے ہمیں جواب دیتے تھے جو باتیں ہم سمجھ نہ پاتے وہ بعد میں فضل صاحب خود بتاتے تھے۔ جب تو الیاں سنتے تو سر پر تولیہ یا کپڑا ڈالتے۔ ان کے باباجی سر پر رومال، جسے پنجابی میں ”پرنا“ کہتے ہیں، ڈالتے تھے۔ بدھ کے روز مغرب سے پہلے زردہ ہنوا کے رکھتے تھے۔

کوئی ضرورت مند کسی کام کے لیے آتا تو اس کی ہر بات درست بتاتے۔ امی کی ایک رشتہ دار کی بیٹی کا رشتہ نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے آکر باباجی سے کہا تو باباجی نے انہیں کہا۔ چار بدھ مغرب سے پہلے آکر یہاں بیٹھ جاؤ، دل کرے تو نماز پڑھ لیتا۔ وہ ماں بیٹیاں دو ہفتہ ہی آئی تھیں کہ خالدہ کا رشتہ ہو گیا۔ انہوں نے چار بدھ پورے کیے۔ جب شادی طے پاگئی تو لڑکی کے والد جو کہ انگلیڈ میں تھے، شادی پر نہیں آ رہے تھے، پھر ماں بیٹی روتی ہوئی آ گئیں۔ باباجی نے کہا، پانی لاؤ، دم کر کے کہا گھر میں چاروں کونوں میں ڈال دینا۔

آپ یقین کیجئے، اس کے والدین دن کے اندر آ گئے اور دھوم دھام سے بچی کی شادی کی۔ سب حیران تھے۔ اسی طرح ایک جاننے والی خاتون رقیہ آئیں۔ ان کے شوہر انڈیا جا کر بیٹھ گئے تھے۔ کوئی خبر نہیں تھی۔ انہوں نے آکر اپنے شوہر کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آ رہے؟ تو باباجی نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ وہ شراب اور عورت کے چکر میں ہیں، پھر کافی دن بعد انہوں نے میرے ذریعے معلوم کیا کہ وہ کب تک آئیں گے۔ باباجی نے کہا۔ بہت جلد اور اس کے شوہر تیسرے دن ہی گھر پہنچ گئے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ فضل صاحب گم سم ہو جاتے۔ ایک دن ہمارے پوچھنے پر بتایا کہ اکثر اور بزرگ بھی آتے ہیں، ان سے باتیں ہوتی تھیں۔ اسی طرح بہت سے لوگوں کی باتیں بتاتے اور ان کے کام بھی ہوتے تھے۔ ایک دن صابر کے گھر نماز عشاء کے بعد محفل لگی ہوئی تھی۔ خاندان کے کافی افراد آئے تھے، محلے سے بھی کچھ عقیدت مند آئے تھے۔ قوالی کے بعد فضل صاحب نے سب کو کہا۔ آپ سٹ کر نہ بیٹھا کریں، آرام سے بیٹھا کریں۔ صابر سے بولے کہ تمہیں آج تک پتا نہیں چلا تمہارے اس کمرے میں آستانہ ہے۔ بہت بزرگ یہاں ہیں۔ سب نے ایک جیسے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ یہ جنات ہیں، صرف میرے والے باباجی سفید رومال سر پر اوڑھتے ہیں، جس سے ان کا چہرہ اکثر چھپ جاتا ہے۔ فضل صاحب نے بتایا کہ باباجی کہتے ہیں۔ ہم یہاں بیٹھے تھے، کسی نے ہمیں مدد کے لیے پکارا تو ہم آ گئے۔ ویسے باباجی پاکستان شریف کے والے بابا فرید کے چاہنے والے ہیں۔ ان کی شان میں کہی تو الیوں پر بہت حال کھیلتے ہیں اور باباجی کی ڈیوٹی مزار مبارک پر چڑیوں کو دانہ ڈالنے کی ہے۔ انہوں نے خود ہمیں بتایا تھا اشاروں سے پھر فضل صاحب کی زبانی..... فضل صاحب گھنٹوں حال کھیلتے، مگر بالکل نہ سمجھتے تھے۔ نہ کبھی کہیں چوٹ لگی.....

ایک دن رات کے وقت ہم کالا بورڈ درختوں سے پیدل رفاہ عام منیر کے گھر آ رہے تھے۔ ہمارے ساتھ میرے بہنوئی اور بھانجی کے شوہر تھے۔ ان سے بھی فضل صاحب کی بہت دوستی تھی۔ جیسے ہی ہم پھاٹک کے قریب

جہاں اب ہفتہ بازار لگتا ہے، پہنچے تو جھاڑیوں کے قریب آ کر بولے۔ ”میں نے پیشاب کرنا ہے۔“ آواز ایسے ہو گئی جیسے نشتے میں ہوں۔ بمشکل ان کو وہاں سے بڑھ کر نکالا۔ ریلوے لائن کر اس کر کے ہم گھر آ گئے۔ گھر آ کر فضل صاحب اپنی قمیص کا پچھلا حصہ دھونے لگے۔ ہم نے پوچھا کیا ہوا، کچھ نہیں بتایا۔ صبح ناشتے سے پہلے کہیں چلے گئے۔ واپسی پر ہم نے پوچھا تو بولے۔ ”رات پہلوان پھر مجھے قابو کرنا چاہ رہا تھا۔ جب میں قابو نہیں آیا تو غصے میں کتا مار دیا۔ قمیص پر اس کے خون کے دھبے تھے۔ میں دیکھنے گیا تھا واقعی وہاں کتا مرا پڑا ہے۔ ہم نے رات کو منیر کے گھر آتے ہی تو الیاں لگا دی تھیں۔ دو تو الیاں سن کر باباجی نے اشارے سے تو الیاں بند کرادی تھیں۔ اب باباجی ہی آتے تھے، پہلوان جا چکا تھا۔ اس دوران میرے بھائیوں نے صابر اور بڑے بھائی جہانگیر نے ہمارا ہر طرح خیال رکھا۔ تین ماہ ہم صابر کے گھر رہے۔ ایک بات اور بہت ہی حیران کن تھی۔ بابا شاہ عتیق کے مزار سے آنے کے بعد جہانگیر بھائی کے قبر بالکل ٹھیک ہو گئے تھے، پھر ہم لوگ لاہور اپنے گھر آ گئے۔ میں ہر بدھ کو زردہ بناتی اور جائے نماز بچھاتی تھی۔ فضل صاحب گھر میں ہوتے تو نماز پڑھ کر سب پر دم درود کرتے۔ کسی کو کوئی کام ہوتا تو پوچھتا۔ ہمارے مالک مکان نے بھی اپنے مکان وزمین کے بارے میں معلومات کی تھیں، پھر فضل صاحب نے باباجی کے کہنے پر مجھ سے کہا کہ طاہر کی شادی اپنی بھانجی رفعت سے کر دو۔ ان کے کہنے پر ہم نے رفعت کو اپنے بڑے بھائی جان سے مانگ لیا۔ میری بہن بہنوئی وفات پا چکے تھے۔ جب رفعت تین سال کی تھی..... بھابی بھائی جان نے اس کی پرورش کی تھی، غرض طاہر کی شادی کر دی۔ فضل صاحب کے معدے میں درد ہوتا ہے تو انہوں نے کبھی سنجیدگی سے اس تکلیف کو نہیں لیا تھا۔ دودھ لیا، ایک پین کمر ٹیبلٹ لی، بس..... طاہر کی شادی پر تو بہت تکلیف اٹھائی۔ ویسے کے دن تو انہوں نے آنکھ بھی ٹھیک سے نہ کھولی۔ انجکشن دے کر سلا دیتے تھے۔ طاہر کی شادی کے تیسرے دن ان کا آپریشن ہوا ایک گروہ نکال دیا گیا، مگر تکلیف نہ گئی۔ ہر دوسرے ماہ لاہور سے کراچی آتے

اور لیاقت نیشنل اسپتال میں انہیں انجکشن لگتا تھا، مگر تکلیف نہیں گئی۔ پھر میں فیروز پور روڈ لاہور میں اپنے فیملی ڈاکٹر نصیر محی الدین شیخ کے پاس لے کر گئی، وہ بہت قابل ڈاکٹر تھے۔ بولے بھابی انہیں خون کی الٹی تو نہیں آئی۔ میں نے کہا نہیں، پھر انہوں نے دوائیاں لکھیں، جن سے انہیں فائدہ ہوا۔

ہم 1994ء میں کراچی میں تھے۔ فضل صاحب کا لاہور سے فون آیا کہ ایک ہفتہ کے اندر بچوں کو لے کر لاہور پہنچو۔ دراصل ہم نے اپنے چھوٹے بیٹے نادر کی شادی بھی کر دی تھی۔ وہ بولے کہ ”دلہن کو بھی ساتھ لانا۔ اس کا جیمز فرنیچر وغیرہ لے آؤ۔“ میرے کل شدید درد اٹھا تھا۔ ”یہ سن کر تو ہم سب تڑپ اٹھے۔ ہم نے فوراً زحمت سفر باندھا اور ایک ہفتے میں اپنے گھر لاہور جا پہنچے۔

سب ہنسی خوشی رہ رہے تھے۔ ہم حسب سابق! بدھ کے دن عصر مغرب کے درمیان زردہ کی نیاز بنا کر رکھتے۔ بھی ان کا سوڈا ہوتا تو بعد نماز عشاء تو الیاں سنتے۔ موسم گرما شروع ہو گیا تھا۔ کراچی سے حسب سابق مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ صابر مع فیملی اور منیر آئے ہوئے تھے، اسی دوران میری بہن عشرت بھی اپنے بیٹے کی منگنی کرنے لاہور آئیں۔ فضل صاحب بہت مہمان نواز تھے۔ ایک دن سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو اچانک صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔

”تم آج کل نیاز نہیں بنا رہی ہیں اور اگر جتنی بھی نہیں جلاتی ہو؟“

میں نے کہا کہ آپ اکثر نہیں ہوتے اس لیے نیاز نہیں بناتی اور اگر جتنی سے ان دونوں بہوؤں کے سر میں درد ہوتا ہے۔ یہ سنتے ہی غصے میں آ گئے۔ کہنے لگے۔ ”بابا جی نے کہا ہے میں ہوں یا نہ ہوں، نیاز رکھنی ہے اور اگر بتیاں بھی جلاتی ہیں۔“

دوسرے دن اتوار تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم سب گپ شپ کر رہے تھے۔ اچانک فضل صاحب نے آنکھیں بند کیں اور دیوار سے ٹیک لگالی۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر ہلایا کہ کیا ہوا۔ وہ بول بھی نہیں پائے، ٹھنڈے برف جیسے ہاتھ تھے۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں اور بڑی نقاہت سے بولے۔

”سخت ترین درد تھلہ شدید تکلیف ہوئی ہے۔“ میں نے اور میرے دونوں بھائیوں نے کہا کہ ڈاکٹر کے پاس چلیں، لیکن وہ کل پر ناں گئے۔ میری بہن عشرت نے کہا: ”گلتا ہے گیس پل پر چڑھ گئی ہے۔ انہیں صبحین بنا کر بلا دو۔ میں نے صبحین بنا کر دی تو ان کی طبیعت سنبھل گئی، پھر ڈاکٹر کے پاس جانے کی بات بھی نہ گئی! جیسا کہ میں نے بتایا کہ فضل صاحب بہت مہمان نواز اور محبت کرنے والے تھے۔ رات کو انہوں نے میرے بھانجے کی منگنی کی خوشی میں گانوں کا پروگرام رکھا جس کو سب نے انجوائے کیا۔ لیکن کی امی میری ماموں زاد بیسہ سے بھی فضل صاحب کی بہت بڑی تھی۔ میری ماموں زاد کے علاوہ بیسہ سے میری دوستی بھی ہے، اسی وجہ سے ہم نے منگنی کو بھرپور طریقے سے شادی کا سارنگ دے دیا۔ ایک ہفتہ بعد 30 جولائی کو عشرت وغیرہ کی کراچی کے لیے واپسی تھی اور فضل صاحب کو اسی شام سوات جانا تھا۔ دراصل وہ بزنس کے سلسلے میں ہر ماہ کے آخر میں کشمیر اور سوات جاتے تھے۔ ان دنوں بارشوں کا سلسلہ شروع تھا۔ میں نے فضل صاحب کو سوات جانے سے روکا تو بولے: ”مت ماری ہے جو نہ جاؤں نقصان ہو جائے گا۔“ پھر عشرت سے بولے، تم لوگ رک جاؤ، میں تین دن میں واپس آ جاؤں گا۔ اس پر میرے بہنوئی کہتے ہیں۔ ابھی جانے دو، کہو تو پانچ دن بعد جہاز سے آ جاؤں؟ پھر وہ لوگ کراچی اور فضل صاحب سوات چلے گئے۔

13 اگست کی رات کو فضل صاحب کی واپسی ہوئی، تھوڑی دیر بعد ہی مزید مہمان آ گئے۔ میری بیٹی کے شوہر اور بچے ایبٹ آباد سے واپسی پر ہمیں ملنے آئے تھے۔ دو دن ہمارے پاس رہتا تھا۔ رات کا کھانا کھا کر صابر نے اور میری امی نے اجازت مانگی اور کہا ہم بیسہ کے گھر جا رہے ہیں تو وہ ناراض ہونے لگے۔ صابر نے سمجھایا کہ ابھی آپ ان مہمانوں کو دیکھیں، ہم پرسوں آ جائیں گے۔ تب وہ راضی ہوئے اور پرسوں آنے کی تاکید کی۔ دوسرے دن صبح ناشتے سے فارغ ہوئے تو میری بیٹی کی بیٹیوں سے بولے: ”چلو تیار ہو جاؤ، تمہیں قلعہ اور شاہی مسجد کی سیر کرا لائیں.....“ میں کھانا تیار کر رہی تھی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کچن سے لے آئے کہ تم بھی

چلو اور بیٹی ہمارے کون بھی بلایا۔

موسم بے حد خوب صورت تھا، ہلکی ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی۔ موسم سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم پہلے یادگار پھر شاہی مسجد اور اس کے بعد قلعہ جانیچے۔ دربار عام میں غلام نبی نے تصویریں بنائیں۔ میری اور فضل صاحب کی تصویر بنائی جو کہ ہماری زندگی کی آخری تصویر ٹھہری۔

پانچ بجے تک سب گھر آ گئے۔ 6 بجے کے بعد منیر، صائمہ اور میری نند اور بچے آ گئے۔ چائے پانی سے فارغ ہو کر وہ جانے لگے تو ہم گیٹ تک انہیں رخصت کرنے آئے۔

منیر نے کہا ہم فورٹ ریس جا رہے ہیں، آپ بھی ساتھ چلیں۔“ بولے: ”یار تھک گیا ہوں، اتنا لمبا سفر کر کے آیا ہوں، پھر صبح سے گھومنے گئے ہوئے تھے، ادھر انہوں نے عائشہ سے رات کو میکوڈ روڈ لے جا کر گول مٹے کھلانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ پیار تو سب سے ہی کرتے تھے، مگر عائشہ کو بہت چاہتے تھے۔ جب وہ چھوٹی تھی تو تو قی زبانی میں باتیں کرتی بہت پیاری لگتی تھی میں نے پلاؤم پر لگا یا تو بولے: ”مجھے پہلے تھوڑا سادے دو۔“ میں نے کہا: ”ہمارا ابھی شامی کباب بنا رہی ہے، میں کھانا لگاتی ہوں۔“

بولے: ”میرے درد ہو رہا ہے۔“ دراصل انہیں معدے کا السر بھی تھا۔ میں نے جلدی سے انہیں تھوڑا سا پلاؤم دے دیا۔ کھا کر وہ ٹی وی پر خبریں دیکھنے لگے۔ میرا بلند پریشر ہائی تھا، میں لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد انہیں طاہر نے اینیوگلاس میں ڈال کر دیا، کچھ دیر بعد نادر نے آ کر بتایا کہ ابو کے بازو میں شدید درد ہو رہا ہے۔ میں گھبرا کر بھاگی۔ کیا ہوا تو وہ پچھلے ہفتے کی طرح بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ طاہر نے فوراً گاڑی نکالی اور ہمارے قریب ہی شیخ زید اسپتال تھا، لے گئے۔ وہاں جا کر انہیں ہوش آیا تو پانی مانگا۔ میں نے ڈاکٹر سے معلوم کیا تو وہ ناراض ہوا اور مجھے باہر جانے کو کہا۔ دونوں بیٹے اور غلام نبی اندر تھے۔ میں باہر بیٹھی دعا کر رہی تھی، آنسو بہہ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں ہی صابر وغیرہ سب آ گئے۔ میری دوبارہ امیر جنسی میں جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اتنی دیر میں ایک

لیڈی ڈاکٹر میرے پاس آئی۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی: ”کیوں رو رہی ہیں، ابھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہم انہیں وارڈ میں بھیج دیں گے۔“ اچانک میرا دل گھبرایا اور میں کھڑی ہو گئی۔ ایسا لگا جیسے کسی نے میرے چروں سے دل تک آگ بھڑکا دی ہے۔ میں گرنے لگی تھی کہ سامنے سے طاہر بھاگتا ہوا آیا اور مجھے اپنی بانہوں میں بھر کر بولا۔

”کیا ہوا امی؟“ مجھے اس نے لے جا کر کرسی پر بٹھایا تو سامنے سے منیر اور میری نند وغیرہ آتے دکھائی دیے۔ طاہر ایک کران کی طرف گیا اور انہیں لے کر امیر جنسی میں چلا گیا، منیر نے کہا: ”ہم بھائی کو بھی لے آئیں گے۔“ غرض میں وہاں سے خالی دماغ لیے گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔

گھر آئی تو گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ منیر کمرہ خالی کروا رہا تھا۔ اتنے میں میری امی داخل ہوئیں، تب انہیں دیکھ کر میری چیخیں نکل گئیں اور سمجھ میں آ گیا کہ میں لٹ گئی ہوں۔

دوران زندگی مری پل بھر میں کر گیا اپنا مکان بنا لیا جائے خلد میں 4 اگست کو رات گیارہ بجے وہ ہمیں چھوڑ گئے۔ 5 اگست کی صبح کراچی سے تقریباً 30 افراد میرے بھائی، بھتیجے، بھابھیاں سب By Air لاہور آ گئے تھے اور یہ میرے شوہر کی محبت اور اخلاق ہی تھا جو اتنے لوگوں کو ایک ساتھ جہاز میں سیٹیں مل گئی تھیں۔ جبکہ کراچی میں حالات بہت خراب تھے اور کیسے لوگ ایئر پورٹ پہنچے۔ ادھر کراچی کے حالات، ادھر لاہور کا موسم۔ جب نسیم بھائی کالاہور ایئر پورٹ سے فون آیا تو انہیں کہا گیا کہ آپ سیدھے قبرستان چلے جائیں۔ وہ جب وہاں پہنچے تو تدفین ہو چکی تھی، کیوں کہ بارش کچھ دیر کے لیے ہی رکی تھی، پھر موسلا دھار برس پڑی تھی۔ سوئم میں صابر کے پاس باباجی آئے۔ ہمیں اس طرح بتا چلا کہ صابر نے سر پر کپڑا ڈالا اور اشاروں سے ہم سب سے تعزیت کی۔ بچوں کو گلے لگایا اور بتایا ہم اسپتال میں تھے، دعا کر رہے تھے، مگر اللہ کی یہی مرضی تھی۔ میں نے باباجی سے استدعا کی۔ آپ ہمیں بھی نہ چھوڑیں ہمارے سر پر اپنا ہاتھ رکھیں۔ یہ سن کر باباجی

بہت روئے اور وعدہ کیا۔ ہم اکثر تو ایلی لگا کر سنتے تھے۔ میں ہمیشہ نیاز بنا کر رکھتی تھی۔ میں نے صابر کے ذریعے باباجی سے بات کی کہ وہ جیسے فضل صاحب کے پاس آئے تھے طاہر کے پاس آیا کریں۔ جب میں نے ضد کی اور سید صاحب کے ذریعے خاص درخواست کی تو صابر نے کہا کہ باباجی کہہ رہے ہیں، طاہر کی بیٹھک دے دیں۔ میں نے تو الیاں کرائیں۔ کراچی سے خاص طور پر صابر اور بہنوئی اختر کو بلایا۔ انہوں نے ہی طاہر کو سنبھالا تھا۔ طاہر تو چھوٹا تھا، اسے کچھ پتا بھی نہیں تھا۔ ساری رات طاہر نے حال کھیلے، مگر اپنے ابو کی طرح بالکل تھکا نہیں، بالکل وہی انداز وہی طریقہ.....

جب ہمیں کوئی بات سمجھ نہیں آتی تو کاپی پنسل لے کر لکھ دیتے تھے۔ جب سے طاہر بیمار ہوا ہے اور الگ گھر میں گئے ہیں تو انہوں نے نیاز رکھنی چھوڑ دی ہے، مگر کہیں تو الیاں ہوں تو طاہر کو حال آ جاتے ہیں، گویا باباجی اپنے وعدے پر قائم ہیں اور میں تو مجبور ہوں۔ میرا کوئی گھر، کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ ہم ان کے انتقال کے چھ سال بعد کراچی شفٹ ہو گئے۔ بھائی نے اپنے مکان کے اوپر مکان بنوایا تھا کہ یہاں رہو، پھر جیسے چڑیا کے نیچے اڑ جاتے ہیں، میرے بچے چلے گئے تو بیٹی کی شادی کے بعد میں نیچے بھائی کے پاس آ گئی۔ بھائی کے بچے اوپر آ گئے۔ اب میں دس پندرہ دن بھائی کے گھر اور ہفتہ بھر طاہر کے گھر رہتی ہوں۔

یہ آج جو ہم پھر رہے ہیں ہوائے در بدر اپنے بھی بیروں کے نیچے دہلیز تھی۔ ابھی طاہر مجھے بہت کہتا ہے۔ ”امی آپ میرے پاس رہیں، کسی کے گھر نہ رہا کریں۔“ مگر یہ دل ہے نا، اکلونی بیٹی ہمارا اور چھوٹے پوتے ارمان کے لیے بڑپتا ہے، جو آٹھ دس دن بعد چار گھنٹے کے لیے ملنے آ جاتی ہے۔ بھائی کا گھر قریب ہے، طاہر کا دور ہے..... قارئین سے التماس ہے میرے اور میرے بچوں کے حق میں دعا کیجیے۔

آتش چمن



سليم فاروقی

ایک شہادت نوجوان کی سرگزشت۔ وہ اپنے ملک سے غداروں کا نام و نشان مٹا دینا چاہتا تھا۔ ان سر کے میں اس سے اپنا سب کچھ ہار دیا لیکن حوصلہ نہیں ہارا

چمن سا حوصلہ رکھنے والے نوجوان کی زوداد، 27 ویں کڑی

بگڑتا افسانہ یا اخلاص

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے نہایت جرأت مند اور اپنی عزت و انانیت کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے۔ ارسلان کچھ لالباہی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے جس کی سمند میں لالچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان راشد کی لالچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر کے دوران میں ان کا راشد کی لالچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم غنی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ غنی راشد کی لالچی میں اس کی لالچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آ میزفون آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آکر کارہے راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق ایک ایرانی علی اکبر شہیدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا ڈان ہے۔ راشد کا مرڈر ہو جاتا ہے اور پھر شہیدی کے آدمی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس عمران کو تھانے لے جا کر شدید تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔ تھانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آ جاتا ہے۔ عمران جب گھر پہنچتا ہے تو اس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی دوران میں پولیس عمران کے گھر پر ریڈ کرتی ہے اور اس کے گھر سے ہیروئن برآمد کرتی ہے۔ عمران کی والدہ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اس کے والد بھی اس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہو جاتے ہیں۔ عمران اور ارسلان غم سے نڈھال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتے سا طاری ہو گیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد ان کی دہشت گردوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ عدالت میں ان کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کر لی ہے۔ عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کار شہیدی سے اپنی بہن شائستہ کی ڈیل باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ عمران اور تیمور شائستہ کو تلاش کرتے کرتے حاکم خان کے اڈے پر پہنچ جاتے ہیں مگر شائستہ حاکم خان کے غنڈوں کو زخمی کر کے پہلے ہی فرار ہو جاتی ہے۔ تیمور حاکم خان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ وہ دونوں حاکم خان کے سیف سے ضروری کاغذات لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ شہیدی فون کر کے ان کاغذات میں سے ایک ریڈ فائل کا تقاضہ کرتا ہے مگر عمران اسے فائل دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ ٹیلی فون پر شہیدی اور عمران کی تلخ کلامی ہوتی ہے۔ شہیدی اسے دھمکیاں دیتا ہے اور ملٹری اٹیلی جنس کو اس کے پیچھے لگا دیتا ہے۔ اسی دوران میں عمران کا ایک دشمن غنی بلوچ عمران سے آلتا ہے۔

جان محمد جو کہ شہیدی کا آدمی ہے لیکن اصل میں وہ عمران کے لیے کام کر رہا ہے۔ معلومات فراہم کرتا ہے کہ ان کے خاتے کے لیے شہیدی نے جن کرائے کے قاتلوں کو امریکا سے بلایا ہے ان کی تعداد پانچ ہے جن میں سے دو کا تعلق امریکا سے ہے ایک ہندو ہے اور دو یہودی۔ بلوچ شہو کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ کسی زمانے میں چھوٹا موٹا بد معاش تھا جسے بعد میں شہیدی نے اپنے گینگ میں شامل کر لیا تھا۔ اس کا اصل نام شہاب ہے اور اس کی ڈیوٹی پورٹ پر ہوتی ہے۔ شہیدی کے خاص آدمیوں میں سے ہے۔ تیمور نعیم کی مدد سے آرنلڈ کے مردہ جسم کو لے کر باہر نکل جاتا ہے۔ ابھی تیمور کو نکلے مشکل سے دس منٹ ہوئے تھے کہ عمران کے گھر کے نزدیک پولیس موبائل کے سائرن کی کرخت آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ بلوچ شہو سے پوچھ گچھ شروع کر دیتا ہے۔ شہو بتاتا ہے کہ ارسلان شہیدی کی قید سے فرار ہو گیا تھا جاتے جاتے شہیدی کی خفیہ فائل لے گیا ہے۔ انڈیا میں وہ "را" والوں کے ہتھے چڑھ گیا اور اب تہاڑ جیل دہلی میں ہے۔ اچانک سامنے سے کوسٹ گارڈ والوں کی تیز رفتار بوٹ آتی ہے جسے دیکھ کر بلوچ اپنی بوٹ کی اسپینڈ بھی بڑھا دیتا ہے۔ کوسٹ گارڈ کی بوٹ کی طرف سے فائرنگ شروع ہو جاتی ہے، حملے میں شہاب مارا جاتا ہے۔ اخبار میں خبر چھپتی ہے کہ معروف سماجی کارکن اور تاجر عبدالحمید راجپوت کو ہوٹل میں پراسرار طور پر قتل کر دیا گیا ہے۔ عمران اس حقیقت سے واقف ہے کہ قتل ہونے والا دراصل "را" کا ایک سفاک اور خونی ایجنٹ ونو تھا، جو گزشتہ بائیس برس سے پاکستان میں مقیم تھا۔ وہ یہ معلومات اخبار کو مہیا کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کے ذہن میں معروف انگلش روزنامے کے چیف ایڈیٹر اور کام نگار وقار الحسن کا نام آتا ہے۔ عمران انہیں فون کر کے ملاقات کے لیے کہتا ہے اور اپنے ہمراہ ہاشم کو بھی لے جاتا ہے۔



دقار لکھن کے دفتر سے واپسی پر انہیں جیک کی سرسبز نظر آتی ہے۔ وہ لوگ جیک کی گاڑی کا بچھا کرتے ہیں۔ ہوٹل کے کمرے میں ان لوگوں کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے اور ان میں سے ایک شخص ہلاک ہو جاتا ہے، جب کہ جیک فرار ہو جاتا ہے۔ عمران اور ہاشم بڑے محفوظ طریقے سے ہوٹل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اگلے روز دقار لکھن سے ملنے ان کے آفس پہنچتے ہیں اور جیک کے بارے میں بتاتے ہیں تو وہ فکر مند ہو جاتے ہیں۔ عمران دقار لکھن کو اپنی فیملی ٹریڈی کے بارے میں بتاتا ہے کہ کیسے ان لوگوں کی دشمنی مشہدی سے ہوئی اور وہ لوگ ارسلان کو مردہ سمجھتے رہے، جب کہ وہ دہلی کی تہاڑ جیل میں ہے۔ جب دقار لکھن انہیں اپنے انڈیا جانے اور ”را“ کی قید میں رہنے کے واقعات کی تفصیل بتاتے ہیں۔

جہاں ان کی ملاقات کی ایسے قیدیوں سے ہوتی ہے جو شخص مسلمان اور پاکستانی ہونے کے جرم میں پوری پوری عمر میں وہاں کاٹ چکے ہوتے ہیں۔ وہ نامی قیدی ان سے کہتا ہے کہ اس جیل سے تم قانونی طور پر رہا نہیں ہو سکتے اس لیے تمہیں یہاں سے غیر قانونی طریقے سے باہر نکالنا ہوگا، دقار لکھن اس کی اس بات پر راضی ہو جاتے ہیں۔

فرار ہونے کی کوشش میں دقار لکھن زخمی ہو جاتے ہیں، انہیں اسپتال لے جایا جاتا ہے جہاں ڈاکٹر شاہد سے دوران علاج ملاقات ہوتی ہے ڈاکٹر شاہد کہتے ہیں کہ دقار صاحب میں جاتا ہوں کہ آپ بے گناہ ہیں اور گزشتہ کئی برس سے بے گناہی کی سزا بھگت رہے ہیں۔ میں نے اسکول کے زمانے میں آپ کے کالم پڑھے ہیں اور آپ کی گرفتاری کی خبر پر مجھے صدمہ ہوا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کے لیے مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکے گا میں کروں گا۔ ڈاکٹر شاہد بتاتے ہیں کہ ان کا تعلق کشمیر لبریشن فرنٹ سے ہے اور وارڈ بوائے ارجن کا تعلق بھی اسی جہادی تنظیم سے ہے۔ ارجن ایک پرچہ دقار لکھن کو دے کر جاتا ہے جس پر تحریر ہوتا ہے کہ آپ کا ذمہ اگلے ہفتے تک اتنا بھر جائے گا کہ آپ چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں گے، لیکن اسپتال کے عملے کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہیے کہ آپ ٹھیک ہو گئے ہیں۔ ہوئی کے تہوار والے دن ارجن مریضوں میں مٹھائی تقسیم کرتا ہے اور دقار لکھن کے پاس آ کر کہتا ہے کہ دو گھنٹے بعد آپ تیار رہیں گے، انہیں ایک گفٹ پیک بھی ملتا ہے جس میں ٹی شرٹ اور جینز تھی، کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ارجن دقار لکھن کے چہرے پر مختلف رنگ مل دیتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ میں نے تمام پولیس والوں اور سیکورٹی گارڈز کو بھگ کے لڈو کھلا دیے ہیں۔ دقار لکھن ارجن کے پیچھے چلتے ہوئے اسپتال سے باہر آ جاتے ہیں۔ جہاں ایک سوز دی ہائی روف آ کر رکتی ہے، رخصت ہوتے وقت ارجن دقار لکھن کے پوچھنے پر اپنا نام ارسلان بتاتا ہے۔ عمران ارسلان کا حلیہ پوچھتا ہے جو کہ اس کے گم شدہ بھائی ارسلان کا ہوتا ہے۔ عمران بتاتا ہے کہ وہ میرا بھائی ارسلان تھا، اب مجھے یقین آ گیا کہ وہ زندہ سلامت ہے۔ تیمور اور نادیا بھی یہ خبر سن کر خوش ہوتے ہیں کھانے کے دوران بلوچ کی کال آتی ہے۔ وہ عمران کو بتاتا ہے کہ اس کی بہن شائستہ کا پتا چل گیا ہے اور وہ تفصیل بتانے گھر آ رہا ہے۔ بلوچ شائستہ کے متعلق بتاتا ہے کہ وہ آج کل میر پور خاص میں کسی جبر کی حفاظت میں ہے اور یہ بات بلوچ کے آدی رمضان نے بتائی ہے، رمضان عمران کو بتاتا ہے کہ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ لڑکی اپنی مرضی سے نہیں رہ رہی ہے، کیوں کہ وہ جس کمرے میں تھی وہ باہر سے بند تھا۔ پوچھنے پر وہ بتاتا ہے کہ پیر صاحب کا نام پیر احسان الحق شاہ ہے۔ عمران اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شائستہ کی تلاش میں میر پور خاص کے لیے روانہ ہو جاتا ہے، میر پور خاص کے داخلی راستے پر پنی پولیس چوکی پر انہیں روک لیا جاتا ہے۔

(اب آگے ملاحظہ کیجیے)

میں نے تیمور سے پوچھا۔ ”ہمارے آدمیوں کے پاس جو ہتھیار ہیں وہ لائنس شدہ ہیں؟“
”ہاں۔“ تیمور نے جواب دیا۔ ”جو ہتھیار ان کے ہاتھوں میں نظر آ رہے ہیں وہ سب کے سب لائنس والے ہیں۔“
میں نے ہاشم کو بھی یوٹرن لیتے دیکھا تھا لیکن اس نے ہمارے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ وہ گاڑی کا رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

ہم چند منٹ میں وہاں تک پہنچ گئے۔ تیمور نے زوردار بریک لگا کر گاڑی روکی اور گاڑی سے اتر گیا۔ مجھے اب اس کے شانے پر ایک کلاشن کوف بھی لگی نظر آ رہی تھی۔ اس نے مجھے گاڑی ہی میں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ تیمور کے ساتھ ہاشم بھی اتر گیا تھا۔ اس کے شانے سے بھی کلاشن کوف بھول رہی تھی۔
”کیا بات ہے آفسر؟“ تیمور نے درشت لہجے میں پوچھا۔
ان دونوں میں سے ایک سب انسپکٹر تھا اور دوسرا انسپکٹر تھا، بقیہ دو سپاہی تھے۔

انسپکٹر نے چونک کر تیمور کو دیکھا اور بولا۔ ”آپ اپنے کام سے کام رکھیں جناب عالی!“
”ہم اپنے کام سے کام ہی رکھ رہے ہیں، تم نے جن لوگوں کو روکا ہے وہ نواب اکبر علی جنجوعہ کے گارڈز ہیں، کیا ان لوگوں نے بتایا نہیں تھا کہ وہ کس کے گارڈز ہیں؟“
”نواب اکبر جنجوعہ؟“ انسپکٹر نے حیرت سے کہا۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ قدرے نرم تھا۔ ”میں ان کا نام پہلی دفعہ سن رہا ہوں۔“
”نواب صاحب، ڈیرے ممتاز سومرو صاحب کے مہمان ہیں اور پھر احسان الحق صاحب کی زیارت کو تشریف لائے ہیں۔“

”سر..... لیکن ان کے پاس..... اسلحے کے لائنس موجود نہیں ہیں اور.....؟“
”آفسر!“ میں نے گاڑی ہی سے رعب دار آواز لہجے میں کہا۔ ”تم نے میرا نام شاید نہ سنا ہو لیکن سندھ کے ہوم سیکریٹری اور ہوم منسٹر نے بہت اچھی طرح سن رکھا ہے۔“ پھر میں تیمور سے مخاطب ہوا۔ ”سیکریٹری! تم ہوم سیکریٹری یا آئی جی کو ٹیلی فون کرو۔“

”او کے سر!“ تیمور نے مستعدی سے کہا اور جیب سے سیل فون نکال لیا۔
”سر، معافی چاہتا ہوں۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے، آپ ڈیرے ممتاز کے مہمان ہیں، ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے اور پیر صاحب کے عقیدت مندوں کو بھلا کون روک سکتا ہے۔“ پھر وہ لجاجت سے بولا۔
”سوری سر! آپ لوگ جاسکتے ہیں۔“
”تمہارے نام کیا ہے آفسر؟“ تیمور نے اس سے پوچھا، پھر اس کی جیب پر لگی ہوئی نام کی پٹی پڑھنے لگا۔ ”اکرم



سیال! اس نے ایک مرتبہ پھر سیل فون سنبھالا۔

”سر! اب اس بات کو جانے دیں، اصل میں آپ کے گارڈز کے پاس لائنس.....“

”ان کے پاس لائنس نہیں تھا تم نے فرض کر لیا کہ ان کا اسلحہ غیر قانونی ہے، ان سب کے لائنس نواب صاحب کے پاس ہیں اور تم نے نواب صاحب کے گارڈز کو دھمکیاں دیں، ان کے ایک گارڈ کو جھکڑی پہنائی، پھر تم سوری کہہ رہے ہو، اب تو آئی جی ہی یہاں آ کر ان لوگوں کے لائنس چیک کرے گا۔“

”سر، میں نے عرض کیا تاکہ میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ مجھے تو ان سنتریوں نے پوری بات ہی نہیں بتائی، پھر وہ گرج کر سنتریوں سے بولا۔ ”تم لوگ کیا بھنگ پی کر بیٹھے ہو؟ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا کہ یہ لوگ نواب صاحب کے گارڈز ہیں؟“

”مجھے موقع ہی نہیں ملا سر!“ سنتری جو عہدے کے لحاظ سے حوالدار تھا، منتنا کر بولا۔

”چلو ان کی جھکڑی کھولو اور ان سے معافی مانگو۔“

”معافی یہ نہیں بلکہ تم مانگو گے۔“ تیمور نے بھر کر کہا۔ میں ان کی بے ساختہ اداکاری پر عرش عرش کر رہا تھا۔

”میں معافی چاہتا ہوں سر!“ اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”معافی مجھ سے نہیں بلکہ میرے اس گارڈ سے مانگیں جسے آپ نے جرائم پیشہ سمجھ کر اس کے ہاتھوں میں جھکڑی ڈالی ہے۔ وہ باعزت آدمی ہے، اگر وہ میرا گارڈ ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ.....“

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے انسپکٹر جلدی سے بلوچ کی طرف گھوما۔ ”سر! میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے بلوچ کی جھکڑی کھولی اور اس کا ریوالتور سے واپس کر دیا۔

”تھینکس آفیر!“ میں نے باوقار لہجے میں کہا۔ اسی وقت انسپکٹر تیزی سے میرے پاس آیا اور کھڑکی کے پاس جھک کر سرگوشی میں بولا۔ ”سر! آپ سے ایک عرض کرنا چاہی۔“

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ عام پبلک کے سامنے فرعون نظر آنے والا وہ انسپکٹر اس وقت بھیگی نئی بنا کھڑا تھا۔

”جی کہیے؟“ میں نے حسب دستور اپنے لہجے کو باوقار رکھا۔

”سر! سومرو صاحب مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو گئے ہیں اور انہوں نے یہاں سے میرا ٹرانسفر کسمور کر دیا ہے۔“

”اگر آپ سفارش کر دیں تو.....“

”میں کوشش کروں گا کہ سومرو صاحب کی ناراضی دور ہو جائے۔“ میں نے کہا، پھر تیمور نے کہا۔ ”چلو، بیکریٹری! ہمیں پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔“

تیمور نے گاڑی کو یوٹرن دیا تو انسپکٹر اکرم سیال نے ہمیں سیلوٹ کیا اور ہماری گاڑی روانہ ہو گئی، ہمارے پیچھے بلوچ کی گاڑی بھی تھی۔

ہاشم نے ہمیں بخیر و عافیت آتے دیکھا تو اس نے بھی اپنی گاڑی کو یوٹرن دے دیا اور ہمارا قافلہ روانہ ہو گیا۔

☆.....☆

ممتاز سومرو انتہائی خوش اخلاق، پڑھا لکھا اور خوش لباس شخص تھا۔ وہ اپنے لباس اور بات چیت سے سندھ کا ڈیرہ نہیں لگتا تھا۔ اس نے بہت پر تپاک انداز میں ہمارا استقبال کیا اور بولا۔ ”سائیں، آپ ارسلان کے بڑے بھائی ہو تو ہمارے بھی بڑے ہوئے، ویسے آپ کو دیکھ کر ارسلان یاد آ گیا، وہی قد، وہی جسامت، وہی بال اور اس کی طرح آنکھیں، وہ میرا بہت اچھا دوست تھا۔ ہم نے بہت اچھا وقت گزارا ہے، اب تو صرف اس کی یادیں ہی رہ گئی ہیں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ پھر وہ سر جھٹک کر بولا۔ ”میں بھی آپ کے سامنے کیا بات لے بیٹھا، اگر آپ کو میری باتوں سے صدمہ پہنچا ہو تو آئی ایم سوری بھیا؟“

”بھیا؟“ میں نے چونک کر کہا۔

”ہاں، ارسلان جب بھی آپ کا تذکرہ کرتا تھا، بھیا ہی کہتا تھا۔“ پھر اس نے کسی کو آواز دی۔ ”اوائے چھوٹو مہمانوں کے لیے کچھ چائے پانی کا بندوبست کرو اور زیناں سے کہو کہ وہ کھانا ذرا اچھا کرائے۔“

”یار ممتاز!“ تیمور نے کہا۔ ”پہلے ہم فریش ہونا چاہتے ہیں تاکہ راستے کی کچھ تھکن اترے۔“

”سائیں، یہ پوری حویلی آپ کی ہے، میں نے کل رات ہی اس کی صفائی ستھرائی شروع کروادی تھی۔“ پھر وہ نادیدہ سے بولا۔ ”بھابی جی! پہلے آپ اپنے اور بھیا کے لیے کوئی کمر اپنڈ کر لیں۔“ نادیدہ کا چہرہ سرخ ہو گیا، اس کا مطلب یہ تھا کہ تیمور ہمیں بہ راہ راست ممتاز کی مہمان داری میں حویلی لایا تھا، شاید ان کے درمیان یہ پہلے ہی طے ہو چکا ہو۔

”بھیا! آپ فریش ہو جائیں، چائے وغیرہ پیئیں، میں جب تک اپنی حویلی سے ہو کر آتا ہوں۔“

”آپ کی حویلی یہاں سے کتنی دور ہے ممتاز صاحب؟“ میں نے پوچھا۔

”بھیا! پہلے تو یہ آپ جناب اور صاحب چھوڑیں، کیا آپ ارسلان سے بھی اسی طرح بات کرتے تھے؟“

”اچھا بھئی، تمہاری حویلی یہاں سے کتنی دور ہے؟“

”نزدیک ہی ہے بھیا سائیں!“ اس نے کہا۔ ”مشکل سے ڈیڑھ کلومیٹر دور ہوگی۔“

”تو کیا ہم اکیلے جائے پیئیں گے؟“ میں نے کہا۔

”میں ابھی آدھے گھنٹے میں آ جاؤں گا۔ میں اپنے بچوں اور آپ کی بہو کو لینے جا رہا ہوں، اب بھابی جی آئی ہیں تو اچھا نہیں لگتا کہ وہ میری وائف سے نہ ملیں۔“ یہ کہہ کر اس نے نوکروں کو ایک بار پھر ہمارے آرام کی ہدایت کی اور محبت میں باہر نکل گیا۔

میں نے اس حویلی کا جائزہ لیا، وہ نام کی نہیں بلکہ واقعی حویلی تھی اور اس کی تعمیر زیادہ پرانی بھی نہیں تھی، پوری حویلی جدید انداز میں تعمیر کی گئی تھی۔ اس میں اوپر نیچے جانے کتنے بیڈروم تھے۔

نادیدہ نے اوپر کا ایک کشادہ بیڈروم پسند کیا، اس کی کھڑکی سے نہ صرف حویلی کے لان بلکہ دور تک کا منظر نظر آتا تھا، میں نے اس کے ساتھ والا کمر اپنے لیے محفوظ کر لیا، اس کے بعد تیمور اور ہاشم کے کمرے تھے، تیمور کے آدی اور بلوچ کے آدی غلی منزل میں تھے۔

ہم لوگ نہاد کو کمر فریش ہوئے تو ڈائننگ روم میں چائے اور دیگر لوازمات کی میزبانی ہوئی تھی، اس میں کھانے کا اتنا سامان تھا کہ ہمیں رات کے کھانے کی ضرورت نہیں تھی۔

ابھی ہم ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ہی تھے کہ حویلی کا آہنی پھانگ کھلنے کی آواز آئی اور پھر پورچ میں کوئی گاڑی آ کر ٹھہری، چند منٹ بعد حویلی کے داخلی دروازے سے ممتاز اندر داخل ہوا، اس کے ساتھ دو بہت ہی خوب صورت بچے تھے، ان کی عمریں مشکل سے بارہ سال اور تیرہ سال رہی ہوں گی، ان کے پیچھے نازک سی، جینکھے نقوش والی ایک گوری چٹی لڑکی بھی تھی، اس کے جسم پر بھی جدید لباس تھا۔

ممتاز سیدھا ڈائننگ روم میں آیا اور بولا۔ ”بھیا! یہ آپ کی بہو مریم ہے اور یہ دونوں آپ کے بھتیجے علی اور حمزہ ہیں۔“ مجھے شدید حیرت ہوئی، سندھ کے وڈیرے تو اپنی عورتوں کو شدید پردے میں رکھتے ہیں، یہ میں نے پہلا وڈیرہ دیکھا تو جو اپنی بیوی کا تعارف غیروں سے کر رہا تھا۔

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے دعادی اور جیب سے ہزار ہزار کے چند نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے بولا۔ ”مریم بیٹا! مجھے تمہارے لیے کوئی تحفہ لانے کا خیال ہی نہیں رہا، میری طرف سے فی الحال یہ قبول کرو۔“

مریم کچپکائی تو ممتاز نے کہا۔ ”لے لو مریم! کامران بھیا میرے بڑے بھائی ہیں، ان سے کوئی تکلف مت کرو۔“

مریم نے نوٹ میرے ہاتھ سے لے کر مجھے ایک مرتبہ پھر سلام کیا۔

میں نے دونوں بچوں کو بھی ایک ایک ہزار کے نوٹ دے دیے۔ ”انکل! آپ کراچی سے آئے ہیں؟“ ممتاز کے

بڑے بیٹے علی نے پوچھا۔
 ”ہاں بیٹا! ہم گراچی سے آئے ہیں، آپ یہ بتائیے، آپ کس اسکول میں پڑھتے ہیں۔“
 ”میں نے ان دونوں کو کیڈٹ کالج گھوڑاگلی بھجوا دیا ہے۔ آج کل تو یہ چھٹیوں پر آئے ہوئے ہیں، دو دن بعد چلے جائیں گے۔“

”بھیا! آپ تو کچھ لے ہی نہیں رہے ہیں۔“ مریم نے کہا۔ ”بادام کا حلوہ تو کھا کر دیکھیں۔“
 ”مریم! اگر میں نے سب کچھ کھا لیا تو پھر رات کا کھانا گول کرنا پڑے گا، میرا خیال ہے کہ تم لوگ رات کے کھانے کا تکلف مت کرو۔“

”بھیا! یہ کیسے ہو سکتا ہے، ابھی صرف ڈھائی ہی تو بجے ہیں۔ رات تک تو یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔“
 ”مجھے اچانک بلوچ اور تیمور کے آدمیوں کا خیال آیا، میں نے تیمور سے کہا۔ ”تیمور! تم نے گارڈز کو بھی کھانا بھجوا دیا ہے؟“
 ”جی بھیا!“ ممتاز نے کہا۔ ”میں نے نو کروں کو پہلے ہی ہدایت کر دی تھی، ان لوگوں نے آپ کے گارڈز کو بھی یہی سب کچھ بھجوا دیا ہے۔“

”ان میں سے سب گارڈز نہیں ہیں بلکہ میرے دوست بھی ہیں۔“
 ”ان کے آرام کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔“ ممتاز نے کہا۔ ”تمہیں اگر کوئی شک ہے تو تم خود ان سے معلوم کر لو۔“
 ”نہیں مجھے شک تو نہیں ہے۔“ تیمور مسکرا کر بولا۔

”ممتاز! تم انسپکٹر اکرم سیال کو جانتے ہو؟“ میں نے اچانک پوچھا۔
 ممتاز نے اب چونک کر میری طرف دیکھا، پھر بولا۔ ”آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟“
 ”اصل میں شہر کے داخلی راستے پر پولیس کی جو چوکی بنی ہے، وہ وہاں تعینات ہے۔“
 ”وہ تو علاقے کا ایس ایچ او ہے۔“ ممتاز نے کہا۔ ”وہاں تو دو تین غریب کاٹھیل اور حوالدار کھڑے ہوں گے لیکن

آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“
 ”جس وقت ہم شہر میں داخل ہوئے، اس وقت وہ بھی چوکی پر موجود تھا۔“
 ”کیا اس نے آپ کے ساتھ کسی قسم کی کوئی بدتمیزی یا بدسلوکی تو نہیں کی ہے۔ وہ انتہائی گھٹیا اور کم ظرف انسان ہے۔“
 ”نہیں اس نے ہمارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی ہے بلکہ وہ تو تمہارا نام سن کر ہم سے بہت زیادہ مرعوب ہو گیا تھا۔“

پھر میں نے آہستہ سے کہا۔ ”ممتاز! اس نے مجھ سے ایک درخواست کی ہے، اسے قبول کرنا یا رد کرنا تمہارے اختیار میں ہے، میں تم پر دباؤ تو نہیں ڈالوں گا، میں نے اس سے وعدہ کر لیا ہے کہ میں ممتاز صاحب سے بات کروں گا، اگر وہ مان گئے تو ٹھیک ہے ورنہ۔۔۔۔۔“

”بھیا! اس نے اپنا ٹرانسفر کوآنے کی بات کی ہوگی؟“ ممتاز نے کہا۔
 ”ہاں، بات تو یہی ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”اس کی غلطی بہت بڑی ہے لیکن میں آپ کی سفارش کو کیسے ٹال سکتا ہوں۔“
 ”میں نے اس کی سفارش نہیں کی ہے، بس تمہیں اطلاع دی ہے۔“

”آپ کی اطلاع ہی میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے بھیا!“ پھر وہ موضوع بدل کر بولا۔ ”بھیا میرا خیال ہے کہ چائے باہر میز میں بیٹھ کے پی جائے؟“
 ”ہاں، میرا بھی یہی خیال تھا۔“ میں نے کہا۔

ممتاز نے اپنے ایک ملازم کو بلا کر میز میں کرسیاں اور چھوٹی ٹیبل لگانے کی ہدایت کی اور دوسرے ملازم سے کہا کہ ابھی اور اسی وقت بڑے صوبے دار (ایس ایچ او) کو ٹیلی فون کرو اور یہاں ملاؤ۔
 ہم جانے ہی والے تھے کہ اکرم سیال وہاں آ گیا، ممتاز نے اسے حویلی کے اندر نہیں بلایا تھا بلکہ وہ باہر لان میں کھڑا

تھا، ممتاز نے مجھ سے کہا۔ ”بھیا! آپ کو زحمت نہ ہوگی لیکن ذرا میرے ساتھ نیچے چلیں۔“
 میں ممتاز کے ساتھ نیچے لان میں چلا گیا۔

اکرم سیال تیر کی طرح ہماری طرف آیا اور مجھے بہت لجاجت سے سلام کیا۔
 ”انسپکٹر!“ ممتاز فوراً ڈر رہ گیا۔ ”یہ میرے مہمان نہیں بڑے بھائی ہیں، تم جانتے ہو کہ میں ایک دفعہ جو فیصلہ کر لیتا ہوں، اسے پھر کبھی تبدیل نہیں کرتا لیکن اپنے بڑے بھائی کے لیے تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں، ان ہی کی وجہ سے میں تمہیں معاف کر رہا ہوں لیکن آئندہ مجھے تمہاری طرف سے ایسی کوئی شکایت نہ ملے ورنہ بار بار بھیا تمہاری سفارش نہیں کریں گے۔“

”آپ کی بہت مہربانی سر جی!“ سیال نے کہا۔
 ”وہ مزید کچھ کہتا لیکن ممتاز نے اسے ٹوک دیا۔ ”ٹھیک ہے اب تم جاؤ لیکن میری بات یاد رکھنا۔“
 وہ وہاں سے چلا گیا، جیسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوگی تو ممتاز اپنا فیصلہ تبدیل کر دے گا۔

ممتاز! یہاں کوئی پیرا احسان الحق ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”اسے کون نہیں جانتا۔“ ممتاز نے کہا۔
 اس وقت تیمور بھی ہمیں ڈھونڈتا ہوا وہاں آ گیا۔
 ”آپ کو اس جعلی پیر سے کیا کام پڑ گیا؟“
 ممتاز نے تفحیک آمیز لہجہ میں پوچھا۔
 ”جعلی پیر؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”اس کا تو بہت نام ہے، اس کے عقیدت مند دور دور سے اپنی مرادیں پوری کرانے اس کے پاس آتے ہیں۔“

”تو کیا آپ بھی کوئی کام لے کر اس کے پاس آئے ہیں؟“ ممتاز مسکرایا۔
 ”اصل میں تمہیں کچھ اور کام ہے۔“ تیمور نے کہا، پھر اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
 میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ ممتاز کو سچائی بتا دے۔
 ”کیا کام؟“ ممتاز نے چونک کر پوچھا۔

”اس کی تفصیل تو تمہیں بھیا ہی بتائیں گے۔“ تیمور نے اپنا دامن صاف چھڑا لیا۔
 ”ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”نہیں بھیا! خاص بات تو ہے ورنہ آپ گراچی سے میر پور خاص نہ آتے۔“
 ”یار، کچھ عرصہ پہلے کچھ لوگوں نے بھیا کی بہن کو اغوا کر لیا تھا۔“

”وہاں؟“ ممتاز سوچ کر بولا۔ ”ارسلان کی ایک ہی بہن تھی، شائستہ! کیا انہیں کسی نے اغوا کر لیا ہے۔“
 ”اغوا کر لیا تھا۔“ تیمور نے کہا۔ ”وہ اس کی قید سے نکل بھاگیں، پھر کافی عرصے تک ان کا کچھ پتا نہیں چلا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ یہاں پیر صاحب کی حویلی میں موجود ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے رمضان بلوچ کا واقعہ بھی بتا دیا۔
 ”بہت الو کا پٹھا ہے وہ پیر!“ ممتاز نے کہا۔

”یہ ظاہر وہ بہت اللہ والا اور پہنچا ہوا بزرگ ہے لیکن اس کا باطن کالا سا ہے۔ اس کے بارے میں بہت سی افواہیں بھی گردش کر رہی ہیں لیکن اس کی پہنچ ایوان صدر اور پی ایم ہاؤس تک ہے لیکن اگر اس کی پہنچ صدر امریکا تک بھی ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب یہ میری ذمہ داری ہے، آپ بس آرام سے بیٹھ کر تماشا دیکھیں۔“

”لیکن ممتاز! جب اس کا اثر رسوخ اتنا ہے تو۔۔۔۔۔“
 ”آپ اس کی فکر مت کریں۔“ ممتاز نے کہا۔ ”اگر وہ اپنے جعلی کارناموں سے اوپر تک رسائی حاصل کر سکتا ہے تو میں اپنی شرافت سے وہاں تک کیوں نہیں پہنچ سکتا۔“
 ”سوال میری بہن کا ہے ممتاز!“ میں نے کہا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنگ نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیگر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”آپ پریشان کیوں ہو رہے ہیں، ہماری بہن پر تو آنچ بھی نہیں آئے گی، اس کے لاکھوں مرید سہی لیکن وہ مجھ سے بہت گھبراتا ہے، میں اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں، میں پہلے تو بات چیت کے ذریعے سلسلہ حل کرنے کی کوشش کروں گا، اگر اس سے بات نہ بنی تو میں اس کی زبان میں بات کروں گا۔ اپنی بہن کی عزت کے لیے میں کسی بھی حد تک جاسکتا ہوں۔“ پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ”آپ ناحق اتنے گارڈز لے کر آئے۔ میرے پاس افرادی قوت کی کمی نہیں ہے، میں آج ہی اس سے بات کروں گا۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں، آپ کا اس بات چیت میں شریک ہونا بہت ضروری ہے، چاہیں تو تیمور کو بھی ساتھ لے لیں۔“

”اس سے کب ملاقات ہو سکتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ عموماً مغرب کے بعد بیٹھتا ہے، پھر عشاء تک عام مریدین کو فارغ کرنے کے بعد عشاء کے بعد خاص مریدوں سے ملتا ہے، ہم عشاء کے بعد ہی چلیں گے، اس وقت وہاں زیادہ رش بھی نہیں ہوگا۔“

”کیا وہ صرف دو گھنٹے کے لیے بیٹھتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو میں آپ کو اس کا شام کا پروگرام بتا رہا ہوں، وہ صبح آٹھ بجے سے ظہر تک بیٹھتا ہے، پھر دو تین گھنٹے آرام کے بعد عصر کے بعد مغرب تک بیٹھتا ہے۔“ پھر اس نے وقت دیکھا۔ ”ابھی تو بہت دیر ہے عشاء میں، اس وقت تک تو ہم کھانے سے فارغ ہو جائیں گے۔“

☆.....☆

پیر احسان الحق کی حویلی کسی محل سے کم نہیں تھی، اس کا بلند و بالا پھاٹک اتنا بڑا تھا کہ اس سے ایک ساتھ دو ٹرک گزر سکتے تھے، آہنی دروازوں کے نیچے حرکت دینے کے لیے اس میں سے لگے تھے، گیٹ کے باہر بہت سی قیمتی گاڑیاں کھڑی تھیں، پھاٹک پر دو سچ پہرے دار موجود تھے، ان کے شانوں پر کلاشن کوف رائفیں تھیں اور کمر کے گرد لگے ہوئے ہولسٹرز میں پسٹل بھی تھے، ان کے چلے ہی ایسے تھے کہ دیکھنے والا ان سے خوف زدہ ہو جائے۔

ممتاز نے اپنی ٹیوٹا وہاں کھڑی ہوئی گاڑیاں میں پارک کی اور ہمارے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھا، گیٹ کے دونوں سروں پر تیز روشنی والے بلب روشن تھے، ان کی روشنی دور تک جا رہی تھی، گیٹ پر ایک جانب پمیل کی پلیٹ پر اجمیرے ہوئے چمک دار حروف میں پیر احسان الحق شاہ تحریر تھا، اس کے نیچے اس کی تعلیمی ڈگریاں تھیں۔

ممتاز اس بات سے بے خبر تھا کہ ہمارے پیچھے پیچھے ہاشم اور ندیم بھی اپنی گاڑی میں آئے تھے، لیکن حویلی سے کچھ فاصلے پر گاڑی روک کر ہاشم اور ندیم پیدل ہی حویلی تک آ گئے تھے، وہاں اب بھی بہت سے لوگ اس کے آس پاس میں موجود تھے کہ ممکن ہے پیر صاحب کے پاس وقت ہو اور وہ انہیں بھی شرفِ ملاقات بخش دیں، ممتاز نے بتایا تھا کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ پیر صاحب ”مخصوص“ مریدین سے فارغ ہونے کے بعد دو چار عام افراد کو بھی بلا لیا کرتے تھے لیکن ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔

ہاشم اور ندیم بھی ان ہی مریدوں میں کھڑے ہو گئے اور دوسروں کی طرح وہ بھی گیٹ کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے ابھی کوئی وہاں سے نکل کر انہیں پیر صاحب سے ملاقات کی نوید سنائے گا۔

پیر صاحب کے چوکیدار ممتاز کو دیکھ کر چونک اٹھے، ان میں سے ایک نے ممتاز کو سلام کیا اور بولا۔ ”خیر تو ہے سائیں!

آج آپ ادھر کیسے بھول پڑے۔“

”بابا! پیر سائیں سے تو کسی کو بھی کام ہو سکتا ہے۔“ ممتاز مسکرایا۔ ”انہیں اطلاع بھجوادو کہ ممتاز ان سے ملنا چاہتا ہے؟“ چوکیدار نے فوراً اپنی جیب سے سیل فون نکالا اور نمبر ملا کر بولا۔ ”مختل! پیر سائیں جا مہمان آیا بہن (پیر سائیں کے مہمان آئے ہیں)۔۔۔۔۔ سائیں ممتاز سومرو۔“ اس نے شاید دوسری طرف سے پوچھنے پر نام بتایا تھا۔

”مشکل سے دو منٹ بعد ہی اس بلند و بالا پھاٹک کی ذیلی کھڑکی کھلی اور شلوار سوٹ اور چوڑی میں ملبوس ایک مجیم شیم

مختص باہر نکل آیا، اس کے چہرے پر کھنی داڑھی موٹھیں تھیں اور شانے پر شاید سیون ایم ایم کی رائفل اور سینے پر گولیوں کی بیلٹ تھی۔

اس نے بہت تپاک سے ممتاز کا خیر مقدم کیا اور اسے سلام کیا۔

ممتاز نے پوچھا۔ ”کیسے ہو مختل؟“

”سائیں، دعا ہے آپ کی۔“ اس نے اکساری سے کہا۔

”میری دعاؤں میں اتنی تاثیر کہاں مختل، دعا تو پیر سائیں کی ہے۔“

وہ اس کے لہجے کے طنز کو محسوس نہ کر سکا اور سر ہلا کر بولا۔ ”بے شک سائیں۔ پیر سائیں کی دعا تو ہر وقت ہمارے ساتھ ہے۔“ پھر وہ چونک کر بولا۔ ”سائیں، اندر آئیں نا! آپ نے بھی مجھے باتوں میں لگا لیا۔ پیر سائیں آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

ہم اپنی پھانک کی ذیلی کھڑکی سے اندر داخل ہوئے تو مجھے اندازہ ہوا کہ اقامتی عمارت وہاں سے خاصے فاصلے پر ہے دور سے مجھے پورچ میں بھی کئی گاڑیاں نظر آئی تھیں۔

”مختل! پیر سائیں کے ساتھ اور کون کون ہے اس وقت؟“ ممتاز نے پوچھا۔

”سائیں سکرینڈ کا ڈیرہ علی نواز ہے، لاڑکانہ کا غلام قادر مہر ہے اور وگن کا احمد خان ہے۔“ مختل نے بتایا۔

پھر ممتاز نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ ہمیں لے کر برآمدے تک پہنچا تو وہاں دو سح آدمی کھڑے تھے، ان دونوں نے ممتاز کو سلام کیا اور ایک مسکرا کر بولا۔ ”سائیں! آپ تو جانتے ہو کہ۔۔۔۔۔“

”ہاں بابا! جانتا ہوں۔“ ممتاز نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”نہ میرے پاس کوئی ہتھیار ہے، نہ میرے مہمانوں کے پاس ہے، تم چاہو تو تلاشی لے لو۔“

”نہ سائیں!“ ان میں سے ایک آدمی نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”ہم آپ کی تلاشی لیں گے؟ آپ نے کہہ دیا، یہ ہی کافی ہے، آئیے ہمارے ساتھ!“

میں جانتا تھا کہ تیمور کی پنڈلیوں سے خوف ناک قسم کا خنجر ضرور بندھے ہوں گے، وہ کسی بھی جگہ نہتا تو جاتا ہی نہیں تھا، البتہ میرے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا۔ ممکن ہے ممتاز کے پاس کچھ ہو۔

وہ دونوں ایک دروازے پر پہنچے اور اس پر ہلکی سی دستک دے کر بولے۔ ”سائیں! اوڈیرہ ممتاز آیا ہے۔“

”تو اسے اندر بھیجو بابا!“ اندر سے ایک نرم آواز آئی، اندر داخل ہونے سے پہلے ممتاز نے اپنے جوتے اتار دیے، ہم لوگوں کو بھی اس کی تقلید کرنا پڑی۔

اندر داخل ہو کر میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں، کمر اتنی روشنی میں نہایا ہوا تھا، پورے کمرے میں انتہائی دہیز قالین تھا، اس پر سفید چادر کا فرش تھا۔ سامنے ایک باریش اور بارعب مختل بیٹھا تھا۔ اس کے جسم پر خاصا قیمتی لباس تھا، مختل کے کفوں میں سونے کے کف نکس تھے اور ہاتھ پر انتہائی قیمتی گھڑی تھی، وہ چہرے سے واقعی کوئی برگزیدہ مختل نظر آ رہا تھا، سرخ و سفید چہرے پر کالی داڑھی جو کہیں کہیں سے سفید ہو گئی تھی، اس کے دقار میں اضافہ کر رہی تھی۔

ممتاز کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا، اس کے کھڑے ہوتے ہی اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے افراد بھی کھڑے ہو گئے، اس نے ممتاز کو گلے سے لگایا، پھر ہم لوگوں سے باری باری مصافحہ کیا اور ہمیں اپنے نزدیک ہی فرش لشت پر بٹھالیا، اس کے مہمان ہاری وجہ سے ایک طرف سٹ گئے تھے۔

”سناؤ سائیں ممتاز! آج ہماری یاد کیسے آگئی؟“

”سائیں، یاد تو اس کی آتی ہے جسے آدمی بھول جاتا ہے، میں تو آپ کو ہر وقت یاد رکھتا ہوں۔“

پیر احسان الحق مسکرایا اور بولا۔ ”حکم کرو بابا!“

”سائیں، آپ اپنے مہمانوں سے فارغ ہو جائیں، مجھے ذرا تفصیلی بات کرنا ہے۔“

میں نے اس کی بات پر پیر صاحب کو چوتکتے دیکھا لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گئے اور بولے۔ ”بابا! اکرم خان سے پھر کوئی جھگڑا ہو گیا ہے؟“

”نہیں سائیں! اکرم خان میں اب اتنی جرأت کہاں کر وہ مجھ سے جھگڑا کر سکے۔“

”ہاں بابا! اکرم سے مجھے یاد آیا، وہ جو انسپکٹر اکرم سیال ہے، تم نے اس کا ٹرانسفر کشمور کر دیا ہے، وہ بے چارہ بال بچوں والا آدمی ہے، کچھ خیال کرو بابا!“

”سائیں کشمور بھی تو اس ملک کا حصہ ہے اور وہاں جو لوگ اس وقت ہیں، وہ بھی تو بال بچوں والے ہوں گے۔“ پھر مسکرا کر بولا۔ ”سائیں، آپ کی سفارش ہے تو وہ انسپکٹر کشمور نہیں جائے گا، میں ابھی ہوم سیکریٹری سے بات کر لیتا ہوں۔“ اس نے جیب سے سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔ ”آپ اپنے مہمانوں سے فارغ ہو جائیں۔“

میں ممتاز کی سیاست پر حیران ہو رہا تھا، وہ اتنا سیدھا تھا نہیں جتنا نظر آتا تھا، انسپکٹر کا جادلہ تو وہ پہلے ہی رکوا چکا تھا، یہ پتا تو اس نے پیر صاحب پر احسان کرنے کو پھینکا تھا۔

اس نے یوں ہی ایک نمبر ملایا اور بولا۔ ”السلام علیکم سر! ممتاز بول رہا ہوں، میں نے دوپہر میں آپ کو کال کی تھی لیکن بات نہ ہو سکی۔۔۔۔۔۔ ہاں سب خیریت ہے، معمولی سا کام ہے، وہ جو انسپکٹر اکرم سیال ہے میرے علاقے میں نہیں بھئی، اس کا ٹرانسفر کرنا نہیں ہے بلکہ روکنا ہے۔ ہاں ابھی آرڈر جاری کر دو، تھینک یو یار!“

پیر صاحب بہ ظاہر ان لوگوں سے بات چیت کر رہے تھے لیکن ان کا دھیان ممتاز کی باتوں کی طرف تھا، جب اس نے ٹرانسفر کرنے کی خبر سنی تو اس کے چہرے پر سکون ہو گیا۔

اس کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے پیر صاحب کے ہاتھ جوئے تھے اور ان کی طرف پیٹھ کیے بغیر دروازے تک گئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد پیر صاحب نے آواز دی۔ ”اڑے چھوڑا!“

اسی وقت ایک ملازم نما شخص کمرے میں داخل ہوا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

”بابا، مہمان آئے ہیں، کچھ چائے، پانی کا انتظام کرو۔“

”کٹف مت کریں سائیں!“ ممتاز نے کہا۔ ”یہ میرا ہٹا گھر ہے، مجھے ضرورت ہوگی تو خود مانگ کر کھالوں گا۔“

”اچھا، ان باتوں کو چھوڑو بابا!“ پیر صاحب نے کہا۔ ”تم آج ادھر کیسے بھول پڑے؟“

”سائیں، آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے!“ ممتاز نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اور وہ کام اس پورے علاقے میں آپ کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا۔“

”ایسا کیا کام ہے بابا؟“ پیر صاحب نے اپنی نورانی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، اس کی عمر چالیس بیالیس سے زیادہ نہیں ہوگی لیکن اپنی بردباری اور سنجیدگی کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کچھ بڑا ہی لگتا تھا۔

”سائیں، یہ میرے بڑے بھائی ہیں۔“ ممتاز نے میرا تعارف کرایا۔ ”یہ کراچی سے آئے ہیں۔“

”تمہارے بھائی؟“ پیر صاحب نے حیرت سے کہا۔

”ہاں، یہ میرے لیے بھائیوں سے بڑھ کر ہیں۔“ ممتاز نے کہا۔ ”اصل میں کام ان ہی کا ہے۔“

”سائیں، آپ نے تو اپنا نام مجھے نہیں بتایا۔“ پیر صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔

”میرا نام کامران ہے سائیں۔“ میں نے کہا۔

”میری بہن کچھ لوگوں کے قبضے میں ہے، میں چاہتا ہوں کہ اسے ان لوگوں کی قید سے رہائی مل جائے۔“

”سائیں، تمہاری بہن اگر سندھ کے کسی بھی کونے میں ہوئی تو تمہیں ضرور ملے گی۔“ پیر صاحب نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”ممتاز نے زندگی میں پہلی دفعہ کوئی کام کہا ہے، تمہیں کچھ پتا ہے کہ تمہاری بہن کہاں ہے؟“ پیر صاحب نے ہلچلا۔ ”وہ سندھ کے کسی وڈیرے کے قبضے میں ہے یا ڈاکوؤں کے قبضے میں ہے؟“

”سائیں، وہ سندھ کے ایک بہت طاقت ور اور معزز آدمی کے پاس ہے۔“

”بابا! وہ کتنا بھی طاقت ور اور معزز ہو، اس سے نمٹنا میرا کام ہے۔“ پیر صاحب کو گویا جلال آ گیا۔ ”تم اس کا نام بتاؤ، تمہاری بہن چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔“

”سائیں اس معزز آدمی کا نام ہے پیر احسان الحق! ممتاز نے سرد لہجے میں کہا۔

اپنا نام سن کر پیر صاحب یوں اچھے جیسے ان کا پاؤں دھکتے ہوئے انگارے پر پڑ گیا ہو۔ لمحے بھر کو وہ بوکھلا گئے پھر سنبھل کر بولے۔ ”ممتاز! سوچ سمجھ کر بات کرو۔“ تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟“

”سائیں، میں سوچ سمجھ کر اور پورے ہوش و حواس میں بات کر رہا ہوں۔“ ممتاز نے سرد لہجے میں کہا۔

”بھائی کا مران کی بہن شائستہ آپ کے پاس ہے۔“

”تم نے کہیں بھنگ تو نہیں پی رکھا ہے۔“

”احسان الحق! ممتاز نے درشت لہجے میں کہا۔

”پورا علاقہ جانتا ہے کہ میں بھنگ تو کیا، کوئی بھی نشہ نہیں کرتا ہوں۔“

”تم میرے ہی گھر میں بیٹھ کر مجھ پر اڑام لگا رہے ہو، تم جانتے ہو کہ میں جھوٹ بولنے والے کا کیا حشر کرتا ہوں۔“

”میں جانتا ہوں احسان الحق! ممتاز نے کہا۔

”اس لیے میں جھوٹ نہیں بلکہ سچ بول رہا ہوں۔“

”بابا! تمہیں کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔“ پیر صاحب اپنے غصے پر قابو پا کر بولے، غصے کی شدت سے ان کا سانس پھول گیا تھا، لوگ ان کے ہاتھ چومتے تھے، پاؤں چومتے تھے، ممتاز تو سر اسران کی توہین کر رہا تھا، انہیں ان کے نام سے مخاطب کر رہا تھا۔

”تم کیا کہتے ہو بابا؟“ پیر صاحب نے میری طرف رخ کیا۔

”میں بھی یہی کہوں گا کہ میری بہن آپ کے قبضے میں ہے، میری اطلاع پر تو ممتاز یہاں آیا ہے۔“

پیر صاحب اچانک جلال میں آ گئے۔ ”بہت سن لی تمہاری بکواس! اب یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ میرے گارڈز تم تینوں کے کٹڑے کر دیں گے اور تمہاری لاشوں کا بھی پتا نہیں چلے گا۔“

”یہ آپ کا آخری جواب ہے؟“ ممتاز نے کہا۔

”اگر تم فوراً یہاں سے دفع نہ ہوئے تو میں اپنے گارڈز کو ایک آواز دوں گا، پھر تم زندہ یہاں سے نہیں جاسکو گے۔“

میں نے تیمور کو غیر محسوس طریقے سے اپنی پنڈلی کی طرف ہاتھ لے جاتے دیکھا۔

”ٹھیک ہے احسان الحق! ممتاز نے کہا۔

”میں ابھی تو جا رہا ہوں لیکن دوبارہ آؤں گا۔ اس وقت صورت حال زیادہ خراب ہوگی۔“

”گیٹ لاسٹ!“ پیر صاحب نے درشت لہجے میں کہا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ انگریزی بھی جانتے ہیں۔

تیمور نے اچانک جھپٹ کر ان کی گردن کو اپنے بائیں بازو کے حلقے میں لے لیا اور دائیں ہاتھ سے خنجر کی نوک ان کے گلے پر رکھ کر بولا۔ ”احسان الحق! اگر زندگی چاہتا ہے تو ابھی اور اسی وقت ہماری بہن کو ہمارے حوالے کر دے ورنہ اس خنجر کی دھارتی تیز ہے کہ لمحوں میں تیری گردن جسم سے علیحدہ ہو جائے گی۔ بتا شائستہ کہاں ہے؟“

”یہ زیادتی ہے بابا!“ پیر صاحب نے کہا۔ ”مجھے مار کے تم لوگ بھی زندہ یہاں سے نہیں جاسکو گے۔“

”ہمیں تو زندگی اور موت کا یہ کھیل کھیلتے ہوئے زمانہ گزر گیا، ہمیں موت سے مت ڈرا، ہم مریں گے تو کم سے کم تجھے تو جہنم رسید کر ہی دیں گے۔“

صورت حال کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے ممتاز نے جھپٹ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

میں نے دیکھا، پیر صاحب اپنے گاؤں کے چچے ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں، میں نے جھپٹ کر گاؤں کی

پٹا دیا، اس کے پیچھے اعشاریہ تین آٹھ کا قیمتی اور ہولناک ریوالتور رکھا تھا، میں نے فوراً اسے اٹھالیا، وزن سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ ریوالتور پوری طرح لوڈ ہے۔

ریوالتور میرے قبضے میں دیکھ کر پیر صاحب کے چہرے پر حیرانی چھا گئی، وہ آہستہ سے بولے۔ ”بابا! میری گردن تو چھوڑ دو۔“

میرے اشارے پر تیمور نے ان کی گردن چھوڑ دی، میں نے ریوالتور ان کی پسلیوں سے لگا دیا اور بولا۔ ”اگر تمہارے حلق سے کسی بھی قسم کی آواز نکلی تو میں تمہارا ریوالتور تمہارے ہی جسم پر خالی کر دوں گا۔“

”شائستہ کہاں ہے؟“ تیمور نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”میں نے اسے انوائس کیا ہے بابا! وہ تو خود یہاں پناہ کی تلاش میں بھنگ رہی تھی، میں نے تو اسے پناہ دی ہے۔“

”تمہارا بہت شکر یہ احسان الحق!“ میں نے کہا۔ ”تم نے میری بہن کو پناہ دی، میں تمہارا احسان مند ہوں اور ساری زندگی رہوں گا لیکن اب تم اسے میرے حوالے کر دو۔“

”میں یہاں سے اندر جاؤں تو اسے لاؤں گا!“ احسان الحق نے کہا۔

”اندر چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

”تم..... تم میرے زنان خانے میں جاؤ گے؟“ پیر مظہر الحق ایک مرتبہ پھر پیر بن گیا۔

”تم اپنی خواتین کو دوسری طرف بھیج دو۔“ ممتاز نے کہا۔

”وہ تھوڑی دیر کے لیے کہیں بھی جاسکتی ہیں۔ جلدی کرو میرے پاس وقت نہیں ہے، پھر وہ تیمور سے بولا۔ تیمور مجھے یہ خنجر دے دو، یہ خنجر ریوالتور سے زیادہ خطرناک ہے یہ زہر میں بچھا ہوا اس کا معمولی سا زخم تمہاری جان لے لے گا۔“

احسان الحق نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور تھوک نکلنے کی کوشش کی، اس کے چہرے پر مردونی سی چھا گئی تھی۔

”ان لوگوں کے بارے میں تمہیں اندازہ نہیں ہے، تیمور اب تک اکیس قتل کر چکا ہے اور انڈر ورلڈ میں ٹائیگر کے نام سے مشہور ہے، اس نے اب تک بے شمار پولیس مقابلے کیے ہیں، اپنے بے شمار مخالفین کو ہمیشہ کے لیے معذور کیا ہے اور کمال کی بات یہ ہے کہ یہ ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں آیا ہے، یہ اپنے پیچھے کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا ہے۔“

تیمور نے خنجر ممتاز کو دیتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس اس قسم کا ایک اور خنجر ہے۔“ اس نے اپنی پنڈلی سے دوسرا خنجر کھولا اور ہاتھ میں پکڑ لیا۔

”جلدی کرو احسان الحق!“ ممتاز نے خنجر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”اسے دور ہی رکھو۔“

احسان الحق نے کہا۔ ”اگر غلطی سے ہلکا سا جھٹکا بھی لگ گیا تو میں زخمی ہو جاؤں گا۔“

”اور زخمی ہونے کا مطلب ہے موت!“

ممتاز نے کہا۔ ”چلو اٹھو۔“

احسان الحق کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”میری جیب سے موبائل فون نکال کر مجھے دے دو، میں اپنے آدمیوں کو ہدایت دے دیتا ہوں کہ وہ شائستہ کو یہیں لے آئیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم اب تک بس اس چکر میں تھے کہ ہمارے ساتھ کوئی ہوشیاری دکھا سکو گے؟“ ممتاز نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اس لیے اندر جانے کا بہانہ بنایا تھا۔“ اس نے سیل فون احسان الحق کے حوالے کر دیا۔

”اور سنو، اگر تم نے کسی اور کو کال کرنے کی کوشش کی تو تمہارے جسم پر صرف ایک چرکا لگاؤں گا، ممتاز نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”پھر تمہاری ساری پیری مریدی ختم ہو جائے گی۔“

پیر احسان الحق نے کانپتے ہاتھوں سے نمبر ڈائل کیا، ممتاز نے اس کے پہلو میں خنجر کی نوک رکھ دی۔

”ہاں، ہاں، ہاں! اوپر جا کر اس لڑکی کو لے آ جس نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی، چابی تو میرے پاس ہے

اس نے سیل فون بند کیا تو ممتاز نے ہاتھ بڑھا کر سیل فون اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔
 ”تم کیا سمجھتے ہو، تم یہاں سے زندہ نکل جاؤ گے؟“ احسان الحق پھر کر بولا۔ وہ ابتدائی صدمے سے کھنکھاتے ہوئے نکلا۔
 ”مٹو اپنی فکر کر جعلی پیر“ تیمور نے درشت لہجے میں کہا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔
 تیمور بلی کی طرح دبے قدموں دروازے تک گیا اور اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا، پھر دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔
 دستک دوبارہ ہوئی تو ممتاز کے اشارے پر احسان الحق نے کہا۔ ”اڑے بابا کون ہے؟ اندر آ جاؤ۔“
 دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور وہی کیم جیم شخص اندر داخل ہوا جو ہمیں باہر ملا تھا، اس کے ساتھ کوئی لڑکی بھی تھی۔
 ”ٹھیک ہے بابا! لڑکی کو ادھر ہی چھوڑ دے۔“ احسان الحق نے کہا۔
 وہ لڑکی کو چھوڑ کر اگلے قدموں باہر نکل گیا، اس کے جاتے ہی تیمور نے دروازہ بند کر دیا۔ لڑکی کا سر جھکا ہوا تھا، اور وہ فرش کو تنک رہی تھی، میں نے آہستہ سے اسے آواز دی۔ ”شائستہ!“
 اس نے چونک کر سر اٹھایا اور مجھے دیکھا، وہ شائستہ ہی تھی لیکن وہ شائستہ نہیں تھی جسے میں نے کھویا تھا بلکہ یہ تو اس کی چھائی لگ رہی تھی، وہ کبھی پھٹی آنکھوں سے مجھے گھورتی رہی، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو، پھر اس کے حلق سے ایک کرب جھاک سی آواز برآمد ہوئی۔
 ”بھئی!“ میں دوڑ کر اس کے نزدیک پہنچا، اس نے ایک مرتبہ پھر غور سے مجھے دیکھا اور بے اختیار میرے سینے سے لگ کر رُی طرح رونے لگی۔ ”بھئی! یہ آپ ہی ہیں یا میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں؟“
 ”میں تیرے سامنے ہوں گڑیا!“ میں نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اب اپنے آنسو پونچھ لے، ہم نے بہت آنسو بہا لیے ہیں، اب آنسو بہانے کی باری دشمنوں کی ہے۔“
 ”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے بھئی!“ اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ ”میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔“
 ”اب تک تو نے جو بھی نیک خواب دیکھا تھا گڑیا، وہ خواب اب ختم ہو چکا ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”مجھے..... یہاں سے لے چلیں بھئی!“ اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا جیسے اسے خدشہ ہو کہ میں اسے چھوڑ جاؤں گا یا اس خواب سے اس کی آنکھ کھلے گی تو پھر وہ اپنے قید خانے میں ہوگی۔
 ”میں تجھے لینے ہی آیا ہوں گڑیا!“
 میں نے کہا۔ اس دوران میں تیمور واپس احسان الحق کی طرف چلا گیا تھا، اجانک اس نے احسان کے منہ پر زوردار تھپڑ مار دیا اور درشت انداز میں بولا۔ ”میں نے کہا ہے کہ اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔“
 احسان الحق کا چہرہ تو ہن اور غصے کے احساس سے سرخ ہو گیا، اس نے پھر کر کہا۔
 ”باؤ تم لوگ مجھے مار دیا پھر اپنے مرنے کا انتظار کرو، میرے جیتے جی تم یہاں سے زندہ نہیں نکل سکو گے۔ یہ میری حویلی نہیں ہے بلکہ قلعہ ہے قلعہ! ممتاز ابھی طرح جانتا ہے، پھر بھی وہ تم لوگوں کو مرنے کے لیے یہاں لے آیا۔“
 ”آپ میری فکر مت کریں بھئی!“ شائستہ نے کہا۔ ”آپ یہاں سے نکل جائیں یہ شخص انتہائی گھٹیا اور کمینہ ہے۔ یہ اوپر سے جتنا نیک نظر آتا ہے، اندر سے اس کا دل اتنا ہی کالا ہے۔“
 ”تم فکر مت کرو شائستہ!“ تیمور نے پہلی دفعہ اسے مخاطب کیا۔ ”اس کمینے سے نمٹنا ہماری ذمہ داری ہے۔“
 شائستہ نے چونک کر تیمور کو دیکھا، پھر بولی۔ ”آ..... آپ کون ہیں..... میں آپ کو پہچانی نہیں؟“
 ”میں ارسلان کا دوست ہوں شائستہ!“ تیمور نے کہا۔
 ”یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی، اب یہاں سے نکلنے کی فکر کرو۔“ میں نے کہا۔
 میری بات پر احسان نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”اگر نکل سکتے ہو تو یہاں سے نکل جاؤ۔“

تیمور نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر اجانک بائیں طرف کے ایک دروازے کی طرف اچھال دیا، ایک کرب ٹاک جی کی آواز سنائی دی، پھر کوئی دھم سے فرش پر گر پڑا۔
 مرنے والا دروازے کے پردے سمیت گرا تھا، وہ گرتے ہی ساکت ہو گیا۔
 میں حیرت سے وہ منظر دیکھ رہا تھا اور تیمور کی حاضر دماغی پر عجب عجب کر رہا تھا۔
 ”تو نے اور کتنے گاڑی یہاں چھپا رکھے ہیں؟“ تیمور نے مرنے والے کے جسم سے خنجر نکالا، اسی کے کپڑوں سے صاف کیا اور احسان الحق کی گردن پر رکھ دیا۔
 احسان الحق کے سرخ و سفید چہرے پر اس وقت گویا رکھ اڑ رہی تھی، اس کے ہونٹوں پر پڑیاں جم گئی تھیں، اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن آواز نہ نکل سکی۔
 ”بول حرام زاونے، اور کتنے آدمی ہیں یہاں؟ اب اگر مجھے کسی کا بھی احساس ہوا تو میں اس سے پہلے تجھے مار دوں گا۔“
 ”اب یہاں کوئی بھی نہیں ہے، یہ میرا باڈی گاڑی تھا اور دس آدمیوں پر بھاری تھا، یہ ہمیشہ اس پردے کے پیچھے رہتا تھا، میرے مریدوں کے علاوہ سو دشمن بھی یہاں آتے ہیں، انہیں بخشش غیر مستحق کر دیتا ہے لیکن اس کے باوجود اگر چار بائج خالی ہاتھوں سے بھی مجھ پر حملہ آور ہوں گے تو مجھے نقصان پہنچا سکتے ہیں، میں نے اس لیے نور کی ڈیوٹی یہاں لگتی تھی کہ جب میں اسے اشارہ کروں تو وہ پردے کے پیچھے سے باہر نکل آئے۔“
 ”تو پھر ابھی تو نے اشارہ کیوں نہیں کیا؟“ تیمور نے اس کے چہرے پر ایک اور تھپڑ لگاتے ہوئے پوچھا۔
 ”اپنے ہاتھوں کو قابو میں رکھو، آج تک کسی میں اتنی جرأت نہیں ہوئی ہے کہ وہ میز می آکھ سے مجھے دیکھ بھی لے۔“
 ”تو میری بات کا جواب دے ورنہ اس مرتبہ ہاتھ کی بجائے میری لات چلے گی۔“ تیمور نے کہا۔
 ”میں اگر اسے اشارہ کرتا تو تم فوراً ہی یہ زہریلا خنجر میرے جسم میں اتار دیتے، ایسے موقع پر تو نور کو خود ہی فیصلہ کرنا تھا کہ وہ مجھے کیسے بچائے؟“
 ”اب تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔“ ممتاز نے کہا۔
 احسان الحق نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”میں..... میں تمہارے ساتھ چلوں گا؟“
 ”ہاں، تجھے ہم ضمانت کے طور پر اپنے ساتھ لے جائیں گے۔“ تیمور نے کہا۔ ”بعد میں تجھے چھوڑ دیں گے دیے تو اس قابل تو نہیں ہے کہ تجھے زندہ چھوڑا جائے۔“
 ”میں کیسے جاسکتا ہوں بابا؟“ اس نے کہا۔ ”میں آج تک اپنے کسی بڑے سے بڑے مرید کے ساتھ نہیں گیا، میرے گاڑی زوراً شک میں مبتلا ہو جائیں گے، پھر تمہاری زندگیوں کی ضمانت بھی میں نہیں لے سکوں گا۔“
 ”باتیں مت بنا جعلی پیر!“ تیمور نے کہا۔ ”ان کا شک و شبہ دور کرنا میرا کام ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر تیری زندگی کی ضمانت کون دے گا۔ اپنے آدمی سے کہہ کہ گاڑی تیار کر کے پورچ میں لائے میں اپنے مہمانوں کے ساتھ جا رہا ہوں۔“
 ”اور اس لاش کا کیا بنے گا؟“ احسان الحق نے نور کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔
 ”لاش تیرے لیے اور تیرے آدمیوں کے لیے کیا مسئلہ ہے، تو تو کسی کے ذرا سے کھانسنے اور چھینکنے پر بھی جان لے لیتا ہے، تیرے پاس جانوروں کی کوئی کمی ہے اور ہاں یہ آدمی تیرے ہی ہاتھوں مارا گیا ہے۔“ تیمور کا لہجہ انتہائی گرجت تھا۔
 ”بخشل کا نمبر بتا۔“ ممتاز نے پوچھا۔
 ”مجھے زبانی یاد نہیں ہے، وہ میرے موبائل کے اسپڈ ڈائل میں ہے، دو نمبر ہے اسپڈ ڈائل کا۔“ احسان نے بے بسی سے جواب دیا۔
 ممتاز نے بخشل کا نمبر ڈائل کیا اور سیل فون احسان کو دے کر اس کے پہلو میں ریوالتور کی ٹال اڑادی۔
 ”بخشل! بابا گاڑی تیار کر..... مجھے ابھی مہمانوں کے ساتھ ایک ضروری کام سے جانا ہے..... کوئی آدمی نہیں بابا..... میں اکیلا جاؤں گا۔ ہاں، کچھ ایسا ہی کام ہے..... نہیں بابا تو بھی نہیں..... گاڑی ممتاز کا ڈرائیور چلائے گا۔“

ممتاز نے سیل فون اس کے ہاتھ سے چھین کر سلسلہ منقطع کر دیا، چند منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی تو احسان نے کہا۔ ”آ جاؤ بابا!“

دوسرے ہی لمحے بخشل اندر داخل ہوا، اس وقت تک ممتاز نے احسان کو اور ہم سب کو بٹھا دیا تھا۔

”گاڑی تیار ہے پیر سائیں!“ بخشل نے بھاری آواز میں کہا۔

تیور کی نظریں مسلسل احسان کے چہرے کی طرف تھیں کہ وہ بخشل کو کوئی خفیف سا اشارہ بھی نہ کرنے پائے۔

”ٹھیک ہے بابا! تو جا!“ احسان نے کہا۔

بخشل سر جھکا کر چلا گیا۔

ممتاز کو کچھ خیال آیا اور اس نے احسان کے سیل فون سے دیکھ کر اپنے موبائل سے بخشل کا نمبر ڈائل کیا اور بولا۔

”بخشل! میں ممتاز بول رہا ہوں، باہر میرا ڈرائیور اور گاڑی ہے، اسے بھی اندر پورچ میں آنے دو۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

چند منٹ بعد بخشل پھر آیا اور اس نے اطلاع دی کہ سائیں ممتاز کی گاڑی اور ڈرائیور بھی آ گیا ہے۔

اس کے جانے کے بعد ممتاز نے ریوالتور مجھے دیا اور خود اپنے ہاتھ میں خنجر لے کر احسان کے پہلو میں آ گیا، دوسری طرف سے تیور بھی اس کے پہلو میں آ گیا۔ احسان نے سہمے ہوئے انداز میں تیور کو دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ وہ ہم سب سے زیادہ تیور سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔

میں نے شائستہ کا ہاتھ پکڑا اور چلنے سے پہلے احسان سے کہا۔ ”ڈراسی بھی ہوشیاری دکھائی تو میں اپنی جیب سے بھی فائر کر سکتا ہوں۔“

”آپ فکر مت کریں بھیا!“ تیور نے کہا۔ ”اس کے تو فرشتوں کو بھی معلوم نہیں ہوگا کہ کب اس کے پہلو میں یہ زہریلا خنجر اتر گیا، چل اب باہر کی طرف!“ اس نے احسان کو دھکا دیا۔

احسان نے اپنا حلیہ درست کیا، ہاتھوں سے بال سنوارے اور سر پہ خوب صورت سی ایک ٹوپی پہن لی، پھر وہ ہمارے ساتھ یوں چلا جیسے سزائے موت کا کوئی قیدی پھانسی گھاٹ کی طرف جاتا ہے۔

”اپنی چال پر قابو پاؤ۔“ ممتاز نے کہا۔ ”ورنہ تمہارے آدمی یہ سمجھیں گے کہ آج پیر صاحب نے کچھ زیادہ ہی پی لی ہے۔“

”سیدھی طرح چل!“ تیور نے ہنک آمیز انداز میں کہا۔ تیور کے کہنے پر وہ کچھ سنبھل گیا۔ تیور نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا اور ہم لوگ اس کمرے سے برآمد ہوئے۔

باہر بخشل کھڑا تھا، اس نے آگے بڑھ کر احسان کے قدم چھونے چاہے لیکن احسان نے اسے اشارے سے روک دیا، وہ ادب سے ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا، اس کا کوئی ملازم یہ راہ راست اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھتا تھا، یہ ایک طرح سے ہمارے حق میں غیبت ہی تھا ورنہ وہ احسان کی اڑی اڑی رنگت اور ترقی چہرہ دیکھ کر ضرور شک میں پڑ جاتے۔

احسان پورچ کی طرف بڑھا تو بخشل نے آگے بڑھ کر احسان کی لینڈ کروزر کی عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا۔

احسان گاڑی میں سوار ہو گیا تو اس کے ساتھ ہی ممتاز بھی گاڑی میں بیٹھ گیا، ڈرائیونگ سیٹ پر ممتاز کا ڈرائیور بیٹھ گیا، ڈرائیور کے ساتھ پینجر سیٹ پر تیور بیٹھا اور ممتاز نے مجھ سے کہا۔

”بھیا! آپ میری گاڑی میں آ جائیں۔“

اس کی کرولا بھی احسان کی گاڑی کے پیچھے ہی کھڑی تھی، میں نے شائستہ کو اپنے ساتھ پینجر سیٹ پر بٹھایا اور خود اسٹیرنگ سنبھال لیا۔

روانگی سے پہلے احسان نے اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ کھولا اور بخشل سے کہا۔ ”اندر نور کی لاش پڑی ہے، اسے ٹھکانے لگا دینا، وہ تم بخت کچھ زیادہ ہی سرکشی دکھانے لگا تھا۔“

”جی سائیں!“ بخشل نے یوں کہا جیسے احسان نے اسے اندر رکھا ہوا الیش ٹرے صاف کرنے کو کہا ہو۔

پھر احسان کی گاڑی حرکت میں آ گئی، اس کے ساتھ ہی میں نے بھی گاڑی آگے بڑھا دی۔

احسان کی گاڑی دیکھ کر اپنی گیٹ پر کھڑے ہوئے پھرے داروں نے لمحے بھر کی حیرت سے گاڑی کو دیکھا، پھر فوراً ہی گیٹ کھول دیا، دونوں گاڑیاں آگے پیچھے باہر نکل گئیں۔

میں نے باہر کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا، وہ پیر سائیں کی ایک جھلک دیکھنے کو گرتے پڑ رہے تھے لیکن پیر سائیں کے پھرے دار انہیں بے دردی سے پیچھے دھکیل رہے تھے، اس بھیڑ میں مجھے ہاشم نظر آیا، میں نے اسے دیکھ کر جیب سے سیل فون نکالا اور اس کا نمبر ڈائل کر کے کہا۔ ”ہاشم! ہم لوگ واپس جا رہے ہیں، تم بھی ہمارے پیچھے آ جاؤ۔“

”ہاں، میں نے دیکھ لیا ہے، تم لینڈ کروزر کے پیچھے ممتاز کی کرولا میں ہو۔“

ممتاز وہاں سے سیدھا اپنی شہر سے باہر والی حویلی میں پہنچا، ہماری گاڑیاں جوں ہی گیٹ کے اندر داخل ہوئیں، ممتاز نے اپنے گاڑی سے گیٹ بند کرنے کو کہا۔ پھر اس نے دھکیل کر احسان کو باہر نکال لیا۔

”بابا! اب تو تم خیریت سے پہنچ گئے ہو، اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے، اب تو مجھے جانے دو۔“

”تو کیا تمہیں بالکل ہی اٹو کا پٹھا سمجھتا ہے؟“ تیور نے کہا۔

”ہم تجھے چھوڑ دیں اور تو ابھی جا کر اپنے آدمیوں کو یہاں بھیج کر ممتاز کی حویلی کا گھیراؤ کرالے۔ جب تک ہم یہاں سے روانہ نہیں ہو جاتے، تب تک تو ہمارا مہمان رہے گا۔“

”دیکھو، بخشل صرف ایک گھنٹا انتظار کرے گا، پھر وہ اپنے طور پر کچھ بھی کر سکتا ہے، یہ تو وہ جانتا ہی ہے کہ مجھے ڈیرہ ممتاز اپنے ساتھ لے گیا ہے۔“

”تو ابھی کچھ دیر بعد اسے سیل فون پر اطلاع دے گا کہ ایک وفاقی وزیر اس وقت حیدر آباد میں موجود ہے، میں اس سے ملاقات کرنے جا رہا ہوں، اگر میں اس وقت نہ پہنچا تو وہ وزیر واپس چلا جائے گا، مجھے اس سے بہت ضروری کام ہے۔“ تیور نے کہا۔

”بابا! تیرا دماغ تو بہت شیطانی ہے۔“ احسان نے کہا۔ ”ہر بات کا جواب ہے تیرے پاس۔“

”ملک کے بڑے بڑے بد معاش اور مافیاضیف یونہی بھی میرے نام سے نہیں کانپتے۔“ تیور نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”میں ان سے دس چالیس آگے کی سوچتا ہوں، تو تو پھر ایک جعلی پیر ہے جو سیدھے سادے لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان کو لوٹتا ہے۔“

”بابا مراد!“ ممتاز نے اپنے گاڑی کو آواز دی، ”پیر سائیں ہمارا مہمان ہے، اس کے آرام کا خیال رکھنا لیکن اگر یہ کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کرے تو بالکل لحاظ مت کرنا۔“

”جو حکم سائیں!“ مراد نے کہا۔

”بابا مراد!“ تیور نے کہا۔ ”تمہیں تم بھی تو اس کے مرید نہیں ہو؟“

”تو بہ کس صاحب! اگر میں اس کا مرید ہوتا تو سائیں ممتاز کے ساتھ نہیں ہوتا، سائیں ممتاز نے کبھی اسے پیر سمجھا ہی نہیں۔“

”سائیں ممتاز ایک دن بچھٹائے گا اور.....“

اچانک تیور نے اس کی گردن دبوچ لی اور بائیں ہاتھ سے اس کے چہرے پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ اس کی خوب صورت اور قیمتی ٹوپی دور جا کر اس کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ پھر وہ مراد سے بولا۔ ”اگر یہ زیادہ بکواس کرے تو اس کے ساتھ اسی طرح پیش آنا۔“ اس نے احسان کو مراد کی طرف دھکیل دیا۔

مراد نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر کی طرف لے گیا، اس وقت بلوچ سمیت اس کے ساتھی بھی وہاں موجود تھے، بلوچ کے چہرے پر خوشی کا تاثر تھا، اس نے ہنس کر کہا۔ ”کامران صاحب! میں آپ کو مان گیا، جو کام رائفل کی

عجیب مرد
تین کہانیاں

تین کہانیاں کا سلسلہ
جس میں مردی تین خواتین کی زندگیوں کے اس سلسلے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس تک پہنچا دیں

سلوونی

شائستہ میر آرزو

سوات سے، دولت کی ہوس میں گرفتار ایک باپ کی داستانِ ملامت

ایک ذریعہ ہوتی ہیں، لہذا میری پیدائش پر بہت خوشیاں منائی گئیں۔ مجھے بہت ناز و نعم سے پالا گیا۔ اسکول کی عمر کو پہنچی تو مجھے اسکول داخل کرایا گیا۔ بچپن سے ہی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ہمارے گھر کا سسٹم دوسرے گھروں سے بالکل مختلف ہے۔ ہر روز مہمانوں کا آنا جانا، تیز موسیقی اور میک اپ سے بھرے چہرے مجھے عجیب سی الجھن میں ڈال دیتے۔ مجھے یہ سب کچھ بہت بُرا لگتا۔

میں فطری طور پر بہت حساس اور کم گو واقع ہوتی تھی۔ رات کو جب سب گھر والے جن میں میری کزن بھی شامل ہوتی، اسٹھے بیٹھ کر گاتے یا ناچتے تو مجھے بہت کوفت ہوتی۔ میں ہمیشہ ان کے ساتھ بیٹھنے سے کتراتی، جبکہ میری ہم عمر کزن رانی ان محفلوں میں پیش پیش ہوتی۔ پھوپھو ہر دوسرے، تیسرے روز تیار ہو کر نجانے کہاں جاتی۔ وہ اکثر رانی کو بھی ساتھ لے جاتی اور جب مجھے ساتھ جانے کے لیے کہتی تو میں ہمیشہ انکار کرتی۔

مجھے بچپن سے ہی شور شرابے اور ہنگامے پسند نہیں تھے۔ سکون کے لیے دو ہی جگہیں میری پسندیدہ تھیں۔ ایک اسکول اور دوسری فرح کا گھر۔

قارئین یہ ایک ایسی کم عمر لڑکی کی کہانی ہے جس نے بہت ظلم و ستم سہے تھے، لیکن اپنے آپ کو رسوا نہیں ہونے دیا اور ہر قدم پر ثابت قدمی اور ہمت کا مظاہرہ کیا۔ ہم دونوں کا چوں کہ بچپن سے ساتھ رہا ہے، اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہ میرا آنکھوں دیکھا حال ہے۔ آئیے اس کی زبانی یہ کہانی سنیں۔

”دکھ کیا ہے؟ اور یہ کس چڑیا کا نام ہے؟“ یہ سوال میں اکثر اپنی گہری دوست فرح سے کیا کرتی تھی، جسے سن کر وہ اکثر ہنس پڑتی تھی۔

”سلوونی تمہیں اس طرح اندازہ نہیں ہو سکے گا جب تک کہ تمہارا خود دکھ سے واسطہ نہ پڑے۔“

لیکن میں انجان تھی کہ جس دن میں دنیا میں آئی۔ اس دن سے ہی دکھوں نے بھی میرے ساتھ جنم لیا، لیکن میں ابھی تک محسوس ہی نہیں کر پاتی تھی۔

میرا نام سلوونی ہے اور ہم تین بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ بہن، بھائیوں میں میرا نمبر سب سے پہلا ہے۔

میں نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہاں پیسوں کی ریل پیل تھی، کسی بھی چیز کی کمی نہ تھی۔ میرا تعلق اس اس جگہ سے تھا جہاں لڑکیاں زیادہ عزیز ہوتی ہیں، کیوں کہ وہ اپنے خاندان کے لیے آمدنی کا

میرے گھر والے ہر طریقے سے مجھے اپنے رنگ میں رنگنا چاہتے تھے، کیوں کہ ان کے بقول میں اپنے گھر کو روشن کرنے والا چراغ بھی اور ابو چاہتے تھے کہ جب یہ چراغ روشنی دینے کے قابل ہو جائے تو اپنے بیٹے کو اختیار کرے، اس میں کوئی جھجک محسوس نہ کرے اور محسوس کی آواز سے درود یوار تک لرزہ کرے، جیسا کہ پھوپھو نے کیا تھا۔ وہ بھی ایک چراغ روشن تھی، لیکن آخر کو اس چراغ نے بجھنا بھی تو تھا۔

مجھے تو ابو نے مجھے اتنی توجہ دی تاکہ بڑی ہو کر وہ مجھ پر اپنی محبت جتانیں اور میں سر جھکا کر ان کی محبت کے اعتراف میں اپنا سب کچھ لٹا کر محبت کا حق ادا کروں۔ یہ سوچے بغیر کہ ہر درخت بھلا کب پھل دینے کے قابل ہوتا ہے۔

خیر وقت گزرتا گیا اور میں ساتویں جماعت میں آ گئی، اب تو میں خاصی بڑی اور ہوشیار ہو گئی تھی۔ تیرہ، چودہ سال کی عمر میں، میں نے اچھا خاصہ قد کاٹھ نکالا تھا اور میں اپنی عمر سے بڑی نظر آنے لگی۔

میں اپنے نام کی طرح بھی ابھی سانولی سلونی سی، لیکن جوانی تو جوانی ہوتی ہے۔ یہ تو نام ہی نکھار کی آمد کا ہے، لیکن جب بھی یہی جوانی اور حسن زندگی کی خوشیاں چھین لے اور جینا دو بھر کر دے تو پھر اپنے وجود سے ہی نفرت ہونے لگتی ہے اور ہر سو چھائی بہار بھی خزاں لگتی ہے۔

میرے مقابلے میں رانی بہت گوری اور خوب صورت تھی۔ اب مجھے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم طوائف خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ میری امی پختون گھرانے کی تھیں اور چوں کہ غریب تھیں اس لیے ابو نے انہیں زبردستی اپنا لیا تھا۔

پھوپھو بھی ناچنے گانے سے شاید تنگ آ چکی تھیں، لہذا انہوں نے اپنا گھر بسانے کا سوچا اور اپنے مرضی سے شادی کی۔ ابو نے بہت برا منایا تھا۔ وہ ابھی پھوپھو کے ذریعے اور بھی دولت کمانا چاہتے تھے۔ شادی سے ایک دن پہلے وہ پھوپھو سے قدرے حقلمند سے بولے۔ ”شاداں! دو، تین مہینے اور انتظار کر لو، سلونی کمانے کے قابل ہو جائے پھر ہم دھوم دھام سے تمہاری شادی کریں گے۔“

”نہیں بالے بھیا اور زبردستی نہیں چلے گی، مجھ سے

جو ہو سکا وہ کر دیا۔

اتنا پیسا ہاتھ آ جانے کے بعد ابو ”بالے“ سے ”بیدار بخت خان“ بن گیا تھا، لیکن پھوپھو اب بھی اسے ”بالے بھیا“ ہی کہا کرتی تھیں۔

”یہ لونگی کار اور گھر کی چابیاں۔“ پھوپھو تقریباً اسے ابو کی طرف پھینکتے ہوئے بے پروائی سے بولیں۔

”کار آپ کے لیے تھخہ اور گھر تو میرے نام ہے، لیکن آپ اس میں رہ سکتے ہیں اور ہاں مانے بھیا کو کچھ پیسے دے کر میں نے اس کا منہ بند کر دیا ہے، اسے کچھ اور دینے کی ضرورت نہیں۔“

”شاداں! تھوڑا سا صبر.....“

”بس بالے بھیا“ پھوپھو دونوں ہاتھ اٹھا کر حتیٰ فیصلے سنار ہی تھیں۔

”مجھ سے اور نہیں ہو گا یہ کام، میں نے اتنا کمایا ہے جسے دو تین سال بیٹھ کر آرام سے خرچ کیا جاسکتا ہے اور ویسے بھی بقول آپ کہ دو تین مہینوں ہی کی تو بات ہے، پھر سلونی آپ کی جیب بھاری کر دے گی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم جس سے شادی کرنے جا رہی ہو وہ تو شادی شدہ ہے، ہمارا مطلب ہے اس کے تو تین بچے بھی ہیں۔“

”میں جانتی ہوں، لیکن ایک ناچنے، گانے والی کو کون سہارا دے سکتا ہے۔ اب کنوارا لڑکا تو مجھے بھی قبول ہی نہیں کرے گا۔ وہ شادی شدہ جیسا بھی ہے مجھے چاہتا ہے، کم از کم وہ مجھے عزت سے جینے تو دے گا۔“

پھوپھو کی شادی کے بعد ہم الگ الگ گھر منتقل ہو گئے۔ ابو کو افسوس تو ہوا کہ سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکل گئی، لیکن پھر بھی مطمئن تھے کہ چلو اب دوسری چڑیا بھی جوان ہو گئی ہے۔

میں اکثر امی، ابو کو چپکے چپکے باتیں کرتے دیکھتی، لیکن جب بھی میں ان کے سامنے سے گزرتی تو وہ دونوں چپ ہو جاتے۔ مجھے ہر وقت ایک انجانے سے خوف کا خدشہ لگا رہتا تھا اور ایک دن یہی خدشہ حقیقت میں بدل کر سامنے آیا۔ ہوا کچھ یوں کہ ایک رات میں سوئی ہوئی تھی کہ اچانک آنکھ کھلی۔ اچانک آنکھ کھلنے کی وجہ شاید یہ بھی کہ مجھے آنے والے طوفان کا الہام سا ہو گیا

تھا۔ مجھے شدید پیاس لگ رہی تھی، لیکن میں اتنی بدحواس تھی کہ کمرے میں رکھے پانی کے جگ کو بھی نہ دیکھ سکی اور پانی پینے کچن میں چلی گئی۔ واپسی پر ابو کے کمرے کے نزدیک سے گزرتے ہوئے مجھے دھیمی دھیمی باتوں کی آواز ملی، میں نے اپنا نام سنا تو نا چاہتے ہوئے بھی وہاں رک گئی۔ ابو کہہ رہے تھے۔

”سلونی اب جوان ہو گئی ہے۔ اب وہ بھی کچھ کم کر لائے اور ہمارے بڑھاپے کا سہارا بنے۔“

”کیا کہہ رہے ہو بیدار بخت خان؟ خدا کے لیے اپنی بیٹی کے بارے میں ایسا مت سوچو، بچے کیا کہیں گے۔“ امی بے زاری سے بولیں۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے تاج بیگم! سلونی کے جوان ہونے تک ہم نے کتنا انتظار کیا ہے، کیا کیا سوچا ہے ہم نے۔ اب جلد ہی ہمارا خواب پورا ہونے والا ہے۔“

مجھ میں تو اور سننے کی طاقت نہیں تھی۔ مجھ پر ایک لرزہ کی سی کیفیت طاری ہو گئی، اگر میں دیوار کا سہارا نہ لیتی تو یقیناً گر پڑتی۔

پتا نہیں ابو مجھے کہاں بھیجیں گے، میں کبھی پھوپھو کی طرح نہیں ناچوں گی، میں تو پڑھنا چاہتی ہوں۔ یہی سوچتے ہوئے روتے روتے نجانے کب میں نیند کی دلدلی میں چلی گئی۔

صبح امی کی آواز پر آنکھ کھلی۔

”اٹھو سلونی بیٹا، چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ کیا اسکول نہیں جانا، دیر ہو جائے گی بیٹا اٹھو شباہش۔“ یہ کہتے ہوئے امی حسب معمول قریب آ کر سر سہلانے لگیں تو چونک گئیں۔

”ارے تمہیں تو سخت بخار ہے، چلو آج چھٹی کر لو اسکول سے تاکہ تمہیں ڈاکٹر کو دکھاؤں۔“

”امی!“

”میں صدمے جاؤں۔“ امی میری سوچی ہوئی آنکھیں دیکھ کر بے قراری سے بولیں۔

”امی! ابو کل رات آپ سے میرے بارے میں کیا کہہ رہے تھے۔ انہیں سمجھائیے امی، میں کبھی پھوپھو کی طرح کام نہیں کروں گی۔ میں نے آپ لوگوں کی باتیں سن لی ہیں۔“ میں بے اختیار رونے لگی۔

”نہیں بیٹا رونا مت، میں تمہارے ساتھ ہوں، میں تمہارے ابو کو بھی ایسا نہیں کرنے دوں گی۔“ امی نے گلے لگاتے ہوئے تسلی دی تو مجھے کچھ سکون ملا۔

اسکول جانے کا وقت تھا اس لیے فرح ہمارے گھر آئی، ہم دونوں اکٹھے اسکول آتے جاتے، پڑوس کی عورتوں نے اسے سمجھایا بھی تھا کہ سلونی کے ساتھ میل جول مت بڑھاؤ، لیکن اس نے کسی کی بات کی پروا نہ کی۔ فرح کو میں نے سر درد کا بہانہ کیا۔

دوسرے دن اسکول میں اس نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔

”کیا بات ہے سلونی، کل تم اسکول کیوں نہیں آئی تھیں۔“

”فرح مجھے جس بات کا ڈر تھا، وہی ہوا۔ میری سبھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں، تم ہی کچھ بتاؤ فرح۔“ میں ایک دم رونے لگی۔

”ارے سلونی تم تو رورہی ہو، بزدل لڑکی! میں تو تمہیں بہت بہادر سمجھ رہی تھی، پلیز خدا پر بھروسہ رکھو، تم تو ابھی سے حوصلہ ہار رہی ہو۔ اگر تمہارا یہی حال رہا تو تمہاری بینیں کیا کریں گی، پھر وہ بھی اس عذاب کی بھیشت چڑھ جائیں گی اور اگر تم ثابت قدم رہیں اور اپنے ابو کی بات نہ مانی تو پھر تمہاری بینیں بھی تمہاری ہمت کو دیکھ کر اپنا دفاع کر سکیں گی۔ تمہیں تو لڑنا ہے دوست، اپنی آبرو کی حفاظت کے لیے۔“

”فرح دنیا کے سارے باپ تو ایسے نہیں ہوتے، باپ تو بیٹیوں کو اپنی عزت سمجھتے ہیں، پھر میرے ابو میرے ساتھ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں، کیا میں ان کی بیٹی نہیں ہوں اس سے تو بہتر تھا کہ میں پیدا ہوتے ہی مر جاتی، یوں ذلت کی زندگی گزارنے سے تو بچ جاتی۔“

”سلونی مایوسی کفر ہے۔ تمہیں ہر حال میں حوصلے سے کام لینا ہے۔ میں نے کہا نا کہ خدا پر بھروسہ رکھو، اس کے فضلے کے آگے کسی کا زور نہیں چلا۔ تم ابھی سے گھر میں کوئی ہنگامہ نہ کرنا ورنہ وقت سے پہلے وہ کچھ ہو جائے گا جو ابھی وہ نہیں کرنا چاہتے۔ تم سب کچھ خدا پر چھوڑ دو اور وقت کا انتظار کر لو، خدا جانے کب کیا ہو جائے۔ ٹھیک ہے نا پیاری دوست؟“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو فرح نے



قائد اعظم کا تدبیر

ہمارے پہلے گورنر جنرل نے عہدہ سنبھالتے ہی ایک ایسا بڑا اقدام کیا جس سے سب حیران رہ گئے اور جس شخص کو

انگریز اپنے صد سالہ دور حکومت میں کبھی سلجھانہ سکے تھے، اسے قائد اعظم نے وزیرستان سے فوج ہٹا کر جہاں انگریز کروڑ ہا روپیہ خرچ کر کے زیادہ تر اپنے وقار اور بعد میں ہندوستان کے دفاع اور آزادی پٹھانوں کی سرکوبی کے لیے فوجیں رکھتے تھے، مسئلہ کو حل کر دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ انگریزوں کی آزادی قبائلیوں کے ساتھ رات دن جھڑپیں ہوتی رہیں لیکن انگریز انہیں کبھی مغلوب نہ کر سکے۔ بسا اوقات انگریز

اپنی بے بسی کے پیش نظر خطیر رومات ادا کر کے اپنی عورتوں اور افسروں کو رہا کراتے جنہیں پٹھان اُن چھاؤنیوں سے جہاں چڑیا تک پہنچ نہیں مار سکتی تھی، اغوا کر کے لے جاتے گرفتاری کے بعد وہ ان قیدیوں کی روایتی مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھانہ رکھتے اور بعد میں زر کثیر وصول کر کے ان کو رہا کر دیتے۔ ہمارے قائد اعظم نے افواج کو واپس بلواتے ہوئے آزاد قبائل کے لوگوں سے کہا کہ بحیثیت مسلمان تمہارا فرض ہے کہ تم اپنے ملک پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کرو۔ دیکھئے کس خوب صورتی سے غیور پٹھانوں کو یہ جتلا یا گیا کہ اب اس نئے ملک کے تم مالک ہو اور انگریز حاکم جو غاصب تھا دستبردار ہو گیا ہے اور اب اس ملک کی حفاظت کی ذمہ داری تمہاری ہے۔ اسلامی رواداری اخوت اور تدبر کا یہ ایسا شاہکار تھا کہ امن و امان فوراً قائم ہو گیا۔ سرحدوں کی خود بخود حفاظت ہو گئی اور آزاد قبائلیوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے۔ مزید برآں پاکستان مستقل زیر باری سے بن گیا۔

حمایت کرنے لگیں۔

”ہاں بالے بھیا یہ پڑھ کر کیا کر لے گی، مجھے تو پڑھنے نہیں دیا۔ اب اس سے بھی تھوڑا کام چلاؤ۔ خواجواہ بیکار بیٹھی ہے۔“

مجھ میں نجانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی، غصے سے سرخ ہو گئی تھی، بُرے انجام کی پروا کیے بغیر میں پھوپھو سے مخاطب ہوئی۔

”پھوپھو میں آپ کی طرح ذلت کی زندگی نہیں گزاروں گی، میں عزت سے جینا چاہتی ہوں، پڑھ کر اسٹانی۔“ یہ سنتے ہی ابو نے ایک زوردار پھپھر رسید کیا، شدت درد سے میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

”کبخت! او، تین جماعتیں کیا پڑھ لی کہ مستقبل کی فکر شروع کر دی، تو کون ہوتی ہے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے والی۔ ہم نے تجھے اتنی محبت دی، تیری تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، آج اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے۔ ہم تیری اس دراز زبان کو کاٹ ڈالیں گے۔ اس زمین میں تجھے زندہ گاڑ دیں گے، کتیا۔“

”مارڈا کیس مجھے..... یوں ذلت کی زندگی گزارنے

”ہاں یہ تو ہے، ان کے تو دورِ روپ ہیں۔ کتنا عجیب انسان ہے۔ شرافت کا لبادہ اوڑھ کر وہ لوگوں کو کتنی آسانی سے فریب دیتا رہتا ہے جیسے دنیا میں اس جیسا شریف کوئی اور ہے۔“

”ہاں یار، یہ مرد ہوتے ہی ایسے ہیں۔“

ابو مان تو گئے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ امتحان دو اور پھر دوسرے امتحان کی تیاری کرو۔

میں نے امتحان میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔
میں اپنے ہاتھ میں پرائز (کپ) تھامے بڑے خوشی
سے گھر آ رہی تھی، گھر میں داخل ہوئی تو سب کچھ اپنا منظر
پایا۔ امی کے علاوہ کسی نے بھی مجھے مبارکباد نہیں دی۔ ابو
نے میرے ہاتھ سے کپ چھین کر ایک طرف پھینک دیا
اور غصے سے کہا۔

”بس بہت ہو چکا۔ اب ہم سے اور برداشت نہیں ہوتا۔ رانی کو دیکھ آج پورے پچاس ہزار کما کر لائی ہے۔ کجخت تیری ہی عمر کی تو وہ بھی ہے، اب یہ روئے دھونے کے نالک بند کر دو۔“

ان دنوں پھوپھو بھی آئی ہوئی تھیں، وہ بھی ابو کی

کرو گی۔ ہے نا بیٹیا جانی؟“ اور میں جو اتنی دیر سے خاموش و پریشان بیٹھی ابو کی باتیں سن رہی تھی، دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

”ابو میرے ساتھ ایسا ظلم مت کریں۔ میں پڑھ کر
استانی بنوں گی۔ آپ کی، آپ کی ہر ایک خواہش کو پورا
کروں گی، لیکن پلیز ابو..... مم..... میں کبھی یہ کام نہیں
کر سکوں گی۔“

ابوایک دم بھڑک اٹھے۔

”جب کرو خبیث کی اولاد۔ ہم نے تیری پرورش میں کوئی کمی نہیں کی۔ تیری ہر ایک ضرورت پوری کی اور آج جب ہمیں تیری ضرورت بڑھ رہی ہے تو، تو انکار کر رہی ہے۔ یہ ضرورت تیری اس گستاخ ماں کی چالپوسی ہوگی۔“

وہ تختی سے میری بال پکڑ کر بولے۔

”دیکھ سلونی شرافت سے ہماری بات مان، ورنہ تیرا
شکر کروں گا کہ تُو یاد رکھے گی۔“

پھر تو ابو کا معمول بن گیا، وہ ہر روز مجھے کبھی جان سے مارنے کی دھمکی دیتے تو کبھی پیار سے سمجھانے کی کوشش کرتے، لیکن میں کسی طرح بھی ماننے والی نہیں تھی۔ میری پڑھائی بھی ان حالات اور ٹینشن کی وجہ سے متاثر ہو گئی۔ میں ہر دوسرے، تیسرے دن اسکول سے چھٹی کر لیتی۔ اب تو تقریباً ایک ہفتہ ہو گیا۔ ابو نے اسکول جانے پر پابندی لگا دی تھی۔ فرح کو میں ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ کرتی، لیکن آج تو وہ اکیلے اسکول جانے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔

”مسلونی پلینز اور کتنی چھٹیاں کرو گی۔ مس تمہارا نام خارج کرنا چاہتی ہے۔ امتحانات قریب ہیں، اب اسکول چلو پلینز۔“

”میں کیا کروں فرح، ابو نہیں مان رہے، ابو جنون کی حد تک خود غرض اور لاپچی ہوں گے، میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ مجھے تو انہیں باپ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، خدا اس گھر میں بہن، بیٹی پیدا نہ کرے جہاں میرے باپ جیسا باپ رہتا ہو۔“

”ختم فکر نہ کرو سلوٹی، میں تمہارے ابو سے بات کروں گی۔ ویسے بھی تم کہتی ہو کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنا دوسرا روپ ظاہر نہیں کرتے۔“

کہا۔ ”یہ ہوئی تاباں، گلدگرل، چلو کلاس میں چلتے ہیں۔“
دو تین دن اسی اضطراب میں گزر گئے کہ نجانے
کب ابو اپنا فیصلہ سنائیں۔ ان تین دنوں میں، میں نے
ابو کا سامنا بہت کم کیا، وہ جب بھی سامنے آتے تو خوف
کے مارے میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے
لگتیں۔ آخر کار ابو کے فیصلے کا وقت آن پہنچا۔ میں
کمرے میں بیٹھی اسٹڈی کر رہی تھی کہ میرا سب سے چھوٹا
بھائی شان آیا۔

”آلی! آپ کو ابو بلار ہے ہیں۔“

”اب.....بو.....مم.....مجھے۔“

”ہاں آپ کی آپ کو۔ اس میں حیران ہونے والی کون سی بات ہے؟“

”ادھر آؤ شان وہ کیا کہہ رہے ہیں مجھے، تمہیں کیا کہا بونے؟“

”آپی مجھے کیا پتا خود جا کر پوچھ لو کیا کہنا چاہتے ہیں وہ، میں تو چلا۔“

میں سمجھ گئی تھی کہ وقت آپہنچا ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ ابو گرج برس کر اپنا فیصلہ سنائیں گے لیکن اس کے برعکس ابو نے مجھے پیار سے بلا کر اپنے ساتھ بٹھایا۔ ابو قدرے نرمی سے سب کچھ بتا رہے تھے۔ ”دوسلوئی بیٹا! تم ہماری سب سے اچھی او۔ پیاری بیٹیا ہو، ہم نے تمہیں بہت ناز و نعم سے پالا تاکہ تم ہمارے بڑھاپے کا سہارا بنو، تم ہماری بڑی اولاد بھی ہو، اب تم ماشاء اللہ بڑی ہو گئی ہو، ہوشیار ہو، ہر بات سمجھ سکتی ہو، دیکھ تمہاری پھوپھو ہم سے بغاوت کر گئی، اپنی مرضی سے شادی کی، ورنہ آج وہ لاکھوں کی مالک ہوتی۔ خیر ہم نے بھی اسے بتایا تھا کہ تم تو چلی گئی، لیکن ہماری بیٹیا ہمارا ہر خواب پورا کرے گی۔ دیکھ بیٹا اس دنیا میں پیسا ہی سب کچھ ہے، تم جانتی ہو گھر کے اخراجات بھی بڑھ رہے ہیں، مہنگائی بھی ہے۔ اب تمہارا بوڑھا باپ کہاں کہاں کے دھکے کھائے گا۔ شان بھی چھوٹا ہے، بڑا بیٹا ہوتا تو شاید ہم تم سے نہ کہتے۔ ہو سکتا ہے تمہاری ماں نے تمہیں الٹی سیدھی باتوں سے ورغلا یا ہو، لیکن اس کی باتوں میں مت آنا وہ گنواران باتوں کو نہیں سمجھتی۔ ہمیں امید ہے تم ہمیں مایوس نہیں

سے تو بہتر ہے میں سکون کی موت مر جاؤں۔“
اور ابو دانتی کمرے میں چلے گئے اور پستول نکال لی۔ یہ دیکھتے ہی سب گھروالے زار و قطار رونے لگے اور ابو کی مٹیوں کرنے لگے۔ اس لمحے پڑوس کی عورتیں بھی ہمارے گھر آ گئیں۔ یقیناً انہوں نے رونے کی آوازیں سنی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی ابو جلدی سے کمرے میں چلے گئے، کیوں کہ وہ تو دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو بہت شریف اور غیرت مند سمجھتے تھے۔ پڑوس کی عورتیں بھی واقف تھیں کہ یہ کس بات پر جھگڑا چل رہا ہے اس لیے دادی سے دو تین پوچھ گچھ کے بعد اپنی گھروں کو چل دیں۔
ابو کمرے سے نکلے تو گرج دار آواز میں کہا۔
”اس کمینہ کو سمجھالے، ورنہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھولے گی۔“
ابو باہر چلے گئے تو پھوپھو سمجھانے لگیں۔

”دیکھ سلونی! ابو کی بات مان! اس میں تیرا ہی فائدہ ہے۔ ناٹو مجھے بتاؤ موت سے نہیں ڈرتی؟ بے وقوف لڑکی وہ تمہیں جان سے مار دیں گے۔ قسم سے مجھے تو ایک مرتبہ ہی کہا گیا تھا اور میں راضی ہو گئی اور پھر یہ سارے خاندان والے بھی تو یہی کام کر رہے ہیں۔ تو پہلی لڑکی ہے جو اس طرح نخرے کر رہی ہے۔ رہے شمال اور رانی کو دیکھو وہ.....“

”بس کریں پھوپھو، میں آپ لوگوں کی طرح بے ضمیر نہیں ہوں۔ مجھے اپنی زندگی پر پورا حق حاصل ہے، میں اپنی مرضی سے جینا چاہتی ہوں اور آپ کو میرے بارے میں سوچنے کا کوئی حق نہیں۔ کیا بُرا ہے اور کیا بہتر..... یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اب میں کوئی بچی نہیں ہوں۔“ میں بے خونی سے بولی۔

”آہ ہاں، میں کوئی بچی نہیں ہوں۔“ پھوپھو نے میرے الفاظ میرے لہجے میں دہرائے۔

”تو اتنی بڑی بھی نہیں ہے سلونی بیٹا۔ جتنا تم خود کو سمجھ رہی ہے، یہ اپنی عمر سے بڑی باتیں کہاں سے سیکھیں؟ طوائف خاندان میں بلی بڑی اور حق کی بات کر رہی ہو؟ اے لڑکی! یہاں کسی بھی لڑکی کو اپنی زندگی پر کوئی حق حاصل نہیں۔ یہاں جو بڑے کہتے ہیں وہی ہوتا

ہے، چاہے وہ ہونج یا غلط۔“
اس لمحے دادی نے میری طرف داری کی۔
”لغت ہو تم پر۔ اگر تم نے اپنے لیے کوئی آواز نہیں اٹھائی تو کم از کم اس کو اس عذاب سے تو بچا سکتی ہو۔“
”میں کیوں بچاؤں اس کو، جب مجھے بچانے کے لیے کوئی نہ تھا، اماں تم بھی تو اس وقت موجود تھیں اور بھیا کی طرف داری کر رہی تھیں۔ مجھ پر تو ذرا بھی ترس نہیں آیا تم لوگوں کو اور اب اس لڑکی کو بچانے کے لیے ہر کوئی تیار ہے۔“
”اپنے اپنے نصیب کی بات ہے، تمہاری قسمت میں جو لکھا تھا وہ مجھے مل گیا۔“

’بھاڑ میں گئے ایسے نصیب۔“ پھوپھو نفرت سے بولیں۔ ابو کی دن رات دھمکیوں اور مارنے مجھے بے حد عذاب کر دیا۔ کالج جانے پر پابندی تھی۔ پابندی کی بھی بس مکمل چھوڑ دیا تھا اس لیے جہاں کہیں کمرے میں بیٹھتی تو بیٹھی رہتی اور سوئی تو سوئی رہتی۔ سر میں ہر وقت درد لگا رہتا اور کبھی کبھی بخار بھی۔ امی بہت پریشان تھیں، وہ ابو سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ سلونی کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔

ایک دن جب مجھے سخت بخار تھا اور کھانسی بھی شدید تھی امی میرے سر ہانے بیٹھی رو رہی تھی تو ابو نے دیکھ لیا۔
”کیا ہوا اسے؟“ ابو اپنے مخصوص انداز میں بولے جس سے غصہ اور نفرت ٹپک رہی تھی۔

”پتا نہیں اس کا بخار کیوں نہیں اُتر رہا، کھانسی بھی کر رہی ہے۔“

ابو میرے قریب آئے تو چونک گئے اور گھبرا بھی گئے، کیوں کہ اتنے دنوں بعد اس نے مجھے غور سے دیکھا تھا۔

”یہ تمہاری رنگت کو کیا ہو گیا ہے، یہ..... یہ تو بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہے۔ چلو جلدی سے اشو ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔“

یہ ابو کے دل میں میرے لیے محبت تھی یا کوئی اور وجہ تھی۔ بہر حال وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے ٹیسٹ کروائے تو پتا چلا کہ مجھے ٹی بی ہے۔

”ڈاکٹر صاحب ہماری بیٹی کا جلدی سے علاج

کر دیا، پیسوں کی فکر مت کریں، بس اسے جلدی صحت یاب کر دیں۔“

گھر آ کر ابو نے ناقابل یقین باتیں کہیں۔
”سلونی بیٹا ہمیں معاف کر دے، ہم نے تم کو دکھ دیا، آئندہ ہم ایسا نہیں کریں گے، تمہارے ساتھ ہم بس وقت پر دوائیاں لیتا اور دیکھو ساری باتیں بھول جاؤ، زیادہ ٹینشن تمہارے لیے ٹھیک نہیں۔“
”ابو آپ۔“

”بس بیٹا کوئی سوال نہ کرنا، ہمیں احساس ہو گیا ہے اپنی غلطی کا۔“

میرا برابر علاج ہوتا رہا۔ اب تو مجھے کوئی ٹینشن بھی نہیں تھی۔ اس لیے میں بہت جلدی صحت یاب ہو گئی۔ دن رات کی طعنوں، دھمکیوں اور مارنے مجھے جس قدر نڈھال اور کمزور بنایا تھا اور جس قدر پریشانی دی تھی وہ ابو کی ایک بات سے ہی ختم ہو گئی۔ اب میں پہلے سے بھی زیادہ پُرکشش اور حسین نظر آنے لگی۔

☆.....☆

ایک شام ابو گاڑی لے کر آئے اور کہا ”سلونی چلو تجھے تیرے چچا کے گھر چھوڑ آؤں، رانی بھی تجھے یاد کر رہی ہے۔“

مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔ میں جلدی جلدی تیاری ہو گئی۔ چھوٹی بہن نے جانے کی خدشہ کی، لیکن ابو نے اسے ڈانٹا، وہ بے چاری خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئی۔ میں گاڑی میں بیٹھ تو گئی، لیکن دل میں طرح طرح کے دوسووں نے جنم لیا۔ کہیں ابو مجھے بچرے میں تو نہیں لے جا رہے ہیں..... نہیں..... ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنے آپ کو گھر کا۔ ابو تو اب بہت اچھے بن گئے ہیں۔ انہیں اپنی غلطیوں کا احساس بھی ہوا ہے، وہ تو اب مجھ پر کوئی ظلم نہیں کریں گے۔

میں یہی سوچ رہی تھی کہ ابو نے گاڑی کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔

میں نے جلدی سے کہا۔

”ابو ہم کہاں جا رہے ہیں..... چچا کا گھر تو پیچھے رہ گیا۔“ وہ کچھ نہیں بولے اور بدستور مسکرا رہے تھے۔ ابو کے اس فاتحانہ مسکراہٹ سے مجھے اندازہ تو ہوا کہ وہ کیا

کرنے جا رہے ہیں لیکن پھر بھی میں کبھی میں غلط سوچ رہی ہوں۔ اس لیے دوبارہ ابو سے پوچھا۔

”ابو ہم کہاں جا رہے ہیں؟ بتائیے نا ابو۔“ وہ مسکرا کر بولے۔

”آج اپنی بیٹا کو ہم ایک خوب صورت جگہ لے جانا چاہتے ہیں۔ بس تم آرام سے بیٹھ کر دیکھتی رہو۔“

ابو نے گاڑی ایک بڑی کونجی کی قریب روک لی۔ اندر داخل ہوتے ہی میرا سر چکرانے لگا۔ یہ کونجی مردوں سے بھری پڑی تھی، خاصے امیر اور عیاش لوگ لگ رہے تھے، جو ہاتھوں میں شراب کی بوتل لیے قہقہہ لگا رہے تھے۔ تیز موسیقی چل رہی تھی۔ چرس اور سگریٹ کی بو سے میرا دم کھٹ رہا تھا۔ میں نے روتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

”ابو.....؟“

”چپ! ابو نے آنکھیں نکال کر ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

”یہاں یہ سب درندے دیکھ رہی ہوتا..... اگر ان سے بچنا چاہتی ہے تو وہاں جا کر خاموشی سے بیٹھ۔ رانی کو غور سے دیکھ کہ وہ کس طرح مردوں کی توجہ اپنی طرف دلاتی ہے۔ اگلے دن تمہاری باری، یہ کہہ کر وہ نجانے کہاں غائب ہو گئے۔ میں اکیلے اتنی گھبرا رہی تھی کہ سخت سردی کے باوجود بھی ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔ میں نے ان مجرموں وغیرہ کے بارے میں پھوپھو سے سنا بہت تھا، لیکن اسے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میں نے پہلی بار مردوں کا اتنا ہجوم دیکھا تھا۔ اس کونجی میں دن نام کی کوئی چیز بھی تو وہ میں اور رانی تھیں۔ ان جنگلی جانوروں کے سامنے ہماری حیثیت اس بے بس چڑیا کی سی تھی جو اڑتا تو دور کی بات ہے ان کے مرضی کے بغیر مال بھی نہیں سکتی تھی۔

میرے خدا یا! پھوپھو ان سارے مردوں کے سامنے ناچتی تھیں؟ کیا پھوپھو اتنے مضبوط دل کی مالک تھیں؟ اسے ان درندوں سے بھی خوف نہیں محسوس ہو رہا ہوتا، تبھی تو وہ اتنی خوشی سے سٹکار کر کے یہاں آتی تھیں۔ کیا میں بھی اس کی طرح ایک دن یہاں.....؟ اس سے آگے سوچنا میرے لیے محال تھا۔

”نہیں نہیں..... خدا نہ کرے۔ میں زہر کھا کر زندگی کا خاتمہ کر لوں گی، لیکن ابو کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں کروں گی۔ اگر وہ مجھے یہاں سے جانے ہی نہ دے تو پھر..... پھر میں کیا کر سکوں گی، کیسے بچاؤ گی ان درندوں سے اپنے آپ کو.....؟ میرے خدایا کیا کروں میں۔“

اچانک میرے کانوں میں فرح کے الفاظ گونجنے لگے۔ ”دوست تمہیں تو لڑتا ہے، اپنی آبرو کی حفاظت کے لیے۔“ اس جملے نے کچھ وقت کے لیے مجھ میں ایک نئی طاقت پیدا کر دی، لیکن جیسے ہی میں گیٹ کے قریب پہنچی تو اس کو ایک بڑا تالا لگا تھا۔ قریب ہی چوکیدار بھی کھڑا تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں اور کھلے گریبان والا چوکیدار شکل سے ہی غنڈہ لگ رہا تھا۔ میں کچھ دیر امداد طلب نظروں سے اسے دیکھتی رہی، پھر وہ مسکرا کر قریب آیا اور کہا۔ ”کیوں بالی، باہر جانے کا ارادہ ہے کیا۔ یہ تو صبح سے پہلے کھل ہی نہیں سکتا۔ ہاں اگر تمہیں اس ہجوم میں رات گزارنا پسند نہیں اور نیند آ رہی ہے تو آؤ ہم تمہیں اوپر لے جاتا ہے۔ وہاں مکمل خاموشی ہے، آج بالی ڈرنا نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے زبردستی میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

”چھوڑو میرا ہاتھ، مم..... مم..... میرا ہاتھ چھوڑ دو، تمہیں خدا کا واسطہ، ورنہ میں چلاؤں گی۔ کوئی ہے..... بچاؤ۔“

”ارے بالی اس فقار خانے میں طوطے کی آواز کون سنتا ہے۔ چل شایاش..... ہم تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔“ اس سے پہلے کہ وہ مجھے گھسیٹتا ہوا اوپر لے جاتا، میری نظر اس کے ڈنڈے پر پڑی جو اس نے گیٹ کے قریب احتیاطاً رکھا تھا۔ میں نے جلدی سے وہ اٹھایا اور ایک ہاتھ میں جتنی طاقت ہو سکتی ہے وہ استعمال میں لا کر زور سے اس کے سر پر دے مارا، وہ درد سے کراہ اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑتھا لیا۔ میں جلدی سے اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئی اور رونے لگی۔

”اے خدا مجھ پر رحم فرما، مجھے ان درندوں سے بچا، بے شک تو ہی عزت دینے والا ہے۔“ تھوڑی دیر بعد رانی چپکتی ہوئی میرے پاس آئی۔

وہ ہلاکی خوب صورت لگ رہی تھی، مسکرا کر کہنے لگی۔ ”آداب سلونی جی..... آداب!“ وہ طوائفوں کے سے انداز میں بولی۔ ”کیوں سلونی آخر آئی گئی تاء، بہت غرور کر رہی تھی تو اپنے آپ پر، آج تیرا غرور خاک میں مل گیا۔ بڑی آئی آستانی بنے۔“ وہ غصے سے دانت پیستے ہوئے بولی۔

”خیر اب تو ہم دوست ہیں، پڑھنے میں کیا رکھا ہے یار۔ یہاں ہم تھوڑا ہی ناچتے ہیں، بلکہ دوسروں کو اپنے اشاروں پر نچاتے ہیں..... تو آج دیکھ ہم کتنا روپیہ کمائی ہیں۔“ میں بے بسی سے اسے دیکھتی رہی۔

رانی کی اداؤں پر ہر ایک مرد دل کھول کر اپنا پیسا لٹا رہا تھا۔ وہ بھی بھی اتنی خوب صورت کہ ہر ایک مرد والہانہ طریقے سے اس پر پیسے لٹاتا فریختے تھے۔ ابو اور چچا پیسوں کو تھیلے میں بھر بھر کر ایک طرف رکھ دیتے۔ میں نے ساری رات روتے ہوئی گزاری۔ فجر کی آذان ہوئی تو سب لوگ جانے لگے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی ابو نے کہا۔

”کہو سلونی کیسا لگا پروگرام، کتنا زبردست تھا، ہے نا! تمہیں پسند آیا؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور روتی رہی۔ گھر پہنچی تو امی نے بھی رورو کر مڑا حال کیا تھا۔ امی کو دیکھتے ہی میں ان کے قدموں میں گری اور بے ہوش ہو گئی۔

دوپہر کو جب مجھے ہوش آیا تو ابو کے علاوہ سب گھر والے کھڑے رورہے تھے۔ امی نے مجھے گلے لگا کر کہا۔ ”کیا ہوا سلونی مجھے بتا، تم کہاں تھیں ساری رات، تمہیں کچھ ہوا تو نہیں۔“ امی نے ایک ہی سانس میں سارے سوالات کر ڈالے۔

”امی ابھی کچھ نہیں ہوا، لیکن بہت کچھ ہو جائے گا، بہت کچھ۔ مجھے بچالیں امی، خدا کے لیے مجھے بچالیں۔ میں مر جاؤں گی، لیکن یہ کام کبھی نہیں کر سکوں گی۔“ میں نے رورو کر رات والا احوال بتایا۔

ابو اس وقت گھر سے باہر تھے۔ امی نے دادی کے کہنے پر جلدی جلدی کپڑے سنبھالے اور ہم ماموں کے گھر آ گئے۔

ابو کو پتا چلا تو آگ بگولہ ہوئے، لیکن پھر نجانے کیا سوچ کر خاموش ہو گئے۔ شاید یہ سوچ کر کہ ماموں غریب تھا اور وہ ہمیں زیادہ وقت اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا تھا، لیکن جب ہمیں ماموں کے گھر رہتے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تو انہیں فکر لاحق ہو گئی۔ وہ بھلا ہمیں اتنی آسانی سے کب چھوڑنے والے تھے۔ اس لیے ماموں کے گھر آ کر ان کی منتیں کرنے لگے کہ مجھے معاف کر دیں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ سلونی پر کوئی ظلم نہیں کروں گا اور نہ اسے غلط کاموں کے لیے مجبور کروں گا۔ آخر کار جرگے ہوئے اور ہم اس شرط پر گھر آ گئے کہ وہ دوبارہ ہم پر کوئی ظلم نہیں کرے گا۔

دو تین مہینے تو آرام سے گزر گئے، لیکن پھر ابو نے دوسری شادی کرنے کا ڈھونگ رچایا۔ امی نے بخوشی اجازت دے دی کہ چلو اس طرح تو میری بیٹیاں اس کے ظلم و ستم سے بچ جائیں گی۔

ابو نے ایک بیوہ طوائف سے شادی کی۔ نئی امی تین بیٹیوں کو چھوڑ کر ہمارے گھر آئیں۔ اب یہ نئی امی بھی ابو کو میرے بارے میں آکسانی تھی کہ تم اکیلے کیا کیا کرتے پھر وگے۔ کب تک ان سب کا بوجھ برداشت کرو گے، اب سلونی سے کام چلاؤ۔

”ٹھیک کہتی ہو تم، لیکن میں نے سب کو اسکول سے بھی اٹھوا دیا ہے اور یہ مجھ سے کسی چیز کی فرمائش بھی نہیں کرتے، تو پھر میں کیوں کر اسے بوجھ کی بات کہہ سکتا ہوں؟“

”ہائے ہائے بیدار بخت خان تیری عقل کو کیا ہوا ہے۔ لگتا ہے تم بوڑھے ہو گئے ہو۔ ارے میں کہتی ہوں یہ چھ افراد کچھ کھاتے پیئیں نہیں، کیا انہیں بھوک نہیں لگتی، تم روزانہ تھیلیاں بھر بھر جو سبزیاں لاتے ہو وہ کہاں جاتی ہیں۔ یہی لوگ ہی اسے ہڑپ کر کھا جاتے ہیں۔ ارے کچھ کرو وقت گزر گیا تو پھر ہاتھ ملتے رہو گے۔ ہم تو بھوکے مرجائیں گے۔“ نئی امی قدرے خفگی سے بولی۔

”بات تو تیری دل کو لگی، ویسے اب تو ہم دوسری کے بارے میں سوچ رہا ہوں، بلو بھی اب جوان ہو گئی ہے۔“ ”دوسری کو بعد میں دیکھا جائے گا، پہلے ”پہلی“ سے نمٹو۔“

ابو کے جذبات پھر سے جوش مار گئے اور پستول نکال کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”سلونی آج میں جتنی فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ لو ٹھکرو، پہن لو اسے اور چلنے کی تیاری کرو، ورنہ آج ہم تمہارے گلے گلے کر دیں گے۔“ وہ میری طرف ٹھکرو بھینکتے ہوئے بولے۔ میں حیران و پریشان کبھی انہیں اور کبھی ٹھکروؤں کو دیکھ رہی تھی۔

”لیکن ابو آپ نے تو وعدے.....“ ”ہاں وعدہ کیا تھا ہم نے۔“ وہ میری بات کاٹ کر بولے۔ ”لیکن اب میں گھر کے اخراجات پورا نہیں کر سکتا۔ گاڑی اور جتنے پیسے تھے وہ تو ہم نے اپنی شادی پر لگا دیے۔ اب میں اکیلا کیا کیا کرتا پھر دوں۔“ اس سے میرا چھوٹا بھائی شان بیچ میں آ گیا اور روتے روتے کہنے لگا۔

”ابو آپ کی وجہ سے ہم نے اسکول چھوڑ دیا، کپڑوں اور جوتوں کا مطالبہ کرنا چھوڑ دیا۔ اب آپ کیا چاہتے ہیں۔ میں لوگوں کی گاڑیاں صاف کروں گا، جوتے پالش کروں گا، لیکن آپ کے لیے پیسے لاؤں گا۔ پلیز ابو امی پر اور ظلم مت کرنا، آپ کی کومت مارتا۔“

امی بھی بول پڑی۔ ”ہاں بیدار بخت خان میں لوگوں کے گھروں میں کام کروں گی اور ان بچوں کا پیٹ پال لوں گی۔ آپ سے ہم کچھ بھی نہیں مانگیں گے لیکن خدا کے لیے۔“

”خاموش ہو جاؤ گستاخ۔ ان بچوں کو تو ہی سب باتیں سکھاتی ہے، تیری ہی وجہ سے آج یہ سب میرے سامنے کھڑے ہیں۔ تیرا تو آج میں کام ہی تمام کر دوں گا۔ تو ہی سارے فساد کی جڑ ہے۔“

”کر لے میرا کام تمام اور ان بچوں کا بھی، تنگ آ گئے ہیں ہم ایسی زندگی سے یوں گھٹ گھٹ کر بچنے سے تو بہتر ہے، ہم ایک بار ہی مرجائیں۔ تیرا کلیجہ اگر اس طریقے سے ٹھنڈا ہوتا ہے تو کر لے ہم سب کا کام تمام۔ تجھ میں ویسے بھی شرم نام کی کوئی چیز نہیں۔ اپنی بیٹی کو گندگی میں ڈال کر تم اپنے آپ کو باپ سمجھتے ہو؟ لعنت ہو ایسے باپوں پر جو اپنی بیٹیوں کی بربادی پر اپنے خواہشات کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر تجھے اتنا شوق ہے تو اپنی طوائف سے نمٹو۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنگ نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

وہ خود بھی غریب تھا اس لیے امی اس پر بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتی تھیں۔

خالہ نے ابو سے میرا رشتہ مانگ لیا۔ پہلے تو وہ انکار کرتے رہے لیکن پھر اصل بات کی طرف آئے کہ اگر وہ ایک لاکھ روپے دے تو رشتہ ممکن ہے۔

خالہ اگرچہ غریب نہیں تھی لیکن اتنی امیر بھی نہیں تھی۔ اس لیے اس نے منت کر کے 50 ہزار تک بات بیانی اور ایک مہینے کی مہلت لی۔

بہت منتوں کے بعد ابو آخر کار پچاس ہزار پر مان گئے۔ ویسے بھی وہ جان گئے تھے کہ سلونی کی جان بھی جائے تب بھی وہ ماننے والی نہیں، کیوں کہ وہ مجھے مانتے مانتے تمک گئے تھے۔

اب میں پندرہ سال کی ہو گئی تھی۔ ایک مہینے کے اندر اندر میری شادی ہو گئی اور یوں میں جہنم سے جنت میں داخل ہو گئی۔

میرا شوہر بہت عام سی شکل و صورت والا ہے، لیکن مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ میرا بہت خیال رکھتا ہے۔ میں عزت سے جینے کی خواہاں تھی جو مجھے مل گئی۔

رانی نے طوائف خاندان کے ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ کر شادی کی۔

پھوپھو نے جس کے ساتھ شادی کی تھی اس نے پھوپھو کو بہت عزت اور محبت دی، لیکن ایک بیٹا ہونے کے بعد وہ شخص انتقال کر گیا۔ اب وہ پھر سے ابو کے گھر رہ رہی ہے۔

میں اپنے آپ پر بیٹے ہوئے ظلم کو جب یاد کرتی ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے، لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اپنے گھر کی ہو گئی ہوں۔ خدا نے مجھے ایک بیٹا بھی عطا کیا ہے جس سے ماضی کی سب یادیں کسی قدر کم ہو گئی ہیں، لیکن بلو اور سوہنی کے بارے میں فکر ہوتی ہے کہ میری بہنیں کیا کریں گی، مجھے تو جو سہنا تھا سہ گئی۔

قارئین میری بہنوں کے لیے دعا کرتا کہ وہ اس ظلم سے بچ جائیں، جو مجھ پر بیٹے اور اللہ ابو کو نیکی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆.....☆

بیوی کو محفلوں میں لے جاؤ وہ تو ویسے بھی عادی ہے۔ تو نے میرے صبر کا پیمانہ لبریز کیا ہے بیدار بخت خان۔

خبردار جو میری بیٹی کو اب اور کچھ کہا۔

یہ پہلا موقع تھا جب امی نے ابو سے اس لمحے میں بات کی تھی، ورنہ وہ تو ابو سے اتنی ڈرتی تھیں کہ ان کے سامنے سانس لینا بھی بھول جاتیں۔

یہ سنتے ہی ابو پہلے حیران سے امی کو دیکھتے رہے اور پھر ان پر لاتوں کی پوچھاڑ شروع کر دی اور امی کو بھی اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئیں۔

”کینی مجھے کہتی ہے اپنی بیوی کو محفل میں لے جاؤ؟ وہ عزت ہے میری۔ خبردار جو اس کے بارے میں کوئی بات کی۔ زبان کاٹ ڈالوں گا تیری کتیا۔“

ابو کی نظر میں بیوی تو عزت کی حق دار ہوتی ہے، جبکہ بیٹی اور بہن کو تو وہ جانور سمجھتے ہیں۔ بیٹی یا بہن کی عزت ہائی رہے یا نہ رہے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

پھر وہ میرے ماتھے پر پستول رکھ کر غصے سے بولے۔ ”سلونی! میں چاہوں تو ابھی پستول کی ایک گولی سے تمہیں اڑا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں، لیکن اتنی آسانی سے نہیں کتیا۔ تم نے بہت ترایا ہے، میں تمہیں تڑپا تڑپا کر مار دوں گا۔ تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تو خود ہی موت کی بھیک مانگے گی، لیکن میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ میں تم پر تیزاب پھینکوا دوں گا۔ یاد رکھنا سلونی۔“ یہ کہتے ہی وہ غصے سے پیر پٹختا ہوا باہر نکلا۔

میں اور میرے چھوٹے بہن بھائی رورو کر امی کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ امی کو ہوش آیا تو دادی نے کہا۔

”بہو تو فکر مت کر، سلونی کو کچھ نہیں ہوگا۔ تو ایسا کر اپنی بہن کو فون کر کہ وہ سلونی کا رشتہ مانگ لے۔“

دوسری صبح میری خالہ آئیں۔ امی نے انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا کہ وہ ماموں کو نہ بتائیں۔ میرا گھر تو ویسے بھی برباد ہو چکا ہے، لیکن مجھے اپنے بچوں کی خاطر اس گھر میں رہنا ہے۔

امی کے صرف ایک ہی بھائی اور پانچ بہنیں ہیں۔

کہاں آ کے لٹے کارواں



ایم اشفاق بٹ

محبت کے قافلے میں لٹنے والے خزاں رسیدہ شخص کی کہتا

نہیں کرتا، لیکن میں کچے وعدے خود سے کرتا ہوں۔ منزل سامنے نظر نہیں آتی۔ میری تقدیر میرے پیار کی جاگیر میرے اپنے ہی دل میں قید ہے۔ میرا بچپن تجرات کے قریبی گاؤں میں گزارا، مجھ سے بڑے دو بھائی اور ایک بہن مجھ سے چھوٹی تھی۔ والد صاحب سرکاری ملازم تھے، گزر بسر ٹھیک ہو رہی تھی۔ سب سے بڑے بھائی ارشد نے ایم اے کرنے کے بعد ایک سرکاری کالج میں لیکچرر شپ حاصل کر لی تھی اور اس کے چند ماہ بعد ان کی شادی کر دی گئی، مجھ سے بڑے بھائی امجد اور چھوٹی بہن شازیہ کا رشتہ والد صاحب نے اپنے بھائی کے ہاں کر دیا تھا۔ امجد نے بی کام کر کے ملازمت شروع کر دی تھی، جبکہ میں ابھی فرسٹ ایئر میں تھا کہ والد صاحب کو ہارٹ ایفک ہوا اور وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ والد صاحب کی وفات کے بعد میری والدہ بیمار رہنے لگیں اور شوہر کی جدائی کا غم انہیں گھن کی طرح لگ گیا۔ ہم نے ان کی دلجوئی کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن ان کی حالت نہ سنبھلی اور تقریباً آٹھ ماہ کے بعد وہ بھی سفر آخرت کو سدھار گئیں اور یوں والدین کی شفقت کا سایہ ہمارے سروں سے اٹھ گیا۔ میرے ایف اے کے امتحان میں ابھی دو ماہ باقی

صحت بہت پیاری چیز ہے۔ اگر آپ کی صحت اچھی ہے تو آپ دنیا کے خوش قسمت انسان ہیں۔ دولت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر آپ کے پاس کروڑوں روپے ہیں اور آپ کی صحت اچھی نہیں ہے۔ آپ چل پھر نہیں سکتے، آپ دیکھ نہیں سکتے، آپ سن نہیں سکتے تو ایسی دولت کس کام کی۔ اللہ تعالیٰ ہم کو دنیا میں ہی جنت دکھاتا ہے۔ یہ آنکھیں جنت ہی ہیں۔ ہم ہر روز ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ہم دنیا میں رہ کر جنت کے نظارے دیکھ رہے ہیں۔ دل کو خوشیاں روزانہ ملتی ہیں، لیکن ہمیں خوشیاں نظر نہیں آتیں۔ دل تو بڑا معصوم ہے، بڑا پاگل ہے۔ یہ کبھی خوش نہیں ہوتا۔ اگر آپ کسی کو دکھ دیں گے تو آپ کو بھی دکھ ہی ملیں گے اور اگر خوشیاں دیں گے تو آپ کو بھی خوشیاں ہی ملیں گی۔ عورت محبت کرنے کے لیے ہوتی ہے، عورت سے نفرت کرنے والے انسان وحشی ہوتے ہیں۔ عورت کا دل بہت نازک ہوتا ہے۔ ایک بار ٹوٹ جائے تو پھر وہ جز نہیں پاتا۔ عورت بہت نا سمجھ ہوتی ہے، اپنا اچھا بُرا نہیں سمجھتی۔ محبت اندھی ہوتی ہے، عورت اندھی نہیں ہوتی۔ وہ زمانہ ضرور آئے گا جب کوئی میرے دکھوں کو اور خوشی کے آنسوؤں کو بار بار چمکائے گا۔ میں وعدے

کبھی کبھی وہ خود بھی رو پڑتی اور کہتی کہ بھیا مجھے سمجھ نہیں آتی کہ یہ لوگ آپ کو اتنا کم تر کیوں سمجھتے ہیں۔ آخر آپ ان کے بھائی ہیں، کوئی غیر تو نہیں ہیں۔ اگر آپ کو نوکری نہیں ملتی تو اس میں آپ کا کیا قصور ہے، آخر کیوں یہ آپ کو طعنے دیتے رہتے ہیں۔ آپ کو اب میں اسے کیا سمجھتا کہ باب اور بھائی میں یہی فرق ہوتا ہے۔ ابا جان نے انہیں اعلیٰ تعلیم دلوائی اور اس قابل بنایا کہ یہ مناسب روزگار حاصل کر سکیں۔ اب ابا جان اس دنیا میں نہیں ہیں، میری تقدیر میں شاید یہی لکھا ہے۔ میں اسے سلی دیتا کہ بچی تو کیوں پریشان ہوتی ہے۔ جب میں ان کی باتوں کا بُرا نہیں مانتا تو ان کی باتوں کو دل پر کیوں لیتی ہے۔ اگر اچھے دن نہیں رہے تو بُرے دن بھی نہیں رہیں گے۔ میں بہن کو تو مطمئن کر دیتا تھا، لیکن خود بے چین سا ہو جاتا تھا۔ زندگی کی گاڑی کو کھینچنے کے لیے مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ میں اپنی پوری کوشش کر رہا تھا، لیکن لگتا تھا کہ تقدیر ابھی مجھ پر مہربانی کرنے سے کتر رہی تھی۔ میرے بھائی اور بھائی کا رویہ شازیہ کے ساتھ بھی اچھا نہ تھا۔ اگر ابا جان بھائی کے رشتے کی بات چچا سے نہ کر

تھے۔ بھائیوں کا رویہ میرے ساتھ بدلنے لگا۔ خاص طور پر بھائی کسی نہ کسی بہانے مجھے نچا دکھانے اور بُرا بھلا کہنے کی کوشش کرتیں۔ ان کی جلی کٹی سن کر میں خون کے آنسو پی کر رہ جاتا۔ ”آمدن ہے کوئی نہیں اور اسے بڑھائی کا شوق چڑھا ہوا ہے۔ بڑھ لکھ کر کون سا تم نے ڈیپٹی کمشنر بن جانا ہے۔ کام سے جان چھڑانے کے لیے بڑھائی کا خوب ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ بھائیوں کی کمائی کی روٹیاں توڑتا ہے کھٹو کہیں کا.....“ یہ وہ طعنے تھے جو بھائی کی زبان سے نکل کر میرے دل کو زخمی کر جاتے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے ایف اے کیا اور بڑھائی کا شوق ہونے کے باوجود مزید بڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور نوکری تلاش کرنے لگا، لیکن جہاں ایم اے پاس ڈگریاں لے کر نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں وہاں ایف اے پاس کو نوکری کہاں سے ملتی تھی، لہذا نوکری کی تلاش میں ڈرڈر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ اس گھر میں میرے زخموں پر مرہم رکھنے والی صرف میری بہن شازیہ تھی۔ وہ ہر وقت میری دلجوئی کرتی رہتی تھی۔ مایوسیوں اور ناامیدیوں میں وہ مجھے اُمید کی کرن دکھاتی اور میرا حوصلہ بڑھاتی تھی اور



گئے ہوتے تو..... چچا بھی ہمارے ہی گاؤں میں رہتے تھے اور بھائیوں پر ان کا کچھ رعب و دبدبہ تھا۔ ویسے بھی امجد بھائی کی شادی چچا کی بیٹی سے ہوئی تھی، لہذا دونوں بھائی اور بھابی شاز یہ کو پروا داشت کر رہے تھے، ورنہ اس کے ساتھ بھی نہ جانے کیسا سلوک کرتے۔ ماں باپ کی وفات کے بعد چچا کے سوا باقی رشتے داروں سے میل جول بھی بھائیوں نے کم کر دیا تھا۔ صرف شادی و مرگ پر آنا جانا رہ گیا تھا۔ کراچی میں ہماری ایک خالہ رہتی تھیں، جب والدہ زندہ تھیں تو وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں بچوں کو لے کر آ جاتی تھیں، لیکن والدہ کی وفات کے بعد اور بھابی کا خشک مزاج دیکھ کر انہیں نے بھی آنا جانا کم کر دیا تھا۔ انہیں دنوں ان کی بڑی بیٹی کی شادی تھی۔ شادی کے کارڈ کے ساتھ خالہ کا خط بھی آیا تھا، جس میں شادی میں شرکت کی تاکید تھی۔ گجرات سے کراچی تک کا طویل سفر تھا اور دو تین دن قیام لازمی تھا، لہذا دونوں بھائیوں نے چھٹی نہ ملنے کا بہانہ بنایا اور مجھ سے کہا کہ تم شاز یہ کو ساتھ لے کر چلے جاؤ۔ اس طرح خالہ کو بھی گلہ نہ ہوتا اور چند روز کے لیے مجھ سے ان کی جان چھوٹ جاتی۔ اتفاق سے شادی سے ایک ہفتہ پہلے شاز یہ کو بخار ہو گیا جس سے وہ خاصی نقاہت محسوس کرنے لگی اور اس کی تیمارداری کے لیے چچا بھی آئے تھے۔ جب انہیں پتا چلا کہ ہم دونوں کا کراچی جانے کا پروگرام ہے، تو انہوں نے شاز یہ کو بھیجنے سے منع کر دیا کہ سفر طویل ہے، کہیں راستے میں طبیعت زیادہ خراب نہ ہو جائے، لہذا طے یہ پایا کہ میں اکیلا ہی کراچی جاؤں گا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، کراچی کا میرا یہ پہلا سفر تھا۔ اتنا لمبا سفر میرے لیے سوہان روح تھا، لیکن جانا بھی ضروری تھا۔ فارغ تو تھا ہی سوچا چلو کچھ دنوں کے لیے بھائیوں اور بھابی کے طعنے تو نہیں سننے پڑیں گے۔

میں ٹرین میں بیٹھ کر کراچی کے لیے روانہ ہوا۔ گاڑی میں خاصا رش تھا۔ میں نے سیٹ ریزرو بھی نہیں کروائی تھی۔ مجھے اتنا لمبا سفر کرنے کا اتفاق ہی کب ہوا تھا، پہلے تو میں پریشان ہو گیا پھر سوچا، ہو سکتا ہے اگلے کسی اسٹیشن پر چکے خالی مل جائے، لیکن اگلے اسٹیشن پر صورت حال یہ ہوئی کہ اگر دس مسافر اترتے تو بیس مسافر چڑھ آتے۔ بہت سے مسافر تو دروازے کے پاس اپنا سامان رکھ کر اس

کے اوپر بیٹھ گئے تھے۔ میں اپنا بیگ پاؤں کے پاس رکھ کر ڈبے کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ مجھے کھڑے ہونے ایک گھنٹہ گزر چکا تھا اور میری ٹانگوں میں درد ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ اگر کراچی تک مجھے ایسے ہی سفر کرنا پڑا تو میرا کیا حشر ہوگا۔

میں ابھی اسی سوچ بچار میں تھا کہ سامنے سیٹ پر بیٹھے ایک نوجوان نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں جب اس کے قریب گیا تو وہ مجھے کچھ شناسا لگا اور پھر جب میں اس کے قریب گیا تو پھر جب اس نے یاد دلایا کہ وہ میٹرک میں میرے ساتھ پڑھتا رہا ہے تو مجھے یاد آ گیا، وہ جمال تھا۔ اس نے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص سے میرا تعارف کر دیا اور بتایا کہ یہ میرے ماموں ہیں۔ انہوں نے گوجر والہ جانا ہے۔ تم یہاں بیٹھ جانا۔ گوجر والہ اسٹیشن پر جمال کے ماموں اتر گئے اور یوں مجھے بیٹھنے کو جگہ مل گئی۔ میں نے جمال سے اس کی موجودہ مصروفیات کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں راولپنڈی میں ملازمت کرتا ہوں، والد صاحب کراچی میں ملازمت کرتے ہیں، ٹیلی فون کے محکمے میں، میں ان سے ملنے کراچی جا رہا ہوں۔ جب مجھے پتا چلا کہ جمال بھی کراچی جا رہا ہے تو مجھے اور خوشی ہوئی، کیوں کہ اتنا طویل سفر تنہا کاٹنے کے تصور سے ہی میں ہلکان ہو رہا تھا۔ جمال نے جب مجھ سے میرے بارے میں پوچھا تو میں نے اسے اپنی تمام پینا سنادی۔

میرے حالات سن کر جمال کچھ دیر خاموش رہا، پھر مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ تم فکر نہ کرو میں تمہیں اپنے والد سے ملواؤں گا وہ ضرور تمہارے لیے ملازمت کا بندوبست کر دیں گے۔ جمال میرے لیے فرشتہ ثابت ہو رہا تھا۔ ملازمت میرے لیے اس وقت اہم ضرورت تھی۔ بھائیوں اور بھابی کی باتیں سن کر میں عاجز آ گیا تھا، ویسے بھی حالات اس انتہا پر پہنچ گئے تھے کہ جتنی جلدی مجھے ملازمت مل جائے اتنا ہی میرے حق میں بہتر تھا۔ جمال کی رفاقت میں طویل سفر بغیر کسی اذیت سے گزر گیا۔

کراچی پہنچ کر جمال نے اپنے والد صاحب کا پتا دے دیا اور مجھے تاکید کی کہ میں کل شام کا کھانا ان کے ہاں کھاؤں۔ میں وعدہ کر کے ٹیکسی میں سوار ہو کر ملیر کے

علاقے ماڈل کالونی کی طرف روانہ ہوا۔ ڈرائیور کے تعاون سے میں خالہ کے گھر پہنچ گیا۔ خالہ کا گھر ان کی معاشی آسودگی کا پتا دیتا تھا۔ خالہ کی تین بیٹیاں تھیں۔ لبتی، سمیعہ، طیبہ جبکہ بٹا کوئی نہیں تھا۔ خالہ خالو اور ان کی تین بیٹیاں بڑے تپاک سے ملیں، دیگر گھر والوں کے نہ آنے کا سبب پوچھا تو میں نے بتایا۔ خالہ سن کر بڑی حسرت بولیں۔ ”چلو میری مرحومہ بہن کے گھر سے کوئی تو آیا، ورنہ جب سے بہن فوت ہوئی ہے، آپ لوگ تو ہمیں بھول ہی گئے ہیں۔“ میں ان کی باتوں کا کیا جواب دیتا، اس لیے خاموش رہا۔

مجھے خاموش دیکھ کر چھوٹی طیبہ بولی۔

”امی جان آپ تو ہر کسی کے سامنے اپنے دکھڑے لے کر بیٹھ جاتی ہیں، آئیں بھائی جان آپ پہلے آرام کر لیں باقی باتیں کھانے پر ہوں گی۔“

وہ مجھے ایک کمرے میں چھوڑ کر چلی گئی۔ تھکاوٹ اور نیند کا غلبہ تو تھا ہی، لہذا میں بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اگلے دن میں خالہ کو بتایا کہ جمال کے والد صاحب سے ملنے گیا۔ جمال پہلے ہی والد صاحب سے میرا ذکر کر چکا تھا، لہذا مجھے وہاں لمبی چوڑی تمہید باندھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جمال کے والد صاحب نے پوچھا۔ ”بیٹے تم کس قسم کی ملازمت چاہتے ہو۔“

”میں نے کہا اٹکل حالات ایسے ہیں کہ جیسی بھی مل جائے قبول ہوگی۔“

انہوں نے کہا کہ ”ہمارے محکمے میں آپریٹر کی آسامیاں خالی ہیں۔ ایف اے پاس لڑکوں کی ضرورت ہے۔ چند روز پہلے اخبار میں اشتہار آیا تھا، ابھی درخواست دی جا سکتی ہے۔ اگر تم چاہو تو درخواست دے دو، باقی میں سنبھال لوں گا۔“

ان کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ ملازمت تو یہاں مجھے مل جائے گی، لیکن رہائش کا کیا ہوگا؟ شروع میں پانچ ہزار یا چھ ہزار تنخواہ ہوگی۔ اس میں الگ مکان لے کر کیسے رہا جا سکتا ہے۔ مجھے سوچ میں مگن دیکھ کر جمال بولا۔

”یار نعمان تم کس سوچ میں پڑ گئے، اگر رہائش وغیرہ کا مسئلہ ہے تو تم ابا جان کے ساتھ رہ سکتے ہو۔ انہیں محکمے کی طرف سے قلیل ملا ہوا ہے۔“ جمال کے والد صاحب

نے بھی تائید دی، میں نے باقی فیصلے بعد پر چھوڑے اور وہیں بیٹھ کر درخواست لکھ دی۔ جمال کے والد نے کہا کہ تم درخواست دے دو میں جمع کرادوں گا اور تم ٹیسٹ و انٹرویو تک اسناد گھر سے منگوا لو، وہ میں بعد میں درخواست کے ساتھ لگا دوں گا۔ میں نے جمال اور اس کے والد صاحب کا شکریہ ادا کیا اور کھانا کھا کر ان سے اجازت لی اور واپس خالہ کے گھر آ گیا۔

جب میں نے خالہ کو بتایا کہ میری نوکری کا بندوبست ہو گیا ہے تو سب بہت خوش ہوئے، لیکن جب میں نے یہ بتایا کہ میں جمال کے والد صاحب کے ساتھ رہوں گا، تو خالہ سخت ناراض ہوئیں اور بولیں۔

”بھلا اپنا گھر چھوڑ کر کسی غیر کے گھر کیوں رہو گے۔ میں تو پہلے کہتی تھی کہ بہن کے مرنے کے بعد تم لوگ آنا جانا بھی چھوڑ دو گے۔ میں تمہاری ماں نہ سہی خالہ تو ہوں، تم اگر ہمیں اپنا سمجھتے تو اس طرح بات نہ کرتے۔“ اتنا کہتے ہوئے خالہ اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔ میں خود بھی آبدیدہ ہو گیا۔ ایک سگے بھائی تھے جو میرا وجود پروا داشت نہیں کرتے تھے اور ایک یہ خالہ تھیں کہ اپنے گھر رکھنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ جب باقی گھر والوں نے بھی اصرار کیا تو میں نے خالہ کے ہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے اپنی بہن شاز یہ بہت یاد آ رہی تھی۔ اس گھر میں وہی تو تھی مجھ سے محبت کرنے والی۔

میں نے اسے کال کر کے ساری صورت حال بتادی اور اسناد وغیرہ فیکس کرنے کا کہا۔ اگلے تین چار دن شادی کے ہنگاموں میں گھر کی مصروفیات میں گزر گئے۔ لبتی کی شادی ہو گئی۔

سمیعہ اور طیبہ خوش طبیعت کی مالک تھیں۔ سارا گھر ان کے ہتھوں سے گونجتا رہتا۔ لبتی کی شادی کے بعد خالہ کا گھر کچھ آداس آداس لگنے لگا، لیکن طیبہ کی شوخی اور شرارتیں اس آداسی کو کم کیے دیتی تھیں۔ سمیعہ جس کو کبھی سہی کہتے تھے، اس کی طبیعت دونوں بہنوں سے مختلف تھی۔ وہ بہت کم مجھ سے بات کرتی تھی، اس لیے میں نے بھی اسے محسوس نہ کیا۔ چند روز کے بعد میرا ٹیسٹ اور انٹرویو ہوا اور یوں مجھے محکمہ ٹیلی فون میں آپریٹر کی جاب مل گئی۔

میں نے جمال کا اور اس کے والد صاحب کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور پھر میں نے شاز یہ کو کال کر کے خوش

خبری سنائی۔ اس نے میرے لیے ٹیک خواہشات کا اظہار کیا۔ ملازمت ملنے پر بھائیوں اور بھابی کی طرف سے بھی مبارک باد کی کال آئی۔ میں نے ملازمت شروع کر دی اور خالہ کے گھر رہنے لگا۔

خالہ کے گھر میں مجھے بہت اپنائیت ملی، میرا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا۔ شام کو کبھی کبھی ہم آئس کریم کھانے کے لیے چلے جاتے تھے۔ طیبہ آئس کریم کی بہت شوقین تھی۔ کوئی بات ہوتی وہ کہہ اٹھتی۔ ”واہ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، اسی خوشی میں آج شام کو آئس کریم کھانے چلیں گے۔“ اس کی اس بات پر ایک بھر پور قہقہہ ابھرتا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہی مجھ سے کچھ نرمی کی رہتی ہے۔ کبھی مجھے لگتا جیسے وہ کوئی بات مجھ سے کہنا چاہتی ہے، لیکن کچھ نہیں پانی۔ کھانے کی میز پر یا چائے کے دوران مجھے محسوس ہوتا جیسے مجھے کوئی دیکھ رہا ہے۔ جب میں سر اٹھا کر دیکھتا تو یہی کو اپنی طرف متوجہ پاتا۔ جو کئی آنکھیں چار ہوتیں، وہ آنکھیں جھکا لیتی۔

میں جوں جوں کسی کے بارے میں سوچتا میری بے چینی اور پریشانی میں اضافہ ہو جاتا۔ خالہ اور خالو نے ایک ایسے وقت میں، جب میرے گئے بھائی میرا وجود بوجھ محسوس کرتے تھے، مجھے اپنے بیٹے کی طرح اپنے گھر میں جگہ دی، میں ان کے احسانوں تلے دبا ہوا تھا، لیکن یہی کاروبار مجھے احساس فراموشی پر اکسار رہا تھا۔ وہ میری خالہ کی بیٹی تھی۔ خاندان میں اس طرح کے رشتے ہوتے رہتے ہیں۔ شازیہ اور امجد بھائی کا رشتہ بھی تو چچا کے گھر ہوا تھا، لیکن یہاں صورت حال مختلف تھی۔ خالو کی اپنی مالی حیثیت ٹھیک تھی، جبکہ میں معمولی ملازم تھا اور خالہ کے گھر میں مقیم۔ آخر ایک اعتماد تھا تو انہوں نے مجھے اپنے گھر میں جگہ دی تھی، پھر میں ان کے اعتماد کو کس طرح ٹھیس پہنچا سکتا تھا، لڑکیاں تو ہوتی ہی بے وقوف ہیں۔ وہ ہواؤں میں محل بنانے اور پانی کی سطح پر لکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ میں کس طرح اس کے ساتھ اس کے سراب کے پیچھے بھاگ سکتا تھا۔ میرا ضمیر اس کے لیے آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ یہ سب میرا وہم بھی ہو سکتا ہے اور پھر میں خدا سے دعا کرتا کہ یہ واقعی میری غلط فہمی ہو، کیوں کہ ابھی میں نے اپنا مستقبل بنانا تھا۔ شازیہ کی

شادی کے سلسلے میں اپنا فرض بھی ادا کرنا تھا۔ میں شازیہ کو جہیز میں زندگی کی ہر آسائش دینا چاہتا تھا۔ بھائیوں نے اپنے طور پر اس کے جہیز کے لیے بندوبست کر رکھا تھا۔ میں نے حکمانہ ترقی کے لیے ملازمت کے ساتھ ساتھ بی اے کی تیاری بھی شروع کر دی تھی۔ اگر میں ابھی سے عشق و محبت کے چکروں میں پڑ جاتا تو اپنی منزل کو نہ پاسکتا۔ تقدیر نے بڑی مشکلوں سے ایک موقع فراہم کیا تھا۔ میں نے اگر یہ موقع بھی گنوا دیا تو پھر ہمیشہ ٹھوکریں کھاتا رہوں گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے کبھی کسی کو یہ احساس ہی نہ ہونے دیا کہ میں اس کی نظروں کو منہ بوم سمجھتا ہوں۔ میں ایک قدم بھی اس راستے پر نہیں رکھنا چاہتا تھا جو راستہ رسوائیوں کا راستہ ہو سکتا ہے، جو میرے مستقبل، میری آنا اور خودداری کی قل گاہ تک جاسکتا ہے۔ میں کئی روز تک بڑی تنہائی سے اس مسئلے پر غور کرتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے اب یہ گھر چھوڑ کر الگ فلیٹ لے لینا چاہیے۔ اب میری تنخواہ اتنی تھی کہ میں الگ فلیٹ لے کر رہ سکتا تھا، لہذا ایک روز کھانے کی ٹیبل پر میں نے خالہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”خالہ جان میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔“ خالہ بولیں۔ ”ہاں بیٹا اس میں پوچھنے والی کون سی بات ہے، لیکن آپ اس کا غلط مطلب نہیں لیں گی۔“ میں نے حوصلہ کر کے کہہ ہی دیا۔ خالہ جان آپ نے جس طرح مجھے محبت دی اور ہر طرح سے میرا خیال رکھا۔ میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں آپ سب کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ الگ فلیٹ لے کر رہ سکتا ہوں، اس لیے آپ مجھے اجازت دیں کہ میں..... خالہ نے میری بات پوری نہ ہونے دی اور کہنے لگیں۔ ”ہم نے تمہیں غیر سمجھ کر نہیں اپنا بیٹا سمجھ کر اس گھر میں رکھا تھا۔ ہمارا کون سا کوئی بیٹا ہے۔ تمہارے یہاں رہنے سے ہمارے بیٹے کی پوری ہوئی اور تم ہو کہ غیروں جیسی باتیں کر رہے ہو، اگر تمہیں اس گھر میں کوئی تکلیف ہے۔“

”نہیں خالہ جان میرا تو آپ نے اس طرح خیال رکھا ہے کہ میں اسے ساری زندگی فراموش نہیں کر سکتا۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ.....“

خالہ نے پھر میری بات کاٹ دی۔ ”تمہیں الگ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں، تم یہیں رہو گے۔“ خالہ نے فیصلہ سنایا اور میں نے خاموشی سے ان کے فیصلے کے آگے نہ چاہتے ہوئے سر جھکا دیا۔ خالہ نے مجھے کہا اور فوراً بول اٹھیں۔

”یہ ہوئی نا بات۔ اس خوشی کے موقع پر سب کو میری طرف سے آئس کریم کی ٹریٹ۔“ سب ہنس دیے۔ میں نے آنکھوں سے کسی کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ بھی کھل اٹھا تھا۔

اکل روز کسی میرے کمرے میں آئی اور عجیب انداز میں میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے۔“ میرے اتنا کہنے کی دیر بھی کہ جیسے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ سیلاب جونہ جانے کب کاڑکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں ہی نہیں وہ بھی مجھ پر برس رہی تھی۔

”دوسروں کی محبت کی یوں توہین کی جاتی ہے۔ کیا آپ کے نزدیک دل کاچ کے کھلونے ہیں جنہیں جب چاہا توڑ دیا۔ کیا آپ کے نزدیک کسی کے جذبات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر بڑے شوق سے یہ گھر چھوڑ کر چلے جائیں۔ آپ کو جانے کی بات کرنے سے پہلے یہ تو سوچ لینا چاہیے تھا کہ آپ کی اس بات سے کسی کے دل پر کیا گزرے گی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اتنے عرصے میں آپ کو اپنی محبت کا احساس نہ دلا سکی۔ میری محبت میں شاید کوئی کمی تھی۔ میں اپنی نظروں میں آپ گر گئی ہوں، لیکن آج میں آپ کو بتا دیتا چاہتی ہوں کہ جس دن آپ یہ گھر چھوڑ کر گئے، میں یہ دنیا چھوڑ دوں گی۔“

میں نے لاکھ خود کو سمجھانا چاہا کہ جو تنہائی نظروں کا مفہوم نہیں سمجھتا، جس کا دل تمہارے دل کے ساتھ نہ دھڑکتا۔ آخر تم کیوں اس کے پیچھے دیوانی ہو رہی ہو۔ میں اپنی زندگی آپ کے نام کر چکی ہوں اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے کہ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اتنا کہہ کر وہ آنسو پونچھتے ہوئے باہر نکل گئی۔

میں عجیب کشمکش میں پڑ گیا تھا۔ اس گھر میں مجھے بہت محبت ملی تھی، لیکن کسی کی محبت نے مجھے آزمائش میں

ڈال دیا تھا۔ یہی بہت خوب صورت، حساس اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی، لیکن میری اس گھر میں حیثیت ایسی تھی کہ میں کسی کو پسند کرنے کے باوجود اس سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ خالہ کو جب اس بارے میں پتا چلے گا تو وہ کیا سوچیں گی۔ چند دنوں بعد گھر سے بھائی نے کال کی کہ چچا شازیہ کی شادی کی تاریخ مانگنے آئے تھے۔ اگلے ماہ کی بارہ تاریخ طے پائی ہے، تم یکم کو چھٹی لے کر آ جانا، میں نے یکم سے پہلے چھٹی لی اور خالہ کو مطلع کیا۔ شادی میں شرکت کی تاکید کی اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ سب آئیں گے۔ میں نے جو رقم پس انداز کی تھی وہ ہمراہ لی اور گھر آ گیا۔ میرے پاس جتنی رقم تھی، میں نے بھائی کے حوالے کر دی۔ شازیہ کے لیے میں بہت سی چیزیں خرید کے لایا تھا۔ شازیہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ بھائیوں اور بھابی کا رویہ بھی اب میرے ساتھ ٹھیک تھا، کمانے جو لگ گیا تھا۔

میں اب ان پر بوجھ نہیں تھا۔ شادی سے دو دن پہلے خالہ خالو، کسی، طیبہ بھی آئیں۔ شادی کا مرحلہ خیریت سے ختم ہوا اور ہم کراچی آ گئے۔ کراچی آ کر میں کسی سے نظریں نہ ملاتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری نظروں سے بھی محبت کا پیغام پڑھ لے اور پھر ایک سراب کے پیچھے بھاگنا شروع کر دے۔ میں اب خود بھی کسی سے محبت کرنے لگا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ کسی کے آنسو پونچھ کر اس سے اپنی محبت کا اظہار کروں، لیکن میں نے خود کو قابو میں رکھا۔ میں نے اسے اپنی محبت کا احساس نہ ہونے دیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ باز آ جائے، مجھ سے مایوس ہو جائے اور میں خالہ اور خالو کی نظروں سے گرنے سے بچ جاؤں۔ کسی مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کر چکی تھی۔ اس کے بعد بھی میری بے رخی سے وہ کچھ اُداس رہنے لگی تھی۔ مجھے اس کی حالت پر ترس بھی آتا تھا اور پیار بھی۔ صرف میری آنا اور خودداری کی وجہ سے، میں ایک معصوم لڑکی کی محبت کے پاکیزہ جذبوں کو نظر انداز کر کے اس کا دل تڑپا رہا تھا، لیکن میں جو کچھ کر رہا تھا، ٹھیک کر رہا تھا۔ چند ہی دنوں میں مجھے احساس ہوا کہ جیسے طیبہ کو اس صورت حال کا پتا چل چکا ہے۔ وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں کبھی مجھے اور کبھی کسی سے چھیڑ خانی کرتی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کسی

نے خود اسے اپنا راز دار بنایا تھا یا اسے خود ہی اس معاملے کی بھنگ بڑھ گئی تھی۔ یہ بات میرے لیے تشویش کا تھی، کیوں کہ اگر طیبہ کو پتا چل سکتا تھا تو خالہ اور خالو کو بھی اس معاملے کی ہوا لگ سکتی تھی۔ میں اس بارے میں فکر مند رہنے لگا اور یہی سے گفتگو میں مزید احتیاط کرنے لگا۔ ایک دن طیبہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔

”بھائی جان آپ کو پتا ہے کہ آپ کی محبت کرتی ہے۔ وہ آپ کی محبت میں اس قدر آگے نکل چکی ہے کہ اگر اب آپ انہیں نہ ملے تو شاید وہ خودکشی کر لے وہ اتنی حساس ہیں..... کہ مجھے اب ان کی طرف سے فکر رہنے لگی ہے اور وہ کہیں کچھ کر ہی نہ لے، لہذا آپ نے جو بھی فیصلہ کرنا ہے، جلدی کر لیں اور مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیں۔“

وہ اس قدر سنجیدگی سے بات کر رہی تھی کہ میں حیران رہ گیا۔ اس کی باتوں نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ”طیبہ تم جانتی ہو کہ اس گھر میری پوزیشن کیا ہے۔ میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے، میرے چاہنے سے کیا ہو سکتا ہے تم کسی کو سمجھاؤ کہ خود کو تقدیر کی لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دو۔ وہ جہاں لے جائیں سو لے جائیں، ورنہ زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ مجھے اس گھر سے تحفظ اور محبت ملی ہے۔ خالہ نے مجھے اپنے بیٹوں کی طرح رکھا ہے۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا کہ جس سے خالہ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچے۔ میں نے کسی سے اسی لیے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا، ابھی کسی یہ سمجھ رہی ہے کہ اس کی محبت یکطرفہ ہے۔ اگر اسے علم ہو گیا کہ میں بھی اس سے محبت کرتا ہوں اور حالات نے ہمارا ساتھ نہ دیا، ہم نے مل پائے تو خود سوچو اس کی حالت کیا ہوگی۔ میں تم سے یہی کہوں گا کہ جب تک حالات ہمارے حق میں نہیں ہو جاتے، تم اسے نہ بتانا۔“

طیبہ کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بولی۔ ”یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں، میں صرف آپ کی رائے لینا چاہتی ہوں کہ آپ اس بات پر راضی ہیں یا تو بس ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

چند روز کے بعد میں دفتر سے گھر آیا تو دیکھا چچا جان، بھائی جان، بڑی بھابی خالہ کے گھر موجود تھے۔

میں انہیں دیکھ کر حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے ان سے آنے کی وجہ پوچھی تو پتا چلا کہ وہ میرے لیے کسی کا رشتہ مانگنے آئے ہیں۔ طیبہ نے کانچ کر کے انہیں پتا نہیں کیا بتایا کہ وہ رشتہ مانگنے آ گئے۔ میں خوش بھی تھا۔ جب چچا نے خالہ سے بات کی تو وہ بولیں۔

”نعمان نہایت سعادت مند لڑکا ہے۔ میں اس کے حسن اخلاق اور حسن کردار سے بہت متاثر ہوں۔ اسے میں نے بہت پہلے ہی اپنا بیٹا بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس لیے ہماری طرف سے ہاں ہی سمجھیں۔“ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ آج مجھے یقین ہو گیا کہ کسی کو کچھ سے کس قدر محبت ہے۔

میرے دل میں جو خدشات تھے وہ بے بنیاد نکلے اور خالہ نے بڑی محبت اور خوشی سے یہ رشتہ منظور کر لیا تھا۔ شادی ایک سال بعد ہونا قرار پائی تھی، تاکہ اس وقت تک میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں۔ کچھ عرصے بعد میں نے محسوس کیا کہ اب میرا خالہ کے گھر رہنا مناسب نہیں ہے۔ جب میں نے خالہ سے بات کی تو انہوں نے بھی اجازت دے دی، کیوں کہ اب نے ان کی بیٹی کو پیارنے آنا تھا۔ میں نے ایک مناسب سالیٹ کرایہ پر لے لیا اور شادی کی تیاریاں کرنے لگا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ میں مسرتوں کی وادی میں گم ہوتا جا رہا تھا۔ کراچی میرے لیے بڑا اچھا ثابت ہوا تھا۔ اس شہر نے مجھے بڑی خوشیاں اور بڑا مقام دیا تھا اور اب ایک محبت کرنے والی بیوی میری زندگی میں آنے والی تھی۔ میں اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے لگا تھا۔ اب میں خالہ کے گھر بہت ہی کم جاتا تھا۔ اگر جاتا بھی تو کسی میرے سامنے نہ آتی تھی اور میں کچھ دیر کے بعد واپس پلٹ آتا اور ایک دن میں خالہ کے گھر گیا، کچھ دیر کے لیے۔ خالہ کچن میں گئیں تو میں نے طیبہ سے کسی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بڑی افسردگی سے بتایا کہ بھائی جان جب سے آپ دونوں کا رشتہ طے ہوا ہے۔ باجی کو جیسے چپ لگ گئی ہے۔ دکھ کی پرچائیاں ان کے چہرے پر عیاں ہونے لگی ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ اس شادی پر خوش نہیں ہیں۔ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”طیبہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔ یہی نے خود مجھ سے کہا تھا اور تم نے بھی اس کی تصدیق کی تھی کہ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی، پھر یہ اچانک تبدیلی کیسی، ضرور تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی؟“

اب میرا اس سے ملنا مناسب نہیں ہے۔ طیبہ تم ہی پتا چلاؤ اسے کیا پریشانی ہے۔ طیبہ نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اصل بات کا پتا لگائے گی۔ میں خالہ سے ملے بغیر وہاں سے اٹھ آیا۔ طیبہ کی بات نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ جو لڑکی میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی، وہ مجھ سے شادی پر خوش نہیں تھی۔ چند دنوں کے بعد میں پھر خالہ کے ہاں گیا اور موقع ملے ہی طیبہ سے پوچھا۔

”کچھ پتا چلا۔“ وہ بولی۔ ”آپ کو تو پتا ہے کہ آپ کی بہت حساس طبیعت کی مالک ہیں۔ وہ آپ سے بے پناہ محبت کرتی تھیں اور اس کا اظہار بھی انہوں نے آپ سے کیا تھا۔ وہ سمجھتی ہیں کہ آپ کو ان سے محبت نہیں ہے، ورنہ آپ اس کا اظہار ضرور کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ صرف میرے کہنے پر شادی کے لیے راضی ہوئے ہیں اور چون کہ آپ کے گھر والوں کو بھی میں نے بلایا تھا، اس لیے وہ سمجھتی ہیں کہ آپ یہ شادی مجبوراً یا پس ایسے ہی کر رہے ہیں۔ آپ کی کا کہنا ہے کہ وہ کسی ایسے شخص سے کیسے شادی کر سکتی ہے جسے اس کے ساتھ محبت ہی نہ ہو، جو اتنے عرصے تک میری محبت کو ہی نہ سمجھ سکا۔ اس کے ساتھ کیا زندگی گزارنی۔ اگر امی ابو نے ہاں نہ کر دی ہوتی تو میں اس شادی سے انکار کر دیتی۔“

طیبہ کے الفاظ میری سماعت پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہے تھے۔ میں نے طیبہ سے انتہائی پلیر طیبہ اسے سمجھاؤ اسے بتاؤ کہ میں اس سے محبت کرتا تھا، لیکن محبت کے اظہار میں کیا رکاوٹیں حائل تھیں۔ اگر مجھے اس سے محبت نہ ہوتی تو میں اس سے شادی پر کیوں کر راضی ہوتا، کیا صرف کسی کا دل رکھنے کے لیے کوئی کسی سے شادی پر تیار ہو جاتا ہے جس کے ساتھ ساری زندگی اکٹھے گزارنی ہوتی ہے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا ہے، لیکن وہ کہتی ہیں کہ تم صرف میرا دل رکھنے کے لیے یہ سب کچھ کہتی ہو۔ میں نے طیبہ سے کہا کہ تم اسے پھر سمجھاؤ، میری

طرف سے اسے یقین دلاؤ۔ اگر پھر بھی اسے یقین نہ آیا تو پھر میں خود اس سے بات کروں گا۔

میں جتنی دیر وہاں رہا، یہی مجھے نظر نہ آئی۔ میں خالہ سے اجازت لے کر واپس آ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شادی کے بعد اسے یقین آ جائے گا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں یا نہیں۔ میں اسے اپنے دل کی کیفیت بتاؤں گا اور اسے اپنی مجبوری بتاؤں گا..... کہ میں کیوں اس سے اظہار محبت نہیں کر رہا تھا، لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ ایک روز طیبہ کی کال آئی کہ بھائی جان آپ نے بہت سی خواب آور گولیاں کھالی ہیں۔ فوراً چنچیں۔ میں دیوانہ وار خالہ کے گھر پہنچا، لیکن تب تک کسی اس دنیا کو چھوڑ چکی تھی۔ سارا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی طیبہ مجھ سے لپٹ کر روتے ہوئے کہنے لگی۔ ”بھائی جان آپ کی کو ہماری بات کا یقین نہیں آیا تھا اور وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔“ میرے تو ہوش و حواس کھو گئے۔ جب ہوش آیا تو میری دنیا ہی لٹ چکی تھی اور کسی کو منوں مٹی تلے دبا دیا گیا تھا اور میں آخری دفعہ اپنی محبت کا دیدار بھی نہ کر سکا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کسی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

میں جو خالہ کی نظروں سے گرنے سے بچنے کے لیے کسی سے اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا۔ آج خالہ کے سامنے نظریں نہیں اٹھا پارہا تھا۔ کسی تم نے فیصلہ کرنے میں بہت جلدی کی ہے۔ ایک بار مجھے صفائی کا موقع تو دیتیں۔ جب ہمارا ایک ہونے کا وقت آیا تو تم ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ گئیں۔ میں تو تمہیں ہم سفر بنانا چاہتا تھا، تمہارا ہاتھ پکڑ کر زندگی کی آخری سانس تک سفر کرنا چاہتا تھا، لیکن کہاں آ کے لٹ گیا کارواں، اس کا پتا نہیں تھا۔ کراچی شہر مجھے کاٹنے کو دوڑنے لگا تھا۔ میں جس شہر کو اپنی خوشیوں کا گہوارہ سمجھ رہا تھا، وہ میری خوشیوں کا قاتل نکلا تھا۔ میں کراچی شہر چھوڑ کر دوبارہ اپنے گاؤں آ گیا۔ آج مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا سب کچھ لٹ چکا ہے۔ بہار مجھ سے روٹھ گئی ہے اور میں دوبارہ خزاؤں کی زد میں ہوں۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے ازل سے ہی خزاں میرا نصیب ہے۔

☆.....☆

ادھوری محبت

نیم سحر

ادھوری محبت کا شکار، ایک مرد کی سچ بیانی

میرا نام عمران ہے۔ یہ کہانی میرے دوست محمود کی ہے جو کہ میرا کافی پرانا دوست ہے۔ وہ بہت اچھا، مخلص، محبت کرنے والا اور نرم گو شخص تھا، لیکن قسمت نے اس کے ساتھ کچھ زیادہ اچھا نہیں کیا۔ اپنی کے علاوہ دوسروں کی بے وفائی نے بھی اس کو بالکل دنیا سے دور کر دیا تھا۔ چوں کہ میں اس کے حالات سے واقف ہوں، لیکن بہتر ہے کہ یہ کہانی خود محمود کی زبانی ہی پڑھی جائے۔

ابھی ابھی مجھ پر پھر یاسیت کا دورہ بڑا تھا۔ کام کرتے کرتے میری طبیعت آکٹاسی گئی تھی اور قلم چھوڑ کر میں نے کرسی کی پشت سے ٹکا لیا تھا۔ خیالات تھے کہ اٹھ چلے آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک تو میں ان خیالات کو روکنے کی کوشش کرتا رہا، پھر نا کام ہو کر سر کو جھٹک کر اپنے ارد گرد دیکھا تو سب لوگ اپنے کام میں مصروف تھے۔ مجھے ان پر بہت رشک آیا کہ وہ سب ان ذہنی الجھنوں سے دور تھے تو پھر میں کیوں.....؟ آخر یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے؟ میں نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ نفل اس کے میں کوئی با آواز بلند اظہار کر بیٹھتا، میری نظر اسد سے ٹکرائی۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملنے پر وہ مسکرا دیا۔ وہ میرا بہت اچھا کو لیگ تھا، بہت ہی خوش مزاج اور کام آنے والا باتوئی سا لڑکا تھا۔

میرا نام عمران ہے۔ یہ کہانی میرے دوست محمود کی ہے جو کہ میرا کافی پرانا دوست ہے۔ وہ بہت اچھا، مخلص، محبت کرنے والا اور نرم گو شخص تھا، لیکن قسمت نے اس کے ساتھ کچھ زیادہ اچھا نہیں کیا۔ اپنی کے علاوہ دوسروں کی بے وفائی نے بھی اس کو بالکل دنیا سے دور کر دیا تھا۔ چوں کہ میں اس کے حالات سے واقف ہوں، لیکن بہتر ہے کہ یہ کہانی خود محمود کی زبانی ہی پڑھی جائے۔

ابھی ابھی مجھ پر پھر یاسیت کا دورہ بڑا تھا۔ کام کرتے کرتے میری طبیعت آکٹاسی گئی تھی اور قلم چھوڑ کر میں نے کرسی کی پشت سے ٹکا لیا تھا۔ خیالات تھے کہ اٹھ چلے آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک تو میں ان خیالات کو روکنے کی کوشش کرتا رہا، پھر نا کام ہو کر سر کو جھٹک کر اپنے ارد گرد دیکھا تو سب لوگ اپنے کام میں مصروف تھے۔ مجھے ان پر بہت رشک آیا کہ وہ سب ان ذہنی الجھنوں سے دور تھے تو پھر میں کیوں.....؟ آخر یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے؟ میں نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ نفل اس کے میں کوئی با آواز بلند اظہار کر بیٹھتا، میری نظر اسد سے ٹکرائی۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملنے پر وہ مسکرا دیا۔ وہ میرا بہت اچھا کو لیگ تھا، بہت ہی خوش مزاج اور کام آنے والا باتوئی سا لڑکا تھا۔

دوست کا قلیٹ تھا جو خالی تھا اور اس نے مجھے رہنے کے لیے دیا تھا۔ ابھی میں وہیں کھڑا رہتا کہ فون کی آواز آئی۔ گھڑی دیکھی آٹھ بجنے والے تھے۔ ارے آج تو کافی ٹائم ہو گیا۔ مجھے آٹھ بجے عمران فون کرتا تھا، پھر ہم لوگ کھانا کھانے باہر چلے جاتے اور رات گئے گھر واپسی ہوتی، پھر میں آگے کے سو جاتا اور صبح آفس۔ بس میری یہی روٹین چل رہی تھی۔

☆.....☆

بھی، شاید عید پر ہی میرے لیے نیا جوڑا بننا تھا، ورنہ تو سارا سال بڑے بھائی کے کپڑے، جوتے، کورس، بیگ ہی مجھے میں آتے تھے۔ جیسے تیسے وقت گزرتا رہا، بڑے بھائی ابو کی زندگی میں ہی کام کرنے لگے تھے۔ اس لیے گھر کے حالات میں کچھ معمولی سی تبدیلی آئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں اپنے الگ الگ گھر کا خواب دیکھ رہے تھے اور اس لیے گھر میں نہ ہونے کے برابر خرچہ دیتے تھے، کیوں کہ وہ اپنے اپنے قلیٹ کی قسطیں بھی بھر رہے تھے اور وہ اپنے لیے لڑکیاں بھی



پسند کر چکے تھے، پھر جیسے ہی ان کو قلیٹ کا قبضہ ملا، یکے بعد دیگرے شادی کر کے وہ دونوں اپنے گھر شفٹ ہو گئے اور ہا سہا تعلق بھی ہمارا ان سے ختم ہو گیا۔ تیسرے بھائی اچھے تھے۔ وہ سب کا خیال رکھتے تھے۔ ابو کو بھی ان سے بہت اُمید تھی، لیکن ان کا اپنڈکس پھٹ جانے سے وہ جوانی میں ہی

ہم پانچ بھائی اور تین بہن تھے۔ بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور ایک بہن مجھ سے چھوٹی تھی۔ سچ کا ہونا بھی میرے لیے ایک البیہ ہی تھا۔ نہ بڑا ہونے کا فخر میرے حصے میں آتا تھا اور نہ ہی چھوٹا ہونے کا لاڈ۔ جس طرح ماں باپ کی محبت مجھ تک پہنچتے پہنچتے ختم ہو گئی تھی۔ اسی طرح ہر چیز

خواب سجائے دنیا چھوڑ گئے تھے۔ ابا خاص کر اس حادثے کے بعد بہت پریشان ہو گئے تھے۔ اس لیے کہ ابھی انہوں نے ایک بھی بیٹی نہیں پیدا کی تھی۔ اماں بھی پریشان تھیں، لیکن مجھ سے بڑے بھائی نے ابا کو تسلی دی تھی کہ ان کے کالج کا آخری سال تھا۔ ان ہی دنوں بڑی آپا کا ایک اچھا رشتہ آ گیا، ابا نے فوراً ادھر ادھر سے قرضہ لے کر آپا کو بیاہ دیا۔ ابھی ابا ٹھوڑا سا ہی سکون میں آئے تھے کہ بڑے بھائی کا کالج سے آتے ہوئے ایکسڈنٹ ہوا اور وہ اسپتال جاتے جاتے ہی ہمیں چھوڑ گئے، یوں لگتا تھا کہ موت نے ہمارا گھر دیکھ لیا تھا۔ ابا یہ صدمہ سہا نہیں پائے اور چپکے سے انہوں نے بھی موت کو گلے لگا لیا۔ ہم لوگ اس بے درے صدمے سے بالکل ہی غمگین ہو گئے تھے۔ ہالی مسائل بھی سر اٹھائے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں چھوٹی بہنیں بھی ابھی گھر میں تھیں۔ اب میں ہی اس گھر میں مرد بچا تھا۔ اس وقت میں انٹر کر چکا تھا۔ میرا آگے پڑھنے کا ارادہ تھا، مگر حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے ملتوی کرنا پڑا۔ میں نے ابا کے دفتر میں ہی امدادی کر دیا۔ خوش قسمتی سے نوکری مل گئی اور گھر کی گاڑی پھر چل پڑی۔ اب اماں اور دو بہنوں کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔ اماں بیمار رہنے لگی تھیں۔ میں تو سارا دن گھر میں نہیں ہوتا تھا۔ شام کو جب واپس آتا تھا تو اماں اکیلی چار پائی پر بیٹی ہوتی تھیں اور دونوں بہنیں یا تو توئی دیکھ رہی ہوتیں یا اپنے ہی کسی کام میں مشغول ہوتیں۔ میں جب کہتا کہ ”اماں کو بھی دیکھ لیا کرو۔“ تو وہ اتنا ترخ کر جواب دیتیں، جو باہر بیٹی اماں بھی سن لیتیں۔ اماں ابا نے بچے تو اتنے سارے پیدا کر لیے تھے، لیکن آپس میں پیار محبت کسی میں بھی نام کو نہ تھا۔ چھوٹے تھے لڑ بھگڑ کر نام پاس ہوا اور بڑے ہوئے تو ایک دوسرے سے لا تعلق ہو گئے۔ ابا تو رہے نہیں تھے اور اماں کو یہ احساس بہت دیر سے ہوا، جب تک پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ اماں شاید اور کچھ دن زندہ رہ جائیں، اگر بہنیں ان کا خیال کر لیتیں۔ شوہر اور دو بیٹیوں کی جدائی اور بیٹیوں کی بدتمیزی نے اماں کو بھی جلد ہی ہم سب سے دور کر دیا۔ میں تو اتنا صدمے کی حالت میں تھا، لگتا تھا کہ کچھ نہیں بچا۔ اب اماں ہی تو میرا سائبان تھے۔ وہ میرے ماں باپ تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں بہنوں سے لپٹ کے روؤں یا بڑے بھائی مجھے گلے ہی لگالیں، مگر وہ سب تو خانہ پری کے لیے ہی آئے تھے

اور تو اور وہ بہنیں جو گھر میں تھیں، ایسا لگ رہا تھا کہ شاید وہ اماں کو بوجھ سمجھنے لگی تھیں جواب اتر گیا تھا۔ میں کئی دن خالی الدن کی تکلیف میں رہا۔ عمران میرے دوست نے مجھے بہت سہارا دیا۔ آہستہ آہستہ سب پھر پہلے جیسا ہونے لگا۔ میں صبح جب کام کے لیے نکلتا تو دونوں بہنیں سو رہی ہوتیں۔ میں پہلے ہوٹل جاتا، ناشتا کرتا، پھر آفس چلا جاتا، بج میں آفس میں ہی کرتا۔ شام کو گھر جاتا تو ایسا لگتا کہ دونوں کو میرا آنا ناگوار گزرتا۔ میں بھی کمرے میں ہی بند رہتا۔ میرا دل چاہتا کہ ہم لوگ مل بیٹھ کر باتیں کریں، کھانا کھائیں۔ اب وہ دونوں میری ذمہ داری تھیں۔ میں نے پرائیویٹ گریجویٹیشن کر لیا تھا اور پارٹ ٹائم جاب بھی کرنے لگا تھا، تاکہ زیادہ جلدی پیسے جمع کروں اور ان کی شادیاں کر سکوں مگر وہ لوگ تو کچھ اور ہی منصوبہ بنائے بیٹھی تھیں۔ ایک دن میرے سر میں درد تھا، میں جلدی چھٹی لے کر گھر آ گیا۔ گھر آتا تو دیکھا کہ میں ایک لڑکا بیٹھا ہے اور وہ دونوں خوب ہنس ہنس کر بات کر رہی ہیں۔ میرے آنے پر وہ لڑکا تو گھبرایا لیکن ان کی دیدہ دلیری واضح نظر آئی کہ وہ گھبرائی نہیں، میرے پوچھنے پر صرف اتنا بتایا ”یہ منیر ہے۔“ منیر تو مجھے دیکھ کر ہی کھسک گیا۔ اب جب مجھے پتا چل ہی گیا اور منیر کو بھی گھر میں میری حیثیت کا اندازہ ہو چکا تھا تو وہ اکثر گھر میں نظر آنے لگا اور بڑے کدو فر سے بیٹھا رہتا۔ چھوٹی بہن نے بتایا کہ آپا اس سے شادی کرنا چاہتی ہیں تو میں نے منیر سے بات کی۔ اس کے گھر والوں سے ملنے کا کہا تو معلوم ہوا اس کا کوئی نہیں، اس کو چچی نے پالا تھا۔ نوکری بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ کسی دکان پر سٹیز میں تھا۔ میں نے منع کر دیا لیکن دونوں بہنوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ شادی اپنی مرضی سے کریں گی۔ میں نے جب کوئی چارہ نہیں دیکھا۔ محلے میں بھی باتیں ہو رہی تھیں۔ ابا کے ایک بہت اچھے دوست تھے۔ انہوں نے مجھے بلا کر سمجھایا تو میں نے بھی سادگی سے نکاح پر ہموار دیا۔ لیکن یہ تو ایسی مصیبت گلے میں پڑ گئی، کیوں کہ منیر نے بجائے میری بہن کو بیاہ کر لے جانے کے، وہ خود ہی ہمارے گھر رہنے لگا۔ میں نے اس پر کافی اس کو برا بھلا کہا، مگر یہاں تو میری بہن ہی اس کی حمایت کر رہی تھی۔ مجھے مجبوراً خاموش ہونا پڑا۔ مجھے تو اب چھوٹی کی فکر تھی۔ منیر مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتا تھا۔ یہی بات جب میں نے بڑی سے کہی تو وہ ہنستے سے اکھڑ گئی اور اتنا دادیلا کیا کہ محلے

والے آ گئے۔ بڑی بہن نے الزام لگایا کہ میں ان تینوں کو کال کر گھر پر قبضہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ میری مائی جانی مجھ پر، اپنے بھائی پر یہ الزام لگا رہی تھی۔ کیا تھے بہن بھائی ایسے ہوتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ماں باپ کے بعد ہم سب میں اعتماد اور محبت مضبوط ہو جائے گا، مگر یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ دراصل ان تینوں کا مقصد مجھے وہاں سے ہٹانا تھا۔ یہ گھر ہمارے والدین کا تھا، جس پر سب کا حق تھا، مگر بڑے دونوں بھائی لا تعلق ہوئے تھے۔ آپا نے بھی حصہ لینے سے منع کر دیا تھا۔ یہ بات بھی مجھے ابھی پتا چلی تھی۔ پتا نہیں یہ لوگ کب سے منصوبہ بنا رہے تھے۔ اب میں ہی ان کا کاٹنا تھا، جس کو وہ دور کرنا چاہ رہے تھے۔ بڑی نے خوب مگر مجھ کے آنسو بہائے اور محلے والوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئی کہ اس کا ماں بے روزگار ہے، وہ کہاں لے کر جائے گا۔ اور اگر وہ چلی بھی گئی تو چھوٹی کا کیا ہوگا۔ کیوں کہ میں تو سارا دن ہوتا نہیں ہوں، اس لیے اس گھر میں ہم ہی رہیں گے۔ ہاشم خالو نے مجھے سمجھایا کہ بیٹا وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تم برس روزگار ہو، اپنے لیے کچھ نہ کچھ بنا ہی لو گے۔ یہ ”بے چاریاں“ کہاں کرائے کے گھر میں رتی رہیں گی۔ تم یہ گھر ان دونوں کو ہی دے دو، جیسے تمہارے بڑے بھائی بہن دستبردار ہو گئے۔ مجھے مکان سے صرف اتنا لگاؤ تھا کہ یہ میرے ماں باپ کی نشانی تھا اور دوسری فکر مجھے چھوٹی کی تھی، مگر جب وہ دونوں کو میری ضرورت نہ تھی تو میں کیا کرتا۔ میں نے اپنے کپڑے اٹھائے اور دو دوپٹے پر آخری نظر ڈالتا ہوا گھر سے رخصت ہو گیا۔

☆.....☆

اس سلسلے میں عمران نے میری بہت مدد کی اور اس نے اپنا یہ فلیٹ مجھے رہنے کو دے دیا۔ مجھے گھر چھوڑے ہوئے باج سال ہو گئے تھے۔ پہلے دو سال میں ایک دوست کے ساتھ رہا، پھر جب اس کے والد نے اس کی شادی کر دی تو مجھے وہ گھر چھوڑنا پڑا، پھر میں عمران کے فلیٹ میں آ گیا۔ عمران میرا بہت اچھا دوست تھا۔ اسی کے مشورے پر میں نے تعلیم حاصل کی تھی اور نوکری کے ساتھ ساتھ کوچنگ بھی لی تھی اور اب میں ایم۔ بی۔ اے کی تیاری کر رہا تھا۔ میری نوکری پکی ہو گئی تھی اور تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی۔ اسی خوشی میں کپڑے اور مشائی لے کر گھر گیا

تھا۔ معلوم ہوا وہ دونوں گھر بچ کر کہیں اور چلے گئے ہیں اور اس کے لیے انہیں منیر نے ہی مجبور کیا تھا۔ اب میں کیا کر سکتا تھا۔ میں نے تو دونوں کو بہت سمجھایا تھا، مگر اب میرے پاس تو کوئی ان کا پتا بھی نہیں تھا۔ میں دل مسوس کر واپس آ گیا۔ میری زندگی کا یہ باب اب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا تھا۔

☆.....☆

میں نے اب خود کو فلاحی کاموں میں مصروف کر لیا تھا۔ کسی کو اسپتال کا مسئلہ ہوتا یا اسکول میں داخل کیا کسی کی شادی یا نوکری کا، میں پوری کوشش کرتا کہ ان کی مدد کر سکوں۔ اسی طرح مجھے بہت سکون ملتا تھا۔ بس کبھی کبھی اپنوں کی یاد ستاتی تو دل بے چین ہو جاتا۔ عمران مجھے شادی کرنے کا مشورہ دے رہا تھا، مگر میں انکار کیے جا رہا تھا۔ میں ان چکروں میں کبھی نہیں رہا تھا اور اپنی بہنوں کے رویے کے بعد تو مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی لڑکی کیسے اعتبار کے قابل ہوگی۔ میں بغیر دیکھے کیسے شادی کروں۔ اگر وہ بھی میری بہنوں کے جیسی مزاج کی لگی تو پھر کیا ہوگا۔ انہی الجھنوں میں وقت گزرتا رہا۔ فلاحی کاموں کے دوران مجھے کچھ بیوہ عورتوں اور مطلقہ عورتوں سے بھی واسطہ پڑا۔ میں ان عورتوں سے مل کر کافی حیران ہوا کہ اتنی اچھی لکھی ہوئی محنتی عورتیں محض اپنے بچوں کی خاطر محنت مزدوری کرنے کو تیار تھیں۔ کم گوسادہ مزاج عورتیں۔ ان میں سے دو کو تو میں نے نوکری لگوائی اور ایک کو سلائی مشین دلا دی۔ ایک کے بچے کو اسکول میں داخلہ کرا دیا، پھر اچانک ہی میرے ذہن میں یہ بات آ گئی کہ کیوں نہ میں ایسی ہی کسی بیوہ یا مطلقہ کا سہارا بن جاؤں۔ یہ تو کاروبار تھا۔ جب عمران سے میں نے اس کا ذکر کیا تو وہ پہلے خوب ہنسا، پھر سمجھانے لگا کہ بظاہر یہ بہت آسان ہے، مگر بہت مشکل ہوگی تمہیں۔ میں اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ اگر کوئی ایسی عورت ملی جو خود بھی سہارے کی خواہش مند ہوگی تو میں اس کا ہاتھ تمام لوں گا۔ میری شخصیت عمران کے سامنے تھی، اس لیے وہ سمجھ گیا کہ میں نے یہ بات پوری سنجیدگی سے کی ہے، اس لیے پھر اس نے کچھ نہیں کہا۔

☆.....☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ٹھکانہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

مجھے کافی تازہ، مگر پھر میری سنجیدگی دیکھ کر اس نے مجھے تسلی دی کہ ”فکر نہ کر مان جائے گی، آخر تیرے جیسا بندہ اس کو کب بٹلے گا۔“

☆.....☆

اسی طرح تقریباً ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ اچانک اس کا میسج اور فون آتا بند ہو گئے۔ کوئی جواب نہیں آ رہا تھا، کبھی نمبر بند اور کبھی مصروف، میں تو بالکل پریشان ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میرے پاس تو سوائے نمبر کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ تقریباً ایک ماہ بعد مجھے ایک لیٹر ملا، یہ اسی کا خط تھا، لکھا تھا۔

”محمود! مجھے آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا تھا۔ آپ ایک بڑھے لکھے انسان ہیں۔ میں آپ کے غلوں کی بہت قدر کرتی ہوں۔ آپ نے جو پیش کش مجھے کی تھی اس حوالے سے میں نے بہت سوچا، پھر آپ کے دیے گئے سچے پر میں نے آپ کو دیکھ بھی لیا۔ یقین جانے آپ کسی بھی لڑکی کو خوش رکھ سکتے ہیں، پھر آپ یوں خوانخواہ خود کو کانٹوں میں تھمیسٹ رہے ہیں۔ آپ نے مجھے نہیں دیکھا۔ مجھے سہارے کی ضرورت تو تھی، اسی لیے میں نے آپ کو چپکے سے دیکھ بھی لیا، لیکن پھر مجھے آپ کو دھوکہ دینے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں آپ سے عمر میں بہت بڑی ہوں اور مجھے ایک میچور سہارے کی ضرورت ہے، گوکہ آپ کی باتوں سے مجھے آپ میچور ہی لگے، مگر عمر کا فرق بہر حال معنی رکھتا ہے۔ اس لیے میں نے اپنی والدہ کے بتائے ہوئے ایک رشتے پر ہاں کر دی ہے اور ابھی بچھلے ہنستے ہی میرا نکاح ہوا ہے۔ اب میرا آپ سے رابطہ ناممکن ہے۔ میری آپ کے لیے دعا میں ہیں اور یہ گزارش بھی کہ آپ کسی اچھی اور اپنی ہم عمر لڑکی سے شادی کر لیں۔ والسلام۔“

خط پڑھ کر میں دل گرفتہ ہو گیا۔ پتا نہیں میرے غلوں اور محبت میں کہاں کی تھی جو کوئی میرا بن ہی نہیں پاتا۔ میں تو اس کو بیوہ اور اپنی عمر سے بڑا ہونے کے باوجود قبول کر رہا تھا، کیوں کہ وہ پہلی عورت تھی جس کو میں نے سلجھا ہوا پایا تھا، لیکن شاید میں اس کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا اور میری یہ محبت ادھوری ہی رہی، اب شاید میں کسی پر بھروسہ نہ کر سکوں۔

☆.....☆

ایک دن میں ایسے ہی عمران کو میسج کر رہا تھا کہ وہ غلطی سے کسی دوسرے نمبر پر چلا گیا، کیوں کہ جواب کچھ اور آیا۔ میں نے سوری کا میسج بھیجا، جواباً ادھر سے بھی ہلکا ہلکا میسج آ گیا۔ میں اس دن نہ جانے کس موڈ میں تھا کہ میں بھی برابر میسج کرنے لگا، حالانکہ میں ان فضولیات سے دور ہی رہتا تھا، پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا۔ اب میری روانہ میسج کے ذریعے بات ہونے لگی۔ پہلے تو وہ خود کو مرد ظاہر کر کے بات کرتی رہی، لیکن جب میری طرف سے کوئی بھی فضول میسج نہیں گیا تو پھر اس نے اپنا ادھورا سا تعارف کرا دیا۔ مجھے خیر اس کی کوئی کھوج نہیں تھی۔ وہ جیسے بات کرتی میں ویسے ہی اس کو جواب دیتا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں چھیلا تھا۔ جو چچ تھا سب بتا دیا تھا۔ آواز سے مجھے وہ کافی نیک لگی تھی اور میں سمجھا کہ شاید وہ کوئی ڈری سبھی سی لڑکی ہے، جس پر والدین سختی کرتے ہیں، کیوں کہ بقول اس کے کہ وہ چھپ کر بات کرتی ہے۔ وہ کافی سنجیدگی ہوئی گفتگو کرتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بڑھی لکھی ہے۔ میرے حالات جان کر اس نے بھی مجھے شادی کا مشورہ دیا۔ جواباً جب میں نے اپنی مرضی بتائی تو وہ کافی حیران ہوئی، پھر اس نے بھی مجھے سمجھانے کی کافی کوشش کی، مگر میں نے ٹال دیا۔ ہمارے یہ صاف ستھری دوستی میسج کے ذریعے چلتی رہی۔ اب ہم کافی باتیں شیئر کرنے لگے تھے۔ وہ ایک کمپنی میں جاب کرتی تھی۔ میں نے اس کے مالی حالات کی وجہ سے کئی بار مدد کی پیش کش بھی کی جو اس نے منع کر دی، پھر جب اس نے بتایا کہ وہ بیوہ ہے اور دو بچوں کی ماں ہے تو مجھے اس سے سچ سچ ہمدردی ہو گئی۔ وہ واقعی بہت اچھی تھی۔ ان حالات میں بھی اس نے میری کسی پیش کش کا فائدہ نہ اٹھایا۔ بقول اس کے اسے صرف اچھے دوست کی تلاش تھی، جس سے وہ اپنے دل کا حال کہہ سکے۔ سال ہو گیا تھا، میں اب اس کا عادی ہو گیا تھا جس دن اس کا میسج نہیں آتا میرا دل کسی کام میں نہیں لگتا۔ میں نے اسے پر پوز کر دیا تھا، مگر اس نے انکار کر دیا کہ اس کا میرا کوئی جواز نہیں۔ میں سمجھا کہ وہ میرے غیر شادی شدہ اور اپنے بیوہ ہونے کی وجہ سے کہہ رہی ہے۔ میں نے اپنے گھر اور آفس کا پتا بھی اسے دے دیا، تاکہ وہ تسلی کر لے اور جیسے چاہے معلومات کر لے، مگر اس نے انکار ہی کیے رکھا۔ اب ہم فون پر بھی بات کرتے تھے۔ میں نے طے پر بہت اصرار کیا، مگر وہ نہ مانی۔ اب پھر میں نے عمران کو بتایا۔ حسب معمول اس نے

ناگن

اعجاز احمد نواب

زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ نیا سلسلہ ”ناگن“۔ آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کر دے گا۔ ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا زندگی کا تیار رنگ۔ ناگن کے روپ میں آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

قسط نمبر: 7

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

جوگی مہاراج کے پردادا کو اس کے گرو نے مرتے سے شیش ناگ کا جوڑا دان کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان ناگوں کے سر پر تاج کے نشان ہیں اور آنکھوں میں سنہری روشنی۔ آنکھوں کی سنہری روشنی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ سائب ہیں۔ اگر یہ سو سال تک زندہ رہ گئے تو یہ نہ صرف انسان کے روپ میں آجائیں گے، بلکہ ہر جاندار کا روپ دھار سکیں گے۔ زمین کی تہوں میں چھپے خزانے ان کی دسترس میں ہوں گے اور اس وقت یہ جس کے قبضے میں ہوں گے یہ اسی کے حکم کے غلام ہوں گے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہر سالوں میں اماؤں کی رات ناگ دیوتا کے حضور ایک مرد اور ایک عورت کی قربانی دی جائے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر ان کے پرکھوں نے ان ناگوں کو ناز و نعم سے پالا تھا اور نگہبانی کا یہ عمل اب جوگی مہاراج کے حصے میں آچکا تھا۔

وہ رات بھی اماؤں کی رات تھی اور ان ناگوں کی عمر کے سوسالی مکمل ہونے جا رہے تھے۔ جوگی مہاراج نے یہ کہانی بیس سال سے ساتھ رہنے والے چیلے صابو کو سنائی تو اس کی نیت میں کھوٹ آنے لگا۔ گرو مہاراج ہاتھ میں خنجر تھا جسے ناگ منتر کا جاپ کر رہے تھے اور صابو انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھ کر زیر لب مسکرا رہا تھا۔ جاپ مکمل کر کے جوگی مہاراج نے بلی کا عمل مکمل کیا۔ دونوں ناگ اور ناگن انسانی خون میں اشان کر رہے تھے اور سرخ زبانیں نکال کر خون چاٹ رہے تھے۔ جوگی مہاراج بیٹھے یہ منظر غور سے دیکھ رہے تھے، یہ ہی وہ لمحہ تھا جس کا صابو کو انتظار تھا۔ اس نے پلک جھپکنے میں خنجر کا وار مہاراج کی گردن پر کیا اور گرو مہاراج پتھرائی آنکھوں سے اپنے چیلے کو دیکھتے رہ گئے۔ صابو لاش ٹھکانے لگا کر جب گھر سے آتا ہے تو پٹاری والی جگہ ایک خوب صورت نوجوان مرد اور سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی موجود تھے۔ صابو انہیں کہتا ہے کہ تم میرے غلام ہو۔ وہ ان کے نام ارجن اور شکنتلا تجویز کرتا ہے۔ تب ارجن اور شکنتلا اسے بتاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ صابو ان کا گرو مہاراج نہیں بلکہ ایک چیلہ ہے۔ تب صابو کے خون سے شیش ناگ کا یہ جوڑا اپنی بنیاد بجا کر شہر کا رخ کرتا ہے۔

لوگ اسے دیکھ لیتے ہیں اور اس پر تیل ڈال کر آگ لگا کر مار ڈالتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر شکنتلا غصے میں آ جاتی ہے اور کہتی ہے۔ ”ارجن کے قاتلوں! تم نے میرے ناگ کی ہتھیار کر کے بڑا ایٹیا کیا، تم ناگن کی طاقت اور انتقام سے واقف نہیں، شکنتلا تمہاری زندگیوں میں زہر گھول دے گی۔ میں اس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی، تم موت مانگو گے لیکن موت بھی تم سے روٹھ جائے گی۔ ایک ایک کوڑ پاتاڑ پا کر ماروں گی میں پھر آؤں گی اور تمہارے لیے قیامت بن کر آؤں گی۔“

چھوڑ جاتا ہے۔ شگنٹلا اپنے پیر چکار کو حاصل کرتی ہے اور اس سے انسانی خون طلب کرتی ہے۔ چکار بتاتا ہے کہ جس گھر میں آپ موجود ہیں اس گھر میں زندہ انسان موجود ہیں جو اس گھر کے مالک ہیں اور خسران نے انہیں قید کر رکھا ہے۔ گرو زائن کو شگنٹلا کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ مہاپنڈت لکشم ناتھ سے اس سلسلے میں مدد طلب کرتا ہے۔ مہاپنڈت شگنٹلا سے فائدہ اٹھانے کے وعدے پر اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ شگنٹلا گھر میں ہی قید نو جوان سلیمان کے خون سے اپنی بھوک مٹاتی ہے اور اس کی بہن رقیہ اور بیوی کینز قاطر پر تشدد کرتی ہے۔ گرو زائن اور لکشم ناتھ شگنٹلا دیوی تک پہنچ جاتے ہیں۔ گرو زائن شگنٹلا کو کہتا ہے کہ وہ اپنے مہاپیروں کو حکم دے کہ وہ ہم سب کو ریاست کلکتہ کالی ماتا کے استھان کے اندر لکشم ناتھ کے کمرے خاص میں لے چلیں۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے)

شگنٹلا تذبذب کے عالم میں تھی۔ اب اس کے سر کو درد نہیں ہو رہا تھا، لیکن اس کو زبانی سے گرو زائن کے خلاف بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کاش اس وقت سامری اور خسران آ جاتیں اور اس مصیبت کا کوئی اپنا کر لیں، ورنہ تو میں بے موت ماری جاؤں گی۔ میری حیثیت قید صیاد میں پھرتی بلی کی مانند ہو جائے گی۔ ابھی سوچا ہی تھا کہ دماغ میں درد کی لہریں ہولے ہولے اٹھنے لگیں اور آہستہ آہستہ ان کی شدت بڑھنے لگی، جیسے کوئی ان دیکھی شگنی اسے گرو زائن کا حکم ماننے پر مجبور کر رہی ہو۔ درد میں پھر شدت آئے گی۔ شگنٹلا سر پر ہاتھ رکھ کر سسکنے لگی اور پھر انہی سسکیوں کے درمیان مجبور ہو کر بولی۔

”جی مالکن۔۔۔“ چکار کی آواز آئی۔۔۔۔۔ ”گرو زائن نے جیسا کہا ہے ویسا اس پر عمل کرو۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے شگنٹلا بے بسی سے باقاعدہ رونے لگی۔

”مالکن آپ ان دونوں کے ہاتھ پکڑ لیں۔“ شگنٹلا آگے بڑھ کر گرو زائن اور لکشم ناتھ کے درمیان کھڑی ہو گئی اور



شگنٹلا گاؤں کے لوگوں سے جان بچا کر بھاگتی ہے اور جنگل میں موجود ریاست تابانہ کے مہاراجہ رام ناتھ کے قافلے تک جا پہنچتی ہے۔ مہاراجہ رام ناتھ اس کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور اسے اپنی کینز بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

شگنٹلا سمجھ جاتی ہے کہ مہاراج اس کے حسن کے جادو کا شکار ہو چکے ہیں وہ ان سے کہتی ہے کہ وہ اسے اپنی مہارانی بنالیں۔ رام ناتھ اور شگنٹلا کے سات پھیرے آگ کے گرد مکمل ہو جاتے ہیں۔ شگنٹلا مہارانی ماریہ کی خاص کینز کو شیلیا کو کینزوں کی سرداری سے برطرف کر دیتی ہے اور پر یہ کینز عالیہ بنادیتی ہے۔ دوسری طرف ماریہ سامری جادوگر سے شگنٹلا کے متعلق پوچھتی ہے، لیکن سامری جادوگر اسے کہتا ہے کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں اس کے بارے میں تفصیل جاننے کے لیے گرو کی روح سے رابطہ کرنا پڑے گا۔ مہارانی اسے جلد از جلد شگنٹلا سے نجات دلانے کا کہتی ہے۔ سامری جادوگر ماریہ سے شگنٹلا کو شاہی محل سے نکالنے کا وعدہ کرتا ہے۔

سامری جادوگر اپنے گرو شدا جادوگر سے ملاقات کرتا ہے جو اسے کہتا ہے کہ وہ ناگن ہے اور ”توسب“ کچھ چھوڑ ناگن سے ناتا جوڑ ”سامری یہ سن کر بہت خوش ہوتا ہے۔ سامری شگنٹلا سے ملاقات کرتا ہے اور اسے سانپ زادی کہہ کر مخاطب کرتا ہے مہارانی شگنٹلا یہ سن کر کچھ جاتی ہے کہ سامری اس کے راز کو جان گیا ہے۔ شگنٹلا کہتی ہے کہ ”آؤ سامری ہم ایک ہو جائیں اور دونوں مل کر اس وسیع ریاست پر اپنی حکمرانی قائم کریں، میں سانپوں کی ملکہ ہوں اور تم جادوگروں کے بادشاہ، ہم دونوں بادشاہ اور ملکہ بن جاتے ہیں۔ سامری اسے کچھ دن بعد جواب دینے کا کہتا ہے۔ شگنٹلا اپنی ملازمہ خاص پر یہ بھی اپنی سچائی کے بارے میں بتاتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ آج کے بعد میرے لیے نو جوان انسانی خون کی فراہمی تمہاری ذمے داری ہوگی۔ پر یہ یہ سن کر بہت خوف زدہ ہوتی ہے۔ شگنٹلا اس سے کہتی ہے کہ اگر یہ بات کسی کو پتا چلی تو وہ پر یہ کا خون کر دے گی، دوسری صورت میں اسے تابانہ کی حکومت میں اٹلی عہدہ دیا جائے گا۔ پر یہ مہارانی کے حکم کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔

مہارانی ماریہ مہاراجہ رام ناتھ کو بتاتی ہے کہ شگنٹلا ناگن ہے اور انسانی روپ میں انہیں بے وقوف بنادیتی ہے اور اس کے لیے وہ چاہیں تو شاہی چنڈت گرو زائن سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ مہاراج اس سے کہتے ہیں کہ اگر شگنٹلا ناگن ہوئی تو اس کو آگ میں جلادیا جائے گا اور اگر یہ الزام جھوٹا ثابت ہو گیا تو ماریہ کو اسی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ ایک ہجوم شگنٹلا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے۔ مہارانی ماریہ اپنے لباس میں چھپا کر لایا جانے والا آئینہ اچانک شگنٹلا کے سامنے کر دیتی ہے جس میں ایک بڑی سی ناگن لوگوں کو نظر آتی ہے۔ یہ سالار ملگرام شگنٹلا کے بجائے راجہ رام ناتھ کو گرفتار کر لیتا ہے۔ شگنٹلا سامری جادوگر کو یاد کرتی ہے تو سامری جادوگر فوری حاضر ہو جاتا ہے۔ گرو زائن بھی سامری سے خوف زدہ ہو کر فرار ہو جاتا ہے اور کلکتہ میں کالی کے مندر جا پہنچتا ہے۔ اب سامری اور شگنٹلا سے مقابلے کے لیے اسے کالی کے مندر میں ایک کنیا کا بلیڈان کر کے حیرتھ جاپ توے دن کرنا تھا اور اس جاپ کے لیے نو جوان لڑکی کو کالی کے چٹوں میں قربان کرنا ضروری تھا۔

کالی کے مندر میں گرو زائن کی نظر پندرہ سولہ سالہ دو شیزہ پر پڑتی ہے۔ وہ اس لڑکی کے بلیڈان کا فیصلہ کرتا ہے اور اوچھل جاپ کا منتر لاپے لگتا ہے۔ منتر مکمل ہوتے ہی وہ سب کی نظروں سے غائب ہو جاتا ہے اور اسی عالم میں لڑکی کو دیو بوج کر خنجر کی مدد سے اس لڑکی کی گردن پر وار کرتا ہے۔ اور اگلے ہی لمحے خون کالی کے چٹوں میں نکھر اہوا تھا۔ بلیڈان کا مکمل مکمل کر کے وہ ناگن شگنٹلا کو اپنا غلام بنانے کے لیے مندر سے ملحقہ شمشان گھاٹ میں جا پہنچتا ہے اور حیرتھ جاپ شروع کر دیتا ہے۔

سامری شگنٹلا، ملگرام اور پر یہ تابانہ کی حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو سکتا تھا۔ ہر طرف غلام کا راج تھا۔ شگنٹلا جاپ کے ذریعے کالی ماتا کی مہمان گشتی کے حصول میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شگنٹلا اب صرف آنگن نہ تھی بلکہ جادوگر بن چکی تھی۔ کالی دیوی کے پیروں کے بجائے مہاپیروں کے قبضے میں تھے۔ پر یہ اس کے لیے ہر روز ایک خوب صورت نو جوان مہیا کرتی۔

شگنٹلا سبز آنکھوں اور چمکریا لے بالوں والے نو جوان کو دیکھ کر بہت رنجور رہ جاتی ہے۔ وہ شگنٹلا کو بتاتا ہے کہ وہ جنات کے بادشاہ خسران کا بیٹا خسران ہے اور تمہارا کوئی جادو جھوٹا ہوگا۔

شگنٹلا خسران کو دوست بنانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ وہ بھی اس کا ساتھ دینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ سامری گرو زائن کو منڈل جاپ سے باز رکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے گرو شدا کی روح سے مدد طلب کرتا ہے۔ سامری جادوگر کی ملاقات خسران سے ہوتی ہے۔ شگنٹلا، خسران اور سامری تینوں گرو زائن کے منڈل کے پاس جا پہنچتے ہیں لیکن گرو زائن اپنا جاپ مکمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ خسران دونوں کو لے کر کلکتہ سے دور لے جاتا ہے اور ان دونوں سے کہتا ہے کہ میں اپنی سلطنت واپس جا کر اپنے باپ اور دوسرے غلاموں سے اس بارے میں مشورہ کرتا ہوں۔ سامری بھی اپنے گرو شدا جادوگر سے رابطہ کرنے کے لیے شگنٹلا کو اکیلا

آکھ کھل گئی۔ شکنتلا کو روتے دیکھ کر وہ ہنسنے لگا اور بولا۔
”ملکہ عالیہ شکنتلا.....! جس کی ایک جنبش ابرو پر زندگیوں کے فیصلے ہو جاتے تھے آج رو رہی ہے آ..... ادھر آ میرے پاس.....“ لیکن شکنتلا بیٹھی مسلسل روتی رہی۔

”شکنتلا!“ گرو زنان دھاڑا تو شکنتلا ایک دم خاموش ہو کر اسے ہنسنے لگی..... ”میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ میرے پاس آؤ.....“ شکنتلا اٹھ کر بے دلی سے چلتی ہوئی اس کے پاس آ گئی۔ گرو زنان بھی کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہی شکنتلا اس کے قریب آئی، اس نے فوراً ہی اس کی زلفیں مروڑ کر اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیں۔ شکنتلا نے درود کی شدت سے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ گرو زنان نے حقارت سے اس کے بال اپنی ٹٹھی میں پورے زور سے جکڑ رکھے تھے۔ بال گرو زنان کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے شکنتلا کا سر جھکا ہوا تھا۔ گرو زنان شکنتلا کو اسی حالت میں لیے کمرے میں قدم قدم چلتے لگا۔
”آج کے بعد تجھے چند باتیں یاد رکھنی ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ تو میری غلام ہے۔ میرا حکم پہلی آواز پر مانے گی اور دوسری یہ کہ کھانا تو اس وقت کھائے گی جب گرو زنان چاہے گا۔ آرام تو میری مرضی سے کرے گی۔ سن لی تو نے میری باتیں؟“ گرو زنان اس کی زلفوں کو زور سے جھٹک کر بولا۔
”جج..... جی۔“ شکنتلا کی سسکتی ہوئی آواز نکلی۔

”اور مجھے صرف آقا کہہ کر مخاطب کرے گی، بول جی میرے آقا۔“
”جی میرے آقا۔“ شکنتلا نے بال کھینچے ہوئے ہونے کی وجہ سے شدید درد سے لاچار ہو کر کہا۔
”تو ایسی کمینہ خصلت عورت ہے کہ جس رجبہ نے تجھے پناہ دی اور پھر تیرے ساتھ شادی کی، تو نے اس کا تختہ الٹ دیا، پھر اسے چیر کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پوری ریاست تابانہ میں تو نے ظلم و بربریت کا بازار گرم کر دیا۔ اپنے عیش و آرام کی خاطر سیکڑوں انسان تو نے بے بسی کی موت مروائے۔ تیری ساری باتوں کا مجھے پتا چلتا رہتا تھا۔ دوسروں کی تکلیف پر تو خوش ہوتی تھی اور اب صرف اپنے بالوں کی تکلیف سے تیرے آنسو نکل رہے ہیں۔“ گرو زنان نے اس کا چہرہ اپنے منہ کے سامنے کر کے کہا۔

شکنتلا کا خوب صورت چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ اس کی ساری ہڈیاں معطل ہو چکی تھیں اور وہ بالکل ایک عام سی کمزور بے بس لڑکی تھی جس کے بال ایک ہٹے کئے مروڑنے پکڑ رکھے تھے۔ لکشم ناتھ بھی جاگ چکا تھا اور گرو زنان کی باتیں سن رہا تھا۔
”چھوڑو یار گرو..... کوئی ناشتا منگواؤ.....“ لکشم نے آواز لگائی تو گرو زنان نے اس کے بال چھوڑ دیے اور لکشم کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

”لکشم ناتھ تو اس کو نہیں جانتا۔ یہ ناگن ہے انسانی خون میں غسل کرنا اس کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ہر وقت عیش و عشرت کرنا اور انسان کو اذیت ناک موت سے ہمکنار کرنا اس کا سن پسند مشغلہ ہے۔ اب میں اس کو جیون کا وہ رخ دکھاؤں گا کہ اس کی نیلیں بھی یاد رکھیں گی۔“

”شکنتلا.....“ گرو زنان نے آواز لگائی۔
”جی.....“ شکنتلا آنسو صاف کرتے ہوئے بھرائی آواز میں بولی۔
”ہمارے لیے بہترین ناشتے کا بندوبست کرو۔“

”جج.....“
”جی مالکن.....“
”ناشتا لاؤ.....“ ملک جھپکتے ہی قالین پر پر تکلف ناشتا حاضر تھا۔
”شکنتلا“ گرو زنان غرایا۔
”جی میرے آقا.....“

دونوں کے ہاتھ تھام لیے۔ اچانک گھپ اند میرا چھا گیا اور پھر گرو زنان کو یوں محسوس ہوا کہ پاؤں کے نیچے سے سخت فرش ہٹ گیا ہوا اور نرم گدا کی نے بچھا دیا ہو۔

اند میرا جھٹکنے لگا۔ روشنی پھیلنے لگی۔ اچانک گرو زنان کے منہ سے نکلا۔
”ارے لکشم ناتھ ہم واپس نکلتے آ گئے..... یہ تو تمہارا کمرہ خاص ہے۔“
لکشم ناتھ نے سر گھما کر دیکھا تو واقعی یہ کمرہ خاص ہی تھا۔

”ہا ہا ہا ہا ہا..... ہو ہو ہو ہو ہو.....“ گرو زنان اب بہت بڑی طاقت ہے۔ گرو زنان کی ہڈیاں لامحدود ہیں۔“
گرو زنان خوشی سے پاگل ہو کر ناچنے لگا۔ ”آؤ لکشم ناتھ تم بھی ناچو یار..... تمہاری سہانٹا کے بچے میں اپنے مقصد میں اتنی جلدی پھیل نہ ہوتا.....“ دونوں خوشی سے ناچ رہے تھے اور شکنتلا ایک طرف سر جھکا کھڑی تھی۔ رقیہ اور کنیر فاطمہ پر کوڑے برستے وقت چہرے پر جو خوشی، رعونت اور فخرانہ پن تھا۔ اب وہ اڑنچھو ہو چکا تھا، وہ اس وقت حسرت و یاس کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

ناچتے ناچتے گرو زنان نے شکنتلا کو آگے بڑھ کر دیوبج لیا اور اپنی بانہوں میں کسے لگا۔ ”اب تو میری ہے تیری ہڈیاں بھی میری ہیں۔“ گرو زنان نے شکنتلا کو بانہوں میں اٹھا لیا۔ ”لو، لکشم ناتھ عیش کرو۔“ یہ کہتے ہوئے گرو زنان نے شکنتلا کو ہوا میں اچھال کر پھینکا تو لکشم ناتھ نے اسے ہوا میں ہی دیوبج لیا اور اس کے سرخ و سپید گالوں پر اپنے بھدے ہونٹ رکھ دیے۔

کافی دیر ناچنے کے بعد دونوں پسینے سے شرابور ہو کر بیٹھ گئے اور ہانپنے لگے۔ ”شکنتلا ہمارے لیے شراب منگواؤ.....“
”چسکار.....“ شکنتلا سر جھکا کئے افسردگی سے بولی۔ ”شراب لاؤ۔“ چمن کی آواز کے ساتھ چاندی کی صراحی اور دو بلوریں جام نمودار ہو گئے۔ دونوں پجاری ٹکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

”شکنتلا ہمارے لیے جام بھرو۔“ گرو زنان نے اسے حکم دیا۔
طوعاً و کرہاً شکنتلا اٹھی اور جام بھرنے کے بعد دونوں کو پیش کرنے لگی۔ لکشم ناتھ بولا۔ ”گرو زنان..... شراب بھی حاضر ہے اور دنیا کا حسین ترین شباب بھی۔ آج رات ہم جشنِ فتح منائیں گے۔ شراب اور شکنتلا کے شباب کے ساتھ۔“
یہ کہہ کر لکشم ناتھ نے کمر میں ہاتھ ڈال کر شکنتلا کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

گرو زنان بھی آگے بڑھ آیا اور شکنتلا کے کھلے بالوں کو ٹٹھی میں پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا تو سسکی کے ساتھ شکنتلا کے آنسو نکل آئے..... لیکن مجبور تھی اور یوں رات گزرتی رہی اور شکنتلا دو کتوں کے درمیان ایک ہڈی کی مانند بھی اس کے منہ اور بھی اس کے منہ جانے لگی۔ ریاست تابانہ کی ملکہ کی مٹی پلید ہو رہی تھی..... وقت کا پھیلا ہوا چل پڑا تھا۔ اسی کا نام مکافاتِ عمل ہے۔

☆.....☆
صبح کی سپیدی نمودار ہونے تک شکنتلا تھکن سے چور ہو چکی تھی۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ دونوں پجاری اس وقت نرم قالین پر بے سدھ سوئے ہوئے تھے۔ شکنتلا نے ہولے سے چسکار کو طلب کر کے کہا۔

”چسکار مجھے یہاں سے اتنی دور لے جا کہ یہ دونوں وہاں نہ پہنچ سکیں۔“ چسکار سر جھکا کر بولا۔ ”مالکن اب میں آپ کا وہی حکم مان سکتا ہوں جس کی اجازت گرو زنان نے آپ کو دی ہو۔“ اس کے یہ الفاظ سن کر شکنتلا بھونچکا رہ گئی۔ اس کے بعد اس نے سانپ بننے کی کوشش کی تاکہ ان کا خون پی لے، لیکن یہ کیا؟ وہ انسان ہی رہی، کئی دوسرے جانداروں کا خیال ذہن میں لا کر اس نے فرار ہونے کا سوچا، لیکن غالباً شکنتلا کی تمام طاقتیں اب گرو زنان کے حکم کے تابع ہو چکی تھیں۔ وہ اب صرف ایک عام اور کمزور لڑکی بن کر رہ گئی تھی جو گرو زنان کی باندی تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر فرار ہونے کی کوشش کی لیکن چسکار سامنے آ گیا اور بولا۔ ”مالکن مجھے گستاخی پر مجبور نہ کریں۔ آپ گرو زنان کی مرضی کے خلاف یہاں سے نہیں جاسکتیں۔“

شکنتلا کا دل بے اختیار بھرا یا اور وہ اوپچی آواز میں زار و قطار رونے لگی۔ اس کے رونے کی آواز سن کر گرو زنان کی

”بکواس نہ کر بڑھے ورنہ خون پی جاؤں گا تیرا۔“ سامری نے غصے سے کہا اور پھر غائب ہو گیا۔ دونوں لڑکیاں چیخنے لگیں۔ بوڑھے اسد اللہ نے آگے بڑھ کر دونوں کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ”بہنی آیت الکرسی کا ورد شروع کر دو، ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اور پھر سب مل کر آیت الکرسی پڑھنے لگے اور دم کیا ہوا پانی گھر کے ہر کونے میں چھڑکنے لگے۔

☆.....☆

سامری سمجھ گیا تھا کہ کسی طریقے سے گرو زائن کے آنے کی اطلاع پا کر شکنتلا کہیں روپوش ہو گئی ہے۔ اس بات کی تصدیق کے لیے سامری نے نکلنے والے کالی کے مندر میں پہنچنے کا فیصلہ کیا اور سیدھا مندر کے شمشان گھاٹ میں نمودار ہوا۔ اس نے سوچا کہ شکنتلا کی خبر لینی چاہیے۔ رات اس کے گرد کی بدروح نے اسے تنبیہ کر دی تھی کہ برائی آگ میں چھلانگ لگانے سے پہلے اس کی حدت کا اندازہ کر لیں، کیوں کہ شکنتلا کے مہابیر آپس میں ٹکرائیں گے اور گرو زائن تو اوجھل جاپ سے غائب ہو جائے گا نقصان شکنتلا کا ہوگا یا پھر سامری کا۔ لہذا سامری نے کالی کے مندر میں ظاہر ہو کر گرو زائن اور شکنتلا کی دور سے ٹکرائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے مندر کی طرف چل دیا۔ مندر کی سیڑھیوں کے قریب آ کر اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا اور آہستہ آہستہ مندر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہ جوں جوں سیڑھیاں چڑھتا جاتا اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی۔

”سامری واپس چلو.....“ اچانک اس کے مہابیر نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ سامری چونک اٹھا اور واپس مڑنے ہی لگا تھا کہ ایک بھاری جسم اچانک ہی پیچھے سے اس کے اوپر آگرا اور سامری سے لپٹ گیا۔ سامری اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور بھاری جسم کے ساتھ ہی سیڑھیوں سے نیچے لڑھکنے لگا اور اس سے قبل کہ سامری کچھ پائے کرتا اچانک اسے زوردار جھپٹن کا احساس ہوا اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆.....☆

پر یہ حیران تھی کہ کئی دن گزر گئے ہیں نہ شکنتلا واپس آئی اور نہ سامری یا شکران کی بھی کوئی خبر ہے۔ پر یہ کو یہ پتا تھا کہ گرو زائن کوئی عمل کر کے شکنتلا کو غلام بنانا چاہ رہا ہے۔ پہلی دفعہ شکنتلا کے سر میں شدید درد جب اٹھا تو اس وقت صرف پر یہ ہی موجود تھی۔ ہو سکتا ہے شکنتلا غلام بن گئی ہو، لیکن سامری اور شکران کو تو واپس آنا چاہیے۔ شکنتلا کا غلام بن جانا ہی بہتر ہے۔ اس نے دل میں سوچا، تاکہ میں کسی طریقے سے حکومت پر قبضہ کر لوں، کیا میں ملکہ بن سکتی ہوں؟ اس نے سوچا۔ ایسا ہو جائے تو مزے ہو جائیں۔ مجھے اس کی تیاری کرنی چاہیے۔ ہو سکتا ہے شکنتلا واپس نہ آئے۔ ابھی تک تو کسی کو نہیں پتا کہ وہ کہاں گئی ہے، اسی لیے حکومت کے تمام اہل کار اور درباری ابھی تک اسی کی عزت کرتے اور اس سے ڈرتے ہیں۔ سب کو پتا تھا کہ یہ شکنتلا کی نائب ہے۔ پورے محل اور دربار میں شکنتلا کے بعد اسی کا ہی سکہ چل رہا تھا۔ اس وقت پر یہ اپنی وسیع و عریض بھی سجائی خوب صورت خواگاہ میں موجود تھی۔ شام کا وقت تھا۔ وہ خوب صورت زرق برق لباس میں آرام دہ تخت پر نیم دراز تھی۔ دو کنیریں مورچہ جھل جھل رہی تھیں اور دو زمین پر بیٹھی اس کے پاؤں داب رہی تھیں۔ پر یہ اعلیٰ درجے کی شراب کی چسکیاں لے رہی تھی۔ گردن غرور سے اٹھ رہی تھی۔ درجنوں کنیریں اور غلام کمرے کی دیوار کے ساتھ کسی بھی حکم کے منتظر مودب کھڑے تھے۔ کمرے کے درمیان دن بھر مختلف غلطیاں کرنے والے غلام اور کنیریں مرعابے ہوئے تھے اور ان کی پشت پر دوزی پتھر رکھے گئے تھے۔ یہ عمل خاصی دیر سے جاری تھا۔ جیسے ہی کوئی سکستیا آہ بھرتا، قریب کھڑا ایک ہٹا کٹا غلام اس کے عریاں بدن پر ہتھ بڑھا دیتا۔ درد کی شدت سے وہ بلبلاتا اٹھتا اور پر یہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ اس کی جان تب ہی چھوٹی جب پر یہ کاجی اس منظر سے بھر جاتا۔

اب صرف کھلا اور پونم اس کے پاس رہ گئیں۔ پر یہ تخت سے اٹھ کر اپنے نرم ریشمی بستر کی طرف چل دی جس کے تین اطراف چھت سے فرش تک تازہ پھول اور کلیاں پرو کر رکھی گئی تھیں۔ کمرے میں خوشبو بکھیر کر رومانی ماحول پیدا کر رہی تھی۔ پر یہ کے بستر پر بیٹھے ہی پونم فوراً جھکی اور اس کے پاؤں سے سونے کے کام والے جوتے اتارنے لگی۔ کھلانے پر یہ

”چنکار سے بولو کہ آئندہ تمہیں مالکین نہ کہے بلکہ براہ راست میرا حکم مانے۔“

”چنکار..... مجھے مالکین نہ کہا کرو بلکہ گرو زائن میرے آقا کی آواز پر عمل کیا کرو۔“

”جی اچھا.....“

”چنکار۔“

”جی میرے آقا.....“ بہت خوب گرو زائن مسرت سے بولا۔

”ایک کوڑے سے شکنتلا کو خوب مارو، لیکن اس کی چیخیں ہمارے سوا کوئی نہ سن پائے۔“

یہ حکم سنے ہی شکنتلا کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں اور وہ دوڑ کر گرو کے قدموں سے لپٹ گئی۔

”معاف کر دو میرے آقا، میں آپ کی باندی ہوں، آپ کا ہر حکم فوراً مانوں گی، مجھ پر دیا کرو۔“ لیکن شراب کی آواز کے ساتھ شکنتلا کی چیخ نکل گئی۔ کوڑا اس کے وجود کو سرخ کرتا گیا۔ درد کی شدید لہر اس کے پورے بدن میں دوڑ گئی، گرو زائن نے اس کی آواز پر قطعاً کوئی توجہ نہ دی اور لکشم ناتھ کو مسکرا کر ناشتا کرنے کا اشارہ کیا اور دونوں سلی سے ناشتا کرنے لگے۔ چنکار سرعت سے کوڑے برسائے لگا۔ شکنتلا کمرے میں ادھر ادھر دوڑنے لگی۔ اس کی دلدوز چیخوں سے کمرہ گونج رہا تھا، لیکن اس کی آواز باہر کسی کو نہ سنائی دے رہی تھی۔ وہ بار بار گرو زائن کے قدموں میں گر رہی تھی۔ ہاتھ جوڑ رہی تھی، لیکن نہ تو گرو زائن نے کوئی توجہ دی اور نہ ہی چنکار کا ہاتھ رکا اور شکنتلا اپنے ہی خون میں لہو لہان ہوتی رہی۔ آج اس کو تکلیف کا باقاعدہ احساس ہوا تھا اور یہ پتا چلا تھا کہ لوگ درد سے کیوں چلاتے ہیں۔

ناشتا کر چکنے کے بعد گرو زائن نے چنکار کو بس کرنے کا حکم دیا تھا۔ شکنتلا کا تمام لباس پھٹ چکا تھا۔ سارا جسم زخموں سے چور تھا اور وہ کمرے کے فرش پر پڑی اپنے زخم چاٹ رہی تھی اور زخمی طرح تڑپ رہی تھی۔

”جی میرے آقا۔“

”اس کی تکلیف ختم کر دو۔“

اور پھر اگلے ہی لمحے شکنتلا کی تمام تکلیف ختم ہو گئی اور زخم بھر گئے تو شکنتلا نے سکھ کا گہرا سانس بھریا۔

”جی.....“ گرو زائن کی آواز سن کر وہ فوراً بولی۔

”اپنا لباس انتہائی خوب صورت کر لو۔“ حکم سن کر شکنتلا نے لوٹ لگائی اور ناگن بن گئی، پھر لوٹ لگائی تو انتہائی شاہانہ لباس میں نکھرے نکھرے حسن کے ساتھ موجود تھی۔ بکھری زلفوں سے جھانکتا گلابی چہرہ لکشم اور گرو زائن کو پاگل بنا رہا تھا۔ دونوں ناشتا ختم کر کے اس کی طرف بڑھے اور شکنتلا ان دونوں کے درمیان پھر کھلونا بن گئی۔

☆.....☆

سامری جب واپس وادی والے مکان میں پہنچا تو شکنتلا موجود نہ تھی۔ رقیہ، کنیر فاطمہ اور اسد اللہ اُداس بیٹھے سلیمان کی دردناک موت کا ماتم کر رہے تھے۔

سامری کو اچانک سامنے باکرتیوں سہم گئے اور سوچنے لگے کہ الہی خیر ہو کہیں دوبارہ کوئی مصیبت تو نہیں آنے والی۔ سامری دروازے میں کھڑا تینوں کو گھورنے لگا اور بولا۔

”شکنتلا کہاں ہے؟“

”ہمیں کچھ پتا نہیں بیٹا میں تو پنجرے میں بند تھا کہ اچانک ہی پنجرہ غائب ہو گیا۔ وہاں سے اٹھ کر اس کمرے میں آیا تو بہو اور بیٹی لہو لہان پایا۔ صبح تک بڑی مشکل سے انہیں ہوش آیا تھا۔ انہی کی زبانی پتا چلا کہ شکنتلا نے رات کو عجیب القوت مخلوق سے ان دونوں بے چاریوں کو کوڑوں سے پٹوایا۔ مار کھا کر یہ دونوں بے ہوش ہو گئیں اور کسی بات کا ہمیں کچھ پتا نہیں۔ ہم غریب مظلوم لوگ ہیں۔ ہم نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا، پھر تم لوگ کیوں ہمیں جک کرتے ہو؟“

”اچھا ملکہ عالیہ؟“ گرو نرائن طنز پر لہجے میں بولا۔
”تو مجھے کھالو..... تم تو انسان کا انسان کھا جاتی ہو.....“

”نہیں آقا.....!“ شگنتلا اس کے پیروں پر سر رکھتے ہوئے بولی۔
”مجھ پر دیا کرو، اب تو میں تمہارے قبضے میں ہوں، میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“
”تو جا بھی کہاں سکتی ہے؟“ گرو اس کی پتلی کمر کو ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔

”اور کھانے پینے کو تو مجھے کل صبح ہی مل سکتا ہے، مجھے احساس بھی تو ہو کہ جن لوگوں کو تو بھوک اور پیاس کی اذیت سے قتل کرتی رہی ہے، ان کو کسی تکلیف ہوئی تھی۔ میں تجھے ہر وہ تکلیف دوں گا جو تو دوسروں کو دیتی رہی ہے۔“ یہ باتیں ابھی وہ کہہ رہے تھے کہ چٹکار ایک دم ظاہر ہو گیا اور تیزی سے بولا۔

”مالک۔ سامری مندر کی طرف شگنتلا کی تلاش میں آ رہا ہے۔“ اس کی بات سنتے ہی شگنتلا کی آنکھوں میں اُمید کی کرن چمکی، لیکن گرو نرائن فوراً کھڑا ہو گیا اور گرج کر بولا۔ ”آج سامری بچ کر نہیں جاسکتا۔ چٹکار اسے مہا پیر اس کا راستہ روکنے پر مامور کر دو۔“

”مالک“ چٹکار ادب سے بولا۔

”سامری بہت بڑا جادوگر ہے اور اس کے قبضے میں بھی بڑے مہا پیر ہیں۔ ہمارا فتح یاب ہونا بہت مشکل ہے۔ البتہ آپ شگنتلا کو حکم کریں کہ وہ چپ کر اس پر وار کرے اور اسے ڈس لے۔ زہر کے اثر سے وہ بے ہوش ہو جائے گا اور آپ اس کو با آسانی قابو کر لیں گے۔“ چٹکار نے مشورہ دیا۔

”واہ..... چٹکار واہ“ گرو نرائن نے مسرت کا اظہار کیا۔

”اس سے اچھی ترکیب ہو ہی نہیں سکتی۔“

”شگنتلا۔“

”جی میرے آقا.....؟“ شگنتلا نہ چاہتے ہوئے بھی کھڑی ہو گئی۔

”تم فوراً ایک کبھی کاروبار دھار کر مندر کی سیڑھیوں پر پہنچ جاؤ اور جیسے ہی سامری قریب آئے ایک بہت بڑے اژدہ کا روپ دھار کر اس کے اوپر جا کر اور اس کو ڈس لو..... سامری کا مرنا آسان نہیں لیکن وہ ہوش سے بگڑا نہ ہو جائے گا۔“

شگنتلا کی خواہش تھی کہ سامری پہنچ جائے اور اس کو آزاد کرانے، اس لیے وہ تاخیر کرنے لگی، لیکن فوراً ہی اس کے دماغ کی رگوں میں شدید کھنچاؤ پیدا ہوا۔ اس کو سامری یاد نہ رہا اور اس کو رگیں چھٹی ہوئی محسوس ہوئیں، لہذا اس نے فوراً لوٹ لگائی اور ایک کبھی بن کر کمرے میں اڑنے لگی۔ چٹکار نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ”شگنتلا میری پتھیلی پر بیٹھ جاؤ۔“ یہی وہ وقت تھا جب سامری سیڑھیاں چڑھنا شروع کر چکا تھا۔ شگنتلا کبھی کے روپ میں سامری کی طرف بڑھنے لگی۔ اسی وقت سامری مہا پیر کی آواز سن کر نیچے کی طرف پلٹا، لیکن شگنتلا پھرتی سے بہت بڑے اژدہ کی شکل میں آ کر سامری کے اوپر آ گری اور اس سے پہلے کے سامری سنبھلتا شگنتلا نے تیزی سے اس کے شانے میں دانت گاڑ دیے۔ سامری کے جسم میں کثیر مقدار میں زہر داخل ہو گیا جس کے اثر سے وہ فوراً بے ہوش ہو گیا۔

اژدہ کی اچانک آمد اور ایک آدمی پر حملے سے مندر کی سیڑھیوں پر آتے جاتے لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ بھگدڑ میں چٹکار نے بے ہوش سامری کا ہاتھ تھاما۔ اس کے ساتھ ہی شگنتلا نے لوٹ لگائی اور دوبارہ کبھی بن کر چٹکار کے دوسرے ہاتھ پر بیٹھی لمحوں کے بعد یہ تینوں دوبارہ لکشم ناتھ کے کمرے میں موجود تھے اور مندر کی سیڑھیوں پر صرف چہ میگوئیاں رہ گئی تھیں۔ لکشم ناتھ اور گرو نرائن بے ہوش سامری کو اپنے قدموں میں پا کر خوشی سے پھولے نہ سارے تھے۔ شگنتلا ایک بار پھر انسانی روپ میں کمرے کے کونے میں ہاتھ باندھ کر با ادب اُداس کھڑی ہو گئی۔

”بڑا جادوگر بنا پھرتا ہے.....“ گرو نرائن فخر پر لہجے میں بولا۔

”لیکن اونٹ جب پہاڑ کے نیچے سے گزرتا ہے تو اس کو معلوم پڑتا ہے اس سے بلند چیزیں بھی دنیا میں موجود ہیں۔“

کے پاؤں اٹھا کر بستر کے اوپر رکھ دیے۔
”اس نوجوان کو ہماری خواہ گاہ کے اندر بھیج کر کاڑ بند کر دو اور تم دونوں ہمارے کسی بھی حکم کی تعمیل کے لیے باہر کھڑی رہو۔“

”جی بہتر۔“

پونم اور کملہ دونوں پر یہ کوفرتی آداب کرتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد ایک دروازہ گوری رنگت سیاہ کالی آنکھوں اور لمبے بالوں والا تیس بائیس برس کا سہا ہوا لڑکا خواب گاہ کے اندر داخل ہوا۔ پر یہ شراب کا جام پکڑے عینے کے ساتھ پشت لگائے پڑا اشتیاق نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ لڑکا پر یہ کو دیکھ کر مزید سہم گیا اور وہیں دروازے کے پاس ہی ساکت ہو گیا۔

”ادھر آؤ لڑکے.....“ پر یہ نے تھکسانہ لہجے میں کہا تو لڑکا ہولے ہولے لرزنے لگا۔ پر یہ کو دیکھ کر وہ مڑی طرح خوفزدہ ہو چکا ہے۔

”ہمارا حکم تم نے سنا نہیں! ادھر آؤ۔“ پر یہ نے مزید بارعب انداز میں کہا تو لڑکا تیز تیز چلتا ہوا اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکا بلکہ جوان مرد خوف سے مڑی طرح کانپ رہا تھا۔

پر یہ اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”جی پرتھوی.....“

”میرا نام تجھے معلوم ہے؟“

”جی نہیں.....“ نوجوان اب بھی خوفزدہ تھا۔

”میرا نام پر یہ ہے.....“ پھر پوری تمکنت سے مسہری پر دروازہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں تاپانہ کی نائب ملکہ اور اپنی مرضی کی آپ مالک ہوں۔ میں چاہوں تو ابھی جلا دلا کر یا خود خنجر کے ساتھ تیری بوٹی بوٹی الگ کر دوں..... اور چاہوں تو اپنا خوب صورت جسم تجھے سونپ دوں اور اس کے بعد تمہیں رہا بھی کر دوں، لہذا جیسے میں کہتی جاؤں ویسے کرتے جاؤ۔“

”جی بہتر.....“ نوجوان کی کچھ ڈھارس بندھی۔ اب وہ پر یہ کا مطلب کچھ سمجھ رہا تھا۔

پر یہ چند لمحے اسے خمار آلود نگاہوں سے نگتی رہی اور پھر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

اور پھر..... کب صبح ہوئی پر یہ اور پرتھوی دونوں کو پتا نہ چلا۔

☆.....☆

پر یہ کی جب آنکھ کھلی تو باہر سے کینز ہولے ہولے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ پرتھوی اوندھے منہ لینا گہری نیند سو رہا تھا اور باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں سے صبح کا اجالا چمن چمن کر رہا تھا۔

پر یہ بستر سے نیچے اتری اور ہلکے ہلکے قدم چلتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ ابھی وہ دروازے کے قریب بھی نہ پہنچی تھی کہ پیچھے سے کسی نے اس کو دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر فضا میں بلند کر دیا۔ اس نے ایک دم گردن موڑ کر دیکھا..... تو مارے خوف کے اس کی سٹی گم ہو گئی۔

☆.....☆

شگنتلا کی جان عجیب عذاب میں پھنس گئی تھی۔ گرو نرائن اور لکشم کو اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ رات سے لے کر اب دوپہر تک وہ ایک ہی راگ الاپتے رہے تھے۔ اب بھی شگنتلا چکی کے دو پاؤں کے درمیان پس رہی تھی اور بار بار ہاتھ جوڑے جاری تھی۔ رات سے اب تک گرو نرائن نے اس کو کھانے کے لیے بھی کچھ نہ دیا تھا۔ بھوک سے اس کا ہر حال ہو رہا تھا وہ تو بھوک سے پہلے کھانے کی عادی تھی۔ پیاس سے اس کے ہونٹوں پر خشکی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔

”میرے آقا.....“ شگنتلا عاجزی سے گرو نرائن سے مخاطب ہوئی۔

”میرے آقا مجھے کھانے کو کچھ دو، بھوک سے میرا اندھا حال ہو رہا ہے۔“

حکمرانی تم ہی کرو گی۔“ حشکران فیصلہ کن لہجے میں بولا۔
 حشکران کی بات سن کر پرہ کے دل میں لڑو بھونٹنے لگے۔ وہ یہی تو چاہتی تھی۔ وہ دوڑ کر حشکران سے لپٹ گئی اور بولی۔
 ”حشکران تمہاری سہائتا کے بغیر تو پرہ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ شکنتلا جی کے آنے تک ہم دونوں مل کر ان کی سلطنت کو
 سنبھال لیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ مکاری سے رونے لگی اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔
 ”رام کرے کروڑاؤں کو کھڑے پڑیں جس نے ہماری ملکہ عالیہ کو غلام بنایا ہے۔“
 ”حوصلہ رکھو پرہ.....!“ حشکران اس کے کول وجود کو الگ کرتے ہوئے بولا۔
 ”گروڑاؤں کی ایسی گردن ناپوں گا کہ اس کی آنے والی کئی نسلیں برہمچاری بننے کا خیال من سے کھرچ دیں گی۔“
 ان دونوں کی گفتگو سے پر تھوکی جاگ گیا تھا اور خوفزدہ نگاہوں سے دونوں کو دیکھتا جا رہا تھا۔ گز رہے ہوئے لمحات اسے
 ابھی تک سحر میں جکڑے ہوئے تھے۔ پرہ اور حشکران نے اسے قطعاً اہمیت نہ دی۔ پرہ نے طائرانہ نظروں سے ایک لمحے
 کو اسے دیکھا اور پھر حشکران کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔
 ”گروڑاؤں نے اس وقت شکنتلا جی کو کہاں قید کر رکھا ہے؟“
 ”کلکتے میں کالی کے استھان پر۔“

”تو تم اس کے مقابلے پر کیوں نہیں جاتے؟“ پرہ نے گروڑاؤں کی طاقت کا اندازہ لگانے کے لیے حشکران کو ٹوٹا۔
 ”اس وقت گروڑاؤں انتہائی چوکنا ہے اور کالی کے استھان کا پجاری لکشم ناتھ جس کے قبضے میں بہت سی شکنتیاں
 ہیں، وہ بھی گروڑاؤں کا سا بھی ہے۔ اس کے علاوہ سامری بھی انہی کی قید میں ہے اور پھر شکنتلا کی ساری شکنتیاں بھی
 گروڑاؤں کے ہاتھ میں ہیں۔ ایسے میں میرا کیلے وہاں جانا دانش مندی نہیں، ہمیں سے کا انتظار کرنا ہوگا۔“
 حشکران کسی گہرے منصوبے کے تانے بانے بن رہا تھا۔ پرہ نے حساب لگا لیا تھا کہ شکنتلا گروڑاؤں کے جال میں
 بڑی طرح جکڑی جا چکی ہے۔ اب جلدی اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں اور تابانہ کے تحت پر بیٹھنا اب پرہ کا حق
 ہے۔ پرہ کی زیر لب مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔

☆.....☆
 سامری کے بے ہوش جسم کے گرد گہری سرخ رنگ کی روشنی کا ہالا بن رہا تھا۔ یہ روشنی سامری کے بے ہوش جسم کو
 اپنے جلو میں لے رہی تھی۔ گروڑاؤں اور لکشم ناتھ کچھ حیران، کچھ خوفزدہ اور شکنتلا پر امید نظروں سے سامری کے بے
 ہوش وجود کو دیکھنے لگی۔

سرخ روشنی کے ہالے لہجہ بہ لہجہ گہرے ہونے لگے اور پھر سامری کے بے ہوش جسم میں کسمساہٹ پیدا ہوئی اور اچانک
 سامری زوردار جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ روشنی اب بھی اس کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھی۔ سامری کی آنکھیں کھلنے لگیں
 اور اس کے ساتھ ہی گروڑاؤں اور لکشم ناتھ کے ہونٹ ملنے لگے۔ لکشم ناتھ نے سامری کو دوبارہ بے ہوش کرنے کی غرض
 سے منتر پڑھ کر منہ غبارے کی طرح پھلا کر سامری کے گرد سرخ لہروں کے بالکل قریب جا کر زوردار انداز میں پھونک
 ماری۔ لیکن رد عمل بڑا حیران کن ثابت ہوا۔ جب لکشم ناتھ کی پھونک سرخ شعاعوں سے ٹکرا کر گوجی آواز کے ساتھ پٹی
 اور لکشم ناتھ کے تھنوں میں گھس گئی۔ لکشم ناتھ کی آنکھیں ایک دم اوپر کو چڑھ گئی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی مانند گرنا چلا گیا۔
 ادھر گروڑاؤں بھی اپنا جابجامل کر چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی شکنتلا کو بھی آنکھوں سے سامری سے فوراً نینٹے کا حکم دیا تو
 شکنتلا کے سر میں درد کی شدید لہریں پیدا ہونے لگیں۔ شکنتلا نے چیخا کر کوٹھل کر لیا۔ گروڑاؤں نے اپنا جابجامل کرتے ہی
 دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑ لیے اور جے کالی کا نعرہ بلند کر کے ڈنڈوت کرنے لگا۔ یکبارگی چاروں طرف سے سیاہ
 کالا دھواں پیدا ہوا اور سامری کے گرد ہالہ بنانے لگا۔ کڑوا سیلا دھواں سامری کے تھنوں میں گھسا تو سامری بڑی طرح
 کھانسنے لگا، حالانکہ اس وقت بھی سامری کے گرد سرخ لہریں موجود تھیں اور سامری کو اُمید مئی کہ دھواں اس کا کچھ نہیں
 بگاڑ سکتا لیکن اسی خوش فہمی میں دھواں سرخ لہروں کو چیرتا ہوا سامری کے منہ اور ناک میں گھس گیا اور سامری کو کھانسی کا

ہر نپلے کے لیے دہلا موجود ہوتا ہے اور دیکھ شکنتلا۔“ گروڑاؤں اس کو بالوں سے پکڑ کر بولا۔ ”آج حیرا خاص یا رہی میرے
 قدموں میں ہے۔ اب میں اس کا وہ حشر کروں گا کہ اس کی آتما بھی نرکھ میں بلبلاتی رہے گی اور کون کون ہے حیرا یا رہ.....
 جلدی بتاؤ۔“ گروڑاؤں شکنتلا کے بالوں کو جھٹکتے ہوئے بولا۔ تکلیف اور بے بسی سے شکنتلا کے آنسو نکل آئے۔ اس سے
 زیادہ بے بس وہ کبھی نہ ہوئی تھی۔ گروڑاؤں کام بھی سارے اس سے ہی مکمل کروا تا اور ذلیل و خوار اور زرد و کوب بھی کرتا،
 شکنتلا کی دماغی کیفیت ایسی ہو چکی تھی کہ گروڑاؤں کے کسی سوال کا صحیح جواب نہ دینا اس کے بس میں نہ تھا، اس کے ہونٹوں
 اور ذہن پر سے اس کا اپنا کنٹرول ختم ہو چکا تھا۔

”جلدی بتا..... کتیا..... اور کون ہے حیرا یا رہ؟“
 ”جی..... حشکران.....“ شکنتلا کو نہ چاہتے ہوئے بھی بتانا پڑا۔
 ”یہ کون ہے؟“
 ”یہ ایک جن ہے میرے آقا اور یہ میرا گہرا دوست ہے۔“
 ”ہوں.....“ گروڑاؤں اس کے بالوں کو چھوڑتے ہوئے بولا۔
 ”اس کا مطلب ہے وہ بھی ضرور حملہ آور ہوگا۔“

اور شکنتلا اس کی باتیں سن کر تھرا اٹھی، کیوں کہ اب صرف حشکران ہی اس کے لیے اُمید کی واحد کرن تھا۔ اگر وہ بھی
 گروڑاؤں کے ہتھے چڑھ گیا تو کیا ہوگا۔ یہ سوچ کر ہی شکنتلا کا دل ڈوبنے لگا۔
 ”گروڑاؤں یہ کیا؟“ اچانک لکشم ناتھ کی آواز گونجی۔ وہ بے ہوش سامری کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ سب نے اس کی
 طرف دیکھا تو وہاں ایک اور ہی منظر تھا۔

☆.....☆
 پرہ نے جب سر گھما کر دیکھا تو اس نے اپنے آپ کو ایک ایسی مخلوق کے شکنجے میں پایا جس کے پاؤں فرش پر اور سر
 چھت کے ساتھ لگا ہوا تھا اور گز بھر لمبی زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ آنکھیں ڈیلوں سے باہر اُبل رہی تھیں۔ بڑے بڑے پیلے
 نوکیلے دانت منہ سے باہر آ رہے تھے۔

پرہ مارے خوف کے چلانے لگی۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ ساری شوخی ہرن ہو گئی اور اس سے قبل کہ وہ بے ہوش ہو جاتی
 حشکران اپنی انسانی شکل میں آ گیا۔ حشکران کو دیکھ کر پرہ کے حواس درست ہونے لگے اور وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔
 ”حشکران کے بچے تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔“ پرہ دونوں ہاتھ اس کے سینے پر مارتے ہوئے مصنوعی خفگی
 سے بولی، پھر اچانک چوٹی اور حشکران کے دونوں ہاتھ تھام کر سوال کرنے لگی۔

”حشکران شکنتلا جی کہاں ہیں؟ سامری بھی واپس نہیں آیا اور تم آج اتنے دنوں کے بعد نظر آئے ہو؟“
 ”ملکہ عالیہ گروڑاؤں کی غلام بن گئی ہے۔“
 ”کیا.....؟“ پرہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اسے ایسے جواب کی قطعاً توقع نہ تھی۔
 ”یہ کیسے ہوا حشکران.....؟“ وہ بے تابی سے بولی۔

”گروڑاؤں تیرے جابجامل میں کامیاب ہو کر شکنتلا کے جسم، جان، روح اور اس کی تمام خلقتوں پر قابض ہو گیا ہے اور
 اب ملکہ عالیہ اس کی بھاؤنا کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتیں اور سامری جی بھی گروڑاؤں کے پاس قید ہو چکے ہیں۔“
 ”کیسی بڑی بڑی خبریں سنار ہے ہو حشکران۔“

”میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ اب شکنتلا جی کا واپس آنا بہت مشکل ہے۔ وہ اب گروڑاؤں کے حکم کے بغیر کچھ نہیں
 کر سکتیں اور سامری اس کی گرفت میں بے ہوش پڑا ہے۔“ حشکران پُر سوچ لہجے میں بول رہا تھا۔
 ”تو..... تو..... اب تابانہ کی سلطنت کون سنبھالے گا؟“ پرہ دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے بولی۔
 ”تابانہ کی وارث صرف ملکہ عالیہ شکنتلا ہی ہیں پرنتو..... جب تک ملکہ گروڑاؤں کی قید میں ہیں، سارے انتظامات کی

ہونٹوں پر پھیری تو وہاں پہڑیاں جننے لگی تھیں۔
 ”مجھے کچھ کرنا چاہیے۔“ شکنتلا نے سوچا۔ ”وگرنہ یہاں ہی میرا مرگھٹ بن جائے گا۔“
 اب شکنتلا نے گھٹنوں سے سر اٹھایا اور اپنی دونوں ٹانگیں آہستہ آہستہ آگے بڑھائیں۔ وہ پیٹھ کے بل بیٹھی تھی،
 اب دونوں ہاتھ اس نے زمین پر رکھے اور ہاتھوں پر اپنا وزن ڈالا اور پیٹھ اٹھا کر تھوڑا آگے کو سرکی۔ پھر اپنے پاؤں مزید
 آگے کیے اور دونوں ہاتھوں پر اپنے جسم کو پھر اٹھایا اور مزید چند انچ آگے ہو گئی۔

اب وہ اسی طرح قدم قدم آگے بڑھنے لگی جس طرح لکڑے لوے اور پانچ فقیر بیٹھے بیٹھے ہاتھوں کے سہارے چلے
 ہیں، ابھی تھوڑا سا ہی چلی تھی کہ زخموں کی تکالیف اور بھوک پیاس کی شدت سے ہانپنے لگی۔ شکنتلا کے لیے تو یہ سب کچھ
 بالکل نیا اور نرک کی مانند تھا۔ اس نے تو سارا جیون پریش بسر کیا تھا۔ جب وہ سانب بھی تو بھی گرو مہاراج اور ان کے آباء
 اجداد نے شیش ناگ کی جوڑی کی پرورش بڑے ناز و نعم سے کی تھی اور انسان بننے ہی کامیابیاں اور عیش و عشرت اس کی
 لونڈیاں بن گئی تھیں، لہذا یہ افتاد شکنتلا کے لیے عذاب النار بن گئی تھی۔

وہ تھوڑا سا چلتی اور پھر رک جاتی، پھر تھوڑا گھسٹ گھسٹ کر سفر کرتی اور پھر ہانپنے لگتی۔ سورج دیوتا اب پورے نصف
 النہار پر جوش و خروش سے آگ بربسا رہا تھا اور شکنتلا کے آس پاس سایہ تک نہ تھا۔ اس کی کوئی منزل نہ تھی۔ اس کی منزل
 اس وقت پانی کے چند گھونٹ اور پیٹ پوجا کا سامان تھا جو کہیں دکھائی نہ دے رہے تھے!

وہ نڈھال ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر بے ہوش ہو گئی تو پھر
 دوبارہ ہوش آنا ممکن نہ تھا۔ بھوک پیاس کی شدت زخموں سے چور بدن، شدید جلن، بکھیوں کی بھنبھناہٹ اور قیامت
 خیز گرمی آتما اور شریر کا رشتہ توڑ کر رکھ دے گی۔ یہ بھی ممکن ہے بے ہوشی میں گدھوں کے کسی ٹولے کا نشانہ بن جائے
 اور وہ اس کی ہڈیاں کھا لیں گے۔

اسی جاں بلب عالم میں شکنتلا سستی اور تڑپتی رہی جانے کتنی دیر چلتی رہی سورج اب مغرب کی طرف اتر رہا تھا۔ شکنتلا
 نے ایک بار پھر سامنے کی طرف نظر دوڑائی تو دور بہت دور اسے یوں محسوس ہوا جیسے کچھ آبادی کے آثار ہیں۔

شکنتلا کی آنکھوں میں ہلکی سی امید کی چمک ابھری اور وہ تمام تکالیف کو بھول کر جسم کو گھسنے لگی، جتنی دھرتی پر ہاتھوں اور
 پاؤں کے سہارے چلنے سے چھالے بڑگئے تھے۔ یہ ایک نئی آفت کا آغاز تھا۔ اسی طرح شام کی سرخی پھیلنے لگی اور پھر آہستہ
 آہستہ سورج اپنا سفر مکمل کر کے مغرب کی آغوش میں چھپ گیا اور دھرتی رات کی سیاہ چادر اوڑھنے کی تیاری کرنے لگی اب
 ہوا ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ شام کے اسی ملگجے میں شکنتلا کو دور کسی گاؤں کے آثار گہرے دکھائی دینے لگے۔ گاؤں کے مکانوں
 سے دھوئیں کے مرغولے بھی اٹھ رہے تھے لیکن ابھی تک کسی انسان کے آثار نظر نہ آئے تھے۔ شکنتلا کے چہرے پر امید کے
 آثار بندھنے لگے۔ اس نے سوچا کہ کسی طریقے سے اس گاؤں تک پہنچ جائے تو زندگی کی ڈور عارضی طور پر بحال رہی جاسکتی
 ہے، لیکن ابھی آبادی خاصی دور اور اس کے چلنے کی رفتار بہت کم تھی اور اب تو اس پر نفات بھی طاری ہونے لگی تھی۔ ادھر
 اب اندھیرا بھی چھانے لگا تھا، لیکن جب تک سانس تب تک آس، شکنتلا سستی سستی اپنے وجود کو دھستکتی رہی!

رات کی سیاہی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ شکنتلا کا سفر جاری تھا۔ گاؤں کی ٹٹھائی روشنیاں ہر لمحہ قریب ہوتی جا رہی
 تھیں۔ شکنتلا کا سارا شریر جھکن سے چور چور ہو رہا تھا۔ زخموں کی تکلیف الگ تھی۔ لیکن وہ چلتی رہی کسی انجانی منزل کی
 تلاش میں۔ اب گاؤں کے انکا دکا دکا کھیت شروع ہو چکے تھے۔ کہیں کہیں سے کٹوں کے بھونکنے یا جانوروں کے گلے میں
 بندھی مٹی کی ٹٹھن کی آوازیں بھی مدہم مدہم سنائی دینے لگی تھیں۔

سیاہ کالی رات کے گھٹاؤب اندھیرے میں شکنتلا ہولے ہولے رینگ رینگ کر چل رہی تھی، لیکن اب اس کی ہمت
 جواب دینے لگی تھی۔ زخموں کی جلن ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ بھوک اور پیاس کی شدت روح و جسم کا ناتا توڑنے کو بے
 چین تھی۔ حواس اس کا ساتھ چھوڑنے پر تل گئے آبادی اب قریب آ چکی تھی۔ اچانک اسے کتوں کے بھونکنے اور تیز تیز
 بھاگنے کی آوازیں محسوس ہوئیں، یہ آوازیں پیچھے سے آرہی تھیں۔ شکنتلا نے گردن موڑ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن اتنے

شدید دورہ پڑ گیا۔ اسی اثناء میں شکنتلا نے نہ چاہتے ہوئے بھی طوعاً و کرہاً سامری کے خلاف کارروائی کا آغاز کر دیا، کیوں
 کہ اس کے سر میں درد کی لہریں دماغ کی رگیں پھاڑنے لگی تھیں۔ شکنتلا نے چٹکار کو اشارہ کیا تو چٹکار حرکت میں آ گیا اور
 سرعت کے ساتھ چند قلابازیاں لگا کر ایک ہاتھ آسمان کی جانب بلند کیا تو یوں محسوس ہوا جیسے کمرے کے اندر بجلی چمک گئی
 ہو۔ اس کی کڑک سے درد یوار تھر اٹھے اور کمرے میں موجود ذرہ ذرہ چمک اٹھا، بجلی کڑکڑاتی ہوئی سامری کی طرف پلکی،
 لیکن سامری بجلی کے چمکنے سے پیشتربھی کھانسی کے شدید دورے کے دوران جھج اٹھا۔

”کارجیکا..... کارجیکا..... دیوتا سہانتا کرو.....“ سامری کی آواز اور بجلی کی کڑک ایک ساتھ پیدا ہوئیں اور پھر ایک دم
 جنگ و جدل کے دیوتا کارجیکا کی شبیہ سرخ لہروں کے اندر جذب ہو گئی۔ یوں سامری جتنی موت سے بچ نکلا اور اگلے ہی لمحے وہ
 کھانسی سے نجات پا چکا تھا۔ اب بے کارجیکا..... کا نعرہ بلند کر کے سامری نے قدم بڑھائے تو سرخ لہروں اور کارجیکا کی شبیہ
 بھی سامری کے قدموں کی حرکت کے ساتھ حرکت کرنے لگیں۔ سامری کو چلتے دیکھ کر گردن ان کے پھر منتر پڑھنا شروع کر دیا
 لیکن دیوتا کی شبیہ پیدا ہونے سے اس کے قدم ڈولنے لگے تھے، جبکہ چٹکار بدگ کر ایک دم غائب ہو گیا۔ سامری نے تیزی سے
 قدم بڑھائے اور شکنتلا کے سر پر پہنچ گیا اور شکنتلا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے بعد گردن ان کی طرف منہ کر کے زور سے گرجا۔

”اوئے پدی کے شور بے! جادو گروں کے شہنشاہ سامری سے ٹکرانے کا وچار اپنے من سے اوش نکال دے، کتنے کی
 موت مارا جائے گا.....“ اسی اثناء میں گردن ان منتر مکمل کر کے بائیں پاؤں کی اڑھی پر لٹو کی طرح گھوما اور گھومتے ہی
 سامری سے جا ٹکرایا تو یکبارگی نیلی آگ کے شعلے نمودار ہوئے اور شعلوں نے سامری اور شکنتلا کو گھیرے میں لے لیا۔
 گردن ان خود بھاگنے لگا لیکن شکنتلا نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گردن ان کو گرتے سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ پلک
 جھپکنے میں گرد بھی آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔

اب تینوں کی دلخراش چٹھیں آگ کے شعلوں کے درمیان سے ابھر رہی تھیں اور ان کے جسم بُدی طرح آگ میں
 تڑپنے لگے۔ تینوں برائیاں ایک جگہ اکٹھی مرنے کے لیے چلنے لگیں۔

تیز دھوپ آنکھوں میں پڑنے سے شکنتلا کی آنکھ کھل گئی! کچھ دیر تک اس کا ذہن خالی رہا، پھر آہستہ آہستہ ذہن کے
 پروے پر خیالات کا ہجوم رقص کرنے لگا۔ ہولے ہولے اس کو گزری باتیں یاد آنے لگیں!

اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔ سخت جلن محسوس ہونے لگی۔ تب اسے یاد آیا کہ حواس کے
 آخری لمحات میں سامری گردن ان اور وہ آگ کی لپیٹ میں تھے۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہ تھا!

وہ فوراً اٹھی، لیکن یہ کیا اس سے تو اٹھا بھی نہیں جا رہا، اس کا رواں رواں دکھ رہا تھا۔ شکنتلا نے فوراً آنکھیں کھول کر اپنے
 جسم پر نظر ڈالی تو کانپ کر رہ گئی۔ اس کا جسم باجائیدی طرح جلا ہوا تھا۔ سارے جسم پر جلنے کے نشانات تھے اور زخموں میں پیپ
 پڑ چکی تھی۔ ٹانگیں بھی چلی ہوئی تھیں اس سے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ شکنتلا شدید جلن اور زخموں پر کھیوں کے بھنبھنانے سے بے
 چداؤیت محسوس کر رہی تھی۔ شکنتلا کا دل بے اختیار بھرا آیا۔ ضبط کے بندھن کرچی کرچی ہونے لگے اور وہ رو پڑی۔ گھٹنوں میں سر
 دیے جانے کتنی دیر رو رہی۔ وہ سوچنے لگی ”میں کتنی با اختیار تھی اور آج کتنی لاچار ہوں، کیا میری انسانی زندگی کا عبرتناک انجام
 یہی تھا۔ آنے والے وقت کا تصور کرتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خاصی دیر رونے سے اس کا جی کچھ ہلکا ہو گیا۔“

اب اس نے سر اٹھا کر گردن ان کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہ ایک ویران جگہ تھی زمین بھی بخرچھی۔
 تیز دھوپ اس کے جسم کو جلائے جا رہی تھی۔

دور دور تک آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔
 اچانک شکنتلا کو احساس ہوا کہ وہ بہت بھوکے ہے۔ بھوک سے اس کے جسم میں نفات بہت بڑھتی جا رہی تھی۔

لیکن کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ کوئی شجر ساہ دار بھی آس پاس نظر نہ آ رہا تھا۔
 ”اب کیا کروں ناگ دیوتا“ اس کی آنکھوں میں پھر نمی تیرنے لگی۔ ”تو ہی سہانتا کر تیری بچارن آج اتنی بے بس
 اور حقیر ہو گئی ہے۔“ شکنتلا پھر رونے لگی، دھوپ کی بے پناہ تپش نے پیاس کی شدت بھی پیدا کر دی تھی! اس نے زبان

ہو گئی۔ دلاور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ ”مجھے سکون چاہیے باباجی۔“

”نماز بجگاہ قائم کر لو دلاور بیٹا“ بزرگ نے پیار بھرے لہجے میں جواب دیا۔

”آپ آپ سائیں مرچو ہیں؟“

”ہاں!“ مختصر جواب ملا۔

”مجھے اپنی پناہ میں لے لیں میں بڑی دور سے آ رہا ہوں۔“

”ابھی مجھے بہت دور تک جانا ہے..... زادراہ ساتھ کر لے۔“

”میری روح اور جسم دونوں زخم خوردہ ہو چکے ہیں باباجی۔“

”دکھ اور سکھ ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔“ باباجی نے دلاور کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ جیسے دھوپ چھاؤں۔ جیسے رات اور دن، جیسے بادل اور بجلی اور جیسے پھول اور خوشبو ساتھ ساتھ چلتے ہیں، اسی طرح دکھ اور سکھ کا ساتھ بھی ازل سے ابد تک چلے گا۔“

باباجی جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے!

”مجھے غزالہ کا پتا بتا دیجیے باباجی؟“

”علم الغیب سوائے اللہ تبارک و تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔ سائیں مرچو سنجیدگی سے تسبیح کے دانے گراتے ہوئے بولے۔“

”لیکن پھر آپ کو میرا نام اور آنے کا مقصد کیسے معلوم ہو گیا؟“

”اکثر لوگ آنکھیں رکھنے کے باوجود اندھے ہوتے ہیں لیکن کچھ گہرا میری طرح آنکھیں نہ ہونے پر بھی دیکھ سکتے ہیں۔“

”آپ..... آپ اندھے ہیں باباجی؟“ دلاور نے بغور ان کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اسے احساس ہوا کہ باباجی کی آنکھیں کھلی ضرور تھیں لیکن بے نور تھیں۔ دلاور اور حیران رہ گیا جس طرح بابا اسے محسن سے کمرے تک لائے تھے، اس سے دلاور کو کہیں یہ احساس نہ ہوسکا کہ سائیں مرچو اندھے ہیں۔

”ہاں..... میری بصارت نہیں، لیکن بصیرت الحمد للہ موجود ہے۔“

”مجھے غزالہ سے ملوادیجیے باباجی یا عقوبت کا پتا ہی بتا دیجیے۔“ دلاور بے تاب تھا۔

”بندے کو اتنا ہی ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے!“

”میں غزالہ کو پانے کے لیے ہر کوشش کروں گا سائیں بابا۔“

”اتنی کوشش اگر اللہ کو پانے کے لیے کر لے تو غزالہ خود ہی تیرے پاس پہنچ جائے۔“

”میں آپ کی باتوں پر عمل کروں گا باباجی۔“

”صرف اللہ جل جلالہ کے احکامات اور اس کے رسول ﷺ کی سنت پر عمل کرو۔“

باباجی کی باتوں سے دلاور کا سر نہامت سے جھک گیا۔

”میں بہت گنہگار ہوں باباجی میں نے تو شاید ایک زمانے سے نماز بھی نہیں پڑھی۔“

”احساس گناہ بذات خود توبہ ہے۔ اللہ کے حضور نہامت کے دو آنسو بھی عبادت ہیں، جا اس کے حضور جھک جا، جو تمہارا بھی رب ہے اور عقوبت کا بھی، اپنا مقدمہ اسی کے حضور پیش کر جو ہم سب کا خالق اور مالک ہے!“

”میں ضرور جھکوں گا باباجی۔ میرا اللہ میرے ساتھ ضرور انصاف کرے گا۔“

”اللہ سے انصاف نہیں ہمیشہ رحمت کا طلبگار رہنا چاہیے۔“

”مجھے عقوبت کے بارے میں کچھ بتائیے باباجی؟“

”مشرق کی طرف ناک کی سیدھ میں چلنا شروع کر دے۔“

”عقوبت بہت بڑی طاقت ہے باباجی میں ناتواں اس کا مقابلہ کیسے کروں گا؟“

”آیت الکرسی کا ورد ہر جادو ٹوٹنے اور سفلی عمل سے مسلمان بندے کو محفوظ رکھتا ہے اور ہمیشہ با وضو رہا کر۔“

سنے میں کہتے اس کے اوپر ہی آپڑے اور پھر اسے اپنے جسم کے مختلف حصوں میں تیز دانتوں کی چھن محسوس ہوئی۔ دردی شدید لہروں نے سراٹھایا اور شکستہ کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ شکستہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆.....☆

سائیں مرچو کا ڈیرہ پہاڑی کی چوٹی پر تھا جس پر پہنچنے کے لیے ایک پگڈنڈی تھی۔ پہاڑی کے ایک طرف شفاف پانی کی جھیل، دوسری طرف تاحد نظر جنگل اور تیسری جانب کچھ دور آبادی اور چوٹی کی جانب کیلے، سیب اور امرود کے باغات تھے۔

سائیں مرچو کے ڈیرے کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں کسی مرید کو رات ٹھہرنے کی اجازت نہ تھی۔ کہتے تھے کہ

شام ڈھلے سے پونہنئے تک جنات ان کے پاس حاضری دیتے تھے! لیکن دلاور جس وقت پگڈنڈی پر چلتا ہوا سائیں

مرچو کے ڈیرے کی طرف جا رہا تھا، اس وقت سورج اپنا سفر مکمل کر کے مغرب کی گود میں پناہ لے رہا تھا۔ پہاڑی کے اوپر

سے نیچے آنے والے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور مغرب کے بعد یہاں کسی زائر کو ٹھہرنے کی اجازت نہ تھی..... اوپر کی

طرف جانے والا دلاور اکیلا تھا اور تمام لوگ اسے حیرانگی سے پلٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے! لیکن دلاور اپنے غموں سے اس

قدر چور تھا کہ کئی لوگوں کے کہنے کے باوجود بھی نہ رکا اور سائیں مرچو کے ڈیرے پر اس وقت پہنچ گیا جب سورج مکمل طور

پر غروب ہو چکا تھا۔ اس وقت تک یہاں ویرانی چھا چکی تھی اور کوئی ذی روح اس کو نظر نہ آئی اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا! یہ

ایک بہت بڑی چار دیواری تھی جس کے صدر دروازے والی جگہ خالی تھی اور کوئی دروازہ وغیرہ نہ تھا! چار دیواری میں وہ بے

دھڑک گھسنے ہی لگا تھا کہ اچانک اسے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا، اس نے آنکھیں سے پلٹ کر دیکھا تو

اس کی آنکھوں میں حیرت ابھر آئی صرف ایک لنگوٹی پہنے ماتھے پر تک لگائے اور جسم پر سیندریلے ہوئے یہ ایک بڈیوں کا

ڈھانچہ نما سادھو تھا، جس کے ہونٹ موٹے اور سیاہ کالے تھے، جبکہ چہرہ بالکل کسی بچے کی طرح اور سوکھا ہوا تھا، آنکھیں

اندھ کو محسوس ہوئی اور ہاتھ میں لکڑی کی کوئی موڑتی نمائش پکڑے ہوئے دائیں کا ندھے پر ایک میلا کچھلا تھیلہ لٹک رہا تھا۔

”بچہ“ سادھو کی کھروری آواز نکلی۔

”غزالہ کو پانا چاہتا ہے!“ سادھو کے منہ سے یہ جملہ سن کر دلاور کو حیرت سے جھٹکا لگا اور وہ بے اختیار ایک

قدم واپس پلٹ آیا۔

”آں..... ہاں.....“ غزالہ کا نام سننے ہی دلاور کی اُداس آنکھوں میں چمک ابھر آئی!

”آ میرے ساتھ“ یہ کہہ کر سادھو منہ موڑ کر چل پڑا تو دلاور بے اختیار سادھو کے پیچھے لپکا لیکن اسے یوں محسوس ہوا

جیسے پیچھے سے کسی نے اس کی ٹیس کا کار پکڑ کر زور سے کھینچا ہو، جھٹکا اتار دیا اور دلاور گئی قدم پیچھے کی جانب چار

دیواری کے اندر جا کر اور گرتے ہی اٹھ کر تیزی سے پھر سادھو کی طرف بڑھا لیکن اب اسے سادھو کہیں نظر نہ آیا۔ وہ شام

کے طلسم میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا لیکن سادھو ایسے غائب تھا جیسے گدھے کے سر سے سیٹک، ابھی دلاور حیرت کے

سمندر میں غوطہ زن ہی تھا کہ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا، اس کا سر بری طرح جھکا رہا تھا۔“

☆.....☆

کسی نے منجھوڑ کر دلاور کو جگایا۔ دلاور آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک سفید ریش نورانی چہرہ بزرگ

سامنے کمرے میں کھڑے ہیں اور دائیں ہاتھ میں تسبیح تمام رکھی ہے۔ سفید براق لباس پہنے ہوئے اسے اپنے پیچھے آنے کا

اشارہ کر کے چل پڑے۔ وہ غیر ارادی طور پر اٹھ کر سفید ریش بزرگ کے پیچھے چل پڑا بزرگ چلتے چلتے برآمدے میں آگئے

اور ایک کمرے میں گھستے چلے گئے دلاور بھی چلتا ہوا کمرے کے اندر آ گیا اندر داخل ہوتے ہی کھٹاک کی آواز سے دروازہ

بند ہو گیا۔ دلاور نے تیزی سے پیچھے دیکھا اور پھر بزرگ کی طرف متوجہ ہوا تو حیران رہ گیا کہ پورا کمرہ سفید روشنی سے اچانک

منور ہو چکا تھا، جبکہ کھٹاک کی آواز آنے سے پہلے کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ دلاور بھی ان کے سامنے ادب سے بیٹھ گیا!

”پریشان ہو؟“ سفید ریش بزرگ جو دلاور کی نظر میں سائیں مرچو تھے نے اپنائیت سے کہا تو ”باباجی“ دلاور سکنے لگا۔

”میرا وجود کچی کرچی ہو گیا ہے۔“ دلاور رو پڑا۔ ”میری بچی مر گئی، میری بیوی عقوبت لے گیا، میرے لیے دنیا اندھیر

”کہاں ہے میری بیوی کیا تمہیں غزالہ کا پتا معلوم ہے.....؟“

”ہاں۔“ سادھو اس کے دونوں ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹا کر چٹائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ پرنو تمہیں ایک وچن دینا ہوگا سادھو کوٹھاری کو۔ ایک کام کرنا ہوگا کوٹھاری کا۔“ سادھو اپنی چمک دار آنکھیں دلاور کے چہرے پر گاڑتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولا۔

”بولو بولو مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔“ دلاور اب کھانے کو بھول چکا تھا اور اس پر جنونی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ ”وہ دیکھو۔“ سادھو کمرے کے اندر موجود ایک دروازے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ دلاور نے دیکھا تو اس کی بیوی غزالہ دروازے کا درتھاے اسے اُداس نگاہوں سے نگے جارہی تھی۔ دلاور نے غزالہ کی غزالی آنکھوں میں تیرتی نمی کو صاف محسوس کر لیا تھا۔

”غزالہ۔“ دلاور دیوانوں کی طرح غزالہ کی طرف جھپٹا لیکن پلک جھپکتے ہی لوہے کی سلاخوں سے بنا ایک پنجرہ دلاور کے اوپر آگرا اور دلاور پنجرے کے حصار میں قید ہو گیا اور غزالہ کو پیچھے سے کسی نے پکڑ کر گھسیٹ لیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی دلاور کے گرد پنجرہ عائب ہو گیا اور دلاور دوزخ دروازے تک پہنچ گیا اور اسے پہنچ کر اور دھکے دے کر کھولنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ غزالہ کہاں ہو دروازہ کھولو کی آوازیں لگانے لگا اور اندر سے غزالہ کی ہچکیاں اسے صاف سنائی دے رہی تھیں لیکن مضبوط لکڑی سے بنا دروازہ دلاور سے ٹس سے مس نہ ہو سکا۔

”دیوار کو دھکا لگانے سے کچھ نہ ہوگا دلاور۔“ سادھو کی گونجدار کڑکٹی آوازیں کر دلاور رک گیا اور پھر آہستگی سے پلانا۔ ”کیوں قید کر رکھا ہے میری بیوی کو۔“ دلاور کے لہجے میں غراہٹ اب نمایاں تھی۔

دلاور کا لہجہ محسوس کر کے سادھو مکاری سے ہنسا۔ ”ہی ہی ہی۔“ ”کوٹھاری چکی گولیاں نہیں کھیلا ہے دلاور..... تمہارے کمزور بازو کوٹھاری کی مضبوط گردن کو اپنے ہاتھوں میں نہیں لے سکتے۔“

”میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔“ دلاور نے لپک کر کوٹھاری کی گردن دونوں ہاتھوں کے شکنجے میں کس لی لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی ٹھنڈے ٹھار لوہے کو پکڑ لیا ہو دلاور کے ہاتھ ٹھنڈک سے سن ہو کر رہ گئے اور اس نے فوری طور پر سادھو کی گردن سے ہاتھ ہٹا لیے۔

دلاور کی ناکامی محسوس کر کے سادھو چٹائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور سنجیدہ لہجے میں کہنے لگا۔ ”کچھ لو اور کچھ دو تمہیں غزالہ مل جائے گی پرنو تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔“

”جلدی بتاؤ۔“ دلاور تلملائے ہوئے لہجے کے ساتھ چلا ہونٹ دانتوں تلے چباتے ہوئے بولا۔

”پہلے ارمان سے بھون کر دو پھر باتیں ہو جائیں گی بہت سے پڑا ہے اتم کھانا کھاؤ میں ابھی آیا۔“ یہ کہتے ہوئے کوٹھاری جس راستے سے دلاور کو لے کر آیا تھا اسی دروازے سے باہر نکلا چلا گیا اور جاتے ہوئے زوردار آواز سے دروازہ بند کر گیا دلاور حیرت کے سمندر میں غوطہ زن بیٹھ گیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بھوک خیالات پر حاوی ہوتی چلی گئی اور بے اختیار اس کا ہاتھ دسترخوان کی طرف بڑھ گیا۔

☆.....☆

دلاور کھانا کھا کر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ جانے کتنی دیر وہ سوتا رہا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو خاصا وقت گزر چکا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کوٹھاری کہاں چلا گیا؟ اور وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ غزالہ کو اس نے ساتھ والے کمرے میں کیوں قید..... غزالہ کا خیال آتے ہی وہ یکدم اٹھ بیٹھا اور تیزی سے اس دروازے کی طرف بڑھا تو دروازہ یکدم کھل گیا بلکہ دروازہ تو شاید پہلے سے کھلا ہوا تھا اور دلاور اپنے ہی زور میں دروازے کے دوسری طرف زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ گرتے ہی اسے احساس ہوا کہ جیسے زمین سے اُڑ کر ریت اس کے منہ میں آگئی ہو! وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا تو اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا کیوں کہ اس نے اپنے آپ کو تاحد نظر ریگستان میں پایا۔

دلاور نے تیزی سے چاروں طرف گھوم کر دیکھا تو تینوں اطراف اسے ریت ہی ریت نظر آ رہی تھی وہ کسی خیال سے

”اللہ اکبر..... اللہ اکبر.....“ دور کسی مسجد میں اذان کی آواز گونجی تو بابا جی چونک پڑے۔ اللہ کا پیام بندوں کو بھلائی کی طرف بلا رہا ہے۔ بابا جی نے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے.....

”دلاور بھی ان کی پیروی میں تیزی سے اٹھا تو اس کی آنکھوں کے آگے اچانک اندھیرا چھا گیا اور اس کا سر چکرانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ کیوں کہ وہ کمرے میں نہیں بلکہ سائیں مرچو کی چار دیواری کے دروازے سے چند قدم اندر زمین پر پڑا ہوا تھا۔“

دلاور اٹھ کھڑا ہوا، دیکھا تو مشرق سے صبح کی سپیدی نمودار ہو چکی تھی! پرندے چہچہا رہے تھے بابا جی کا دور تک پتا نہ تھا۔ وہ اٹھا اور نماز کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ آج بابا سائیں مرچو سے دوبارہ ملے گا۔

سورج ذرا بلند ہوا تو ازراہ آنے لگے۔ دلاور نے ایک آدمی جو شکل سے مجاور نظر آتا تھا، کو روک کر پوچھا کہ سائیں مرچو کس وقت شرف ملاقات بخشے ہیں تو وہ ملنگ سا آدمی اسے یوں دیکھنے لگا جیسے اسے دلاور کی دماغی صحت پر شک ہو اور پھر بولا۔ ”سائیں مرچو اب قبر سے باہر آ کر تم سے ملاقات کریں گے۔“ تو دلاور کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ کچھ اور لوگوں سے پوچھنے پر اسے پتا چلا کہ سائیں مرچو تو کئی سال ہوئے انتقال کر چکے ہیں۔

دلاور کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا اور اسے اپنا دماغ پھٹتا ہوا محسوس ہوا تو کیا سائیں مرچو اس کے خواب میں آئے تھے؟ اور اسے رستہ دکھا گئے ہیں۔ وہ اپنی سوچوں میں غرقاب آہستہ آہستہ سائیں مرچو کے ڈیرے سے نکل کر مشرق کی طرف چلنے لگا۔

☆.....☆

دلاور چلا جا رہا تھا۔ آج اسے کئی دن ہو گئے تھے! پیدل چلتے چلتے اس کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ جیب میں موجود سکے ختم ہو گئے اور اب فاتح کی نوبت آنے لگی۔ گزشتہ دو دنوں سے اس نے کچھ نہ کھایا تھا جہاں رات پڑی پڑ کر سو رہا تھا، صبح آنکھ کھلتے ہی پھر انجانی منزل کی تلاش میں چل نکلتا۔ نماز کے وقت قریبی مسجد میں جا کر وضو کر کے نماز پڑھ لیتا، مسجد نہ ہوتی تو خاک رہی مسجد نہ کر لیتا، لیکن اب بھوک نے خاصا ستانا شروع کر دیا تھا۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلا تا اس کی نظر میں گناہ تھا!

لیکن بھوک تو آخر بھوک تھی۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے اب اس کی نظریں چاروں طرف گھوم رہی تھیں! وہ اس وقت ایک بازار سے گزر رہا تھا۔ صبح کا وقت اور جانے کون سا قصبہ تھا! لوگ آ جا رہے تھے، دکانیں کھل چکی تھیں۔ قبوہ خانوں اور طباقوں سے کھانے پینے کی خوشبو آ رہی تھی! کھانوں کی خوشبو اس کے نھنوں میں گھسی تو وہ بے چین ہو گیا! اس کی حالت فقیروں جیسی بن چکی تھی! وہ اپنی سوچوں میں غرقاب چلا جا رہا تھا کہ کسی نے اس کے شانے پر پیچھے سے ہاتھ رکھ دیا اور رک گیا اور آہستگی سے مڑ کر دیکھا تو وہی سادھو تھا جو اسے سائیں مرچو کے ڈیرے کے باہر ملا تھا۔

”پریشان ہو بچہ؟ آؤ میرے ساتھ۔“ جانے سادھو کی آنکھوں میں کیا سحر تھا کہ دلاور کوئی مزاحمت نہ کر پایا اور کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ چلنے لگا۔

سادھو جا، نے اسے لیے کتنی دیر چلتا رہا۔ مختلف بازاروں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے خاصی دیر کے بعد وہ ایک بظاہر نہایت بوسیدہ سے مکان میں داخل ہو گیا! مکان کے اندر گھستے ہی دلاور کو خنکی کا احساس ہوا۔

مکان کی ڈیوڑھی خاصی تاریک تھی! ڈیوڑھی کے بعد تنگ سامان تھا۔ محن عبور کرتے ہوئے ایک کمرہ آ گیا، اس کے بعد دوسرا کمرہ اور پھر کئی کمرے سے گزرتے ہوئے سادھو دلاور کو لے کر ایک بہت بڑے کمرے میں آ گیا۔

اس کمرے میں داخل ہوتے ہی دلاور کی ناک میں انواع و اقسام کھانوں کی خوشبو آئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ کمرے کے فرش پر چٹائی پڑی ہوئی ہے! اور دسترخوان سجا تھا! تازہ کھانوں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ کھانا دیکھتے ہی اس کی بھوک دوچند ہو گئی۔

”کھاؤ.....“ سادھو خصوصاً آواز میں بولا تو دلاور ایک دم فرش پر بیٹھ گیا اور نندیدوں کی طرح کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”غیرو۔“ سادھو کڑک کے بولا۔ ”کھانا کھانے سے پہلے اپنی پٹنی غزالہ سے قول لو۔“ سادھو کی بات سن کر دلاور بری طرح چونکا اور اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے سادھو کے دونوں شانے پکڑ کر ہلاتے ہوئے اکھڑی سانسوں اور تیز آواز میں بولا۔

توازن قائم نہ رکھ سکا اور غراب سے پانی کے اندر جا کر اور غوطے کھانے لگا۔

پانی اس کے منہ اور ناک میں گھس گیا اور پھر دلاور کو کوئی ہوش نہ رہا اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ دلاور کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک دریا کے کنارے ریت پر پڑے ہوئے پایا۔ بہت سے لوگ اس کے اوپر بچکے ہوئے تھے اور اس کو ہوش میں لانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ دلاور کو ہوش میں آتے دیکھ کر ایک شخص بولا۔

”کسی اچھے گھر کی لگتی ہے رام جانے کس نے اس کو دریا میں پھینک دیا۔“

”ارے.....“ ایک تیسری آواز ابھری یہ تو کھیا کی داشتہ ہے! جس کو کھیا نے ایک تاجر سے خریدا تھا۔

”چلو چلو اسے کھیا کی حویلی لیے چلتے ہیں۔“ اور پھر کچھ لوگوں نے مل کر اسے ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا اور کچھ دور جا کر ایک چار پائی کے اوپر ڈال کر چل دیے! دلاور جواب پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا! صورت کو سمجھ نہیں پایا تھا کہ یہ لوگ اسے لڑکی اور داشتہ کیوں کہہ رہے ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ اسے ایک حویلی میں لے گئے اور چار پائی حویلی کی ڈیوڑھی میں رکھ دی۔

”واپس چلے جاؤ تم سب۔“ ایک موٹی اور کرخت آواز آئی، دلاور اٹھ بیٹھا۔ دیکھا کہ اسے لالے والے سب لوگ آہستہ آہستہ حویلی سے باہر نکل گئے اور ایک انتہائی صحت مند سیاہ کالے بالوں اور بڑی گھنی مونچھوں والا شخص دھوتی کرتے میں کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

”کیوں بھاگی تھی ری۔“ وہ شخص دلاور کے قریب آ گیا۔

”میں..... میں..... لڑکی نہیں..... میرا نام دلاور ہے۔“ دلاور بولا۔ لیکن خود ہی چونک اٹھا کیوں کہ اس کے حلق سے ایک انتہائی باریک اور سریلی آواز نکلی تھی۔ اب جب سٹ پٹا کر اس نے اپنے آپ کو دیکھا تو مارے حیرت کے اسے چکر آ گئے۔

وہ ایک سرخ رنگ کی ساڑھی میں تھا اور اس کا جسم جسامت کے لحاظ سے بھی ایک سڈول اور سانولے رنگ کی خوب صورت لڑکی جیسا تھا، فوری اور غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ اپنے سر پر گیا تو گدی کے پیچھے بالوں کا گھنا جوڑا محسوس کر کے دلاور کا دل ڈول گیا۔ شاید سادھو کوٹھاری نے اسے اذیت دینے کی غرض سے یہ روپ دے دیا تھا۔

اور دلاور کے لیے یہ روپ تھا بھی بڑا شرمناک..... لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ لڑکی بن چکا تھا اور بقول لوگوں کے اس کھیا کی داشتہ بھی تھا۔

”جواب کیوں نہیں دیتی سچن۔ کیا تجھے کسی نے پانی میں پھنکوا یا خود بھاگی تھی!“

دلاور جس کو سچن کے نام سے پکارا گیا تھا پریشان تھا کہ کیا جواب دے۔ خاموش بیٹھا رہا پھر اچانک اس کے ذہن میں جھپکا کہ ہوا اور اس کا ذہن کھلتا چلا گیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی کھوئی ہوئی یادداشت واپس آ رہی ہو۔

”مجھے آپ کی چٹی شریستی شالیا جی نے اپنے خاص ملازموں کی مدد سے بے ہوش کر کے دریا میں پھنکوا دیا تھا۔ آپ مجھ سے بہت پریم کرتے ہیں نا اسی لیے انہوں نے راستے سے ہٹانے کے لیے مجھے قتل کروانا چاہتا تھا تاکہ آپ کی توجہ حاصل کر سکے۔“

دلاور کے منہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ الفاظ خود نکلتے گئے اور وہ خود بھی اپنے رویے اور باتوں پر حیران ہو رہا تھا لیکن اب اس کا ذہن اس کا ساتھ نہ دے رہا تھا۔

”ہاں ہاں سچن میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔“ کھیا نے آگے بڑھ کر دلاور کو اپنی گود میں اٹھالیا اور دلاور شرم سے زمین میں گڑھنے لگا۔ اس کو بے حد سبکی اور شرم محسوس ہو رہی تھی کہ کہاں تو وہ مونچھوں والا کڑیل جوان تھا لیکن کوٹھاری کی شرارت سے وہ ایک لڑکی بلکہ کھیا کی داشتہ بن گیا تھا۔

☆.....☆

”ہوش میں آ رہی ہے۔ اب اسے ہوش آ رہا ہے۔“ ملی جلی آواز میں شکنتلا کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ وہ کسمانے لگی۔ انسانوں کے دھندلے عکس نمایاں ہونے لگے۔ شکنتلا باقاعدہ ہوش

آکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ وہ کسمانے لگی۔ انسانوں کے دھندلے عکس نمایاں ہونے لگے۔ شکنتلا باقاعدہ ہوش

آکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ وہ کسمانے لگی۔ انسانوں کے دھندلے عکس نمایاں ہونے لگے۔ شکنتلا باقاعدہ ہوش

آکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ وہ کسمانے لگی۔ انسانوں کے دھندلے عکس نمایاں ہونے لگے۔ شکنتلا باقاعدہ ہوش

آکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ وہ کسمانے لگی۔ انسانوں کے دھندلے عکس نمایاں ہونے لگے۔ شکنتلا باقاعدہ ہوش

آکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ وہ کسمانے لگی۔ انسانوں کے دھندلے عکس نمایاں ہونے لگے۔ شکنتلا باقاعدہ ہوش

آکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ وہ کسمانے لگی۔ انسانوں کے دھندلے عکس نمایاں ہونے لگے۔ شکنتلا باقاعدہ ہوش

آکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ وہ کسمانے لگی۔ انسانوں کے دھندلے عکس نمایاں ہونے لگے۔ شکنتلا باقاعدہ ہوش

آکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ وہ کسمانے لگی۔ انسانوں کے دھندلے عکس نمایاں ہونے لگے۔ شکنتلا باقاعدہ ہوش

آکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ وہ کسمانے لگی۔ انسانوں کے دھندلے عکس نمایاں ہونے لگے۔ شکنتلا باقاعدہ ہوش

آکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ وہ کسمانے لگی۔ انسانوں کے دھندلے عکس نمایاں ہونے لگے۔ شکنتلا باقاعدہ ہوش

آکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ وہ کسمانے لگی۔ انسانوں کے دھندلے عکس نمایاں ہونے لگے۔ شکنتلا باقاعدہ ہوش

واپس کمرے میں آیا اور اس دروازے کی طرف بڑھا جہاں سے وہ کوٹھاری باہر گیا تھا۔ دروازے کو ہاتھ لگاتے ہی دروازہ کھلتا گیا۔ تو دلاور کو یوں لگا جیسے ہاتھ لگا جائے گا۔ کیوں کہ یہاں بھی ہر طرف ریت کے ٹیلے نظر آ رہے تھے! جبکہ اسے یاد تھا کہ یہاں تک آتے آتے وہ کئی کمروں سے گزر کر آئے تھے۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ سادھو کوٹھاری کوئی بہت بڑا جادوگر ہے اور اس نے اسے یہاں قید کر دیا ہے تاکہ وہ فرار نہ ہو پائے۔“ سوچتے سوچتے دلاور کے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں اور وہ کمرے میں پھر آ کر لیٹ گیا اور کالی دیر سوچتا رہا۔ اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ طاغوتی شکتیوں کے گھیرے میں آ گیا ہے۔ کالی دیر کے بعد وہ پھر باہر آیا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت شام کا وقت ہو رہا تھا اور سورج مغرب کی طرف خاصا جھک چکا تھا دلاور کو سائیں مرچو کی فصیحت یاد آ گئی کہ نماز قائم کرو، اس نے فوراً زمین پر بیٹھ کر ریت سے تمیم کیا اور نماز کی نیت باندھ لی۔ اب دلاور نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے میں بہنے کے لیے تیار کر لیا تھا، کیوں کہ بے درے اعصاب شکن واقعات کے بعد اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔

اندھیرا پھیلنے ہوئے واپس کمرے میں آ گیا اور پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی!

صبح منہ اندھیرے اس کی آنکھ کھل گئی وہ دوبارہ باہر نکلا تو صحرا میں ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور صبح کا نور رات کے اندھیرے پر عادی ہونے کو تیار ہو رہا تھا۔ اس نے پھر تمیم کرنے کے بعد فجر کی نماز ادا کی اور رب العزت سے اپنے گناہوں کی معافی اور دینی و قلبی سکون کی دعا کی تو نماز کے بعد اس نے اپنے آپ کو ہشاش بشاش پایا۔ واپس کمرے میں آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ سادھو کوٹھاری کمرے کے وسط میں چٹائی پر بیٹھا مکروہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

”سجدے کر آئے نہ دکھائی دینے والے کو۔“ کوٹھاری چھوٹے سے سر کو ہلا کر طنزیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”کیوں مت کرو کوٹھاری۔“ دلاور نے براہ راست لہجے میں اسے گھورا۔

”میں تم سے مطلب کی بات کرنے آیا ہوں سلسے۔“ کوٹھاری بیٹھے بیٹھے بولا۔

اگر بانی مانندہ جیون عیش و عشرت سے گزارنا اور غزالہ کو پانا چاہتے ہو تو کوٹھاری کی تمام باتوں پر بلا جوں جوں عمل کرتے جاؤ۔ پھر دیکھو گے کوٹھاری تمہارے جیون میں خوشیوں کے رنگ کیسے بھرتا ہے اور اگر گڑ بڑ گھٹالہ کر دو گے تو کوٹھاری تمہیں خارش زدہ کتے کی طرح کر دے گا۔“ کوٹھاری کے لہجے میں بلا کا اعتماد سفاکی دیکھ کر دلاور نے دل میں سوچا کہ اس کی بات پر عارضی طور پر عمل کر لیا جائے اور حالات سدھرتے ہی اس کی گردن تاپی جائے!

”بولو۔ میں تمہارے کیا کام آ سکتا ہوں۔“ دلاور بے دلی سے بولا۔

”کسی مسلمان عورت کی میت کے بال کاٹ کر اور نو جوان دو شیرہ اغوا کر کے لانی ہے۔ اور میرے کہنے کے مطابق مزید عمل کرنا ہے۔ بس اتنا ہے تیرا کام اور پھر ہی ہی ہی آگے کام کوٹھاری کا شروع ہو جائے گا اور باقی سارا جیون تو راج کماروں کی طرح بسر کرے گا تجھے اتنی دولت دوں گا کہ محل نما حویلی، درجنوں کنیریں اور غلام تو رکھ سکے گا اور غزالہ بھی تجھے دلا دوں گا۔“

”لیکن میں ایک مضبوط ایمان والا مسلمان ہوں سچی بات تو یہ ہے کہ یہ کام دلاور کے بس کا نہیں!“ دلاور دھیمے لیکن اعتماد بھرے انداز میں بولا۔

”اب بھی سے ہے کہ تو راہ راست پر آ جا۔ نادانوں والی بات نہ کر دلاور تو ابھی کوٹھاری کی شکتی سے واقف نہیں!“

سادھو اپنے کالے اور بھدے ہونٹوں پر اپنی پیلی اور سرخ زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہیں ایک اور موقع دیتا ہوں خوب اچھی طرح سوچ لے۔“ یہ کہتے ہی سادھو کوٹھاری چھلاوے کی طرح اپنی جگہ سے غائب ہو گیا۔ یہ منظر دیکھتے ہی خوف سے دلاور پر کچلی طاری ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ پرسکون ہوا تو اس نے سوچا کہ باہر نکل کر ہوا خوری کی جائے تاکہ براگندہ ذہن کچھ تروتازہ ہو جائے۔ باہر نکلنے کی نیت سے اس نے جیسے ہی دروازہ کھول کر قدم باہر نکالا تو ایک لمحے کو چکر آ کر رہ گیا۔ باہر

ریگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

رنگستان کی بجائے ٹھانڈی مارتا پانی اسے نظر آیا اس نے فوری طور پر قدم واپس اندر کھینچنا چاہا لیکن دیر ہو چکی تھی وہ اپنا

ہوئے لباس کا کپڑا اس قدر قیمتی اور نیا تھا کہ پتا چلی کہ وہ شواہس ہو گیا کہ تمہارا تعلق کسی بہت اچھے خاندان سے ہے، پھر تم جلی ہونے کے باوجود بھی خوب صورت تھی۔ اسی ناتے پتا جی نہیں اٹھا کر گھولائے کہ کسی بڑے خاندان کی معیبت کی ماری معلوم ہوتی ہے۔

”لیکن دیدی ایک بات تو بتاؤ۔“ سندری اس کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ ”جن کتوں نے تجھے کاٹا تھا، وہ مینوں کیسے مر گئے، ان کے جسم تو یوں نیلے پڑے تھے جیسے انہیں کسی نے زہر دے دیا ہو! یا کسی سانپ نے انہیں کاٹا ہو!“

”مجھے کیا پتا۔“ شکنتلا بھولپن سے بولی۔ ”ہو سکتا ہے کسی دیکھنے والے نے مجھ پر کر پا کر کے انہیں مار دیا ہو۔“

شکنتلا اپنا راز کسی صورت ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی! اس کی حالت زیادہ بہتر نہ تھی تاہم پھر بھی علاج، اچھی خوراک اور مکمل آرام سے اس کے زخم بھرنے شروع ہو چکے تھے! ایک بات جو اس نے محسوس کی تھی کہ سندری کا بھائی گنگن جو ایک تھومند نو جوان تھا روزانہ آدھی رات کو بے قدموں اٹھ کر باہر نکل جاتا اور رات کے آخری پہرے ہونے سے قبل اسی رازداری سے واپس آ جاتا۔

اس بات کا شکنتلا کو ایسے پتا چلا کہ وہ تو ناگن تھی اور نیند کی اس کو کوئی خاص ضرورت نہ تھی تاہم اپنی مرضی سے سو سکتی تھی۔

ایک بار رات کو جب سندری جو اس کے پاس ہی سوتی تھی۔ سو گئی اور شکنتلا ماضی اور مستقبل کے بارے میں سوچ رہی تھی تو اچانک اسے کھٹکھٹ محسوس ہوا، کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی باہر آئی تو گنگن کو اس نے کشادہ گھٹن سے گزر کر مردان خانے کی طرف جاتے دیکھا اور پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے گنگن بڑا کواڑ کھول کر باہر نکل گیا اور شکنتلا نے رات کے آخری پہرے اسے اسی رازداری سے واپس آتے دیکھا!

اگلے دن اور پھر اس کے اگلے دن بھی ایسا ہی ہوا تو شکنتلا کو یقین ہو گیا کہ گنگن کسی خاص مقصد سے باہر جاتا ہے اور صبح دن چڑھتے تک سوتا رہتا ہے اور پھر رات کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتا ہے۔ شکنتلا گنگن کی اس حرکت کو شاید نظر انداز کر دیتی، کیوں کہ اس کے خیال میں کسی عشق وغیرہ کے چکر میں ہوگا۔ لیکن ایک دن سندری اسے کہنے لگی۔

”دیدی پتا نہیں بھیا کو کیا ہو گیا ہے۔ کئی دنوں سے نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ دن چڑھتے تک سوتا رہتا ہے! اور اس کی سرخ و سپید رنگت پیلی زرد پڑتی جا رہی ہے! کسی سے کوئی بات نہیں کرتا اور ہر وقت کھویا کھویا رہنے لگا ہے۔ صحت بھی گنگن بھیا کی تیزی سے گرتی جا رہی ہے! اور کبھی کبھار تو وہ کمزوری سے گر پڑتے ہیں۔ جیسے جسم میں خون ہی نہ ہو!“

”خون؟“ شکنتلا کو ایک جھٹکا لگا۔ اسے تیزی سے اپنی خونی پیاس کی شدت محسوس ہوئی! اور گنگن کے جسم میں خون کی کمی کا سن کر اسے خیال آیا کہ کیا وہ کسی ماورائی شکتی کے زیر اثر ہے! جو اس کا خون ہولے ہولے چوس رہی ہے! سندری کے جانے کے بعد بھی وہ ایسی ہی باتیں سوچتی رہی۔ اچانک اس کے دل میں خواہش دعا بن کر نکلی کہ کاش اس وقت چسکا آ جائے اور مجھے کہیں سے خون کا بندوبست کر دے ورنہ تو میں مر جاؤں گی اور ایسی معدوری میں تو میں خود بھی بندوبست نہیں کر سکتی۔

یہ الفاظ ابھی اس کی زبان پر ہی تھے کہ اس کو گرم ہوا کا تپیر اٹکا، گرم ہوا کے اس مانوس جھونکے سے شکنتلا بری طرح چونک اٹھی، نظریں اٹھا کر دیکھا تو چسکا اس کے قریب کھڑا خوفناک انداز میں مسکرا رہا تھا۔ شکنتلا بھونچکا رہ گئی اور کئی لمحے اس کو حیرت سے دیکھتی رہی پھر گویا ہوئی۔

”تنتہم؟“

”جی مالکن میں..... آپ کا غلام بد شکلا۔“

”تم پہلے کہاں تھے؟“ شکنتلا کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

”مالکن میں تو ہر دم آپ کے آس پاس رہا، آپ نے خود ہی مجھے طلب نہ کیا اور میں آپ کی پرا رتھنا کے بغیر کیسے ظاہر ہو سکتا ہوں۔“

”تو..... تو کیا میری شکلیاں مجھے واپس مل گئی ہیں؟“

☆.....☆

(حیرت کے نئے رنگوں سے آباد اس سلسلے دار تاول کی اگلی قسط ماہ جولائی میں ملاحظہ کیجیے)

میں آچکی تھی اور خالی خالی نگاہوں سے اپنے گرد و پیش میں کھڑے لوگوں کو دیکھنے لگی۔

حواس بحال ہوئے تو شکنتلا نے دیکھا کہ یہ ایک گھر کا اندرونی حصہ ہے۔ ایک لڑکا، ایک نو جوان لڑکی اور ادھیڑ عمر عورت اور ایک سیاہ کالی نوکدار مونچھوں والا سالو نے رنگ کا صحت مند سن رسیدہ مرد اس کے گرد کھڑے تھے۔

شکنتلا سر ہانے کے ساتھ ٹیک لگا کر سیدھی ہونے لگی!

”اب کیسی طبیعت ہے؟“ لڑکی نے آگے بڑھ کر شکنتلا کے شانے پر ہاتھ رکھا! شکنتلا اسے خالی الذہن نظروں سے دیکھنے لگی۔ شاید بے درپے اپنے سیدھے واقعات نے اس کا دماغ سن کر دیا تھا۔

”کون ہو تم..... کہاں سے آئی ہو..... چلی کس طرح سے ہو؟“

لڑکی نے یکے بعد دیگرے کئی سوال کر دیے!

شکنتلا نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا اور گردن موڑ کر ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔

”مم..... میں..... کہاں..... ہوں؟“ شکنتلا نے بمشکل جملہ پورا کیا۔

”تم ہمارے گھر میں ہو پتری۔“ ادھیڑ عمر عورت نے آگے بڑھ کر شکنتلا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”سندری کے پتا تجھے اپنے کھیتوں سے اٹھا کر لائے تھے! تو بہت گھائل تھی نا گاؤں کے وید نے تیری مرہم پٹی کر دی ہے۔ بھگوان کی کرپا سے جلدی بھلی چلی ہو جائے گی۔“

مرہم پٹی کا نام سنتے ہی شکنتلا نے اپنے سراپے کو دیکھا تو اسے اپنے سارے شریر پر مرہم کی لپ دھکائی دی، جبکہ کتوں کے کاٹنے والی جگہوں پر پٹیاں کر دی گئی تھیں!

”لو دودھ پیو۔“ سندری نے دودھ کا بڑا سا پیالہ اس کے ہاتھ میں پکڑا یا تو شکنتلا کی بھوک اور پیاس ایک دم زور پکڑ گئی! اور وہ پیالہ ہونٹوں سے لگا کر غنا غٹ پی گئی۔

سندری فوراً ہی ایک اور پیالہ بھر لائی۔

دوسرا پیالہ پینے سے شکنتلا کو کوئی سدھ بدھ محسوس ہوئی!

”ایک بات تو بتاؤ نوک دار مونچھوں والے شخص نے آگے آتے ہوئے کہا! جس جگہ تو بے ہوش پڑی تھی وہاں تین کتے بھی مردہ حالت میں پڑے تھے جنہوں نے تجھے کاٹا تھا!“

”آں..... ہاں.....“ شکنتلا چونکی۔ ایک بل میں ساری حقیقت اس پر واضح ہو گئی لیکن اس نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور یوں آنکھیں موند لیں جیسے نقاہت کے باعث سونا چاہتی ہو۔ تو سندری کی ماں نے اس کے پتا کو آنکھ کے اشارے سے مزید سوالات کرنے سے روک دیا اور وہ سب کمرے سے باہر نکل گئے تاکہ شکنتلا سو سکے۔

☆.....☆

شکنتلا کو اس گھر میں قیام پذیر ہوئے آج پانچواں روز تھا۔ ان پانچ دنوں میں اسے کئی باتوں کا پتا چل گیا تھا کہ سندری کا باپ مورادیا گاؤں سوگی کا راج تھا اور اثر رسوخ والا بڑا زمیندار بھی اور سندری کے بھائی کا نام گنگن تھا، یہ کوئی کام کاج نہ کرتا تھا۔ گاؤں میں ان کی بہت بڑی حویلی تھی جس میں وہ شکنتلا کو لائے تھے، شکنتلا انہی کے کھیتوں میں بے ہوش پڑی تھی۔

سندری جو اپنے نام کی طرح ہی سندری تھی، اس کی گہری سکھی بن چکی تھی۔ یہ مانتا پتا کی لاڈلی اور نہایت شوخ بھی پورے گاؤں میں ہرنی کی طرح چوڑیاں بھرتی پھرتی تھی!

مورادیا شکنتلا کو اس خیال سے حویلی میں لے آیا تھا کہ اس کے زخم مندمل ہو جائیں تو اس کے گھر کا پتا معلوم کر کے اس کو بحفاظت گھر چھوڑ دیتا لیکن اس بے چارے کو کیا معلوم کہ یہ کس آفت کی پرکالہ گھر میں اٹھا لایا ہے!

ان تینوں دنوں میں سندری اور اس کی ماں نے بھی اس کا بڑا خیال رکھا تھا۔ سندری تو گھٹنوں اس کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہتی تھی۔ شکنتلا نے اس سے پوچھا کہ میرا حلیہ اور جسمانی حالت تو بالکل فقیروں اور بھیک مانگنے والوں جیسی تھی تم لوگ مجھے کیوں گھولائے ہو تو اسی نے شکنتلا کو بتایا کہ ٹھیک ہے دیدی کہ تمہاری ظاہری حالت بالکل خراب تھی مگر تمہارا پھٹا اور کی جگہ سے چلے

کرے، یہی سوچ سوچ کر دلاور پاگل ہوا جا رہا تھا۔

☆.....☆

موسم گرما کا آغاز ہو چکا تھا اور مٹی کے ابتدائی دن تھے۔ گندم کی کٹائی جاری تھی۔ چار پائیاں مچن میں بچھا کر سب لوگ لیٹ گئے تھے، صبا لیکن ابھی پڑھ رہی تھی، جبکہ روجی جلد ہی سو گئی تھی اور دلاور چار پائی پر لیٹا ہوا آسمان پر چمکتے تاروں کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ شائستہ تم اتنی جلدی کیوں چلی گئیں ہم سب کو چھوڑ کر۔ ذرا آ کر دیکھو کہ میں کتنا تنہا ہو گیا ہوں تمہارے بنا، آخر کیوں تقدیر نے ہمیں جدا کر دیا۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ خوشیاں میری قسمت میں

رک ہی نہیں رہی تھی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے اور اس وقت تو محلے میں کوئی ڈاکٹر کے ملنے کے بھی امکانات نہیں تھے، مگر دلاور نے فوری طور پر روجی کو اٹھایا اور صبا کو ساتھ لے کر باہر نکل آیا، کیوں کہ اکیلی صبا کو بھی تو گھر پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

گرمیوں کے دن تھے، اس لیے رات کے اس ٹائم بھی اسے ایک رک شامل ہی گیا۔ اگر سیر دی ہوتی تو رات کو نہ بجے کے بعد ہی سے کوئی چیز نہیں ملتی تھی۔ وہ روجی کو لے کر سرکاری اسپتال پہنچا جہاں اس کا فوری طور پر علاج شروع کر دیا گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ”باسی کھانا کھانے کی وجہ سے



اس کے معدے میں اٹھیشن ہو گیا ہے جس کی وجہ سے تپ ہوئی ہے اور تپ زیادہ ہونے کی وجہ سے پانی کی کمی ہو گئی ہے اس لیے اسے دو دن اسپتال رہنا پڑے گا۔“ ڈاکٹر صاحب کوئی پریشانی والی بات تو نہیں ہے نا.....“ دلاور پریشان زدہ لہجے میں بولا۔

”ارے نہیں، آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ نے اچھا کیا جو اسی وقت لے آئے، ورنہ اگر آپ صبح ہونے کا انتظار کرتے تو شاید پانی کی شدید کمی ہو جاتی۔ آپ بالکل بھی پریشان مت ہوں، ان شاء اللہ جیسے ہی ڈرپ

ہیں ہی نہیں، پیار مجھے ملنا ہی نہیں یا وہ اس دہم کا شکار ہے کہ سکراہٹ میں میرا کوئی حصہ نہیں تو ایسے شخص کی مثال اس کسان کی طرح دی جاسکتی ہے جو اس ڈر کے ساتھ اپنے کھیت کو تیار نہیں کرتا کہ اس سال تو بارش آئے گی نہیں، خشک سالی ہی ہوگی۔

”پاپا..... پاپا..... انھیں دیکھیں روجی کو کیا ہو گیا ہے۔“ اچانک صبا کی آواز پر دلاور کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹا تو دیکھا کہ روجی بار بار تپے کیے جا رہی ہے۔ دلاور اور صبا نے روجی کو بہت سنبھالنے کی کوشش کی، مگر تپ

شعلہ سماں تحریریں

پیشکش

انصیب کی بارش

ڈاکٹر محمود آکاش

ایک مرد کی خاطر معصوم بچیوں کی خواہشات کو خون میں رنگنے والی ایک حسینہ کی داستان

موسم بہار کی آمد آمد تھی۔ ہر طرف تروتازہ، رنگ برنگی پھول ہی پھول کھلے ہوئے نظر آ رہے تھے، لیکن ایک دلاور تھا جس کے گھر اور چہرے پر خزاں کا رقص جاری تھا۔ گلی محلے والے، رشتے دار اور فیکٹری میں ساتھ کام کرنے والے دوست، سب اسے دوسری شادی کا مشورہ دے رہے تھے، مگر دلاور اس بات پر رضامند نہ تھا۔

چوں کہ بچیاں ابھی بہت چھوٹی تھیں اور کل کو ان کو بڑا بھی ہونا تھا اور جوان بچیوں کو وہ گھر میں اکیلا چھوڑ کر کہیں آ جا بھی نہیں سکتا تھا۔ یہی سوچ سوچ کر دلاور کا دن کا چین اور راتوں کی نیند ختم ہو گئی تھی۔

شائستہ کے انتقال کو ابھی چند دن ہی گزرے تھے اور شائستہ کی امی اور چھوٹی بہن نبیلہ بھی اس دن سے وہیں پر تھیں اس لیے دلاور تھوڑا بہت ریلیکس تھا۔ صبا اور روجی نے بھی اسکول جانا شروع کر دیا تھا، لیکن ایک دن تو انہوں نے اپنے گھر جانا ہی تھا۔ نبیلہ کو صبا اور روجی سے بہت پیار تھا اور ماں کے جانے کے بعد ان دونوں نے بھی خالہ کے ساتھ رہنا شروع کیا تو انہیں کافی حوصلہ ملا تھا، مگر جب وہ لوگ چلے گئے تو دلاور کی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

شادی وہ کر نہیں سکتا تھا، کیوں کہ کوئی بھی عورت بچیوں کو ماں کا پیار نہیں دے سکتی تھی۔ آخر کرے بھی تو کیا

شائستہ کی موت پر ہر آنکھ اشک بار تھی۔ وہ بھی ہی ہر دل عزیز، ہر ایک کا خیال رکھنے والی۔ جو بھی اس سے ایک بار مل لیتا وہ دوبارہ بھی ملنے کی خواہش رکھتا۔ وہ گھر میں آئے ہوئے مہمانوں کی خدمت میں کوئی کمی نہ رہنے دیتی تھی۔

صبا اور روحانہ شائستہ کی کل کائنات تھے۔ صبا دس سال کی اور روحانہ سات سال کی، لیکن جب وقت آ جائے تو کبھی ٹل نہیں سکتا۔ شائستہ کو چند دنوں کے بخار نے ختم کر دیا تھا۔

دلاور کو شائستہ سے بہت محبت تھی۔ دلاور بہت زیادہ امیر نہ سہی، مگر ان کی اچھی گزر بسر ہو رہی تھی۔ بیوی کے مرنے کے بعد دلاور کی زندگی میں ایک خلا سا آ گیا تھا۔ بچیاں ابھی چھوٹی تھیں۔ کھانا بنانا، کپڑے دھونا، گھر کی صفائی وغیرہ، یہ سب کیسے ہوں گے، اسے یہ فکر لاحق تھی۔ دلاور جس فیکٹری میں کام کرتا تھا، وہاں سے اسے ایک ہفتے کی چھٹی تو ملی ہوئی تھی، مگر اس سے زیادہ کام سے غیر حاضر رہنا ممکن نہ تھا اور اگر نوکری بھی جاتی رہتی، تو مزید مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا اور روز روز اچھی نوکریاں ملتی بھی تو مشکل سے ہیں نا۔

☆.....☆

نہ کوئی بہتر حل نکل آئے گا۔ خدا بہتر کرے گا۔“

☆.....☆

”نبیلہ مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔“
”جی امی، کیسے۔“

”وہ بیٹا دراصل بات یہ ہے کہ دلاور، صبا اور روحانہ کا ہمارے علاوہ کوئی نہیں ہے اور ہمارا بھی اور پھر جب سے شائستہ ہم سے روٹھ گئی ہے، تب سے صبا اور روحی باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم ہو گئی ہیں بیٹا، کیوں کہ جس طرح ایک ماں اپنے بچوں کی پرورش کر سکتی ہے، اس طرح باپ نہیں کر سکتا۔“

”جی امی میں یہ سب باتیں سمجھتی ہوں۔ شائستہ باجی کے جانے کے بعد ہم سب بہت ادھورے سے ہو گئے ہیں۔“

”ہاں بیٹا اور میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ یہ ادھورا پن ختم ہو جائے اور تمہاری شادی دلاور سے کر دی جائے۔“

”ارے امی یہ آپ کہہ رہی ہیں، ایسا کیسے ممکن ہے؟ میں دلاور بھائی سے..... نہیں امی ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اور ظہیر ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔ میرا ضمیر مجھے ایسا کرنا سے روک دے گا اور آپ دلاور بھائی کی شادی کہیں اور بھی تو کروا سکتی ہیں نا۔ اگر انہوں نے ضرور شادی کرنا ہے تو.....“

”کہیں اور شادی کرنے سے دلاور کو بیوی تو مل جائے گی مگر صبا اور روحی کو ماں نہیں مل سکتی نبیلہ بیٹی..... صرف تم ہی ان کو ماں بن کر پال سکتی ہو اور وہ تم سے بہت زیادہ اسچ بھی تو ہیں۔ تمہیں یہ قربانی دینا ہی پڑے گی۔ مجھے کل تک سوچ سمجھ کر اپنا فیصلہ سنا دو اور ہاں یا درکھنا، مجھے فیصلہ ہاں میں ہی چاہیے، کیوں کہ مجھے اپنی بیٹی کی روح کو ناراض نہیں کرنا ہے۔“

☆.....☆

ظہیر نبیلہ کا تانا بڑا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے، لیکن انہی باقاعدہ کوئی رشتہ طے نہیں ہوا تھا۔ ظہیر نبیلہ کو کالج چھوڑنے اور لینے جایا کرتا تھا اور وہیں دونوں کے مابین عہد و پیمان ہوئے تھے، مگر ابھی اس بات کا ظہیر کے گھر والوں کو علم نہ تھا۔

نبیلہ نے صاف صاف ماں کو انکار کر دیا کہ وہ دلاور

The Mother's Pride

تم نہ سمجھو گے عورت کا غرور کبھی کتنا خوش گوار ہے تخلیق کا کرب بھی اک لفظ کہہ کر جنت بھی قدموں تلے کر دی میرے بچے نے ”ماں“ کہہ کر پکارا جو ابھی

عنبرین نعیم

بھائی سے شادی کے لیے رضا مند نہیں ہے، مگر ماں جی نے زبردستی شادی کروانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور دلاور کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ وہ ایک ہفتے کے اندر اندر نکاح کی تیاری کر لے۔ ابھی دلاور کے علم میں یہ بات بالکل نہیں تھی کہ شادی ہو کس کے ساتھ رہی ہے۔

جب صبا اور روحی کو دلاور نے اعتماد میں لینے کی کوشش کی اور صبا نے بہت خل مزاجی سے بات کو سمجھتے ہوئے پایا سے کہا کہ بابا ہمیں آپ کی شادی کرنے پر تو کوئی نہیں ہے، مگر میں چاہتی تھی کہ اگر..... میرا مطلب ہے بابا کہ ”بابا اگر نبیلہ آئی اس گھر میں آجائیں تو اچھی بات ہوتی۔“

”بیٹا وہ آخر کب تک یہاں رہ سکتی ہیں، آخر ایک نہ ایک دن تو ان کی بھی شادی ہو جانی ہے، پھر بھی تو آپ کو اکیلے ہی رہنا پڑے گا اور اس سے بہتر ہے کہ ہم ابھی سے.....“

”بابا آپ میری بات سمجھ نہیں رہے ہیں، میرا مطلب ہے کہ آپ نبیلہ آئی سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ بابا وہ ہم سب سے بہت پیار کرتی ہیں اور بابا اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ کوئی دوسری عورت ہمیں ماں کا پیار دے سکتی ہے۔ بابا نبیلہ آئی سے بہتر کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔“

”مگر بیٹا آپ کے اس چھوٹے سے دماغ میں یہ بات آئی بھی کہاں سے اور بیٹا وہ بھی ابھی اس رشتے پر رضا مند نہیں ہوں گی اور ہم ان کو مجبور بھی تو نہیں کر سکتے نا۔“

”جی بابا آپ کی بات ٹھیک ہے، مگر مجھے یقین ہے کہ وہ انکار نہیں کریں گی۔ اگر آپ بات نہیں کر سکتے تو میں خود تانی ماں سے بات کروں گی۔“

”مگر بیٹا آپ کی تانی ماں مجھے اطلاع دے چکی ہیں کہ شادی کی تیاری کروں۔ ایک ہفتے بعد نکاح ہے۔“

ختم ہوگی، آپ کی بیٹی کو ہوش آ جائے گا۔“

”شکریہ، ڈاکٹر صاحب۔“

”ارے اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے، یہ تو ہمارا فرض اور ہماری ذیولنی ہے اور ہم اس کی باقاعدہ تنخواہ لیتے ہیں۔ اوکے خدا حافظ۔“

پھر جیسے ہی ڈاکٹر صاحب گئے، دلاور کے ذہن میں باسی کھانا کھانے والی بات آگئی تو صبا نے بتایا کہ بابا میں نے روحی کو منع بھی کیا تھا کہ ماما کہتی تھیں گرمیوں میں سالن خراب ہو جاتا ہے، اس لیے کل کا بچا کھانا نہیں کھانا چاہیے، مگر روحی نے زبردستی کھالیا، اسی کی وجہ سے اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔

دلاور کو آج پھر شائستہ بہت یاد آئی تھی اور پھر اس نے صبا کو گلے سے لگایا اور اپنے پاس ہی لٹا لیا کہ بیٹا رات کافی ہو گئی ہے آپ کچھ دیر کے لیے سو جاؤ، روحی اب بالکل ٹھیک ہے۔

صبح ہوتے ہی نبیلہ اور اس کی امی بھی اسپتال پہنچ گئے۔ روحی کو ہوش آچکا تھا اور وہ پہلے سے بہت بہتر تھی اور پھر مزید ایک دن رکنے کے بعد روحی کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ دلاور نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی بیٹی بالکل ٹھیک ہو کر گھر واپس آ گئی ہے۔

”نبیلہ آئی آپ ہی رہا کریں نا، میرا آپ کے بنا دل نہیں لگتا اور پتا ہے آپ کے جانے کے بعد ہمیں کھانا بھی تازہ نہیں ملتا۔ بابا ہول سے لے آتے ہیں اور وہی گرم کر کے دو دن کھا لیتے ہیں اور کبھی کبھار جب گھر میں بننا ہے تو وہ ٹھیک طرح سے بن ہی نہیں پاتا۔“

روحی باتیں کر رہی تھی آنٹی نبیلہ سے، جبکہ دلاور دروازے کے پاس سے گزرتا ہوا سن رہا تھا، تو ایک دم سے دلاور کو خیال آیا کہ اسے اپنے بچوں کی خاطر شادی کر ہی لینی چاہیے، مگر کس سے.....؟ کیسے.....؟ اور آخر وہ کس طرح اور کس سے اس سلسلے میں بات کرے، کیوں کہ اس کے اپنے ماں باپ تو تھے نہیں، آخر ایک ساس ہی تو ہیں، وہ بھی کیا سوچیں گی اور پھر دلاور نے سوچ لیا کہ وہ ان سے ضرور بات کرے گا۔

☆.....☆

مئی کے اختتامی دن تھے۔ عصر کے بعد سے لے کر

مغرب تک شدید آندھی چلنے کے بعد موسم کافی حد تک صاف ہو گیا تھا۔ روحی کی ضد تھی کہ مجھے ابھی باہر لے کر چلیں اور آٹس کریم کھلا کر لائیں۔ نبیلہ بھی آئی ہوئی تھی، آخر دلاور مان ہی گیا، کیوں کہ جب سے شائستہ دنیا سے گئی تھی، تب سے وہ بھی کہیں نہیں گیا تھا۔ صبا بھی بہت خوش ہوئی تھی اور روحی تو بہت زیادہ خوش تھی، پھر وہ لوگ رات گئے تک گھومتے رہے۔ دلاور نے محسوس کیا کہ صبا اور روحی نبیلہ کے ساتھ کافی خوش ہیں۔

چونکہ نبیلہ ابھی کچھ دن یہیں رہنے کی غرض سے رکی ہوئی تھی، اس لیے دلاور نے ساسو ماں سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور ان کے گھر چلا آیا۔

ماں دلاور کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ ”سب خیریت تو ہے نا بیٹا۔“

”جی، سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ میں ویسے ہی ادھر سے گزر رہا تھا تو سوچا کہ آپ سے مل لوں۔“

وہ بولیں۔ ”بیٹا تم بچوں کو بھی لے آتے۔“

”ارے نہیں ماں جی، ان کا اسکول کا حرج ہوتا ہے۔ وہ دراصل بات یہ ہے کہ ماں جی کہ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ میرا آپ لوگوں کے سوا ہے ہی کون، جس سے میں بات کروں۔ تو اس لیے میں نے سوچا کہ آپ سے ہی بات کر لی جائے تو بہتر ہے۔“

”ہاں، ہاں بیٹا تم بولو کیا بات ہے۔“

”دراصل امی آپ کو تو پتا ہی ہے کہ شائستہ کے جانے کے بعد ہم سب کس مشکل صورت حال سے گزر رہے ہیں۔ بچیاں ابھی چھوٹی ہیں۔ ان کو کھانا پینا نہیں آتا اور پھر کل کو جب وہ بڑی ہو جائیں گی اور میں سارا دن فیکٹری میں ہوتا ہوں تو اس لیے بہت ضروری ہے کہ میں..... آپ بات کو سمجھ رہی ہیں نا..... کہ جوان بچیوں کا گھر میں اکیلے رہنا کسی بھی صورت ٹھیک نہیں ہے۔ تو مناسب یہی ہے کہ آپ ہی کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر میری شادی..... پلیز ماں جی مجھے غلط مت سمجھئے گا۔ مجھے بیوی کی نہیں مگر میرے بچوں کو ماں کی ضرورت ہے۔“

”میں سمجھتی ہوں بیٹا تمہاری بات، تمہارے احساسات اور یہ بھی کہ شائستہ کا خلا پُر نہیں کیا جاسکتا، مگر بیٹا، مجھے سوچنے سمجھنے کا کچھ ٹائم چاہیے۔ ان شاء اللہ کوئی

اب دونوں بچوں کو نام پر اسکول جانا تھا۔ انہیں ناشتا اور یونیفارم تیار ملنے چاہیے تھے، مگر نبیلہ کی روٹین نہ بدلی۔ آج بھی سب کام صبا کو خود ہی کرنا پڑتے تھے۔ وہ اپنے اور روجی کے لیے ناشتا بنانے کے ساتھ ساتھ پایا کو بھی ناشتا کروادیا کرتی اور پھر پایا فیکٹری جاتے ہوئے راستے میں ان کو اسکول چھوڑ دیتے۔

دلاور کو شائستہ یاد آتی اور پھر وہ اپنے فیصلے پر بہت پچھتا تا کہ کاش وہ دوسری شادی ہی نہ کرتا، مگر جو کچھ اس نے سوچا تھا، ویسا نہ ہوسکا، پھر وہ تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر چپ کر جاتا۔

☆.....☆
سردیاں اپنے اختتام کو تھیں۔ دن کو موسم گرم اور راتیں سرد ہو گئی تھیں۔ خدا نے نبیلہ کو ایک خوب صورت بچے کی ماں بنا دیا تھا، مگر وہ اپنی روش سے باز نہ آئی۔ اس کو جیسے دلچسپی ہی نہ تھی کہ خدا نے اسے دنیا کے سب سے خوب صورت روپ سے نوازا ہے۔ صبا اور روجی کو تو جیسے ایک کھلو تامل گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھیں اور ہمہ وقت منے کو اٹھائے رکھتیں۔ یہاں تک کہ نبیلہ نے بچے کو اپنا دودھ تک پلانا گوارا نہ کیا اور بچہ ڈبے کے دودھ پر پرورش پانے لگا۔

دلاور کو بہت غصہ آتا، مگر وہ اپنی بچیوں اور ماں جی خاطر خاموشی سے وقت پاس کرتا رہا۔ ماں جی نبیلہ کو بہت سمجھاتیں، مگر اس کا جواب یہی ہوتا کہ میں نے آپ کو کہا تھا کہ میں اس شادی کو قبول نہیں کر سکتی، پھر ایک روز جب صبح ماں جی نماز کے لیے انھیں تو صبا بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ کر وضو کر کے نماز ادا کر رہی تھی تو منے کی رونے کی آواز پر صبا جب کمرے میں گئی تو نبیلہ کو نہ پا کر اس نے ہر جگہ دیکھا۔ واش روم میں چیک کیا، مگر نبیلہ ہوتی تو ملتی، پھر جب اس نے آ کر نانی ماں کو بتایا تو ان کے لیے یہ خبر جان لیوا ثابت ہوئی۔

نبیلہ کا یوں ظہیر کے ساتھ بھاگ جانا اور پھر ماں جی کا دنیا چھوڑ جانا ایسے صدمات تھے جنہوں نے دلاور کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ دو جوان بچیاں اور دو ماہ کے بچے کو پالنے کی فکر نے دلاور کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ صبا نے اسکول چھوڑ دیا تھا اور مکمل ذمے داری کے ساتھ گھر سنبھالنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے

بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا تھا تا کہ گھر میں دل بھی لگا رہے اور کچھ حالات بھی ٹھیک ہو جائیں۔ روجی باقاعدہ سے اسکول جاتی اور واپسی آ کر منے کو اٹھا لیتی، تب تک صبا گھر کے کام وغیرہ کرتی تھی۔

☆.....☆
جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، ویسے ویسے دلاور کی فکر بڑھتی جا رہی تھی۔ صبا کے دو ایک اچھے رشتے بھی آرہے تھے اور دلاور غور کر رہا تھا کہ اگر باعزت طریقے سے اپنے گھر کی ہو جائے تو اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی۔ مٹا اب اسکول جانے لگ گیا تھا اور روجی بھی کافی حد تک کھانا پینا سیکھ چکی تھی۔

شائستہ کی ایک دو چیزیں بھی گولڈ کی پڑی ہوئی تھیں اور تھوڑا بہت سامان بھی شائستہ نے بنایا ہوا تھا۔ اس لیے دلاور نے اچھی طرح چھان بین کے بعد ایک رشتے کی ہاں کر دی اور شادی کے لیے ایک ماہ کا ٹائم دے دیا گیا۔ صبا ابھی شادی کے لیے تیار نہ تھی، مگر وہ پایا کی مجبور یوں سے آگاہ تھی۔ اس لیے اس نے کوئی بات نہ کی۔ وہ ہمہ وقت روجی کو سمجھاتی کہ کس طرح گھر کو سنبھالنا ہے۔ لڑکا کراچی کسی فرم میں کام کرتا تھا اس لیے شادی کے بعد صبا کو بھی کراچی ساتھ ہی رہنا تھا۔

☆.....☆
مٹا ساتویں کلاس میں تھا، جبکہ روجی میٹرک کے بعد گھر میں ہی رہتی تھی۔ وہ صبا کی جگہ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی اور گھر کا خیال رکھتی اور پایا سے جب وہ آتے تو ڈھیروں باتیں کرتی اور صبا بھی روز ہی فون کر کے سب سے بات کرتی تھی۔ خدا نے اس کو بیٹی سے نوازا تھا۔ اس کا شوہر بہت اچھا آدمی تھا۔ وہ دونوں خوش تھے۔ دلاور بھی اب پہلے سے کافی ریلیکس رہتا تھا۔

ایک روز کی بات ہے، اتوار کا دن تھا۔ صبا اور اس کا شوہر دونوں بیٹی کو ساتھ لے کر سیر کو نکلے۔ دونوں بہت خوش تھے، سارا دن پکنک مناتے گزر گیا۔ جب شام سے ذرا پہلے انہوں نے واپسی کا پروگرام بنایا تو ایک ماٹنے والی نے صدا لگائی۔ ”اللہ کے نام پر کچھ مدد کرو، میں نے دودن سے کچھ نہیں کھایا۔“

صبا نے پرس سے دس کا نوٹ نکال کر بیٹی کو دیا کہ

اب مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ نکاح کس کے ساتھ ہو رہا ہے۔ بیٹا انہوں نے آپ لوگوں کی بہتری کے لئے ہی کیا ہوگا نا انتظام۔“

”نہیں پایا، میں اس بات پر رضامند نہیں ہوں۔ آپ کی شادی ہوگی تو آنٹی کے ساتھ ورنہ نہیں۔ ہم کسی بھی دوسری عورت کے ساتھ کبھی بھی نہیں رہ پائیں گے۔ آپ مجھے نانی ماں کے گھر چھوڑ کے آئیں، میں خود بات کر دوں گی ان سے۔“

☆.....☆
اتوار کا دن تھا، شائستہ کے بعد دلاور، صبا اور روجی کو لے کر نانی ماں کی طرف نکلا ہی تھا کہ گلی سے ماں جی آتی نظر آ گئیں۔ صبا اور روجی نانی ماں سے لپٹ گئیں اور جب نانی ماں کو پتا چلا کہ سب لوگ ان کی طرف ہی جانے والے تھے تو وہ دونوں نواسیوں کو بہت پیار کرنے لگیں کہ مجھے پتا تھا کہ میری بیٹیاں اُداس ہو گئی ہیں، میں اسی لیے تم سے ملنے خود چلی آئی۔ صبا اور روجی بہت خوش ہوئیں۔

”اچھا ماں جی آپ سب باتیں کریں، میں آپ کے لیے کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں۔“ دلاور یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆.....☆
روجی ہوم ورک کرنے لگ گئی اور صبا نانی ماں کے پاس بیٹھ گئی۔ نانی ماں صبا کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں اور بولیں۔

”دیکھو صبا بیٹی! تم ماشاء اللہ سے اب بڑی ہو گئی ہے اور ہر بات کو سمجھتی ہوں اور بیٹا میرا تم لوگوں اور نبیلہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو نبیلہ کو کون سنبھالے گا اور بیٹا شائستہ کے جانے کے بعد مجھے تم دونوں کی بھی بہت فکر لگی رہتی ہے۔ دلاور بہت اچھا بیٹا ہے، مگر بیٹی وہ ہر وقت تو تم لوگوں کے پاس نہیں نا بیٹھ سکتا۔ اس لیے میں نے دلاور کی شادی کا فیصلہ کیا ہے۔“

”سوری نانی ماں میں آپ کی بات کاٹ رہی ہوں، مگر نانی ماں کوئی بھی فیصلہ سنانے سے پہلے آپ کو میری بات نہ صرف سننا ہوگی بلکہ ماننا بھی پڑے گی۔“

”جی بیٹا کہو تم کیا کہنا چاہتی ہو۔“

”نانی ماں میں مانتی ہوں کہ میں بچی ہوں۔ مجھے

زیادہ سمجھ بوجھ نہیں ہے، مگر نانی ماں میں یہ بات تو سمجھ ہی سکتی ہوں نا کہ کوئی بھی دوسری عورت سوتیلے بچوں کو ماں کا پیار اور بچے اس کو ماں کا درجہ نہیں دے پائیں گے۔ اور نانی ماں آپ یہ بھی تو چاہتی ہیں تا کہ نبیلہ آنٹی کا فرض بھی ادا ہو جائے تا کہ آپ کی پریشانی ختم ہو جائے، تو کیوں نا نبیلہ آنٹی ہی کو ہماری ماں بنا دیا جائے۔ میرا مطلب ہے نانی ماں کہ کیوں نہ پایا اور نبیلہ آنٹی۔۔۔۔۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا۔۔۔۔۔ نانی ماں۔“

یہ کہنا تھا کہ نانی ماں کی آنکھوں سے پانی نکلنے لگا اور انہوں نے اپنی معصوم سی صبا کو سینے سے لگالیا۔ دلاور بھی گھر میں داخل ہو رہا تھا، وہ بھی ماں بیٹی کی باتیں سن کر ماں جی کا فیصلہ سننے کا منتظر تھا اور جب ماں جی نے صبا کو یہ بتایا کہ انہوں نے خود ہی فیصلہ کیا ہے اور ایک ہفتے کے اندر اندر نکاح کر دیا جائے گا تو دلاور کو اطمینان سا ہو گیا۔

☆.....☆
نبیلہ اس نکاح پر رضامند نہ تھی، کیوں کہ وہ ظہیر کو پسند کرتی تھی، مگر ماں جی کے حکم پر اس کو دلاور کے ساتھ نکاح کرنا پڑا، مگر چوں کہ وہ خوش نہ تھی اس لیے اس نے آتے ہی تیور بدلنا شروع کر دیا جس کو صبا جی سمجھ دار لڑکی نے فوراً محسوس کر لیا، کیوں کہ وہ آنٹی جو ان دونوں سے بے انتہا پیار کرتی تھی، جب رشتہ بدلا اور وہ ماں کے درجے پر آ گئی تو اتنی لا پرواہ ہو جائے گی، ایسا تو پرانے بھی نہ کرتے۔ کچھ دن تک تو صبا نے ساری ذمے داریاں خود نبھائیں۔ کھانا پینا تو تھوڑا بہت سیکھ ہی چکی تھی۔ صفائی وغیرہ بھی وہ دونوں بہنیں خود ہی کرتیں، کیوں کہ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ نبیلہ کا زیادہ تر وقت ٹی وی دیکھتے یا موبائل پر باتیں کرتے گزرتا تھا۔

صبا اس بات کو دل سے محسوس کرتی کہ آخر آنٹی سارا سارا دن کس سے باتیں کرتی ہیں، مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ نبیلہ جب سے آئی تھی اس نے کبھی پاؤں بیڈ سے نیچے نہیں اتارا تھا۔ روجی چھوٹی تھی اس کو ان باتوں کی کچھ سمجھ نہیں تھی۔ وہ صبا سے پوچھتی تو صبا کہہ دیتی کہ آنٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ ٹھیک ہو جائیں گی تو کھانا وہی بنایا کریں گی۔ ”یہ سن کر روجی خاموش ہو جاتی۔ گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہو گئیں، اسکول مکمل ہوئے۔“

بیٹی بھی جلتی ہے



عادل حسین

مردوں کی انا کی بھینٹ چڑھنے والی ایک بیٹی کی کہانی

نعیم صاحب سرکاری ملازم تھے۔ نماز روزے کے پابند، ملتسار اور اچھے گھرانے سے تعلق تھا۔ اسد، نعیم صاحب کا بڑا بیٹا تھا۔ میٹرک کے بعد اچھے کالج میں پری انجینئرنگ کا اسٹوڈنٹ ہونے کے ساتھ ساتھ باپ کی



جاؤ مانگنے والی کو دے آؤ اور خود چنیں سہنے لگی۔
”خدا تمہارا بھلا کرے۔ خدا تمہیں بھی زندگی دے، خدا تمہارے ماں باپ کے مابین ہمیشہ محبت رکھے۔“
مانگنے والی کی آواز پہ صبا کو ایک شاک سا لگا اور پھر اس کی نظروں نے فوراً ہی پہچان لیا کہ یہ کوئی اور نہیں اس کی نبیلہ آنٹی کی ہی آواز ہے۔ صبا فوراً نبیلہ کی جانب دوڑی اور جاتے ہی آنٹی کہہ کر ان سے لپٹ گئی، جبکہ اس کا شوہر حیران تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟
”آنٹی آپ ہمیں چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھیں اور یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ انہیں میرے ساتھ گھر چلیں۔“
”ارے نہیں بیٹا، میں اس قابل کہاں کہ کوئی مجھے گھر رکھے۔ میں تم سب کی مجرم اور بہت گنہگار ہوں۔ خدا نے مجھے میرے کرموں کی سزا جو دی ہے جو ابھی بہت کم ہے، ابھی تو مجھے اور سزا ملنی چاہیے۔ جاؤ بیٹی خدا تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ میرے پاس ان دعاؤں کے سوا تمہیں دینے کو کچھ نہیں ہے اور بیٹی میرے لیے بھی دعا نہ کرنا، کیوں کہ میں دعا کے قابل ہی کہاں ہوں۔ میں نے اپنی بہن کے بچوں کی قدر نہ کی، تو تم بھی میری قدر نہ کرو۔ مجھے میرے حالات پر چھوڑ دو، جاؤ بیٹی اپنے گھر جاؤ۔“
”نہیں آنٹی پلیز آپ ایسی باتیں مت کریں۔ ہم آپ کو معاف کر چکے ہیں، ہمیں آپ جیسے بزرگوں کے سائے کی ضرورت ہے۔ پلیز آنٹی میرے ساتھ چلیے۔ ہم آپ کو ایک بار پھر کھونے کی ہمت نہیں دیتے، پلیز اسی لیے آنٹی۔“

اور پھر صبا اور اس کے شوہر نے زبردستی نبیلہ کو ساتھ لے جانے پر رضامند کر ہی لیا۔ صبانے جب بیٹی کو بتایا کہ یہ اس کی نانی ماں ہیں تو وہ ان کی گود سے باہر ہی نہ نکلتی۔
دلدار اور رومی بھی منے کو ساتھ لے کر صبا کے ہاں ہی آچکے تھے اور پھر جو کہانی نبیلہ نے دلدار کو سنائی وہ کچھ یوں تھی کہ میں اپنے کزن ظہیر کے ساتھ جب گھر سے نکلی تو وہ مجھے لے کر اپنے ایک دوست کے فلیٹ پر آ گیا اور مجھے یہ کہہ کر میں علیحدہ گھر کا بندوبست کرتا ہوں، باہر چلا گیا۔ جب وہ شام تک نہ آیا تو مجھے پریشان ہوئی کہ آخر ظہیر چلا کہاں گیا ہے، پھر رات ہوئی اور میری آنکھ لگ گئی۔ رات کا نہ جانے کون سا

پھر تھا جب میری آنکھ شور کی آواز پر کھل گئی۔ میں نے دروازے کی اوٹ سے سنا چاہا تو پتا چلا کہ ظہیر اور اس کا دوست کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں۔
ظہیر اس کو کہہ رہا تھا کہ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ خالی ہاتھ آجائے گی۔ میرا تو خیال تھا کہ کم از کم تھوڑا بہت زیور تو ضرور ہی ساتھ لے کر آئے گی، مگر یہ تو بالکل ہی کنگلی نکلی۔“
”بالکل تو کنگلی خیر نہیں ہے یہ، میرے خیال میں تو جو دولت اس کے پاس ہے وہ کسی اور کے پاس ہو ہی نہیں سکتی۔“ ظہیر کا دوست بولا۔
”کیا مطلب ہے تمہارا..... تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔“
”میرا مطلب تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو ظہیر اور اس کے سوا اب کوئی چارہ بھی نہیں ہے، کیوں کہ مفت کی روٹیاں توڑنے کے لیے تو اب ہم اس کو رکھ نہیں سکتے نا، میرا مشورہ مانو تو اس کو بیچ دیتے ہیں۔ کم از کم ایک لاکھ تو مل ہی جائے گا اور پھر تم نے کون سا نکاح کرنا ہے اس کے ساتھ۔“

جب ظہیر کے دوست نے یہ بات کی تو میرا خیال تھا کہ ظہیر اس کے منہ پر تھپڑ مارے گا اور اس کو کہے گا کہ نبیلہ میری عزت ہے۔ میں اس سے پیار کرتا ہوں اور نکاح کروں گا، مگر ظہیر کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ دیکھ کر میرے سینے ٹوٹ گئے اور میری امید کا دامن ٹوٹ گیا۔ تب میں اپنے فیصلے پر بہت پچھتائی۔ مجھے رہ رہ کر تمہارا اور بچوں کا خیال آتا رہا، مگر تب وقت سر سے گزر چکا تھا۔ اور پھر میں ایک لاکھ میں بک گئی۔ مجھے اسی فلیٹ سے جن لوگوں نے خریدا تھا لے گئے، مگر مجھے اس دن کے بعد سے کبھی بھی ظہیر اور اس کا دوست نظر نہ آئے اور نہ ہی میں ان کو دیکھنا چاہتی تھی، یہاں تک کہ مجھے ظہیر سے بھی کنگلی نہیں تھا، کیوں کہ تصور تو میرا تھا، جس نے اپنا ہنسا ہنسا گھر خود اجاڑا۔ کاش میں تقدیر کے فیصلے کو مان کر تمہیں دل سے قبول کر لیتی۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو دلدار۔ صبا بیٹی بہت عظیم ہے۔ میں نے اس بن ماں کی بچی پر بہت ظلم کیا، مگر اس نے پھر بھی مجھے گلے لگایا، ورنہ میرے نصیب کی بارش مجھ پر بھی نہ برسی۔

چہرے پر ادا سیوں نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ لوگوں کے دکھ درد بانٹ کر انہیں حوصلہ دینے والا باپ کی باتیں کرنے لگا تھا۔ اس کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔

☆.....☆

کئی مہینوں بعد سارہ نے کسی ذریعے سے اسد کو خط بھیجا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس پر جو گزر رہی ہے وہ بتا کر تمہیں دکھ نہیں کرنا چاہتی۔ بس اتنا سمجھ لو کہ جسم پر اتنا نشان پڑ چکے ہیں کہ سمجھ نہیں آتا مرہم پہلے کہاں لگاؤں۔ مجھے بات بات پر مارا پیٹا جاتا ہے۔ جان سے مارنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں اور اگر تمہارا نام بھی بھولے سے زبان پر لے آؤں تو کہا جاتا ہے کہ ہم اسے بھی مار دیں گے۔ اسد تمہاری سارہ ہار چکی ہے۔ نہ زخم سہنے کے لیے جسم پر کوئی جگہ باقی ہے اور نہ آنکھوں میں اتنے آنسو ہیں کہ اگر کوئی تمہیں نقصان پہنچا دے (خدا نہ کرے) تو میں جی بھر کے رو بھی سکوں۔ تم خدا را مجھے بھول جاؤ اور اگر ہو سکے تو یہ گھر چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ۔ تمہیں دیکھنے کو بہت من کرنا ہے مگر کیسے؟ میں اب چاہتے ہوئے بھی تمہارے سامنے نہیں آ سکتی۔ جانتے ہو اسد کیوں؟ جو کھنی زلفیں تمہیں بہت پسند تھیں نہ! وہ کاٹ کر پھینک دی گئی ہیں تاکہ میں گھر سے باہر ہی نہ نکل سکوں۔ سوچو میری عمر کی ایک لڑکی گنجائش سے لے کر باہر کیسے آ سکتی ہے؟ اسد پلیز میری بات مانو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ پلیز اسد پلیز۔

یہ سب باتیں پڑھنے کے بعد اسد بالکل پاگل سا ہو گیا تھا۔ نہ زندوں میں اور نہ ہی مردوں میں۔ وہ بے بسی کی تصویر بنا زندہ تھا اور موت کی دعا میں مانگنے لگا تھا۔ لیکن موت کا تو وقت متعین ہے نا؟ کس کو پہلے آتی ہے یہ کون جانتا ہے۔

ایسے میں اگر میرا ساتھ نہ ہوتا تو شاید اسد اپنے آپ کو ختم کر چکا ہوتا۔ میں اس کے والدین کے بارے میں اسے بتاتا کر کوئی بھی غلط قدم اٹھانے سے روکے ہوا تھا۔ اسد کی چھوٹی بہنوں کے چہرے دکھا دکھا کر اسے سمجھاتا کہ ان کا کیا قصور ہے؟ جن کی ذمہ داریاں تم نے اٹھانی ہیں اور سارا کے گھر والوں

کی سزا تم اپنے گھر والوں کو کیوں دینا چاہتے ہو؟ سارہ تو تم سے محبت کرتی ہے نا؟ تو اس کا ہی سوچو! وہ لڑکی ہو کر جب اتنی تکلیفیں برداشت کر سکتی ہے تو تم کیوں نہیں؟ تم تو اس کے حالات سن کر مرنا چاہتے ہو اور اس بے چاری پر تو یہ سب کچھ گزر رہا ہے۔ تم خدا سے دعا کیا کرو، دعا تقدیر بدل دیتی ہے میرے دوست! اور پھر وہ بے چارہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتا۔ کہتا تو وہ ٹھک ہی تھا۔ ایسے میں کس محبت کرنے والے کا من جینے کو چاہتا ہے، لیکن زندگی کی یہی مجبوری ہے کہ موت کے انتظار میں جینا پڑتا ہے۔

میں نے اسد کو مشورہ دیا کہ سارہ کی بات مان لو اور کچھ دنوں کے لیے کہیں اور چلے جاؤ۔ ان لوگوں سے اچھی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ جو اپنے خون کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کر سکتے ہیں تو تمہارے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں، مگر وہ میری بات نہ مانا۔ میری لاکھ کوششوں کے باوجود بھی وہ اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہ گیا۔

میں کوشش کرتا تھا کہ زیادہ تر وقت اسد کے ساتھ ہی گزاروں۔ فارغ ہونے کے سبب اپنی اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی تھا، مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے؟ ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ سو ہونی ہوگی۔

ایک دن اسد کو کچھ لوگوں نے اکیلا دیکھ کر ایک سنان مقام پر لے جا کر بہت تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس کی دونوں ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ اس کے جسم کو مختلف جگہوں پر 38 ٹانکے لگائے گئے تھے۔ بس اللہ پاک نے جان بچالی تھی بے چارے کی۔ یا یہ کہہ لیں کہ ابھی کچھ مزید قیامتیں ٹوٹی ہوئی اور دیکھنی تھیں اس کی خون میں ڈوبی آنکھوں نے۔ انہی آنکھوں نے جن میں کچھ مدت پہلے خوشیاں رقص کیا کرتی تھیں۔ جن میں مستقبل کے خوب صورت سننے سنے تھے۔ چار مہینے تک بستر پر پڑا رہا۔ میں اس کے گھر کے ایک فرد کی طرح ہو گیا تھا۔ اس کو پیروں پر کھڑا کر دینے میں مدد کو میں احسان نہیں مانا، مگر اس کے گھر والے میرے احسان مند بنے ہوئے تھے۔ اس نے پھر سے چلنا پھرنا شروع کر دیا تھا اور سچ کہوں تو

طرح ہی نہ ہی ملتا تھا، ہم جن فلیٹوں میں آباد تھے وہیں نعیم صاحب بھی رہائش پذیر تھے۔

رزاق صاحب کی بیٹی سارہ میٹرک کے امتحانات سے فارغ ہوئی تھی اور رزلٹ کے انتظار میں اپنے فارغ وقت کو انگلش لیکچر سیکھنے میں کارآمد بنا رہی تھی۔ رزاق صاحب کا شمار بھی پڑوسیوں میں ہوتا تھا۔ سارہ اسد کو جانتی تو تھی مگر بات چیت کا کوئی سلسلہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اس سے باقاعدہ طور پر ملاقات اور گفتگو کو چنگ کی کلاسز کے دوران ہی ہوئی تھی۔ کنوریشن سے بات دوستی تک اور دوستی سے محبت تک جا پہنچی۔

میرا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا تھا جو اسد کو ایک اچھا انسان مانتے تھے۔ ہم عمر ہونے کی وجہ سے میری اس سے اچھی خاصی دوستی تھی۔ اسد سارہ سے دیوانگی کی حد تک محبت کرنے لگا تھا۔ اس نے مجھے اپنی تمام باتوں کا راز دار بنا رکھا تھا۔ ان دونوں کی محبت میں دو سال کا عرصہ پڑ لگا کر اڑ گیا تھا۔ ان دو سالوں میں اسد نے کوئی ایسا کام نہ کیا تھا کہ جس سے سارہ کی طرف کوئی انگلی بھی اٹھا سکے۔ بات خفیہ و کتابت اور موبائل پر میسج کے ذریعے سے چل رہی تھی۔ وہ چاہتا تو رشتہ بھی بھیج سکتا تھا، لیکن اپنی تعلیم مکمل کر کے اچھی نوکری حاصل کر لینے کے بعد پیغام بھیجنے کو زیادہ بہتر تصور کرتا تھا۔

رزاق صاحب اخلاقاً کچھ اچھے واقع نہیں ہوئے تھے، جس کو سب ہی لوگ جانتے تھے۔ آئے دن کسی نا کسی سے جھگڑا کرتا۔ بات بے بات الجھتے رہتا۔ جیسے یہ ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ شاید اعلیٰ عہدے پر افسر اور زیادہ دولت نے انہیں کچھ گھمنڈی طبیعت کا مالک بنا دیا تھا۔

☆.....☆

ایک دن اسد نے مجھے بتایا کہ اس نے سارہ کی بات اپنے گھر والوں سے کر لی ہے اور اس کے گھر والے بھی اس کی اس خوشی میں شریک ہیں۔ امی ابو رشتہ لے کر فوری جانا چاہتے تھے مگر میں نے یہ کہہ کر روک لیا کہ پہلے میں کوئی نوکری ڈھونڈ لوں اس کے بعد رشتہ لے کر جانا بہتر ہوگا۔

سارہ خوب صورتی کا پیکر تھی۔ سیاہ گٹھاؤں جیسی

دراز زلفیں، بڑی بڑی آنکھیں جن پر گھنی پلکیں، چوڑی چاند جیسی پیشانی اور گلاب کی چٹکھڑی جیسے ہونٹ، لمبے قد اور صاف رنگت کی مالک اور اسد؟ لمبے قد اور بھرے ہوئے سینے کا گہرو جوان۔ چال ڈھال میں بردباری اور پُرکشش شخصیت۔ سب سے اچھی بات اس کی آنکھوں کی حیاتی جو کہ آج کے بگڑے ہوئے لڑکوں سے بالکل مختلف تھی۔ کسی لڑکی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ دونوں کی جوڑی میری نظر میں بہت خوب صورت تھی۔ دونوں اپنی زندگی میں مگن، آنکھوں میں آنے والے دنوں کے حسین خواب سجائے اچھے بھلے جی رہے تھے۔ دنیا کی دنیا داری سے بھی انجان ہو چکے تھے۔ ان کے لیے ان کی محبت ہی دنیا تھی اور محبت ہی زندگی۔

☆.....☆

کہتے ہیں عشق اور مُشک چھپائے نہیں چھپتے۔ تو بھلا سارہ کی آنکھوں میں رہنے والی ہر وقت کی چمک اور بے وجہ کی مسکراہٹ اس کے پیار کو کیسے چھپنے دیتی؟ بھید کھلنا تھا سو کھل گیا۔ جانے کیسے رزاق صاحب کی فیملی کو بھی اس عشق کی بھنگ بڑی گئی۔ سارہ سے زبان سے تو کسی نے کچھ نہ پوچھا، مگر گھر والوں کے رویے نے اسے سب سمجھا دیا تھا۔ بات اسد تک پہنچی تو اس نے والدین کو رشتہ لے کر بھیج دیا۔ یہ بات رزاق صاحب کے لیے شاید بیٹی کے عشق سے زیادہ خطرناک تھی۔ انہوں نے آگ بگولہ ہو کر اسد کے والدین کی تذلیل کر دی اور انہیں احساس دلایا کہ ان کی حیثیت میں بہت فرق ہے اور رخصت کرتے لمحے یہ بات بھی بتانی کہ سارہ کا رشتہ وہ اپنے افسر کے بیٹے سے کر رہے ہیں۔ اسد کے والدین نے بہت ہاتھ پیر جوڑے مگر بے سود۔ دولت کا نشانہ اتنی آسانی سے اترنے والا تھوڑی ہوتا ہے۔ بے چارے خالی ہاتھ ذلت اٹھا کر گھر واپس لوٹ آئے۔

سارہ سے موبائل فون چھین لیا گیا۔ آنے جانے پر پابندی لگا دی گئی۔ تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ سارہ پر جو بیت رہی تھی اس سے میری طرح اسد بھی بے خبر تھا۔ کئی مہینوں تک رابطے کا کوئی سلسلہ نہ بن پایا۔ اسد کی حالت میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ ہنستے مسکراتے

[illegible][illegible]

تیسرا شعلہ

اپنا بویا کٹ رہی ہوں

شکلیہ انجم طارق

لاہور سے ماں کے روپ میں ایک ڈائن کی عبرت خیز کہانی

سمیرا اور اس کی ماں پچھا اُن شاطر اور عیار عورتوں میں سے تھیں، جن کے دل میں جذبات کی جگہ دولت کو جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرنے کے نئے خیالات جمع رہتے تھے۔ وہ دونوں اکثر ویش تر اس دولت کی خاطر پیگے اور دوسروں سے دنگا فساد کرنے سے بھی باز نہیں آتی تھیں۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ تمام پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ام ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

اس طلاق کو چندا نے بڑی خوشی سے قبول کیا، جیسے طلاق نہ ہوئی ہو اسے کوئی میڈل مل گیا ہو۔ چوں کہ وہ پہلے بھی غلط راہوں پر گھل رہی تھی، مگر تب تو شوہر نام کی رکاوٹ بھی اور اب تو وہ کھلم کھلا من مانیوں پر اتر آئی۔ ایسے میں اولاد کو بھی شل مل گئی، تو وہ بھی بے باگی اور غلط راہوں کا حصہ بننے کے لیے چل دی۔

ایک بیٹے نے شوقیہ چوریاں شروع کر دیں اور دوسرا سارا سارا دن گھر سے غائب رہتا اور موٹر سائیکل لیے سڑکیں ناپتا رہتا۔ آزاد خیال بیٹی نے کمپیوٹر کورسز کر کے ایک اچھی کمپنی میں جاب حاصل کر لی اور جاب کے دوران اپنے ہی ایک کولیگ سے دوستی کر لی۔ یہ کولیگ پہلے سے شادی شدہ تھا، لیکن سمیرا ہر قیمت پر عظیم سے شادی کرنا چاہتی تھی اور اس شادی کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔ عظیم کی خاندانی بیوی اور دو بچے تھے۔ اُس کے سر پر بھی سمیرا کے حسن اور عشق کا جادو چڑھا ہوا تھا، بالآخر اس نے ہتھیار ڈال دیے اور سمیرا کے ساتھ خوب دھوم دھام سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد سمیرا نے گاہے بگاہے عظیم سے خوب روپیہ پیسا بٹورا، کیوں کہ عظیم کے پاس کافی زمینیں تھیں اور انہی زمینوں کے لالچ میں اُس نے اس سے شادی بھی کی تھی۔

سچ کہتے ہیں جب دولت کی ہوس بڑھ جاتی ہے تو رشتوں، جذبات اور احساس کی موت ہو جاتی ہے۔ اس سچ اگر کچھ باقی رہتا ہے تو دولت کا چکر..... اور مال و زر سے اپنی تجوریاں بھرنے کی خواہش ہوتی ہے۔

جیسیں تو بھر جاتی ہیں، پر ہاتھ محبت، اعتماد اور خلوص کی دولت ہی نہیں بلکہ رشتوں کے ریشم سے بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ اُدھر سمیرا کی ماں چندا دونوں ہاتھوں سے اختر کو لوٹ رہی تھی۔ اختر جان بوجھ کر اس کے ہاتھوں لٹ رہا تھا۔ اس لئے میں بھی اس کا نقصان چندا سے بڑا نہ تھا۔ وہ بڑے دھڑلے اور استحقاق کے ساتھ جب چاہتا، اُسے اپنے بستر کی زینت بنالیتا اور سمیرا کی ماں ذرا بھی اس پر چوں چاں نہیں کرتی تھی۔ کرتی بھی کیسے اس کا منہ تو اختر کے ہرے، نیلے اور لال لال نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ اختر کی رکھیل بنی

سمیرا دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ ماں کے بے جالاؤ، پیار اور بے پناہ اہمیت نے اُسے خود سر اور ضدی بنا دیا تھا۔ ہر معاملے میں چندا اُس سے صلاح مشورہ لینا نہیں بھولتی تھی۔ سمیرا کا باپ، عابد نہایت شریف انسان تھا، جسے ان دونوں ماں بیٹی نے ”ملازم“ سے زیادہ کا درجہ کبھی نہیں دیا تھا اور وہ شریف انسان گھر کو مکان بننے سے بچانے کی تنگ و دو میں گئے رشتوں کے درمیان خوب پس رہا تھا اور رہ گئے دونوں بیٹے وہ ماں، بہن کی ہر غلط و سچ بات پر ایمان لے آتے تھے۔ چندا نے اُن کی تربیت ہی سمجھ اس ڈھنگ سے کی تھی کہ وہ ماں، بہن کو ہر معاملے میں حق بجانب سمجھتے تھے۔

چندا کے رنگ ڈھنگ نرالے تھے۔ شوہر کی موجودگی میں ہی اُس سے بے وفائی کر گئی تھی۔ نت نئی الزام تراشیاں کر کے خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی خوشیوں کو پرے دھکیل دیا تھا۔ بیوی کی بے وفائی اور طوطا چشمی کے باوجود عابد اُسے طلاق دینے کی ہمت نہ کر سکا، وجہ اس کے بچے تھے۔ کچھ بھی تھا وہ بے وفا عورت اُس کے تین بچوں کی ماں تھی اور وہ بچوں کو اُن کی ماں سے دور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس بات کا اس کی بیوی چندا نے کھل کر فائدہ اٹھایا۔ اس نے اختر نامی ایک شخص سے ناجائز تعلقات استوار کر لیے اور اُس کی مدد سے عابد کی ساری زندگی کی جمع پونجی سے بنا ہوا گھر اپنے نام کر لیا۔ عابد کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ سر پیٹ کے رہ گیا۔ اُس روز گھر میں خوب ہنگامہ ہوا، نوبت لڑائی مار کٹائی تک آ گئی۔ اس دوران اُس کی تینوں اولادوں نے بھی اپنی ماں کا ساتھ دیا۔ چندا نے اختر کے ساتھ مل کر ایک عیسائی سفلی عمل اور جادو ٹونے کرانے والے سے بھی رابطہ کر لیا۔ چندا بجائے اس کے کہ خود صراطِ مستقیم پر آئی، اپنے کیے پر نادم ہوتی، اُلٹا اس نے شوہر کو نکیل ڈالنے کے لیے اُس پر اُلٹے سیدھے عمل کرانے شروع کر دیے..... جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عابد نے سب کچھ جان کر وہ گھر بھی چھوڑ دینا مناسب سمجھا اور ساتھ ہی چندا کو طلاق بھی دے ڈالی۔

ہوئی تھی اور اُسی کے دیے ہوئے پیسوں سے چندا کے گھر
میں اعلیٰ سے اعلیٰ، بیش قیمت کراکری، فرنیچر اور جیولری
میں اضافہ ہوتا گیا۔

اپنی کارکردگی کا گراف بدستور بلند سے بلند ہوتا دیکھ کر چندا خوشی سے پھولے نہ سار ہی تھی، اس کے اندر سے گناہ و ثواب کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ وہ دنیا کے کھیل تماشوں میں مگن تھی۔ یہ بھول گئی کہ اوپر نیلی چھتری والا اس کے ایک ایک اچھے بُرے فعل کا حساب رکھ رہا ہے۔ وہ اُس کو ڈھیل دے رہا ہے۔ اس کی رشتی دراز کر رہا ہے، کسی دن یہی رشتی اس کے گلے کا پھندا ثابت ہونے کو تھی۔ توبہ کے در کھلے ہوئے تھے پر توبہ سے فائدہ اٹھانے والی فی الحال دولت اور نام نہاد عشق و عاشقی میں پھنسی ہوئی تھی۔ کس قدر شرم و ذلت کا مقام تھا کہ وہ عزت کا سودا دولت کے ساتھ کر رہی تھی۔ ایک پلڑے میں عزت سسک رہی تھی تو دوسرے میں دولت اٹھیلیاں کر رہی تھی۔ اُسے عزت سستی لگی، جب کہ دولت معزز اور مہنگی۔ اسی لیے تو اس کم طرف عورت نے عزت پر دولت کو ترجیح دی۔ جس کے بارے میں مشہور ہے ”دولت کسی کی سسکی نہیں ہوتی، آج اس ہاتھ ہے تو کل اُس ہاتھ میں ہوتی ہے۔“ دولت کا کوئی گھر نہیں ہوتا، جب کہ عزت کی جگہ تو ہر شریف انسان کے دل میں، گھر میں ہوتی ہے۔

اس کم عقل عورت نے اپنی نادانی اور بے وفائی سے اپنا شریف شوہر کھو دیا۔ اُس میں ذرا بھی عقل ہوتی تو اس مرحلے پر ہی سبھل جاتی، پر رُسوائی کی دلدل میں وہ جان بوجھ کر گر رہی تھی اور اسے اس گہری بدبودار دلدل سے باہر نکالنے والا کوئی نہ تھا۔

ایک اچھی ماں پوری فیملی کو سنوارتی ہے، بچاتی ہے، بگڑنے سے بچاتی ہے، لیکن میرا کی ماں نے تو گھر کے ہر فرد کو نکالتا کر کے بکھیر دیا اور ”گھر“ جو کبھی گھر ہوا کرتا تھا، جس میں سب رشتے محبت کے ساتھ سانس لیتے تھے، وہ بکھر کے رہ گئے۔ کمین تماشا بن گئے اور گھرا اینٹ گھارے اور پتھروں سے بنا ایک بے جان مکان رہ گیا۔

باز

میرے پیارے نوجوانو! اس کاہل زندگی کو چھوڑو اور کچھ کام کرو کام کیا ہے؟ آخری نصف رات اور ابتدائی نصف دن سوتے رہو۔ آہ وہ مزیدار خواب جو دھوپ چڑھے ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ پھر تمام کس بل دکھا کر اٹھو۔ انگڑائی پہ انگڑائی لو۔ سگریٹ پہ سگریٹ پھونکو۔ ذرا سا پانی منہ پر ڈالو تاکہ آنکھ کھل جائے۔ کھانا کھا لو تاکہ جان بنے پھر تاش کھیلنے بیٹھ جاؤ اور شام تک سو روپے ہارنے کی کوشش کرو۔ ایک نیا کرتا یا اپنی شرٹ پہنو اور رقص و سرور کی محفل میں یا سینما میں آدمی رات تک جی بہلاؤ۔ گھر آ کر ہاتھ میں خیار پکڑو اور بستر پر دروازہ بجاؤ۔

(ابوظفر زین)

شادی کے دو سال بعد میرا ایک پیارے سے بیٹے کی ماں بن گئی تو فخر و غرور سے اس کی کلف زدہ گردن اور اکڑ گئی۔ حالاں کہ اس میں اُس کا کیا کمال تھا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی تھی کہ اُس نے اسے بیٹے کی نعمت سے مالا مال کیا اور اگر رب کائنات یہ نعمت اسے نہ دینا چاہتا تو وہ کیا کر سکتی تھی۔ رب کے حضور شکر ادا کرنے کی بجائے فخر و غرور کر کے وہ اپنی اوقات سے بڑھ کر اپنے مقام سے نیچے گر رہی تھی۔

سمیرا نے علیم پر بے پناہ دباؤ ڈالا کہ وہ گھر والوں سے اپنا حصہ لے اور اپنے گھر والوں سے علیحدہ ہو جائے۔ علیم سمیرا سے بہت دہتا تھا، کچھ جادو اور تعویذوں کا بھی اُس پر اثر تھا، جو سمیرا اور اس کی ماں اکثر ویسٹرا سے گھول کے پلا دیتی تھیں، نتیجتاً وہ انہی کا ہموار بن چکا تھا اور اُن کی ہاں میں ہاں ملانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ بڑی کو اُس کی طرف سے کھلی چٹھٹی ملی تو اس نے بغیر کسی لگی پٹی کے ساس کو اٹھتے بیٹھتے سُنا تا شروع کر دیا کہ علیم کا حصہ اُسے جلد دے دیا جائے.....

وہ دونوں الگ رہنا چاہتے ہیں۔ ساس بھی منہ

پیٹ تھی کہنے لگی۔ ”ایسا تو اس کے زندہ رہنے تک تو نہیں
ہوگا، مرنے کے بعد لے لینا اور مکان بنگلہ بناتی رہنا۔
ان سے تو کوئی آس، کوئی امید نہ رکھے تو اچھا ہے۔ یہ کورا
سا جواب سن کر میرا کہ سن میں آگ لگ گئی اور وہ
دل ہی دل میں سیاسی کو مزہ چکھانے کا سوچنے لگی۔ آخر
ایک دن اُسے موقع مل ہی گیا۔ اس کی ساس اکیلی تھی۔
اُس نے فون کر کے اپنی ماں کو اپنے گھر بلوایا۔ ماں نے
فون کر کے اختر اور دو غنڈوں کا انتظام کر لیا۔ میرا نے
اختر، ماں اور اس کے لائے ہوئے مستندوں سے مل کر
قابل احترام ساس کو خوب مارا پیٹا..... وہ بے چاری اتنے
سارے لوگوں کے بیچ اپنا آپ نہ بچا سکی اور مار پیٹ سہتی
رہی۔ اس وحشیانہ تشدد کے نتیجے میں اس کی ایک ٹانگ
ٹوٹ گئی اور کئی پسلیاں بھی مضروب ہو گئیں۔ تاک اور
منہ پر گہرے زخم آئے، بازو، کمر اور کہیاں چوٹوں سے
نیلی ہو گئیں۔ اس کے بعد میرا بڑے آرام سے اپنی ماں
کے ساتھ چلی گئی۔

علیم کے بہن بھائیوں نے ماں کی یہ حالت
 دیکھ کر سیرا، چندا اور اختر کے خلاف پہلی فرصت میں
 کیس کر دیا۔ پولیس نے سب کو بروقت گرفتار کر لیا،
 لیکن علیم نے اُن تینوں کو ضمانت پر رہا کر لیا کہ یہ ہمارا
 آپس کا گھریلو جھگڑا تھا۔ ساس نے بہو کو مارا تو بہو
 نے زیادہ ہی غصہ دکھا دیا۔ ساتھ ہی بے غیرت علیم
 نے پولیس کی مٹھی بھی گرم کر دی، تو پولیس نے موم
 ہونے میں دیر نہیں لگائی۔

اُدھر علیؑ کی ماں اور تمام فیملی ممبران کا غصے کے مارے بُرا حال تھا۔ وہ سب سیرا اور چندا سے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ ایک دن سیراؑ کسی ضرورت کے تحت گھر سے باہر نکلی۔ بیٹے حمزہؑ کو وہ ماں کے پاس گھر چھوڑ آئی تھی۔ ابھی چوک تک بھی نہ پہنچ پائی تھی کہ اُس کی تاک میں بیٹھے چند نقاب پوشوں نے اُسے دبوچ لیا۔ اس اچانک افتاد پر وہ گھبرا گئی۔ نقاب پوشوں نے اس کی ہر مزاحمت پر قابو پالیا اور اُسے مٹی کے تیل میں بُری طرح نہلا دیا۔ وہ بُری طرح چیختی چلاتی رہی، مگر یہاں اُس کی چیخیں، آہیں سننے والا کوئی انسان نہ تھا، دفعتاً ایک دیاسلائی بھڑکی اور اس نے مغرور، گھمنڈی اور

مال و زر کی بھجاری کو منٹوں میں راکھ کے ڈھیر میں بدل دیا۔ سمیرا کے ہاتھ میں دبے نیلے، ہرے نوٹ بھی راکھ کا حصہ بن گئے۔ چندا کے لیے اپنی لاڈلی بیٹی کی اچانک اور بھیا تک موت برداشت کرنا دشوار ہو گیا، اُسے سکتہ سا ہو گیا کہ یہ کیا ہو گیا؟

سمیرا اس دنیا سے کیا گئی کہ چننا کے حصے میں
شکھ سارے مفتی ہو گئے۔ اُس کے بُرے دن آزمائش
بن کر شروع ہو گئے تھے۔ اب اُس کا دل اس دنیا سے
اُچاٹ ہو گیا۔ جس دولت کے لیے اُس نے اپنا
آپ، اپنا گھر اور اپنی اولاد برباد کی، وہ دولت اُس
کے کسی کام نہ آ سکی۔ اُس کی حسین جوان بیٹی کو یہ
دولت بھی بھیا تک موت کے پنجوں سے نہ بچا سکی۔
وہی توازن ذرا بگڑا تو اسے اصل میں ہوش آیا کہ اُس
کی جھولی میں دُکھوں اور گناہوں کا بوجھ ہے، کچھ بھی
اُس کے حق میں نہ رہا۔

اُسے ہوش آیا بھی تو کب آیا جب سارا گھر ہی اُجڑ
گیا۔ علیم بھی بیوی کی موت کے بعد پاگل سا ہو گیا۔ علیم
کے گھر والوں نے اُس کی ذہنی حالت کے پیش نظر اُسے
زندہ رہنے دیا ورنہ اُسے مارنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ جو اولاد
اپنی نہ بن سکے وہ لوگ اُسے دوسروں کے لیے نہیں چھوڑنا
چاہتے تھے لیکن قدرت نے خود ہی فیصلہ کر دیا۔

آج اتنے بڑے گھر میں وہ اکیلی رونی رہتی ہے۔ اللہ سے معافیاں مانگتی ہے، گھنٹوں خلاؤں میں کھٹی رہتی ہے، کبھی اپنے بال نوچتی ہے تو کبھی اپنا چہرہ، جب اس کا پیارا نواسہ اپنی توہلی زبان میں پوچھتا ہے کہ اُس کی ماں کہاں ہے؟ تو وہ کہتی ہے۔ بیٹا تیری نانی ڈائن ہے، تیری ماں کو کھا گئی..... نواسہ پھر سوال کرتا ہے۔ نانی یہ ڈائن کیا ہوتی ہے؟ نانی چیخ چیخ کے روتے ہوئے کہتی ہے۔ پتر ڈائن تیری نانی جیسی ہوتی ہے، نواسہ اپنے سوال کے ادھر رے جواب کو سن کر بہم بہم جاتا ہے اور نانی نواسے کو دیکھ کے روز جیتی ہے، روز مرتی ہے۔ وہ اُس کے معصوم سوالوں پہ بڑھتی ہے، اب یہی اس کی سزا ہے، یہی مکافات عمل ہے جو بویا جائے وہ کاٹا توڑتا ہے!!

مکھنی



ارشاد علی ارشد

رہنمائی سے خیال اور حقیقت کی قید سے آزاد و غیر مبرا کی ایک حیرت انگیز داستان

ایک مافوق الفہم اسرار بھری عجیب داستان

قسط نمبر 14

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

مکھنی ایک نہایت ذہین و سمجھ دار، اوروں سے مختلف سوچ، خیالات، نظریات اور غیبی طاقت رکھنے والی گاؤں کی ایک لڑکی ہے جو اپنے ماں باپ، دو بھائیوں اظہر اور مظہر، ایک بہن سکھاں اور محبت میں ناکام، غیر شادی شدہ بچپن کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ سکھاں کو اپنے کالج فیلو سانول سے محبت ہو گئی ہے، مکھنی محبت اور عشق کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے اپنی بہن سکھاں کو سفید چوڑے کی دیوار کو اپنی غیبی طاقت سے پردہ اسکرین بنا کر ماضی میں مجاہدین اسلام کا ایک لشکر دکھاتی ہے۔ محبت اور عشق کی باتیں کرتی، گتھیاں سلجھاتی اور مسلمانوں کے عظیم ماضی و اسلاف کے کارنامے بتاتی اور دکھاتی، مکھنی، سکھاں سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ سانول سے اس کے رشتے کے سلسلے میں گھر والوں سے بات کرے گی۔ مکھنی کے بھائی اظہر کی دینی روانگی سے پہلے شادی کر دی جاتی ہے۔ مکھنی اسی دوران میں سانول کے گھر اس سے ملنے جاتی ہے۔ ایک روز سکھاں کالج سے لوٹ رہی ہوتی ہے تو چوہدری اللہ رکھا کا بیٹا چوہدری راجیل اسے روک کر پریشان کرتا ہے اور پھر ایک روز جب سکھاں اپنی ماں کے ساتھ جاری ہوتی ہے تو چوہدری راجیل دوبارہ وہی حرکت کرتا ہے۔ اس دوران میں سکھاں کا پاپ اس کی منگنی فاطمہ خالہ کے دیور سے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ایک روز یوں بھی ہوتا ہے کہ چوہدری اللہ رکھا، مکھنی کا راستہ روک لیتا ہے۔ مکھنی اس کو برا بھلا کہتی ہے تو وہ اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ لیکن مکھنی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ چوہدری اللہ رکھا اپنے کارندوں کے سامنے اس بے عزتی پر مکھنی کو دھکی دیتا ہے کہ اب میرے حجرے میں تیرا تاج ہوگا اور پھر ایک روز چوہدری اللہ رکھا کے کارندے مکھنی کو اغوا کر کے اس کی کوٹھری کی شکل میں موجود حجرے میں پہنچا دیتے ہیں۔

چوہدری اللہ رکھا کے حجرے میں مکھنی اس کی خواہشات پوری کرنے کی بجائے موقع ملنے ہی چوہدری اللہ رکھا کی رائفل سے اسے قتل کر دیتی ہے۔ مکھنی کو چوہدری کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور پھر سکھاں تھانے میں آ کر بتاتی ہے کہ چوہدری اللہ رکھا کے بڑے بیٹے چوہدری مشتاق نے اسے پیغام بھیجا ہے کہ اگر سکھاں کے لیے چوہدری راجیل کا رشتہ قبول ہے تو ہم مکھنی کو معافی کے بعد دیت کے قانون سے رہائی دلا سکتے ہیں۔ اسی دوران میں لیڈی انسپکٹر شبانہ کو مکھنی سے تفتیش کے لیے بلایا جاتا ہے۔ مکھنی اسے دیوار پر محمد بن قاسم کا نظارہ کر کے دہلا دیتی ہے اور وہ تھانے دار کے گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ مکھنی کے معاملات سے خائف ہو کر تھانے دار اسے لے کر گاؤں آتا ہے جہاں مکھنی کے قاتل ہونے کے گواہ اپنے بیان سے منکر جاتے ہیں۔ مکھنی تھانے دار سے رہائی حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر آتی ہے۔

گھر آ کر اسے پتا چلتا ہے کہ اس کا ابا قانچ کے باعث چار پائی سے لگ گیا ہے، پھر کچھ دن بعد اس کے ابا کا انتقال ہو جاتا

ہے، جبکہ اس کا بھائی، باپ کی موت سے پہلے ہی دینی چلا جاتا ہے۔ اسی دوران میں اس کی شادی بلاول سے ہو جاتی ہے۔
 مکھنی اور بلاول نے اپنے بیٹے کا نام معاویہ رکھا ہے، معاویہ چار سال کا ہو گیا ہے۔ لیکن باپ کی موت کی خبر سے
 مکھنی کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے، کبھی وہ کہیں ہوتی ہے اور پھر غیر محسوس طریقے سے ماورائی قوت کے تحت وہاں سے کوسوں
 دور جا پہنچتی ہے۔ ذہن کی اگلی جست میں وہ اپنے گھر کے نزدیک تھی، اس نے گھر کی طرف قدم بڑھائے پھر روک لیے، مگر والے
 ڈٹے اور لوہے کے سرے اٹھائے اس کی طرف بھاگے آئے تھے۔ ان کے ساتھ دوڑتے بلاول نے مکھنی کو متوجہ کرتے ہوئے
 کہا۔ ”مکھنی بھاگ جاؤ یہ لوگ تمہارے قتل کا منصوبہ بنا چکے ہیں۔“ مکھنی کے ذہن پر ہتھوڑے برسے لگے۔ اس نے سوچا، مکھنی
 تیرے حق میں بھاگنا ہی بہتر ہے۔ میں انہیں کانٹے کی طرح جیسے لگی ہوں۔ مکھنی حیران تھی کہ امی ابو میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی
 کہ وہ تمک نہیں رہے۔ گاڑیوں، برکشا، موٹر سائیکلوں اور لوگوں کی بھیڑ سے بچتی بچاتی وہ بھاگی چلی جا رہی تھی۔
 ”میرے دشمنوں کا کیا حال ہے؟“ یہ سوچ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک نیرہ اڑتا ہوا آیا اور اس کی آنکھ میں کھپ گیا۔ اس
 کی آنکھوں کا شیشا ایک چھتا کے ٹوٹ گیا۔ شیشہ ٹوٹنے کے جھٹکے سے وہ لڑکھرائی، اسے احساس ہوا کہ وہ پانی سے ٹکرائی تھی۔
 جب مکھنی کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خود کو انتہائی آرام دہ بیڈروم میں پاتی ہے۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوتی ہے اور کمرے
 میں ایک وجہ نوجوان اور میزمر کی یاد دہانی ایک خاتون اور جنرل اور جیکٹ میں ملبوس ایک خوب صورت لڑکی اندر داخل ہوتے ہیں۔
 آہستہ آہستہ کمرے میں لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور وہ سب قطار میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔
 ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ مکھنی خود سے سوال کرتی ہے، پھر وہ لوگ ایک ایک کر کے آگے بڑھتے ہیں اور مکھنی کے پاؤں چھوتے
 ہوئے کمرے سے نکلے جاتے ہیں۔ کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز پر مکھنی سوچوں کی دنیا سے لوٹ آئی۔ کمرے میں ایک خوب صورت
 نوجوان داخل ہوتا ہے جو اپنا نام اس چند دہائی بتاتا ہے۔ وہ مکھنی سے کہتا ہے کہ اس کا نام مہک ہے اور آج اس نے پورے تیرہ ماہ اور
 دس دنوں بعد مکمل ہوش و حواس میں بات کی ہے اس سے پہلے وہ استعارات میں گفتگو کرتی رہی ہے۔ اس نے بتاتا ہے کہ وہ اس وقت
 ضلع گھنٹی کے نواحی گاؤں گھنٹہ چمن میں ہے۔ مکھنی اس سے پوچھتی ہے کہ اس سے پہلے وہ کہاں تھی؟ اس سوال سن کر خاموش
 ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے تاپا اور بابائے بتانے سے منع کیا ہے اس مکھنی سے کہتا ہے کہ وہ اس کی آمد کا ذکر بابائے نہ کرے۔
 مکھنی ان لوگوں کا ہاتھ جوڑ کر اس کے احترام میں کھڑا ہوتا، اس کو حد سے زیادہ عزت دینا دیکھ کر سوچتی ہے کہ کہیں یہ لوگ بھی
 کوتم بدھ کی طرح اس کی پوجا نہ شروع کر دیں۔

اسن کراچی سے واپس آتا ہے اور آتے ہی مکھنی کے کمرے میں حاضری دیتا ہے وہ حسب معمول ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کرتا ہے اور
 دل ہی دل میں کچھ بڑھتا ہے۔ مکھنی اس سے کہتی ہے کہ مجھے کچھ نہیں آتی کہ آپ لوگ مجھے کیا سمجھ رہے ہو۔ میرے روبرو ہاتھ کیوں
 جوڑے جاتے ہیں، آنکھیں بند کر کے کیا پڑھا جاتا ہے۔ مکھنی کہتی ہے۔ ”دیکھو اس بات کا یقین کر لو کہ میں بھی ایک معمولی سی عام سی
 لڑکی ہوں۔ آج تم نے مجھے چھو کر بھی دیکھ لیا۔ دیکھو اپنا ہاتھ اس طرح صحیح سلامت ہے۔ نہ جلا نہ کٹا نہ معذور ہوا۔“
 اسن مکھنی سے وہ سادے حالات و واقعات بیان کرتا ہے کہ کس طرح وہ لوگ لاہور میں دریا دہلی کے کنارے موجود تھے اور مکھنی

انہیں بے ہوشی کی حالت میں ملی تھی، مکھنی اس سے کہتی ہے کہ یہ زندگی کے بارے میں آپ کو کچھ پتا ہے اسن
 بتاتا ہے کہ اس سلسلے میں انہیں کچھ معلوم نہیں۔ مکھنی اس سے کہتی ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ مکھنی کو اپنا شوہر بلاول اور بچہ معاویہ یاد آتا ہے وہ
 سوچتی ہے خاندان والوں کے بارے میں جاننے کے لیے اس کا لاہور کا سفر ضروری ہے۔ لیکن اس سے پہلے وہ اسن کے خاندان کے وہاں و
 قلوب میں اہم پیغام پہنچانا چاہتی تھی اور اس کے لیے وہ اس دن کے انتظار میں تھی جب تمام لوگ خاموشی کے ساتھ اکٹھے ہو کر اس کے
 روبرو پیش ہوتے تھے اس کے لیے مکھنی کو ایک خالی سفید دیوار چاہیے تھی جب سب لوگ اکٹھے ہو گئے تو مکھنی انہیں ہندو مذہب کے
 بارے میں سمجھاتی ہے کہ کچھ نہیں آتا کہ پڑھے لکھے لوگ جانوروں، تیل، کھوا، چھیل، تسمی وغیرہ کو کیسے مقدس سمجھتے ہیں۔ دنیا کے
 سارے عقیدے تو حید پرستی ہیں پھر وہ انہیں اسلام کی بابت سمجھاتی ہے اور ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتی ہے۔ مکھنی کی بات سے
 وہاں ہلچل مچ جاتی ہے اور وہ لوگ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں، تب اسن مکھنی کو گھر چھوڑنے کا کہتا ہے، کیوں کہ وہ لوگ اسے قتل
 کرنا چاہتے ہیں، مکھنی وہاں سے فرار ہو کر انکل فییم کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ وہاں اس کی ملاقات عظمیٰ سے ہوتی ہے جو کہ انکل فییم کی
 بیٹی ہے اور ماضی میں مکھنی کی ملاقات عظمیٰ سے ان کی صورت میں ہوئی تھی۔ انکل فییم عظمیٰ سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ مہک یعنی مکھنی کو
 پہنچاتی ہے تو عظمیٰ مکھنی کے متعلق بتاتی ہے کہ یہ مہک، بین مکھنی ہے، میرا دامگر کے رحم اللہ ترکھان کی بیٹی۔ تب بچپن سے لے کر
 لڑکپن اور جوانی تک کے سارے حالات و واقعات مکھنی کی نگاہوں میں گھوم جاتے ہیں۔ انکل فییم مکھنی کو اسن کے فون کا بتاتے ہیں

کہ اسن مکھنی سے ملنا چاہتا ہے۔ مکھنی انکار کر دیتی ہے۔ اسن مکھنی کو اسن سے ملاقات کا کہتی ہے اور کہتی ہے کہ تو اسن سے پیار کرنے لگی
 ہے۔ مکھنی انکار کرتی ہے، وہ کہتی ہے کہ مجھے محمد بن قاسم، سلطان محمود غزنوی، صلاح الدین ایوبی، شیخ سلطان، امام اعظم ابوحنیفہ، حضرت
 ابوہریرہ اور حضرت خزفہ شمس کے عشق ہے۔ ان کے بعد کسی عشق کی گنجائش نہیں، پھر مکھنی اسن کو امام ابوحنیفہ کے بارے میں بتاتی ہے۔
 ”مکھنی! انہوں نے بغاوت کیوں کی تھی۔“

”ہاں یہ بتانا بھول گئی۔ آل عباس نے سادات کے خلاف سفاکانہ اقدام اٹھانے شروع کر دیے تھے تو یہ لوگ بھی
 سادات میں شامل تھے۔ محمد نفس زکیہ تو بہادری کے ساتھ جنگ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ان کے بھائی
 ابراہیم نے بھی جنگ کی تھی۔ وہ بھی شہید ہوئے تھے۔ امام صاحب نے ابراہیم کا ساتھ دیا تھا۔“
 ”اس کا مطلب ہے۔ جب منصور نے امام ابوحنیفہ کو دربار میں بلایا تو یقیناً سختی کی ہوگی۔“
 ”تم سختی کی بات کرتی ہو انم۔ اس بد بخت نے بعض سیاسی احباب کی بدولت امام اعظم کو قید کر لیا۔ اصل میں امام
 صاحب نے جو اہل بیت کا ساتھ دیا تھا یعنی نفس زکیہ اور ابراہیم کے متعلق جو آپ کے لیے خیالات تھے، تو حکومت اس
 سے خائف تھی۔ قید میں کیا ہوا۔ یہ پھر بتاتی ہوں۔ پہلے ایک دلچسپ بات سنو۔“
 ”ہاں، ہاں، سناؤ۔“

منصور کے حکم پر جب امام اعظم ان کے دربار میں داخل ہوئے تو دربار میں تجاہت کا عہدہ رکھنے والے ریح بھی وہاں
 موجود تھے۔ ریح نے ابوحنیفہ کو دربار میں پیش کیا اور کہا۔ ”آج دنیا میں یہ سب سے بڑے عالم ہیں۔“
 ”منصور نے امام صاحب کو دیکھا اور پوچھا۔ ”بتاؤ آپ نے کس سے علم کی تحصیل کی۔“
 ”امام صاحب نے اپنے استادوں کے نام گنوائے۔“ سن کر منصور بولا۔
 ”آپ کو میں قضا کا عہدہ دیتا ہوں۔“
 ”امام صاحب نے کہا، مگر میں اس عہدے کا اہل نہیں۔“



”امام صاحب کا انکار سن کر منصور غصے میں آ گیا اور غصے میں ہی بولا۔ ”تم جھوٹ بولتے ہو۔“
 ”ابو حنیفہؒ بولے۔ ”اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو یہ دعویٰ میرا خود بخود دسپا ثابت ہو جاتا ہے کہ میں عہدہ قضا کی قابلیت نہیں رکھتا، کیوں کہ جو شخص جھوٹا ہو وہ قاضی نہ ہو سکتا۔“
 منصور نے جب دیکھ لیا کہ اس عہدے کے لیے اس شخص کے علاوہ کوئی دوسرا اہل نہیں تو وہ قسم کھا کر بولا۔ ”تم کو یہ عہدہ قبول کرنا ہوگا۔“

جواباً امام ابو حنیفہؒ نے بھی قسم کھا کر کہہ دی کہ میں قبول نہیں کروں گا۔
 جب امام صاحب نے بھی قسم کھا لی تو رنج غصے میں بولا۔ ”ابو حنیفہؒ نے بھی قسم کھا لی، وہ بھی امیر المومنین کے مقابلے میں۔“
 امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا۔ ”ہاں بالکل۔ اس لیے کہ قسم کا کفارہ ادا کیا جاتا ہے۔ جو میری نسبت امیر المومنین کو ادا کرنا بہت آسان ہے۔“

”کیا بات ہے۔“ مکی بنی بڑے لوگوں کی بڑی سوچ اور بڑی بات۔ ”انہوں نے پکار کر کہا۔
 ”انہی اسی منصور نے 146 ہجری میں امام صاحب کو قید کیا، مگر یہ قید امام صاحب کی شہرت میں ذرہ برابر کی نہ لاسکی، بلکہ امام صاحب نے دوران قید بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کا بین ثبوت امام محمدؒ ہیں۔“

”یہ امام محمدؒ کون ہیں۔“
 ”انہی امام محمدؒ کو قلعہ خفی کا دست و بازو کہا جاتا ہے۔ انہوں نے امام ابو حنیفہؒ سے قید خانے میں ہی تعلیم حاصل کی تھی۔“
 ”تو کیا امام اعظمؒ کو جیل سے رہائی مل گئی تھی۔“

”نہیں! 150 ہجری میں امام اعظمؒ کو بے خبری میں زہر دے دیا گیا تھا۔ امام صاحبؒ کو زہر کا اثر ہوا تو آپ سجدے میں چلے گئے اور سجدے کی حالت میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔“

”اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔“ انہی تم نے اتنے خلوص سے کہا کہ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ چند لمحے کمرے میں گہری خاموش چھا گئی۔ پھر میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”امام اعظمؒ کو حسن بن عمارہ جو شہر کے قاضی تھے، انہوں نے غسل دیا، غسل سے ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ لوگوں کا جم غفیر جمع ہو گیا۔ پہلی نماز جنازہ میں کم و بیش پچاس ہزار کا مجمع اکٹھا ہوا تھا، مگر لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی، یہ سلسلہ اس قدر طویل تھا کہ چھ بار نماز جنازہ ادا کی گئی۔ عمر کے بعد آپ کو سپرد خاک کیا گیا، مگر دفن ہو جانے کے بعد بھی بیس دنوں تک لوگ آپ کی نماز جنازہ ادا کرتے رہے تھے۔“

میں نے دیکھا انہی کچھ کہنا چاہتی ہے، مگر میں نے بات جاری رکھی۔ ”سلطان الپ ارسلان سلجوقی، نے 459 ہجری میں امام صاحب کی قبر پر قبہ تعمیر کیا اور قریب ہی شہید ابو حنیفہؒ کے نام سے مدرسہ بھی بنایا۔ امام ابو حنیفہؒ کی وفات کے بعد فقہ اسلامی میں آپ کے بیٹے حماد اور پوتے اسماعیل نے ممتاز حیثیت حاصل کی۔ حماد بصرہ کے اور اسماعیل درقہ کے قاضی تھے۔ امام ابو حنیفہؒ کے بہت سے شاگردوں نے بھی فقہ اسلامی میں اہم مقام حاصل کیا۔ ان شاگردوں میں بھی بہت بڑے بڑے نام آتے ہیں۔“

”کچھ نام یاد ہیں مکی؟“
 ”چند نام یاد ہیں۔ امام صاحب کے چالیس اہم شاگرد وہ تھے، جن کی مجلس بنائی گئی تھی۔ یہ چالیس افراد امام صاحب کی سرگردی میں فقہ کے ابواب مرتب کرتے تھے۔ کم و بیش بارہ لاکھ نوے ہزار سے بھی زائد مسائل ہیں جنہیں مدون کیا گیا۔ ان شاگردوں میں امام ابو یوسفؒ، امام زفرؒ جیسی اہم شخصیتیں بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ زفر بن النذیل، داؤد الطائی، ابو مطیع، اسد بن عمرو، حسن بن زیاد، لولوی وغیرہ اور انہی میں سے امام ابو حنیفہؒ کے عہد میں فتاویٰ ابی حنیفہؒ سلطنت میں قانون کی حیثیت رکھتے تھے۔ جبکہ مغلوں کے بعد جو خاندان بھی اقتدار میں آیا۔ اکثریت حنفیوں کی تھی۔ اس کے علاوہ تاریخ کے چند اہم حکمران فقہ حنفی سے متاثر تھے۔ محمود غزنوی، ان کی کتاب التفرید فقہ حنفی پر کافی شہرت رکھتی

سلجوقی، نور الدین زنگی، مصر کے چرکی، ہندوستان میں آل تیمور، یہ سب حنفی مسلک سے تھے۔ اسی طرح اورنگزیب عالمگیر، ان کے دور کی اہم کتاب فتاویٰ عالمگیری، فقہ حنفی کی عمرہ کتاب شمار ہوتی ہے۔ انہی میں سے مشہور دوں کی کہ قسم فتاویٰ عالمگیری کا مطالعہ کرو۔ یہ اردو ترجمہ میں بھی دستیاب ہے اور ہر قسم کی اغلاط و نقائص سے پاک ہے۔“

”مکھی! تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ میں نے زندگی کا سارا حصہ ناکہ کے کونٹے پر گزارا ہے اور میں لکھ پڑھ نہیں سکتی۔“
 ”نلوہ..... سو رہی انہی۔ مگر علم حاصل کرنے کی کوئی مدت یا عمر نہیں ہوتی۔ تم آج سے ہی یہ کوشش شروع کر دو۔“
 ”مکھی! ڈیڑی میرے لیے ایک لیڈی پروفیسر کا بندوبست کر چکے ہیں۔“

”دیری گڈ! مجھے یقین ہے کہ تم علم کی منزلیں بہت جلد عبور کر لوں گی اور جب اردو کو اچھی طرح پڑھنے کے قابل ہو جاؤ تو اس کتاب کا مطالعہ شروع کر دینا۔“

”مکھی! فتاویٰ عالمگیری، فقہ حنفی کی عمدہ کتاب ہے، تو کیا اسے اورنگزیب عالمگیرؒ نے مرتب کیا ہے۔“
 ”انہی۔ اورنگزیب عالمگیرؒ مغلیہ خاندان کے علم و علماء اور بزرگان دین سے محبت و عقیدت رکھنے والے بادشاہ تھے۔ انہوں نے 1658ء سے 1707ء تک حکومت کی۔ اورنگزیب عالمگیرؒ انتہائی بلند پا کردار کے مالک انسان تھے۔ انہوں نے اسلامی روایت کے عین مطابق زندگی گزاری۔ اس بات کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی اخراجات کے لیے خود ہاتھ سے ٹوپیاں سیٹے اور قرآن مجید لکھتے تھے۔ سرکاری خزانے کو قومی امانت سمجھتے تھے، گوکہ اورنگزیب خود بھی تالیف کے کام میں دلچسپی لیتے تھے، لیکن فتاویٰ عالمگیری کے لیے انہوں نے پوری سلطنت کے کونے کونے سے علم فقہ کے کامل اساتذہ کو جمع کیا تھا۔ ان بڑے علماء میں شیخ نظام، قاضی حسین جوہپوری، شیخ وجیہ الدین گویا موسیٰ، ملا جوہپوری، ملا محمد اکرم لاہوری، جلال الدین محمد، سید محمد قزوینی اور دیگر بہت سے علماء شامل تھے۔ جن کا مجھے نام یاد نہیں رہا۔ ان تمام جید علماء نے مل کر کم و بیش آٹھ سال کی مدت میں فتاویٰ عالمگیری کے نام سے ایسی ضخیم کتاب تیار کی جس میں تمام فقہی مسائل جمع ہیں۔ اس کتاب کی تیاری میں مجموعی طور پر عالمگیری کے دو لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔“

”مکھی! میرا جی چاہتا ہے تمہاری پیشانی چوم لوں۔“
 ”وہ کیوں بھی۔“

”وہ اس لیے کہ رحم اللہ تر کھان کے گھر میں پیدا ہونے والی عام سی لڑکی کے پاس اس قدر علم کا ذخیرہ موجود ہے۔“
 ”انہی یاد رکھو۔ علم، فن اور ذہانت کسی کی میراث نہیں ہیں جو بھی ان کے حصول کے لیے کوشش کرے گا، یہ ذات پات سے مبرا ہو کر اس کے دل میں ڈیرہ جمائیں گے۔“

”مکھی! کیا امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں مزید کچھ باقی ہے۔ اگر ہے تو میں سننے کو تیار ہوں۔“
 ”انہی! وہ اتنی عظیم شخصیت ہیں کہ ان کے بارے میں ہزاروں صفحات کی کئی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں تو بھی بے قرار رہے گی۔ میرے پاس جو کچھ تھا، میں نے تمہیں بتا دیا۔ بس تم یوں سمجھو کہ ان کی زندگی کے بارے میں مختصر ترین باتیں ہوئی ہیں۔“

”مکھی! میں سوچتی ہوں۔ امن کے گھر والوں نے تمہیں اپنی فطرت اور عقیدے کے مطابق اگر بھکوان کا اوتار سمجھ لیا تو کچھ غلط نہیں کیا۔“
 ”وہ کیوں انہی۔“

”یار تمہاری باتیں ہی ایسی ہیں۔ عقل کو حیران کر دیتی ہو۔ اب نہ جانے ان کے سامنے کیا کچھ کہا ہوگا۔ جسے سن کر وہ تیری پوجا کرنے لگے۔ ویسے کیا لطف آتا ہوگا۔ جب تجھے دودھ سے نہلایا جاتا تھا۔“ انہی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرائی ہوئی بہت اچھی لگتی ہے، اس کے مسکرانے سے مجھے احسان یاد آ گیا۔ میں نے پوچھا۔

”انہی! احسان اپنے وعدے پر آج بھی قائم ہے یا اس کے وعدے بھی عام مرد کی طرح ریت کا ڈھیر ثابت ہوئے۔“
 ”میرے سوال پر انہی کے بارونق چہرے پر گہری سنجیدگی دوڑ گئی۔ میں نے آنکھوں کے اشارے سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“
 ”احسان جھٹی قسم کا نوجوان ہے مکھی۔“

”یار تمہاری باتیں ہی ایسی ہیں۔ عقل کو حیران کر دیتی ہو۔ اب نہ جانے ان کے سامنے کیا کچھ کہا ہوگا۔ جسے سن کر وہ تیری پوجا کرنے لگے۔ ویسے کیا لطف آتا ہوگا۔ جب تجھے دودھ سے نہلایا جاتا تھا۔“ انہی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرائی ہوئی بہت اچھی لگتی ہے، اس کے مسکرانے سے مجھے احسان یاد آ گیا۔ میں نے پوچھا۔

”انہی! احسان اپنے وعدے پر آج بھی قائم ہے یا اس کے وعدے بھی عام مرد کی طرح ریت کا ڈھیر ثابت ہوئے۔“
 ”میرے سوال پر انہی کے بارونق چہرے پر گہری سنجیدگی دوڑ گئی۔ میں نے آنکھوں کے اشارے سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“
 ”احسان جھٹی قسم کا نوجوان ہے مکھی۔“

”یار تمہاری باتیں ہی ایسی ہیں۔ عقل کو حیران کر دیتی ہو۔ اب نہ جانے ان کے سامنے کیا کچھ کہا ہوگا۔ جسے سن کر وہ تیری پوجا کرنے لگے۔ ویسے کیا لطف آتا ہوگا۔ جب تجھے دودھ سے نہلایا جاتا تھا۔“ انہی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرائی ہوئی بہت اچھی لگتی ہے، اس کے مسکرانے سے مجھے احسان یاد آ گیا۔ میں نے پوچھا۔

”انہی! احسان اپنے وعدے پر آج بھی قائم ہے یا اس کے وعدے بھی عام مرد کی طرح ریت کا ڈھیر ثابت ہوئے۔“
 ”میرے سوال پر انہی کے بارونق چہرے پر گہری سنجیدگی دوڑ گئی۔ میں نے آنکھوں کے اشارے سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“
 ”احسان جھٹی قسم کا نوجوان ہے مکھی۔“

”یار تمہاری باتیں ہی ایسی ہیں۔ عقل کو حیران کر دیتی ہو۔ اب نہ جانے ان کے سامنے کیا کچھ کہا ہوگا۔ جسے سن کر وہ تیری پوجا کرنے لگے۔ ویسے کیا لطف آتا ہوگا۔ جب تجھے دودھ سے نہلایا جاتا تھا۔“ انہی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرائی ہوئی بہت اچھی لگتی ہے، اس کے مسکرانے سے مجھے احسان یاد آ گیا۔ میں نے پوچھا۔

”انہی! احسان اپنے وعدے پر آج بھی قائم ہے یا اس کے وعدے بھی عام مرد کی طرح ریت کا ڈھیر ثابت ہوئے۔“
 ”میرے سوال پر انہی کے بارونق چہرے پر گہری سنجیدگی دوڑ گئی۔ میں نے آنکھوں کے اشارے سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“
 ”احسان جھٹی قسم کا نوجوان ہے مکھی۔“

”ایک منٹ انم احسان خٹلی ہے یا نہیں۔ ہاں تیرے عشق میں شاید جنونی ہو گیا ہو۔“
 ”چلو جو بھی تم سمجھو۔“ انم کا انداز ایسا تھا کہ میری نظروں میں مسکان کا چہرہ گھوم گیا۔ میرا دل یک دم اُداسی کی اثناء گہرائیوں میں گر گیا، مگر اندر کے تاثرات میں نے چہرے تک پہنچنے نہ دیے۔
 ”مجھے بولو تم!“

”ملکھنی! جب خانم کے غنڈوں نے مجھے واپس کوٹھے پر پہنچایا تو کندھے کا زخم گہرا تھا۔ بحالت مجبوری مجھے اسپتال ایڈمٹ کر دیا گیا۔ احسان کو جب تین چار دن میرے کمرے میں نہ بھیجا گیا تو اسے کچھ شک ہوا۔ اس نے میڈم خانم کو گلے سے پکڑ لیا، عنقریب تھا کہ جذبات کی شدت میں وہ گلا ہی دبا دیتا خانم کے محافظوں نے اسے پکڑ لیا، احسان کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا مگر وہ بھی بڑے گہرائی کا چشم و چراغ ہے۔ اسی دن تھانے سے باہر آ کر خانم کے سامنے پھر چلا آیا۔ اس بار اس کے خطرناک تیور دیکھ کر میڈم خانم اندر سے خوف زدہ ہو گئی، کیونکہ احسان ایک رات بھی تھانے میں نہیں رہا، لہذا اسے میرے بارے میں بتا دیا گیا، وہ بھاگتا ہوا اسپتال چلا آیا، ملکھنی.....“ انم کہتے کہتے رک گئی۔
 پلوتم۔ میں پوری دلجوئی سے سن رہی ہوں۔

”ملکھنی میں نے زندگی میں پہلی بار کسی مرد کو روتے ہوئے دیکھا، وہ میرے میڈ کے پاس بیٹھ کر بچوں کی طرح رو پڑا، میں گھبرا گئی وہ ایسے رویا تھا کہ بات کرنا مشکل ہو گیا، ہچکیاں کچھ ہمیں اور دل ہلکا ہوا تو بولا۔“
 ”جانتی نہیں.....“ انم..... تمہیں میرا یقین کیا آئے گا۔

”ملکھنی۔ احسان کے الفاظ و کیفیت اس پر اعتبار کرنے کے متقاضی تھے، مگر میں بھی مجبور یوں کی زنجیر میں جکڑی ہوئی تھی، مجھے اندازہ ہوا۔ میں اس کے ساتھ زیادتی کر رہی ہوں، میں نے سراوڑاٹھا کر اسے دیکھ کر کہا۔“
 ”احسان! اتنا چھوٹا دل ہے تمہارا، پیار کے دھوئی دار اس قدر بزدل تو نہیں ہوتے، پیار نہ ملے تو یوں بچوں کی طرح رویا جاتا ہے، اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا۔“

”تیری قسم انم! تیرے نہ ملنے پر کون کا فرورہا ہے، میں تو تمہیں صرف اس حالت میں دیکھ کر تڑپ رہا ہوں۔“
 ”ملکھنی اس وقت مجھے تم بہت یاد آئی تھی۔“
 ”ایسے ماحول میں، میں یاد آئی۔ مجھے واقعی حیرانی ہوئی۔“

”ہاں ملکھنی! جب احسان نے میری قسم کھائی تو تیری بات یاد آ گئی۔“ میں نے احسان سے کہا۔ ”احسان کسی بشر کی قسم نہیں کھائی جاتی قسم صرف اللہ کی کھاتے ہیں۔“
 وہ فوراً بولا اللہ کی قسم انم۔ میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ میں جتنے دن اسپتال میں رہی وہ متواتر میرے پاس آتا رہا۔ انم احسان کو پتا ہے کہ اب تم کہاں ہو۔“
 ”نہیں ملکھنی میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔“

”اوہ انم۔ اس قدر بے رحمی اور بے حسی کا مظاہرہ کیا تم نے۔ جو تمہیں نہ پا کر خانم کو گلے سے دبوج لیتا ہے اور تجھے دیکھ کر بچوں کی طرح ہچکچوں میں روتا ہے، سوچو نا وہ یوں تمہیں مستقل نہ پا کر کیا کر گزرے گا۔“
 ”تم ٹھیک کہتی ہو ملکھنی مجھے انتہائی شدت سے احساس ہے، مگر صدیوں کے پیار سے کو جب پانی کا کٹورا مل جائے تو وہ دنیا و مافیہا کو بھول کر پانی پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ بس مجھے بھی ڈیڑی ملے تو میں سب کچھ بھول گئی۔“

”انم رابطہ نمبر ہے تو احسان سے بات کرو، ورنہ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے، میڈم خانم کے کوٹھے کو آگ لگا دے گا، ایسا نہ کر سکا تو خود کو مار دے گا۔ وہ انتہائی قدم اٹھانے میں درگزر نہیں کرے گا۔“ انم میری بات سن کر پریشان ہو گئی، وہ پریشانی میں بولی۔ ملکھنی ایسا تو میں نے سوچا ہی نہیں۔

”انم سچ بتاؤ۔ احسان کا کردار یا نہیں آگیا، کیا اس کی ذات بھی یاد نہیں آئی۔“
 ”سوچیں کس حد تک با اختیار ہوتی ہیں ملکھنی۔ مگر یادوں پر کسے اختیار۔ احسان مجھے ہر لمحہ یاد آتا ہے۔“

”اور پھر بھی بنگی اس سے رابطہ نہیں کیا۔“ انم نے مجھے حیران کر دیا۔
 ”سچ پوچھو تو ملکھنی، اندر کا خوف ابھی تک دور نہیں کر پائی، یہ سب کچھ خواب سا لگ رہا ہے، اس لیے چاہنے کے باوجود احسان سے رابطہ نہیں کیا۔“

”تمہارے پاس نمبر ہے؟“ میں نے پوچھا تو انم اٹھ کر بیڈ کی دراز کے پاس گئی، دراز کھول کر اس نے ایک وزیٹنگ کارڈ نکالا، یہ اس کا کارڈ ہے۔ میں نے کارڈ لے کر دیکھا، اس پر احسان کے آفس اور موبائل، دونوں نمبرز لکھے تھے۔
 ”موبائل دو انم۔“ انم نے لحظہ بھر بعد تپائی کی طرف اشارہ کیا، میں نے تپائی سے موبائل اٹھا کر احسان کا نمبر ملایا۔ ملکھنی جاری تھی، میرا دل دھڑکنے لگا، کچھ باتیں لحوں میں ذہن سوچتا ہے اور بڑی جی سوچتا ہے، میرا بھی وہی حال تھا، خیالات کہاں سے کہاں جا رہے تھے، دل دعائیں مانگ رہا کہ فون احسان ہی اٹھائے، ہیلو تھوڑی دیر بعد مردانہ آواز آئی۔
 ”مجھے احسان سے بات کرنی ہے۔“

”احسان ہی بول رہا ہوں۔ آپ کون۔“
 ”احسان میرا نام ملکھنی ہے۔“

”جی بولے۔“
 ”احسان بھائی میں انم کی سہیلی ہوں۔“ مجھے ایسا لگا جیسے دوسری طرف احسان اُچھل کر کھڑا ہو گیا ہے، اس کی بے چینی اور اضطراب بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ہیلو، انم کہاں ہے۔ پلیز میری انم سے بات کرو ایسے۔ احسان کی بے چینی عروج پر پہنچ گئی، میں اس سے چند باتیں کرنا چاہتی تھی، مگر اس کے انداز تکلم نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں موبائل انم کے حوالے کر دوں، یہ لیجئے انم سے بات کریں، میں نے کہتے ہوئے موبائل انم کی طرف بڑھایا، مگر انم نے فون لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

”لو انم بات کرو۔“ میں نے کہا تو انم کو جیسے کرنٹ لگا، وہ خیالوں میں گم تھی، ہوش کی دنیا میں آئی تو فون لے لیا اور انتہائی دھیمے لہجے میں ہیلو کہا، وہ دس منٹ تک باتیں کرتی رہی، انم کی باتوں سے مجھے بے حد حوصلہ ہوا، کیوں کہ اس نے احسان کے ساتھ انتہائی دانش مندانہ باتیں کی تھیں اور آخر میں اسے بتا دیا تھا کہ یہ نمبر میرا ہی ہے، تاہم اسے اپنے گھر کا پتا نہیں بتایا۔

”انم! تم نے پوری تفصیل تو احسان کو بتا دی، مگر گھر کا پتا نہیں بتایا۔“
 ”دانتہ نہیں بتایا ملکھنی۔ کہا نا وہ خٹلی قسم کا شخص ہے، کل ہی حاضر ہو جاتا۔“
 ”تم نہیں چاہتیں کہ وہ تم سے ملنے آئے۔“ اس بار وہ خاموش رہی۔ میں نے اس کی ٹھوڑی اوپر کرتے ہوئے کہا۔
 ”انم پیار کرتی ہو نا احسان سے.....؟“ انم نے خوب صورت آنکھوں سے مجھے دیکھا۔
 ”مجھ سے کیا پوچھتی ہو ملکھنی۔ میرا چہرہ بھی تمہارے سامنے ہے اور آنکھیں بھی، خود ہی پڑھ لو۔“
 انم! دونوں میں پیار کا ٹھانٹھا مارنا سمندر موجزن ہے۔
 ”ملکھنی! احسان نے مجھے ایک دن شعر سنایا تھا۔ سنو گی؟“
 ”ضرور انم.....“

صدیاں تیری سمیٹ کے جو لے گیا قتل
 اب تیرے پاس لوٹ کے وہ پل نہ آئے گا
 انم نے ایک بار پھر مجھے مسکان کی یاد دلادی، میرا دل یک لخت مر جھا گیا۔ انم گزری رات میں نے ایک نظم لکھی تھی۔
 ”اوہ..... بہت اچھے ملکھنی۔ سناؤ نا پلیز۔“
 مگر پہلی بار طبع آزمائی کی ہے۔ طبیعت پر گراں گزرے تو درگزر کرنا۔
 ”او کے سناؤ۔“

ڈائری میں اُتار نہ سکی اس لیے شاید کچھ الفاظ مس ہو جائیں۔
کوئی بات نہیں تم سناؤ تو سہی۔
”زندگی کیا ہے؟“

تہائی کا اک سفر
جسے تہائی طے کرتا ہے
دوست، ہم عصر اور ہم سفر، یہ سب تو اک بہانہ ہیں
ہم عصر
جو دل سہارے کے لیے ڈھونڈتا ہے

مگر
کوئی بھی ساتھ نہیں دیتا
دوست، ہم عصر اور ہم سفر سبھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں
ہاں مگر ساتھ بھائی ہے
تو تہائی.....
صرف تہائی.....

”ملکھنی! شاعری دل کی عکاس ہوتی ہے، مگر مجھے یقین ہے، اللہ کبھی تمہیں تہائی نہیں سونپے گا۔“
”نہیں یقین کی وجہ؟“

”ملکھنی! تو اللہ کی سچی اور کھری بندی ہے اور اللہ اپنے کھرے اور سچے بندوں کو تہائی نہیں چھوڑتا۔“
”تیری آخری بات تو بالکل درست ہے، مگر انم میں کیا ہوں، نہ تمہیں پتا ہے نہ مجھے۔ آگے چل کر میرے مقدر میں کیا لکھا ہے، تقدیر جانے اور تقدیر لکھنے والا۔“
”ملکھنی میری بات کا بین ثبوت تیرا ماضی ہے، دو سالوں سے اوپر ہو چکے ہیں تمہیں گھر سے غائب ہوئے، دیکھ لو ابھی تک صحیح سلامت ہو، جسمانی، روحانی اور عزت و آبرو۔ ہر لحاظ سے اللہ نے تمہاری حفاظت کی ہے، ورنہ میڈم خانم کے کوٹھے سے کسی بے بس لڑکی کا عزت و آبرو کے ساتھ نکل آنا کسی معجزے سے کم نہیں، وہاں سے نکلی تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں خداؤں جیسی عزت و توقیر دی، وہاں سے بھاگی ہو تو ڈیڈی جیسے شخص کے پاس پناہ گزین ہو، جو تمہارے احسان کے نیچے سرتاپاؤں دبے ہوئے ہیں، میری بھی یہی حالت ہے، اس لیے ملکھنی۔ آگے بھی تیری حفاظت خود سوہنڑاں رب کرے گا۔“

میں وہاں 7 ماہ دس دن قیام پذیر رہی، حالات سازگار ہونے تک میں نے دل پر صبر و ضبط کے پتھر باندھے رکھے، اس دوران دوبار امن نے ملنے کی کوشش کی مگر میں نے ملنے سے انکار کر دیا، ازاں بعد پتا چلا امن کسی ضروری کام کے لیے سعودی عرب چلا گیا ہے، میں نے سکھ کا سانس لیا، امن جب ملنے کا تقاضا کرتا تھا تو مجھے ملنے نہ ملنے کا بھنور گھیر لیتا تھا، میں اپنے آپ سے حالت جنگ میں چلی جاتی تھی، اس لیے امن کے بیرون ملک جانے کی خبر نے مجھے دکھ کے ساتھ خوشی بھی دی تھی، دو ماہ دس دن کے بعد میں نے انکل سے اپنے گھر جانے کو کہا تو وہ بلا تامل راضی ہو گئے، آئی نئی نے کہا۔

”ملکھنی! ہم سب تمہیں چھوڑنے تمہارے گاؤں جائیں گے۔“ انم نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور انکل انہیں ساتھ لے جانے پر راضی تھے، مگر میں راضی نہیں تھی، میں صرف انکل کے ساتھ جانا چاہتی تھی، مہر داد نگر کے حالات کیسے ہیں۔ میں مکمل طور سے لاعلم تھی، اس لیے میں تمام گھر والوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی، خصوصاً آئی نئی اور انم دونوں عورتیں تھیں، ورنہ میں نے انکل سے کہا۔ ہمارا سفر طویل ہے، اس لیے آپ کوئی دوست ساتھ لیتا چاہیں تو میں منع نہیں کروں گی، مگر انکل نے کہا۔

”ملکھنی! عظمیٰ اور اس کی ممی ساتھ ہوتی تو اور بات ہے، اگر تم ان کے ساتھ جانے پر رضامند نہیں ہو تو میں

اکیلا ہی جاؤں گا۔“

”انکل! آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں ایسا کیوں چاہتی ہوں۔“ میں نے کہتے ہوئے انم کو دیکھا اور بات جاری رکھی بلکہ انم تو بہت بہتر جان سکتی ہے۔

”ہاں ملکھنی۔ تمہاری مجبوری سمجھ کر ہی تو خاموش ہو گئی ہوں، ورنہ تمہیں تمہارے گھر میں داخل کر کے میں لوٹی۔“
ہم نے شام کو نکلنے کا پروگرام بنایا، تاکہ صبح تک مہر داد نگر پہنچ جاسکیں، وقت رخصت اس گھر میں آنسوؤں کا سیلاب اُٹھ آیا تھا، انم کی ہچکیاں بند ہی نہیں ہوتی تھیں، اس نے مجھے تین بار ہاتھوں سے نکالا اور پھر بھر لیا، آخر اسے ڈیڈی نے پکڑ کر مجھے کہا۔ میرے آنسو بھی رکتے نہ تھے، میں نے انکل کو اشارہ کیا کہ انم کو یہاں سے لے جائیں، اس کے بعد آئی نئی مجھ سے لپٹ گئیں، میری پیشانی چومی، گالوں کو بوسہ دیا، آنسو بہاتی ہوئی بولیں۔

”ملکھنی! یہ ایک طویل عرصہ تک اولاد کی نعمت سے محروم رہے، اللہ تعالیٰ مہربان ہوا تو اس نے دو اکٹھی بیٹیاں عطا کر دیں، جی نہیں چاہتا کہ میں پھر سے ایک بیٹی کے جگر میں تڑپوں، مگر کیا کیا جائے قانون قدرت ہے بیٹی کو ایک دن گھر چھوڑ کر جانا ہی ہوتا ہے۔“

”ملکھنی ایک وعدہ کرو مجھ سے۔“ آئی نئی کی محبت کے مہانے کچھ کہنا محال ہو رہا تھا۔ میں نے نم پلکوں سے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

”ملکھنی! اپنی شادی پر مجھے ضرور بلانا، میں اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے ڈولی میں بٹھانا چاہتی ہوں، میں بے اختیار پھر ان سے لپٹ گئی، جس طرح پہلے دن انم نے مجھے چوما تھا، اسی طرح میں نے گھر سے نکلنے وقت آئی اور انم کو چوما۔

رات بھر ہم نے سفر کیا، یہ سفر بھی عجیب و غریب تھا، غم و خوشی کا امتزاج، خوف و ہراس کی کیفیت اور امید کی کرنیں، انکل تمام راستے میرا دل بہلاتے رہے۔ ان کی تسلیوں کے طفیل سفر بہت اچھا کٹ گیا، صبح آٹھ بجے کے قریب راولپنڈی کا بورڈ نظر آیا تو میری کیفیت مزید بدل گئی۔ راولپنڈی ساٹھ کلومیٹر پر گیا تھا۔ یہاں سے مہر داد نگر کا سفر دو گھنٹوں کا تھا، میں دل ہی دل میں آنے والے حالات کے بارے میں سوچ رہی تھی، دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز ہونے لگی تھیں، گیارہ بجے کے قریب میرا دنگر کے آثار نظر آنے لگے۔ مہر داد نگر کی ابتدا میں نے گاڑی رکوا دی، تھوڑا سا آگے سائنول اور چاچا بکرا کے کھیت ہیں، کھیتوں کے سامنے کچا راستہ جاتا ہے، جو آگے جا کر پختہ سڑک سے مل جاتا ہے، اس سڑک کے کنارے مولوی بابا کی زیارت ہے، وہی مولوی بابا جس کی زیارت کے عقب میں سائنول اور سکھاں ملا کرتے تھے، زیارت سے تھوڑا آگے مہر داد نگر کے واحد ڈاکٹر عظیم کا کلینک ہے۔ کلینک کے ساتھ چڑگا گا کی برآمدے والی دکان ہے، اس سے بچپن میں ہم ٹافیاں، دل شکر اور دال سویاں لیتی تھی، دکان بند ہو تو برآمدے میں سہیلیاں اکٹھی ہو کر پتوں (اک قسم کا کھیل) کھیلا کرتی تھیں۔

”ملکھنی!.....“ انکل کی آواز نے مجھے گاڑی میں واپس کھینچ لیا، ”کیا بات ہے بیٹی؟ گاڑی کیوں رکوا دی۔“

”انکل! ہمارا ساتھ یہیں تک تھا۔ میں معذرت خواہ ہوں، آپ کو گھر لے جا کر کسی پانی نہیں کروا سکتی۔“

”ملکھنی بیٹی! کسی پانی کا کوئی شکوہ نہیں، مگر بیٹی تمہیں گھر تک تو پہنچاؤں۔“

”انکل! میں دو سالوں کے بعد مہر داد نگر لوٹ رہی ہوں، اتنے عرصے کے بعد یوں نئی ٹوبلی گاڑی سے اتروں گی تو دیکھنے والے ہزار ہا باتیں بنائیں گے، اب بھی نجانے کیا کچھ سوچا ہوگا، مگر جیم اللہ ترکھاں کی بیٹی نے ماڈل کی کروا کر میں بیٹھ کر گھر لوٹے تو.....“

میں سمجھ گیا بیٹی۔

کاش انکل میں آپ کو اپنے گھر لے جاتی، کچھ دن آپ کی خدمت کرتی۔ میرے ابا کی کمی دور ہو جاتی، میرے لہجے کی ادا سی بڑھ گئی، جسے محسوس کر کے انکل شفقت سے بولے۔

”مجھے تم سے کوئی گدہ نہیں ملکھنی۔“ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا، ہمیشہ سکمی رہو۔ انکل نے کہتے ہوئے ڈیش بورڈ

میں سے ایک لفافہ نکالا۔ ”مکھنی بیٹی! یہ رکھ لو، مگر اسے گھر جا کر کھولنا۔“
 میں نے خاکی رنگ کے لفافے کو دیکھا، پھر انکل کو دیکھ کر پوچھا۔ ”اس میں کیا ہے انکل؟“
 ”پلیز مکھنی! کوئی سوال موت پوچھو جب باپ اپنی بیٹی کو گھر سے رخصت کرتا ہے، تو اسے ڈیر سارا جینز دیتا ہے،
 سونا چاندی اور مال و اسباب دیتا ہے، لیکن مکھنی بیٹی! میں تمہیں صرف دعائیں دے رہا ہوں۔“
 ”میرے لیے آپ کی دعاؤں سے بڑھ کر کچھ نہیں انکل۔ نہ سونا چاندی نہ مال و اسباب۔“
 ”نہ رکھ لو بیٹی۔“
 ”انکل اگر آپ بتا دیجئے تو.....“

اگر بتا دوں تو باپ اور بیٹی والے رشتے سے محروم ہو جاؤں گا، کیوں کہ باپ بیٹی کو کچھ دے تو بتا کر نہیں دیتا۔ میں نے
 لفافہ لے کر اپنا سر انکل کے سینے سے ٹکا دیا، وہ میرے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگتے، مجھے میرا ابا بہت یاد آیا، میں جتنی
 دیر انکل سے لپٹ کر روتی رہی ابا میری نگاہوں میں رہے، میں نے لفافہ دوپٹے سے باندھا اور گاڑی سے اتر آئی، سامنے
 سانول کے کھیت تھے، جی چاہا اس طرف نکل جاؤں، اسے آواز دوں، ماضی کی طرح وہ ہاتھ کا چھبانا کر دیکھے، پہچان لینے
 پر بھاگ کر آئے، میرے لیے بنے پر چادر بچھائے اور میں سکھاں کا پوچھوں۔ ماں اور بھائیوں کا پوچھوں۔ پھوپھو اور رانی
 بھابھی کے بارے میں سوال کروں، اور وہ جواب دے، مکھنی پینٹر (بہن) سارے ہیڈے انتظار بوجھ اکھاں بچھائے بیٹھے
 ہیں، میں سانول کے کھیت کر اس کرچکی، سامنے کچا راستہ تھا، انہی راستوں پر چل کر میں بڑی ہوئی تھی۔

جس لڑکی نے سالہا سال والدین اور بہن بھائیوں کی جدائی کا زہر حلق سے اتارا ہو، فطرتاً جب وہ گھر لوٹے تو اس کی
 چال میں غیر معمولی تیزی اور پھرتی ہوتی ہے، وہ اُڑ کر گھر والوں کے سامنے پہنچ جانے کی تمنا میں چلتی ہے، مگر میرے قدم
 دھبے تھے۔ رفتار سست تھی، نجانے کیوں میرا دل ڈر اور خوف سے کانپ رہا تھا۔ یہ ڈر کس بات کا ہے میں سمجھنے سے قاصر
 ہوں، گاؤں والے پہچان نہ لیں، میں نے دانستہ دوپٹے سے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا، کیوں کہ میرے اچھے قسم کے کپڑے
 توجہ کا باعث بن رہے تھے، بہت سوں نے بغور دیکھا اور کچھ نے مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے پہچاننے کی کوشش کی۔

پروین آبا، امتیاز خالہ اور گاؤں کی چند دوسری عورتیں بھی سامنے سے آئیں، مگر میں کئی کترائے گزر گئی، گاؤں کے
 لوگ اور گاؤں کی فضا سب کچھ جوں کا توں تھا، بس بدلی تھی تو میری اندر کی دنیا۔ میں سوچوں میں محو گھر کے قریب پہنچ گئی،
 پیلا گھر راشدہ خالہ کا تھا، اس سے آگے ہمارے پڑوسی سعیدہ ماسی کا کچا گھر ہے اور اس کے ساتھ جڑا ہوا رحیم اللہ ترکھان کا
 مکان ہے، میں اپنے گھر کے دروازے پر پہنچی تو میرا دل اچھل کر حلق میں آڑکا۔ دروازے پر بڑا سالا لگا ہوا تھا، میں بے
 دھبائی میں تالے کو دیکھنے لگی۔ میرا ذہن زمین اور آسمان کے بیچ کہیں خلا میں اٹک گیا، سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود
 ہو گئیں، میں بہت دیر کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہیں رکی رہی۔ خیالات اور کچھ سمجھنے کی تمام حسیں یک دم غائب ہو گئی تھیں، نجانے
 سب کہاں گئے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ تمام گھر والے تالا لگا کر کہیں گئے ہوں، کوئی ایک فرد گھر میں ضرور رہتا ہے، میں
 پریشان نظروں سے گھر کی درو دیوار کو دیکھ رہی تھی۔

”اے بیٹی کون ہے تو.....؟“ معاقب سے ایک آواز نے مجھے چونکا دیا، یہ آواز سعیدہ ماسی کے شوہر فردوس کی تھی، میں
 نے پتہ لگے کہا۔ ”چاچا شہر سے آئی ہوں، سکھاں سے ملتا ہے۔“ سکھاں کا نام لیتے ہوئے میرے حلق میں گولا سا اٹک گیا۔
 ”سکھاں سے.....“ فردوس چاچا نے دھیرے سے دہرایا۔ اس کی بڑبڑاہٹ میں مجھے ایک نئی کہانی چھپی ہوئی
 محسوس ہوئی، میرے دل میں سیاہ دھواں بھرنے لگا، نہ معلوم کون سی نئی بات سننے کو ملے۔
 ”بیٹی چل تو میرے گھر چل۔ پاس ہی میرا گھر ہے۔“

”نہیں چاچا۔ مجھے واپسی بھی جانا ہے، آپ کو پتا ہے، سکھاں اور اس کے گھر والے کہاں گئے ہیں؟“ میرے
 سوال پر خاموشی چھا گئی۔

میں بھی شاید فردوس چاچا چلا گیا ہے، پلٹ کر دیکھا تو وہ کھڑا ہوا تھا، میں نے چہرے سے گھونگھٹ ہٹایا نہیں اس لیے

وہ مجھے پہچان نہیں پایا، میں نے سوال دہرایا تو وہ بولا۔

”کیا بتاؤں بیٹی! بڑے اچھے اور شریف لوگ تھے، اللہ بخشے رحیم اللہ ہاں کوں (بھائی کو) بڑا غیرت مند اور شریف
 انسان تھا، اُس دی موت دے بعد دو چارے لٹے گئے۔“ فردوس چاچا کی بات سن کر میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ مجھے
 لگ رہا تھا جیسے دماغ اور دل اکٹھے ہو گئے ہیں، پتا نہیں کون سی انہونی بات سننے والی ہوں۔

رحیم اللہ دی دمی مکھنی..... کچھ دیر کی پھر خاموشی اور پھر چاچا کی دھمی آواز۔ شاید وہ احتیاط سے بولنے لگا تھا۔
 ”مکھنی دمی کوں ناں چو ہدرویوں نے اٹھالیا، رحیم اللہ کا چھوٹا پڑوی باپ کی طرح غیرت مند تھا، چو ہدرویوں اس
 کے گھر گھس کر جان توں مار ڈالا۔ آپ پنڈی جیل لڑ گیا اور گھر والاں نوں رب جانے جاوے راتوں رات کتھے بھیج دیا۔“

شاید چاچا نے اس سے آگے بھی کچھ کہا تھا۔ مگر میرے دماغ میں مکے برسنے لگے تھے۔ دل کو زور زور جھٹکنے لگنے لگے،
 میرے اندر کی ساری چولیس لرزہ بر اندام ہو گئیں، میری ٹانگیں کا پینے لگیں، میں نے دیوار کا سپارالے کر بمشکل خود کو گرنے
 سے بچایا، مظہر بھائی نے چو ہدروی را حیل کوئل کر دیا۔ اوہ میرے خدا..... میرے دل میں آہ گوئی اور پورے جسم کو تیز دھار
 خنجر کی طرح کاٹ گئی۔ امی، پھوپھو، بھائی اظہر، رانی بھابی سب کہاں چلے گئے۔

ارے بیٹی رکو۔ کسی پانی کر کے جا۔ یہ آواز مجھے کافی دور سے سنائی دے رہی تھی، دیکھا تو پتا چلا میں چاچا فردوس سے
 کافی دور نکل آئی تھی، میں نے وہ قدم کیسے اٹھائے پتا ہی نہیں چلا۔ میں رکی نہیں پھر سے چل پڑی، اتجان راستوں اور ان
 دیکھی منزل کی جانب..... میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے، ایک جگہ ٹھوکر لگی تو میں بری طرح زمین پر گر پڑی، یہ زمین فصل
 کے لیے ہموار کی گئی تھی، کپڑے مٹی سے مٹی ہو گئے۔ میں نے ہمت کی اور کھڑی ہو گئی، مجھے چلنا تھا، یوں گرتی رہی تو طویل
 خارزار سفر کیسے کئے گا، میں اٹھ کر پھر سے چل پڑی، مگر قدم منوں بھاری ہو رہے تھے، بڑی مشقت اور تکلیف کے بعد
 مولوی بابا کی زیارت تک پہنچ پائی۔ میں زیارت میں داخل ہو گئی، وہاں پہلے سے تین عورتیں اور دو بوڑھے مرد بیٹھے ہوئے
 تھے، وہاں پہنچتے ہی میں دیوار کی جڑ میں ڈھیر ہو گئی..... میں نے گھٹنوں میں سر دالیا، کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی،
 ایک بوڑھا شخص قبر کے قریب بیٹھ کر بلند آواز میں سیف الملوک پڑھنے لگا۔

باپ مرے سردوں سایہ اٹھدا،
 ماواں بانج محمد بخشا تے کون کرے رکھوالی
 بھائی بھائیاں دے درد ونداوندے
 تے بھائی بھائیاں دی آں باواں
 باپ سراں دے تانج محمد، ماواں ٹھنڈیاں چھاواں

آواز کا سوز اور کلام کی گہرائی میرے اندر دھنستی چلی گئی، آخری مصرعے نے جیسے اندر تک زخمی کر دیا۔
 باپ سراں دے تانج محمد..... ماواں ٹھنڈیاں چھاواں..... میرے سر سے تاج پہلے ہی چھن چکا تھا، اب ٹھنڈی
 چھاؤں کا بھی کچھ پتا نہیں کس دھوپ میں ڈھل چکی ہے، میرے دل میں اٹھنے والی درد کی ہوک بلند ہونے لگی، میں بلک
 بلک کر رونے لگی، ادھر آواز کا سوز بڑھتا جا رہا تھا۔

اوپچی آں لمبیاں ٹالیاں تے کنڈی آں جھٹاں دی چھاواں
 ہر اک چیز بازاروں لہدی برنیں بلائیاں نے ماواں

اس بار ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے، میرے حلق سے گریٹاک جھپٹیں بلند ہونے لگی، چیخوں میں اس قدر درد اور
 اذیت تھی کہ سیف الملوک پڑھنے والا شخص بھی کانپ کر اٹھ گیا، عورتیں بھاگ کر میرے پاس چلی آئیں، میں گال پیٹتے
 ہوئے رو رہی تھی، میرا دل چاہ رہا ہے اپنے سارے بال بوجھ لوں، سینے میں ہاتھ ڈال کر دل مسمی میں دیو بوجھ لوں، بہت ترپے
 تو مولوی بابا کی زیارت کی چھوٹی دیوار پر دے ماروں۔ میں دل کا درد برداشت نہیں کر سکتی، عورتوں نے آ کر مجھے سنبھالا۔
 رابہ کڑی کوٹو ہے زیتون۔ (یہ لڑکی کون ہے زیتون) ایک آواز کانوں سے ٹکرائی، آنسوؤں کی برسات میں ان کے

چہرے دکھائی نہیں دیے۔

پتا نہیں کوئی پروں گلدی ہے، دوسری آواز آئی، اور بہت دھمکی دی ہے بچاری، یہ تیسری آواز تھی، میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھنے کے قابل ہوئی، عورتیں میرے پاس بیٹھی تھیں اور مردوں پریشان حال کھڑے تھے، ان میں سے کوئی بھی چہرہ میرا سا نہیں تھا، وہ مہر دادگر کے نہیں تھے، شاید کسی دوسرے گاؤں سے زیارت کے لیے آئے تھے۔
”بیٹی کوڑے تو؟ اور کیا پریشانی ہے؟“ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں، ایک عورت نے میرا چہرہ اوپر اٹھا کر دیکھا۔ ”ارے کریم!..... تیرے تو مہر دادگر میں رشتہ داریاں ہیں، تو بھی نہیں پہچانتی اسے۔“
”نہیں بہن میں نے اسے نہیں دیکھا۔“ دوپٹے سے میرے آنسو پونچھے جانے لگے، میں کھڑی ہو گئی، عورتیں دو قدم پیچھے ہٹیں، انہیں تو قہقہے کی طرح کچھ بتاؤں گی، مگر میں نے خاموشی سے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔
”عجیب گوی ہے۔“ پیچھے سے آواز سنائی دی، ساتھ ہی مردانہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

اوسے پیڑ کریم!۔ راہیہ مولی بابا کی زیارت ہے۔ اتھے جیڑا دی آوند عجیب ہی آوندالے۔ چل آ..... سیف الملوک سوز، میں چلتی جا رہی تھی، مولوی بابا کی زیارت سے پُرسوز آواز پھر سے بلند ہونے لگی، میں یہ آواز نہیں سنتا چاہتی۔ یہ پُرسوز آواز اور دل کو چیرنے والا کلام میرے کانوں کے پردے پھاڑ دے گا، اگر میں نے مزید کچھ سنا تو دل پھٹ جائے گا، میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بھاگنے لگی۔

میں بدحواسی میں واپس گاؤں کی طرف بھاگ پڑی تھی، سانول کے کھیتوں کے قریب ٹھوکر کھا کر گر پڑی، سانول اس وقت درخت کے سائے میں بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا، مجھے گریبا ہوا دیکھ کر وہ میرے طرف بھاگ پڑا، میں خود کو پردے میں نہ چھپا سکی، میرے قریب پہنچ کر سانول کو زمین نے پکڑ لیا، اگر حیرت سے موت ہوئی تو شاید وہ مرجاتا، منکھنی پیڑ..... حیرت سے آواز اس کے حلق میں دب گئی۔ میرے حلق میں پیاس سے کانٹے اگنے لگے تھے، سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی، سانول مجھے اٹھانے کے لیے آگے بڑھا مگر پھر رک گیا۔

پانی..... پانی..... میرے خشک ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست تھے، میں بمشکل پانی مانگ سکی، سانول اٹھ قدموں سے واپس بھاگا، میں نے غلہ حال ہو کر سر زمین پر رکھ کر آنکھیں بند کر لی۔

یہ لو منکھنی..... پیڑ..... پانی..... سانول کی بوکھلائی ہوئی آواز سن کر میں نے پوری طاقت سے بھاری پلکیں پھر اٹھائیں، سانول میرے سامنے پانی کا کٹورا لیے بیٹھا ہوا تھا، لرزتے ہاتھوں سے پانی کا کٹورا لے کر میں نے ہونٹوں سے لگالیا، میں نے غناٹ پانی پیا تو جان میں جان آئی، پانی پینے کے بعد حواس کچھ بحال ہوئے اور کھڑی ہو کر سانول کی طرف دیکھا، وہ عجیب حالت سے دوچار تھا، کچھ کہنے کے لیے لب کھولا مگر بنا کچھ کہے بند کر لیتا۔

میں نے کہا۔ سانول بھراں (بھائی) مجھے اپنے گھر لے جاؤ، میری بات سن کر وہ تیز تیز سر ہلانے لگا۔
ہاں ہاں منکھنی پیڑ (بہن) چلو۔

مجھے دیکھ کر جس قدر سانول حیران ہوا تھا، اس کے گھروالے اس سے بڑھ کر حیران و پریشان ہوئے، ماں جی کے چہرے پر حیرت و پریشانی کے آثار نقش ہو کر رہ گئے، سانول کی ہمیں الگ سے ششدر تھیں، مگر ان کے والہانہ پن میں کوئی کمی نہیں تھی، ماں جی نے مجھے سینے سے بھینچ لیا، میری نگاہوں میں امی کا چہرہ گھوم گیا، امی کا خیال آتے ہی میں خود پر ضبط نہ کر سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میر کر دھیمے مبر..... ماں جی شفقت سے میری پیٹھ سہلا رہی تھی، سونہراں رب بندے ٹوں ہر طرح نے امتحان لیتا اے، ماں جی مجھے کافی دیر تسلی بخشی دیتی رہی۔ میں سستی رہی اور روئی رہی۔ ریشم نے آگے بڑھ کر مجھے ماں جی سے علیحدہ کیا، ریشم کے ساتھ ہی زیتون کھڑی تھی..... سانول کی کیفیت نا حال ناقابل بیان تھی، میں نے قیاس لگایا، مجھے دیکھ کر اس کے سوتے ہوئے زخم پھر سے جاگ اٹھے ہیں، اس کے چہرے پر جذبات کی سرخی دوڑ رہی تھی، ماں جی مجھے چار پائی کی طرف لے جاتے ہوئے بولی۔ آ منکھنی ادھر بیٹھ۔

ریشم! منکھنی پیڑ واسطے کچھ کھانے کے لیے لا..... سانول کے کہنے پر ریشم ایک طرف چلی گئی، کھانے کا سن کر میرے چڑیاں بچے ہونٹوں پر پیاس کی شدت نے اضافہ کر دیا، میں نے زیتون سے پانی مانگا۔ وہ جھٹ سے پانی کا کٹورا لے آئی، منکھنی پانی نے میرے اندر کی کال زدہ کیفیت کو رفع کیا اور فرحت بخشی، میں نے ماں جی سے پوچھا۔
میرے گھروالے کہاں ہیں ماں جی.....؟ ہمارے گھر کو تالا لگا ہوا ہے۔ سوال پوچھتے ہوئے میری اندرونی کیفیت کا حشر نشر جاری تھا، ماں جی نے منکھنی آہ بھری۔ یہ آہ سیدھا میرے دل پر تیز دھار خنجر کی طرح پڑی۔ میرا دل زخمی ہو کر دکھنے لگا، اندر کی تاریکی بڑھی، ماں جی نے دکھ بھرے لہجے میں بتایا۔

اک تیرے نہیں منکھنی مہر دادگر کے کئی گھراں لوں (گھروں کو) تالے لگ گئے۔
ماں جی کا جواب خلاف توقع تھا، وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

انج لگتا ہے منکھنی تیرے جانے کے بعد مہر دادگر تے کسی ویسب داسا یہ پڑ گیا ہے، ماں جی کے لہجے میں ایسا کرب تھا کہ میں تڑپ اٹھی۔

میں کچھ بھی نہیں ماں جی، مہر دادگر پر ویسب کا سایہ۔
ہاں منکھنی پیڑ! ماں جی سے پہلے سانول بول اٹھا، مہر دادگر کا ہر مرد دن کو محنت مزدوری کرتا ہے اور

رات کو گھر کا پہرہ دیتا ہے۔
آپ لوگوں کی باتیں مجھے الجھا رہی ہیں، سانول بھراں خدا کے لیے مجھے تفصیل بتائیں۔

منکھنی! تمہیں چوہدری راجیل نے اغوا کیا تھا، یہ واردات چاچا کبیر کے پُتر رضوان نے دیکھ لی تھی، وہ سیدھا بھاگ بھاگ تمہارے گھر پہنچا، مظہر بھراں کو پتا چلا تو اس نے کلہاڑی اٹھالی، تیرے بڑوسی بتاتے ہیں، امی نے مظہر بھراں کے پاؤں پکڑ لیے تھے، مگر وہ غصے میں ہوش و حواس گنوا بیٹھا تھا، مظہر بھراں حویلی گیا مگر وہاں چوہدری راجیل نہ ملا۔ اس کے پیور دیکھ کر چوہدریوں کے بندوں نے اسے پکڑنا چاہا لیکن اظہر بجلی اور طوفان بنا ہوا تھا، وہ تین چار آدمیوں کو ماری طرح زخمی کر کے چوہدری راجیل کے سر پر پہنچ گیا۔

لختل بھر سانول نے توقف کیا تو میں بے چین ہو کر بولی۔ پھر کیا ہوا سانول۔
پھر منکھنی مہر دادگر کے باسیوں نے ترکھان کے بیٹے کے آگے چوہدری کے بیٹے کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ مظہر بھراں

چوہدری راجیل پر کلہاڑی کے کئی وار کر چکا تھا، چوہدری راجیل خون میں لت پت جان بخشی کے لیے مہر دادگر کی گلیوں ادھر سے ادھر بھاگ رہا تھا، مہر دادگر کے غریب لوگ جنہوں نے بھی چوہدریوں کے سامنے لب کشائی کی جرات نہ کی، وہ گھر کے دروازوں سے جھانک کر یہ تماشا عبرت دیکھنے لگے تھے، مردوں کے ہجوم میں سے کسی کی ہمت نہ تھی کہ مظہر کا ہاتھ روک سکے۔ مظہر بھراں اک ہی گل پوچھ رہا تھا۔

بتا منکھنی کہاں ہے؟ بتا چوہدری ورنہ اللہ کی قسم تیری بوٹی بوٹی کر دوں گا۔
چوہدری راجیل کو انے زخم لگ چکے تھے، کہ وہ بات کرنے کے لیے ہونٹ کھولا مگر کج (کچھ) کہہ نہ پاتا۔

آخر وہ زخموں کی تاب نہ لا کر گندھے (گندے) تالے میں گر پڑا، مظہر بھراں نے اس پر تھوکا اور فارم ہاؤس کی طرف واپس بھاگا، مگر منکھنی ٹوکھیں نہ ملی، سانول خاموش ہو گیا۔ میرا جسم ہولے ہولے کاہنے لگا۔ میرے دائیں طرف

ماں جی بیٹھی ہوئی تھی اور بائیں طرف زیتون، ماں جی نے میرے شانول پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
منکھنی! اس کے بعد مہر دادگر نے بہت ظلم سہے ہیں۔

مجھ میں سکت نہیں تھی کہ مزید کچھ سنا جائے، آنسوؤں کی برسات جاری تھی اور جسم کا ارتعاش قہم نہیں رہا تھا۔
بس کر ماں! منکھنی پیڑ بھوکی ہے، ریشم کھانا لے آئی ہے، سانول کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ساتھ ہی ریشم

بولی۔ آ منکھنی! کھانا کھا میری پیڑ (بہن)۔
میری بھوک مر گئی ہے ریشم۔ میں نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے، ٹمکین پانی نے جس منظر کو دھندلا کیا ہوا تھا، وہ

آنسو پونچھے سے صاف ہو گیا، سامنے چار پائی کے وسط میں کھانا رکھا ہوا تھا، اٹھ میری دمی تھوڑا سا کھالے، پانچ نہیں کدھر سے آئی ہو، اور کب کی نگلی ہو، ماں جی نے اٹھتے ہوئے مجھے بازو سے کھینچا۔
تھوڑا سا کھالے مٹھنی۔ ریشم کی التجائیہ نظروں نے مجھے پکھلا دیا۔ ان لوگوں میں خلوص اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی، ان کے خلوص نے مجھے ان حالات میں بھی دو چار لمحوں کے لئے کھانے پر مجبور کر دیا۔
یہاں سے مجھے جو کرب انگیز تفصیلات بتائی گئیں، اس نے میرے روئے کھڑے کر دیے۔

چوہدری اللہ رکھا کے بعد چوہدری راجیل بھی منوں مٹی کے نیچے دفن ہو گئے، انہیں اونچی پگڑیاں اور بے تحاشا زمین و جائیداد بھی موت سے نہ بچا سکی، دوسرے دن چوہدری راجیل کی تدفین کے بعد چوہدری نثار رنجی سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا ہمارے گھر پر چڑھوڑا تھا، مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ مظہر بھائی راتوں رات گھر والوں کو لے کر کہیں نکل گیا تھا، ان کی تلاش ہنوز جاری تھی، اس کے بعد مہر داد و مگر ظلم و انگریز بن گیا۔ چوہدری نثار جو باپ اللہ رکھا سے زیادہ سفاک اور ظالم مشہور تھا۔ وہ بھائی اور باپ کی اموات کا بدلہ پورے مہر داد و مگر سے لیتے لگا۔ اس کے انتقام کا اصل بیج رحیم اللہ تر کھان کا گھر تھا، رحیم اللہ کے گھر میں سے مٹھنی نے چونکہ اس آگ کو بھڑکانے کی بنیاد رکھی تھی۔ اس لیے مہر داد و مگر والے ہمارے گھر اور خصوصاً میرے خلاف تھے۔ وہ میرے نام سے بھی نفرت کرنے لگے تھے۔ پچھلے چھ ماہ سے مہر داد و مگر والوں پر چوہدری اللہ رکھا کے پھلے بیٹے چوہدری مشتاق کی حکمرانی ہے۔

چوہدری نثار چھ ماہ پہلے اچانک کہیں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں دو قیاس آرائیاں تھیں، ایک اسے سیاسی حریفوں نے اغوا کر لیا ہے، آئندہ الیکشن کا دور ہے اور چوہدری مشتاق ضلع بھر کی بااثر شخصیات میں شمار کیا جاتا ہے، دوسری اسے اظہر نے اغوا کر لیا ہے۔ دوسری قیاس آرائی نے لوگوں میں اس نفرت کو مزید ہوا دی جو وہ رحیم اللہ تر کھان کے گھر والوں سے کرتے تھے۔ مہر داد و مگر کی نفرت بھری فضا میں سانول اور اس کے گھر والوں کی محبت دیکھ کر میں دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہی تھی۔

چوہدری مشتاق اپنے تمام تر اثر و رسوخ کے باوجود ابھی تک بھائی چوہدری نثار کو بازیاب نہیں کر دیا تھا، میں نے ریشم سے چوہدری مشتاق کے بارے میں پوچھا کہ اس نے باپ اور بھائیوں کے انجام سے کچھ عبرت لی، مجھے اندازہ تھا کہ وہ پورا نہیں تو آدھا رحم دل ضرور بن گیا ہوگا، ریشم کا جواب سن کر میں نے تاسف سے سوچا۔ ظلم و ستم چوہدریوں کی مٹھی میں شامل رہتا ہے، وہ بھی خاندانی روایات کو برقرار رکھے ہوئے تھا، بلکہ ان سے دو چار ہاتھ آگے لگا، نقص و سرور کی محفلیں سجانا تو اس کا معمول تھا۔ چوہدری مشتاق نے باپ اور بھائی سے زیادہ سنگین فطرت پائی تھی، اس کی ہوس پرست فطرت نے مہر داد و مگر کے لوگوں سے محفلی چار بھی نہیں، نو بیا ہتا دہن ہو، کنواری کہ ہو سہا کن، کوئی بھی چوہدری کی ہوس پرستی سے محفوظ نہیں گئی۔ ریشم نے سرد آہ بھر کر کہا۔

”سچ پوچھو تو مٹھنی ہمارے ابا اور بھائیوں کی نیندیں بھی حرام ہو گئی ہیں، مگر کا کوئی مرد رات میں نہیں سوتا میں اور زیتون گھر میں قید ہو کر رہ گئی ہیں، بلکہ مہر داد و مگر کی ساری عورتیں خوف کے سائے میں زندگی گزار رہی ہیں، دن ہو کہ رات مہر داد و مگر میں ہو کا عالم رہتا ہے۔“

ریشم کی بات سن کر میرے اندر نفرت اور غصے کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں، میں نے انتہائی غصے میں کہا۔
ریشم! پورے مہر داد و مگر میں صرف مظہر بھائی ہی مرد تھا، جس نے چوہدری راجیل کو گلیوں میں کتنے کی طرح بھگایا اور اس کی لاش کو گندے نالے میں بہا دیا، چوہدری مشتاق بھی ایک گولی کی مار ہے، کوئی ایک مرد کا بچہ اٹھے اور اس کے سینے میں داغ دے، میری باتیں سن کر ریشم خاموش ہو گئی۔

سانول کا ابا چھوٹے بیٹے بہادر علی کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تو مجھے دیکھ کر اسے زبردست شاک لگا، میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ السلام علیکم چاچا..... میرے سلام کا کوئی جواب نہیں آیا۔ مجھے اندازہ لگانے میں چنداں دیر نہیں لگی کہ گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی مجھ سے نفرت کرتا ہے، اس کے چہرے کے تاثرات مجھے ساری کہانی سنائے،

بیوی کو ایک طرف لے جاتے ہوئے بولا۔
”یہ..... مٹھنی ہے نا..... رحیم اللہ تر کھان کی دمی۔“

”ہاں ہاں مٹھنی ہی ہے۔“

”یہ ادھر کیوں آئی ہے؟ اسے بولو فوراً یہاں سے چلی جائے۔“

”کلمے یا بچاری دکھا دی ماری اے۔ گھر والے اس کے ہیں نہیں، کدھر جائے گی۔“

”ساڈی بلاؤں..... جہاں مرضی ہے چلی جائے، چوہدری کو پتا چل گیا نا..... تو اس کے ساتھ ساتھ ہماری بھی خیر نہیں، سانول کے ابا، ہم بھی دمیوں والے ہیں، بچاری کو کیسے بولیں گھر سے نکل جا..... نہ بابا نہ۔“
”ٹھیک ہے تو نہیں بول سکتی تو میں بول دیتا ہوں۔“

وہ اتنے سادہ لوح لوگ تھے، ساری باتیں ہم سے ذرا ہٹ کے بول رہے تھے، میں با آسانی سب کچھ سن رہی تھی، میرے ساتھ ریشم کھڑی ہوئی تھی، اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

”مٹھنی! کہیں مت جانا۔“ وہ دیر سے بولی۔ ”ابا کی باتوں پر دھیان مت دے، چل ہمارے کمرے میں۔“
”نہیں ریشم، مہر داد و مگر کے بارے میں اتنا کچھ جان لینے کے بعد میرا یہاں رکنا محال ہے، قصور تو ہمارے ابا کا نہیں، وہ حق بجانب ہے، میں جب تک یہاں رہی تم لوگوں کے سروں پر تلوار لٹکتی رہے گی، شام کا اندھیرا پھیل رہا ہے، میرے لیے جاؤ ہی بہتر ہوگا۔“

”مٹھنی! آگے خالی رات ہے میری پیٹری، ٹوا کی لڑکی رات کے اندھیرے میں کہاں بھٹکتی پھرے گی۔“
”میں آج رات اپنے گھر میں گزاروں گی، علی الصبح مہر داد و مگر کو چھوڑ جاؤں گی۔ میں جان گئی ہوں مہر داد و مگر کی زمین رحیم اللہ تر کھان کے گھر والوں کے لیے بہت چھوٹی ہو گئی ہے۔“
ادھر ہم دونوں جو گفتگو تھے اور ادھر ماں جی شوہر کے ساتھ الجھ رہی تھیں۔

میں لہن کی طرف بڑھی تو سانول بھی تیزی سے آگے آگیا، وہ میرے بولنے سے بیٹش تر ہی بولا۔

”ابا! مٹھنی پیٹری رات یہاں بسر کرے میں صبح اسے چھوڑ جاؤں گا۔“

”تیرا داغ خراب ہے سانول، تو سب جانتا ہے پھر بھی ایسی باتیں کر رہا ہے۔“

”ابا، ہم بھی ماں بہن والے ہیں، ٹو سوچ ذرا مٹھنی بھی کسی کی عزت ہے سامنے اندھیری رات ہے، بچاری کہاں جائے گی۔“
”یہ بچاری نہیں ہے سانول، اس نے اور اس کے گھر والوں نے مہر داد و مگر والوں کو ظلم و ستم کی چکی میں پسنے کے لیے دھکا دیا ہے، جہاں مرضی ہے جائے، ہم اسے اپنیڑے کار (اپنے گھر) رکھ کر چوہدری مشتاق کی دشمنی مول نہیں لے سکتے۔“
”ابا.....“

”ایک منٹ سانول بھراں.....“ سانول کو مزید کچھ کہنے سے منع کرتے ہوئے میں نے کہا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہو چاچا، میں اپنی ذات کی حفاظت کے لیے آپ لوگوں کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتی، بس اتنی مہربانی کیجیے مجھ پر کہ مجھے ایک گھنٹہ مزید یہاں رکھنے دیں، اندھیرا گہرا ہوتے ہی میں نکل جاؤں گی۔“

”سانول نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر میں نے پھر اسے ہاتھ سے روک دیا، سانول بھراں، حالات کا تقاضا یہی ہے کہ میں یہاں سے چلی جاؤں۔“

پر مٹھنی تو کہاں جائے گی..... چوہدری یا اس کے کسی بندے کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو وہ تیری تکتہ بوتی کر دیں گے۔ مجھے اپنے رب پر یقین ہے، جس رب نے میری دو سالوں تک حفاظت کی، آگے بھی وہی خیال رکھے گا۔

شام کا اندھیرا گہرا ہوتے ہی میں نے ریشم سے بڑی چادر مانگی اور وہاں سے نکل آئی، سانول مجھے گاؤں سے باہر چھوڑنے پر رضامند تھا، مگر میں ایسا نہیں چاہتی تھی، دروازے کے باہر ہی میں نے اسے روک دیا۔

بس سانول بھراں۔ اس سے آگے مکھنی جانے اور مکھنی کا خدا جانے..... آپ واپس گھر کے اندر چلے جائیں، تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے پوچھا، سانول! کیا اب بھی سکھاں سے پیار کرتے ہو؟ میرے سوال پر اس نے طویل سانس کھینچا۔ لمحہ بھر چپ رہا، پھر بولا۔ پیارا رک داری (ایک بار) ہوتا ہے مکھنی۔ دارو داری پیار نہیں ہوتا۔ میں کل وی سکھاں سے پیار کرتا تھا اور اب وی کرتا ہوں۔

اگر اب وی سکھاں سے پیار کرتے ہو تو پھر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کیوں نہیں کی، پیار رب سے ہو یا اس کے بندے سے گھر سے نکلے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ مکھنی نے ایک اور سرد آہ کھینچی۔ مکھنی پینز! جس طرح فصل نوں کیزا لگ جائے تو اسے دھیرے دھیرے کھا جاتا ہے، بجر بھی۔ کپڑے کی طرح بندے نوں کھا جاتا ہے، میری مجبوریوں نے میرے پاؤں میں سنگل (زنجیر) ڈال رکھی ہے۔ ریشم اور زیتون کے چہرے مجھے گھر سے باہر جانے نہیں دیتے۔ بہادر علی چھوٹا اور بابا بوڑھا (بوڑھا) ہے، چار بندے ان کے سامنے آجائیں تو مار کھائیں گے۔

میں کچھ گئی سانول بھراں۔ میری کل وی رب سے دعا تھی اور اب بھی ہے، رب سائیں تجھے تیرا پیار نصیب کرے۔ مہر دادگر میں چوہدری مشتاق کے کرتوں اور ظلم نے خوف و ہراس کی چادر پھیلا رکھی تھی، شام کا اندھیرا بھی گہرا تھا، اس لیے ہر طرف ہوکا عالم تھا، ہاں البتہ بہت سے مکانوں کی چھتوں پر مردوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا، ریشم کی بات سچ تھی۔ مہر دادگر کا کوئی مرد راتوں میں نہیں سوتا، رات کے سناٹے میں، میں با آسانی مہر دادگر سے نکل سکتی تھی، مگر میرا دل میرا دماغ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا، دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

مکھنی! تُو اسے گھر کو دیکھے بنا جا رہی ہو، اس گھر میں تیرے ابا رحیم اللہ اور تیری امی خورشید کی کئی یادیں وابستہ ہیں، جو تو نے گھر والوں کے ساتھ صبح اور شام میں گزاری ہیں، ان کا احوال گھر کی چار دیواری کے اندر تجھے بلا رہا ہے، گھر کی تنہائی تیرے پیاروں کے بچر میں بین کر رہی ہے، چل نا مکھنی ذرا ان درو دیوار کو گلی دے آ۔ ابا کی چھوڑی گئی نشانیوں کو چوم انہیں آنکھوں سے لگا، ان سے اپنے دکھ درد بانٹ لے۔

میں دل کی پکار پر رت پ اٹھی، میرے قدم گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ رات کے مہیب سناٹے میں گھر کا تالا توڑنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا، بل بھر میں پڑوسیوں کو پتا چل جاتا تھا کہ رحیم اللہ ترکھان کے گھر کا کوئی تالا توڑ رہا ہے، ہمارے گھر کے دائیں بائیں دو گھر ہیں مگر عقی دیوار خالی ہے، مجھے عقی دیوار پھلانگ کر اندر جانا ہوگا، دیوار کی جڑ میں پہنچ کر میں سوچ میں پڑ گئی۔

مکھنی! تُو چھوٹے سے قد والی نازک لڑکی یہ اونچی دیوار کیسے پھلانگے گی، اس سوال پر میرا دل اُداسی کی آواز اٹھاتا تھا۔ میں گریہ میں نے سر اٹھا کر دیوار کو دیکھا۔ یہ میری پہنچ سے دور تھی۔ دفعتاً میرے ذہن میں تاریخ کا ایک واقعہ ابھرنے لگا۔ اہل بحرین مرتد ہو چکے تھے، مرتدین سے جنگ کرنے کے لیے صحابی حضرت علاء بن الحضرمی کو مامور کیا گیا۔ جنہوں نے مرتدین کو عبرت ناک شکست سے دوچار کیا۔ شکست خوردہ مرتدین بھاگ کر ظلیج دار بن میں پناہ گزین ہو گئے۔ دار بن میں پہلے سے دشمنان اسلام کا اجتماع تھا۔ دونوں کا اجتماع ایک نئی قوت کا باعث بنا۔ اس قوت کو توڑنا بے حد ضروری تھا، حضرت علاء بن الحضرمی کو دو پریشانیوں لاحق ہوئیں، ایک دار بن سمندر کے اس پار کی بستی تھی، بحری جہاز پر اس کی مسافت چوبیس گھنٹوں کی تھی، دوسری دار بن پر حملے کی صورت میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ دشمن عقب سے اصل بحرین پر حملہ آور ہو جائے گا، کچھ قبائل فتنہ ارتداد میں مبتلا نہیں ہوئے تھے۔ حضرت علاء بن الحضرمی نے انہیں خط لکھ بھیجا کہ وہ عقب سے دشمن کا راستہ روکیں، اس طرح وہ بحرین کی طرف نہ آنے پائیں گے، وہاں سے کسلی بخش جواب ملنے کے بعد حضرت علاء نے دار بن جانے کا حتمی فیصلہ کر لیا، مگر دار بن ایک ظلیج تھی جس تک پہنچنے کے لیے جہاز یا کشتیوں کی ضرورت تھی، مسلمان ان اسباب سے عاری تھے، حضرت علاء بن الحضرمی نے لشکر اسلام کو جمع کیا اور فرمایا۔

”جب ہم خشک میدان میں دشمن سے مقابلہ کر رہے تھے تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی مدد ملی تھی، وہاں جیسے خشک

مقام سے لشکر اسلام کے لیے غیب سے پانی نکل آیا تھا، ہمیں اللہ تعالیٰ پر کامل یقین رکھنا چاہیے کہ وہ ذات واحد خشکی کی طرح سمندر میں بھی ہماری مدد فرمائے گا۔

لشکر اسلام نے ایک زبان کہا۔ ہم اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی چیز سے نہیں ڈرتے۔ اس پر حضرت علاء بن الحضرمی اسلامی لشکر کے ہمراہ دعائے کلمات پڑھتے ہوئے داخل ہو گئے۔ میرے ذہن میں یہ سارا واقعہ کسی قلم کی طرح چلنے لگا، مجھے لگ رہا تھا جیسے میں لشکر اسلامی کو ٹھائیں مارتے سمندر میں چلتے ہوئے دیکھ رہی ہوں، وہ کچھ پڑھ رہے ہیں، میں نے دھیان دیا۔ اور ذہن پر دباؤ ڈالا تو مجھے وہ دعا یاد آنے لگی۔

يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ، يَا حَكِيمُ، يَا كَرِيمُ، يَا اَخَذَ، يَا صَمَدَ، يَا حَيُّ، يَا مُحْيِي الْمَوْتِ، يَا خَيُّ، يَا قَيُّوْمُ، لَا اِلَهَ اِلَّا اَنْتَ، يَا رَبَّنَا

لشکر اسلامی اونٹ، خچر، گدھوں اور گھوڑوں پر سوار تھا۔ بہت سے لوگ پیادہ چاہتے، مگر جب سمندر میں اترے تو سمندر سٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ کا کرشمہ ظاہر ہونے لگا۔ پانی اس قدر خشک ہو گیا کہ صرف اونٹ، گھوڑوں کے پاؤں بھیکتے تھے، ہولناک سمندر نے مجاہدین اسلام کو راستہ دے دیا تھا۔ دشمنان اسلام تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمان بحری جہازوں یا کشتیوں کے بغیر یا آسانی سمندر عبور کر لیں گے۔ وہ چین کی بانسری بجارہے تھے، لشکر اسلامی نے وہاں پہنچ کر دربار بن کو فتح کر لیا۔

میں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

”اے اللہ! تُو نے مسلمانوں کے لیے سمندر میں ایسے راستے بنائے کہ وہ آرام سے بیچ اپنی سواریوں کے سمندر عبور کر گئے، تُو نے بے آب و گیاہ میدانوں میں ان کے لیے پانی کے چشمے جاری کر دیے، اے اللہ! میں بھی تجھے ماننے والی مسلمان لڑکی ہوں۔ تیرے محبوب حضرت محمد ﷺ کی امتی ہوں۔ تُو میری بھی سن لے میرے اللہ..... میرے سامنے ٹھوس دیوار حائل ہے، مجھے اس پار جانے کو کچھ بھائی نہیں دیتا تو میری مدد فرما۔“

دعا مانگتے ہوئے مجھے خیال آیا۔ حضرت علاء بن الحضرمی کی طرح حضرت سعد بن ابی وقاص کا واقعہ بھی اسی طرح کا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے عراق و قادسیہ کو فتح کرنے کے بعد دار السلطنت فارس یعنی مدائن کا مقصد فرمایا۔ مدائن تک جانے کے لیے دجلہ کا منہ زور دریا عبور کرنا ضروری تھا۔ ساٹھ ہزار سواروں کا دریا عبور کر کے مدائن پہنچنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اہل فارس نے دجلہ کے ساحل سے تمام کشتیاں ہٹا دی تھیں، دجلہ کی طغیانی جو بن پر تھی۔ اس موقع پر حضرت سعد بن ابی وقاص نے خواب میں مسلمانوں کا دجلہ میں داخل ہونا دیکھا۔ حضرت سعد نے لشکر اسلامی کو بیچ سواریوں کے حصار میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی دعائے کلمات کا ورد کرنے کی تاکید فرمائی۔

میں نے ذہن پر زور دیا تو وہ کلمات بھی پوری طرح ذہن کی زمین پر اترنے لگے۔ میں نے بہت پہلے اس دعا کا ترجمہ پڑھا تھا۔

”ہم اللہ سے مدد چاہتے ہیں اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اللہ کافی ہے اور وہ اچھا وکیل ہے۔ قسم ہے اللہ کی، اللہ اپنے دوست کو فتح دے گا اور اپنے دین کو غالب کرے گا اور دشمن کو ہزیمت دے گا، سوائے اللہ کی مدد کے کسی میں قوت نہیں۔“

حضرت سلمان فارسی جو حضرت سعد کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، فرماتے ہیں۔

ساٹھ ہزار اسلامی شہسوار دجلہ پر ایسے چل رہے تھے جیسے باغ میں چہل قدمی کر رہے ہیں، وہ یوں ہی باتیں کرتے اور ورد کرتے ہوئے دریا کے پار چلے گئے، اس سفر میں حیران کن بات یہ بھی تھی کہ چلتے ہوئے جو گھوڑا تھک جاتا، اس کے لیے دریا میں ٹیلہ ظاہر ہو جاتا تھا، جس میں وہ آرام کر لیتا تھا، یہ اتفاق کی بات ہے یا رب کریم نے دانستہ یہ کرشمہ دکھایا کہ ہر گھوڑے کے ساتھ ایسا ہوا، اس دن کو عرب کی تاریخ میں یوم الماء اور یوم البحر اشم کہا جاتا ہے۔

☆.....☆

(اس حیرت انگیز اور اسرار بھرے ناقابل فراموش

سلسلے کی اگلی کڑی آئندہ ماہ پڑھیے)

پسند اپنی اپنی

عابد حسین

محبوبہ کے گھر کو لوٹنے والے محبوب ڈاکو کی اثر انگیز کہانی

روز کی طرح آج پھر گھر دیر سے آنے پر راجا کا باپ ہاتھ میں ڈنڈا اٹھائے راجا کی دھنائی کر رہا تھا اور راجا روز کی طرح ہاتھ جوڑ جوڑ کر باپ سے معافی مانگ رہا تھا۔ لیکن شاید آج راجا کا باپ راجا کو جان سے مار دینے کے درپے تھا۔ راجا کی بہن کلثوم اور اس کی یاں ہمیشہ کی طرح راجا کو چھڑانے کے لیے کوشش کر رہی تھی، لیکن آج راجا کا باپ راجا کو کسی قیمت پر نہ چھوڑنے کا عہد کیے بیٹھا تھا۔

”سننے کی اولاد کہاں تھا اب تک تو؟“ راجا کا باپ راجا کو مارنے کے ساتھ ساتھ گالیاں بھی دے رہا تھا۔

”تجھے گھر کی بھی کوئی فکر ہے؟ سارا دن تو آوارہ لڑکوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا رہتا ہے اور بھوک لگنے پر گھر کو دوڑا چلا آتا ہے۔ جا..... چلا جا، دفع ہو جا میری نظروں سے۔“

راجا کو تو جیسے اب یہ سب سننے اور سننے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ وہ روز اپنے آپ سے عہد کرتا کہ اب وہ آوارہ گردی نہیں کرے گا اور باپ کے ساتھ دکان پر جائے گا اور اس کا ہاتھ میں کام بنائے گا، لیکن صبح ہوتے ہی پھر وہ ہاتھ میں گیند اور بیل پکڑ کر گراؤنڈ کی طرف چلا جاتا۔ یہ اب اس کا معمول بن چکا تھا۔

راجا کو تو جیسے اب یہ سب سننے اور سننے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ وہ روز اپنے آپ سے عہد کرتا کہ اب وہ آوارہ گردی نہیں کرے گا اور باپ کے ساتھ دکان پر جائے گا اور اس کا ہاتھ میں کام بنائے گا، لیکن صبح ہوتے ہی پھر وہ ہاتھ میں گیند اور بیل پکڑ کر گراؤنڈ کی طرف چلا جاتا۔ یہ اب اس کا معمول بن چکا تھا۔

چاہتا تھا۔ اکثر امیر لوگوں کی بڑی بڑی گاڑیوں اور محل نما گھروں کو دیکھ کر راجا کا خون کھول اٹھتا۔ وہ سوچتا تھا کہ کیا ان سب آسائشوں پر صرف امیر لوگوں کا ہی حق ہے؟ اتنی دیر میں راجا کی ماں سالن اور روٹی گرم کر کے لے آئی۔

”راجا پتر، تو کیا سوچ رہا ہے؟“ راجا کی ماں نے گہری سوچ میں پڑے راجا سے پوچھا۔

”کچھ نہیں ماں، میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ گاڑیاں اور کونٹھیاں اور یہ سب آسائشیں صرف امیر لوگوں کے پاس کیوں ہیں۔ ان سب پر کیا ہمارا کوئی حق نہیں؟“

”دیکھ راجا پتر! یہ بڑے لوگوں کی باتیں نہ کر، ہمارا تو مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ ابھی دو وقت کی روٹی مل جاتی ہے، کبھی نوبت فاقوں تک آ جاتی ہے اور تو گاڑی اور بیکلے کی بات کر رہا ہے۔“

”نہیں ماں! میں یہ سب حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھنا ماں، ایک دن میں اتنے پیسے کماؤں گا کہ ابا بھی حیران رہ جائے گا۔“

”اچھا چل باتیں چھوڑ اور روٹی کھا۔ دوپہر کو بھی پتا نہیں کھایا ہے یا نہیں، اب کھانا کھا اور سو جا، صبح ابا کے ساتھ دکان پر جاتا ہے۔“

راجا کی ماں نے راجا کے سامنے کھانا رکھا اور پانی لینے کے لیے چلی گئی۔

صبح سویرے راجا اپنے باپ کے ساتھ دکان پر چلا جاتا ہے، لیکن جوں ہی لڑکے اس کی دکان کے سامنے سے ہاتھوں میں گیند اور بیٹ پکڑے گزرتے ہیں تو راجا کا دل بھی چاہتا ہے کہ وہ بھی دکان چھوڑ کر ان لڑکوں کے ساتھ گراؤنڈ کی طرف چلا جائے، لیکن پھر ابا کی مار اور لڑائی سے ڈر کر بیٹھ جاتا ہے، لیکن راجا کا دل دکان پر ذرا بھی نہیں لگتا۔ اتنے میں نالکہ اپنی ماں کے ساتھ سبزی لینے کے لیے دکان پر آتی ہے اور راجا کو دکان پر کام کرتا دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہے۔ نالکہ اور راجا ایک دوسرے کے ساتھ بہت پیار کرتے ہیں۔ نالکہ حاجی رفیق کی بیٹی ہے جو راجا سے بہت پیار کرتی ہے۔



”اے راجا تو دکان پر کیسے؟ آج گراؤنڈ نہیں گیا کیا؟“ نالکہ قدرے خوشی سے راجا سے پوچھتی ہے۔

”دیکھ نالکہ تو مجھ سے اتنی بے تکلفی سے باتیں نہ کیا کر، اگر ابا نے دیکھ لیا تو خواجواہ میں میری شامت آجائے گی۔“ راجا ادھر ادھر دیکھتے ہوئے نالکہ سے بولا۔

”دیکھ لے..... کیا تو مجھ سے پیار نہیں کرتا ہے؟“ نالکہ نے خفگی سے کہا۔

”نالکہ یہ پیار جو ہوتا ہے نا، یہ بڑے لوگ کرتے ہیں اور جب میں بھی بڑا آدمی بن جاؤں گا تو پھر سوچوں گا۔“ راجا نے شاہانہ انداز میں کہا۔ اسی طرح دن گزرتے گئے۔ زندگی ایک ہی ڈگر پر رواں

تھی۔ کبھی راجا دکان پر جاتا اور کبھی پھر آوارہ گردی کرتا۔ راجا تاملہ سے پیار تو کرتا تھا، لیکن راجا کے کچھ خواب تھے بہت بڑے خواب اور وہ ان کی تکمیل کے بعد ہی تاملہ کو اپنا بیٹا سمجھتا تھا۔

”اے حرام زادے! تو دکان کھلی چھوڑ کر کہاں دفع ہو گیا تھا؟“ راجا کے ابا نے گالیوں کے ساتھ دو تین لائنیں راجا کو رسید کرتے ہوئے پوچھا۔

”دیکھ ابا! تو جتنا مرضی مار لے مجھے، لیکن گالی نہ دیا کر۔“ راجا نے منمناتے ہوئے کہا۔

”اچھا تجھے کو گالیاں نہ دوں، تو جو چاہے مرضی کرتا پھرے۔“ اصل میں راجا کے ابا سے تاملہ کے باپ نے شکایت کی تھی کہ تیرا بیٹا میری بیٹی کو چھیڑتا ہے اور اب راجا کا ابا شام کو گھر آتے ہی راجا پر ٹوٹ پڑا تھا۔

”تجھے پر عاشقی کا بھوت کب سے سوار ہو گیا ہے؟“ گھر میں کھانے کے لیے بیٹے نہیں ہیں اور نواب صاحب چلے ہیں عاشقی کرنے۔“ راجا کا باپ اس پر برس رہا تھا۔ ”دفع ہو جا میرے گھر سے اور آئندہ مجھے اپنی منحوس شکل نہ دکھانا، کچھ نہیں لگتا تو میرا۔“

”ابا قسم سے میرا کوئی قصور نہیں ہے، وہ تو خود گلی میں کھڑی ہوئی تھی میرا راستہ روک کر۔“ راجا نے اپنی صفائی پیش کی۔

”میں کچھ نہیں جانتا، ابھی اور اسی وقت دفع ہو جا میری نظروں سے۔“ راجا نے بہت منت کی، باپ کے پاؤں پکڑے، لیکن راجا کا باپ آج کسی قیمت پر راجا کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

راجا کے باپ نے اس کو اسی وقت دھکے مار کے اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ اب اس صورت حال سے راجا بہت پریشان تھا۔ وہ اب اتنی رات گئے کہاں جائے گا۔ اگر کسی دوست کے پاس گیا تو پھر اسے واپس آنا پڑے گا، اس لیے اب راجا نے بھی عہد کر لیا تھا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو جائے، وہ اب کسی صورت اس گھر میں واپس نہیں آئے گا۔ اس کے پاس کچھ پیسے تھے، لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اب اسے کہاں جانا ہے۔ ساری رات وہ سڑک پر گھومتا پھرتا رہا اور صبح

ہوتے ہی وہ لاہور کی بس پر سوار ہو گیا اور لاہور روایت ہو گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ لاہور میں کس کے پاس جانا ہے۔ بس وہ ایک انجان منزل کی طرف سفر کر رہا تھا۔

راستے میں اس کا بہت دل چاہا کہ واپس چلا آئے، لیکن پھر ابا کے غصے کے ڈر کی وجہ سے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ راجا کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے، وہ بھی ایک رات بھی اپنے گھر اور گھر والوں سے دور نہیں رہا تھا، لیکن اب وہ ہمیشہ کے لیے اپنے گھر اور گھر والوں سے دور جا رہا تھا۔

”ارے پتا نہیں میرا بیٹا کہاں چلا گیا۔“ راجا کی ماں اور بہن کا رورور کرنا حال ہو رہا تھا۔

”کہیں نہیں گیا، ادھر ہی کسی آوارہ دوست کے گھر ہوگا۔ آجائے گا واپس گھر ضرور آئیں گا۔“ راجا کا باپ بہ ظاہر تو بہت غصے میں تھا، لیکن اندر سے وہ بھی بہت پریشان تھا۔

”مجھے کچھ نہیں پتا، مجھے میرا بیٹا واپس لا دو۔ تم نے اسے گھر سے نکالا ہے۔ تم کیسے باپ ہو، جو ایک معصوم بیٹے کو گھر سے نکال دیا۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہوگا؟ میرا تو دل ڈوبا جا رہا ہے۔“ راجا کی ماں رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔

”تم نے ہی اسے سر پر چڑھا رکھا تھا۔ میرا دماغ نہ چاٹو اور کھانا لا کر دو۔ آجائے گا جب بھوک لگے گی تو۔“ راجا کا باپ راجا کی ماں پر برس پڑا۔

”شام تک راجا لاہور پہنچ گیا، لیکن اب اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کدھر جائے، ادھر تو کوئی اس کا جاننے والا بھی نہیں تھا۔ راجا ایک ہوٹل کے باہر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس ابھی کچھ رقم تھی، جن سے وہ کچھ دن گزار سکتا تھا، لیکن رقم ختم ہونے کے بعد وہ کیا کرے گا۔ یہ سوچ کر وہ بہت پریشان تھا۔ انسان پر جب آفتوں کا پہاڑ ٹوٹتا ہے تو وہ سب کچھ تباہ کر دیتا ہے۔ راجا نے ہوٹل میں کھانا کھایا اور وہیں بیٹھ گیا۔

وہ ہوٹل میں آتے اور جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اب آہستہ آہستہ تاریکی بڑھ رہی تھی اور راجا کو سونے کی فکر تھی۔ راجا کافی دیر تک لاہور کی سڑکوں پر پھرتا رہا اور اپنی قسمت کو کوستارہا۔ اسے اپنی ماں اور بہن کی یاد

آ رہی تھی۔ پتا نہیں ان کا کیا حال ہوگا اور وہ میرے لیے کتنے پریشان ہوں گے، لیکن اپنے باپ کے بارے میں سوچ کر اس کا خون کھول اٹھا۔ راجا نے کبھی گھر میں سکھ کا سانس نہیں لیا تھا۔ ہر وقت لڑائی جھگڑا اور اسے اس مقام پر پہنچانے والا اس کا باپ تھا۔ گھر والوں کو یاد کرتے اور ٹہلٹے ٹہلٹے وہ ایک پارک میں آ گیا اور ایک بیچ پر لیٹ گیا، تھوڑی دیر بعد سفر سے تھکا ہوا راجا نیند کی دایوں میں چلا گیا۔

صبح کی پو پھوٹ رہی تھی، جب راجا کی آنکھ سورج کی روشنی سے کھل گئی۔ یہ پہلی رات تھی جو اس نے گھر سے باہر گزاری تھی۔ راجا کو بھوک محسوس ہوئی تو وہ قریبی ہوٹل کی طرف چلا گیا اور ناشتے کا کہہ کر منہ ہاتھ دھو کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جب راجا نے ناشتہ کر لیا تو اس نے بل ادا کرنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا، لیکن یہ کیا..... اس کی جیب تو بالکل خالی تھی۔ راجا بہت حیران تھا کہ رات کو تو اس کے پاس کچھ رقم تھی، مگر اب وہ کہاں گئی؟ بھولے راجا کو کیا پتا تھا کہ یہ گاؤں نہیں شہر ہے اور ادھر تو لوگ دوسروں کے تن سے کپڑے تک اتار لیتے ہیں۔ اب اسے ہوٹل کے بل کی فکر تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کاؤنٹر پر گیا اور وہاں بیٹھے شخص کو بڑی معصومیت سے اسے رات کی بات بتائی تو کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا آدمی جو دیکھنے سے ہی غصے والا لگتا تھا، راجا کی بات سن کر طیش میں آ گیا اور گالیاں دیتا ہوا کاؤنٹر سے راجا کو مارنے کے لیے لپکا۔ راجا نے صورت حال کا اندازہ لگاتے ہوئے اپنے بچاؤ کے لیے باہر کی طرف دوڑ لگا دی، لیکن سامنے سے آتے ہوئے ویٹرنے اسے دبوچ لیا، اتنے میں کاؤنٹر والا آدمی بھی آ گیا اور راجا کو اتنا مارا، اتنا مارا کہ راجا نے سدھ ہو گیا۔ راجا نے اس کی بہت منت سماجت کی، لیکن ہوٹل کا مالک اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ راجا اپنے زخموں کو سہلاتا ہوا فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ آج اسے گھر کی بہت یاد آ رہی تھی، لیکن ابا کا سوچ کر پھر خاموش ہو گیا۔ اب راجا وہ راجا نہیں رہا تھا۔ اب راجا کے دماغ میں کچھ اور چل رہا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر یہ دنیا والے اسے شرافت کا

جامہ اتار کر بد معاشی اور غنڈہ گردی کے لبادے میں دیکھنا چاہتے ہیں تو اس میں راجا کیا کر سکتا ہے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ آج اس نے اپنی مار کا بدلہ لیتا ہے۔ وہ چپ چاپ فٹ پاتھ پر بیٹھ رہا اور شام ڈھلنے کا انتظار کرتا رہا، کیوں کہ شام کو ہوٹل کے مالک نے اپنی دن کی آمدن لے کر گھر جانا تھا۔ آہستہ آہستہ دن گزرتا گیا، صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام۔ راجا نے اب اپنے آپ کو پوری طرح تیار کر لیا تھا۔ وہ گاؤں کا زور آور لڑکا تھا اور اب آہستہ آہستہ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ راجا ہوٹل کی طرف سے آنے والی سڑک کے کونے پر درخت کے پیچھے چھپ کر بیٹھا تھا اور ہوٹل کے مالک کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد راجا نے قدموں کی چاب سنی اور آنے والے آدمی کو دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ ہاں یہ وہی آدمی تھا، جس نے راجا کو بے دردی سے مارا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا، پھر وہ جیسے ہی راجا کے قریب سے گزرا تو راجا خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیا، کیوں کہ سڑک پر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بڑی خراماں چال چل رہا تھا اور راجا اس سے کچھ فاصلے پر اس کے پیچھے تھا۔ راجا کے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا تھا اور چہرہ اس نے کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہوٹل کا مالک جیسے ہی روڈ سے اتر کر کچی سڑک پر مڑا تو راجا نے دوڑ کر زور سے اس کے سر پر ڈنڈا مارا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کے منہ سے آواز بھی نہ نکلنے پائی تھی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ یہ سب دیکھ کر راجا کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ یہ پہلی بار تھا کہ راجا نے کسی کو مارا تھا۔ گاؤں میں لڑکوں کے ساتھ لڑائیاں تو ہوتی تھیں، مگر وہ معمولی نوعیت کی ہوا کرتی تھیں۔ راجا نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے آٹھ ہزار اور کچھ روپے اور موبائل فون نکلا۔ راجا نے پیسے اور موبائل فون اپنی جیب میں رکھے اور وہاں سے فرار ہو گیا۔ یہ راجا کی منزل کی طرف پہلی حکمت عملی تھی جو اس نے اپنے لیے متعین کی تھی۔

راجا نے جان لیا تھا کہ اگر اس دنیا میں زندہ رہتا ہے تو شرافت سے نہیں بلکہ بد معاشی اور غلط کام کر کے ہی زندہ رہا جاسکتا ہے۔ اب راجا کا معمول بن گیا تھا کہ وہ ہر رات کوئی نہ کوئی واردات کرتا تھا۔ اب وہ معمولی ڈاکو نہیں، بلکہ شہر کا ڈان راجا ڈاکو بن گیا تھا۔ اب وہ معمولی وارداتیں نہیں کرتا تھا، بلکہ اب وہ بڑے ہاتھ مارتا تھا۔ اسی طرح دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے اور راجا کو گھر سے بھاگے ہوئے پورے چار سال ہو گئے تھے۔ ان چار برسوں میں اس کا بہت دل چاہا کہ گھر جائے، لیکن پھر وہ نہ جاتا، کیوں کہ ابھی اس نے بہت سے میسے کمانے تھے۔ میسے تو اب بھی اس نے کافی سے زیادہ اکٹھے کر لیے تھے، لیکن وہ ابھی مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اس عرصے میں وہ اپنے گھر والوں کی خبر رکھتا رہا تھا۔ راجا کی بہن اب جوان ہو چکی تھی اور ان کا اب ایک بڑا اسٹور تھا اور انہوں نے گھر بھی تبدیل کر لیا تھا۔

راجا کے ماں باپ نے تو راجا کو مردہ سمجھ لیا تھا۔ انہوں نے متعدد بار راجا کی گمشدگی کا اشتہار بھی اخباروں میں چھپوایا، لیکن راجا اس طرح غائب تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

راجا کے گھر آج کلٹوم کو دیکھنے کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ مجھے تو وہ لوگ بہت پسند آئے تھے۔ لڑکا امریکا میں ملازمت کرتا ہے، تم ان کی چھان بین کرو۔ ”اے راجا کے ابا تم سے کہہ رہی ہوں کن سوچوں میں کم ہو؟“ راجا کی ماں نے راجا کے باپ کو سوچوں کے سمندر سے باہر نکالا، جو نہ جانے کب سے سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

”کچھ نہیں، بس آج راجا بہت یاد آ رہا ہے۔ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور اب مجھ سے اسٹور پر نہیں بیٹھا جاتا۔ آہ کاش اس دن میں نے اپنے بیٹے راجا کو گھر سے نہ نکالا ہوتا۔“ راجا کے باپ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”بس کروے راجا کے ابا، میرا بیٹا زندہ ہے وہ ضرور آئے گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ ضرور آئے گا۔“ راجا کی ماں ٹھحال سے قدموں کے ساتھ کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دنوں میں کلٹوم کا رشتہ طے پا گیا اور تاریخ رکھ دی گئی۔ جب راجا کو معلوم ہوا کہ اس کی بہن کی شادی

ہے تو وہ بہت خوش ہوا، لیکن اگلے ہی لمحے اسے ادا سی لے گھیر لیا، کیوں کہ وہ اب اپنے گھر نہیں جاسکتا تھا، اس لیے کہ اسے اس گھر سے نکالا جا چکا تھا، لیکن اس نے جانا ضرور تھا، دن کی روشنی میں نہ سہی، رات کے اندھیرے میں ہی سہی۔

مقررہ تاریخ پر بڑی دھوم دھام کے ساتھ کلٹوم روٹی، سسکتی اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر اپنے پیارے گھر چلی گئی۔ راجا یہ سب کچھ دور سے دیکھتا رہا۔ اپنے ماں باپ اور بہن کو اتنے عرصے بعد دیکھا تو ان سے گلے لگ کر رونے اور باتیں کرنے کو اس کا دل چاہا، مگر نہ جانے کیوں اس کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ واپس آ گیا۔

راجا نے اپنی کارروائیاں اب مزید تیز کر دی تھیں۔ اب اس کی گینگ میں کافی لڑکے کام کرنے لگے تھے۔ راجا نے اپنا تمام روپیہ جینک میں جمع کر دیا ہوا تھا۔ اب راجا کا دل چاہتا تھا کہ وہ سارا مال روپیہ پیسے لے جا کر اپنے باپ کو دے اور پھر سے کہہ سکے کہ دیکھ ابا کتنا روپیہ کمایا ہے میں نے اور پھر اسے نانکہ یاد آگئی جو اس کا انتظار کر رہی ہوگی، جس کی وجہ سے وہ زندہ ہے اور پھر یہ کہ وہ اپنے ماں باپ کو نانکہ کے گھر اپنے رشتے کے لیے بھیج سکے۔ راجا اپنی سوچوں میں کم تھا کہ اس کے ایک شاگرد نے جو گینگ میں بلا کے نام سے مشہور تھا، راجا کو بتایا کہ ”فلاں کو گئی میں آج رات ڈکیتی کرنی ہے۔ کافی امیر لوگ ہیں، آخر ہمارا بھی تو کچھ حق بنتا ہے نا؟“

بلا نے جتنے ہوئے سوچوں کو ناؤ دیا۔ ”کیوں نہیں ملتے کیوں نہیں، ان امیر زادوں سے میں نے پرانے حساب چکنا کرنے ہیں۔“ لیکن ملتے میں یہ سوچ رہا تھا کہ راجا کچھ بولتے بولتے چپ ہو گیا، جیسے سوچ رہا ہو کہ وہ بات کرے یا نہ کرے اور پھر بلا سے مخاطب ہوا۔

”دیکھ دوست اس گینگ میں تو سب سے پرانا دوست ہے میرا اور میں نے تجھے اپنے بارے میں سب بتا بھی دیا ہے۔ میں نے اب بہت پیسے کمائے ہیں اور اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ بس اب اپنے ابا اور اپنی ماں کے پاس جانا چاہتا ہوں اور اپنی نانکہ کو اپنانا چاہتا ہوں، لیکن پھر میری ہمت نہیں ہوئی، کیوں کہ جب میں

خود کو مجرم تصور کرتا ہوں تو پھر میرے پیروں میں بیڑیاں پڑ جاتی ہیں۔ دیکھ دوست، اگر کبھی مجھے کچھ ہو گیا تو میرے بار، میرا تمام روپیہ تو نکلا کر میرے ابا کو دے دینا اور میری میت میرے گھر پہنچا دینا۔“

”دیکھ باس راجا ایسی بات نہ کر! تو مجھے اچھی طرح جانتا ہے کہ میں تیرے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔“ بلا نے اپنی وفاداری کا یقین دلوایا اور پھر وہ آئندہ رات کی ڈکیتی کا پلان بنانے لگے۔

راجا سمیت چار لوگ تھے۔ پہلے انہوں نے چوکیدار کو بے ہوش کیا اور پلٹے سنے دیوار پھلانگ کر اندر سے دروازہ کھولا، پھر چاروں اندر گھس گئے۔ رات کے تقریباً 11 بجے کا وقت تھا۔ ایک باہر دروازے پر کھڑا رہا، تاکہ کسی پیش قدمی پر آگے اطلاع کر سکے اور راجا، بلا اور جانی اندر گھس گئے۔ اندر گھس کر انہوں نے گھر کی تلاشی لیتی شروع کر دی۔

”کون ہے؟ فضلو دیکھو کون ہے ادھر؟“ کسی مرد کی آواز آئی جو شاید قدموں کی آہٹ سے بیدار ہو گیا تھا۔

”خبردار جو آواز نکالی۔“ راجا کسی جانور کی طرح صوفے کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ راجا نے اس مرد پر پستول کی نال سیدھی کی ہوئی تھی، اس کا مکمل چہرہ کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔

”کک، کک، کون ہو تم لوگ؟“ اس آدمی کے منہ سے بمشکل نکلا۔

”تیرے باپ۔“ اس دفعہ بلا بولا تھا۔ ”چل جلدی بنا، یہاں تیرے علاوہ اور کون رہتا ہے اور تمام زیور اور تجوری والا مال کہاں رکھا ہے؟“ بلا اس طرح بول رہا تھا جیسے اپنا قرض مانگ رہا ہو۔

”میری بیوی رہتی ہے میرے ساتھ، خدا کے لیے آپ کو جو چاہیے وہ لے لیں، لیکن میری بیوی کو اور مجھے کچھ نہ کہیں۔“ وہ آدمی تقریباً رونے لگا تھا۔

اتنے بڑے آدمی کو یوں روتا دیکھ کر بلا کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ”ارے لومڑی اولاد روتا کیوں ہے؟ تجھے کچھ نہیں کہیں گے اگر تو چپ چاپ اپنا سب کچھ ہمارے

حوالے کر دے گا۔“

”بلا تو جا اس کی بیوی کو لے آ، کہیں وہ ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہ کھڑا کر دے۔“ راجا نے پستول تانے بلا کو کہا اور بلا اس کمرے کی طرف چل دیا، جہاں سے یہ آدمی باہر نکلا تھا اور کچھ دیر بعد ہی ایک لڑکی ہو اس باختہ کمرے سے باہر آئی، جو شاید سو رہی تھی اور اس کے پیچھے بلا تھا۔

”ارے یہ کیا، یہ تو نانکہ ہے۔“ راجا سب کچھ بھول سکتا تھا، لیکن ان آنکھوں کو نہیں بھول سکتا، جن میں راجا کے لیے پیار بٹا ہوا تھا۔ نانکہ پہلے سے بہت بدلی ہوئی تھی، مگر اس کی آنکھیں ویسی ہی تھیں۔ لاؤنج میں آتے ہی نانکہ نے بھی راجا کو پہچان لیا۔ اگرچہ راجا کا چہرہ کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا، مگر نانکہ نے بھی اسے اس کی آنکھوں کی وجہ سے پہچان لیا تھا۔

”راجا تو؟“ اچانک نانکہ کے منہ سے نکلا اور راجا نے باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔ ابھی وہ داخلی دروازے سے باہر نکل ہی تھا کہ پولیس دین کے سائرن کی آواز سنائی دی۔ پولیس نے چاروں طرف سے عمارت کو گھیر لیا تھا۔ راجا اور اس کے ساتھیوں نے پولیس کا مقابلہ کیا، اسی دوران ایک پولیس اہلکار نے فائر کیا اور راجا کو سیدھی دلی کے مقام پر گولی لگی۔ اس مقابلے میں راجا کے دو ساتھی مارے گئے، لیکن بلا نے راجا کو وہاں سے نکال لیا، کچھ دور جا کر بلا نے راجا کو بٹھا دیا۔ راجا نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اس دوران راجا کا بہت خون بہہ نکلا تھا۔ راجا اب اور نہیں جیتا چاہتا تھا، اس لیے اس نے بلا کو پانی لانے کو کہا۔ جب بلا راجا سے کچھ دور چلا گیا تو راجا نے اپنے ہی ریوالور سے اپنی گھوڑی میں سوراخ کر دیا، کیوں کہ جس کے لیے وہ جیتا تھا، جب وہ ہی اس کی نہ رہی تھی تو پھر جینے کا فائدہ کیا تھا؟ بلا نے راجا کا تمام روپیہ پیسہ جینک سے نکلوایا اور راجا کی میت کے ساتھ راجا کے گھر چلا گیا۔ راجا واپس گھر آ تو گیا تھا، مگر مردہ حالت میں۔ راجا کی ماں نے بیٹے کی لاش دیکھ کر دل خراش چیخ ماری اور غش کھا کر گر پڑی، کیوں کہ اس کے دل کا راجا اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔

☆.....☆

جنتِ نظیر میرا کشمیر

عروہ عدنان

کشمیر کی وادیوں میں جنم لیتی بہادری کی عظیم داستان

گلزار بابا کی پھرائی ہوئی آنکھیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں، جن میں موجود بے چینی اور اضطراب مجھے واضح نظر آ رہا تھا۔ میں سہمی ہوئی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بابا کے پاس آ گئی۔ اس وقت میرے دل کا جو حال تھا وہ میں اور میرا خدا ہی جانتا تھا۔ میں بے حد ڈکھی اور بے چین تھی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہتا تھا، مگر صرف آنکھیں ہی رو رہی تھیں۔ وہ میری دسترس میں جو نہ تھیں۔ میرا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

گلزار بابا ”جاں کنی“ کے عالم میں تھے۔ میں جانتی تھی وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے؟ کچھ پوچھنا چاہتے تھے؟ میں آئی ہی اسی لیے تھی۔ مجھے یہ ہمت ان کے پیار اور خلوص نے دی تھی۔ مجھے خبر ملی تھی کہ گلزار بابا مجھ سے ملنا چاہتے ہیں، مگر وہ خود بے حد بیمار ہیں، چل بھی نہیں سکتے۔ ان کے دل کا مرض اب اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ وہ مزید کوئی صدمہ برداشت کر ہی نہیں سکتے تھے اور آج تو ان کا حال بے حد خراب تھا۔ بی پی بالکل نہ ہونے کے برابر تھا۔ ڈاکٹر نے بھی جواب دے دیا تھا۔ بس روح کا رشتہ ٹوٹا نہ تھا، شاید انہیں میرا ہی انتظار تھا اور اسی لیے مجھے بلا پا بھی گیا تھا۔ وہ بے چینی سے پناہ بھی دے رہی تھی اور کبھی با میں نہ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ نہایت بے چینی

سے بولے۔
”آؤ بیٹا آج تمہیں سچ کا ساتھ دیتا ہے۔ جو کچھ دل میں موجود ہے سچائی کے ساتھ بول دو، تاکہ میں سکون سے جان دے سکوں۔ میرا بیٹا سچا مجاہد تھا کہ نہیں؟“

میں نے جواب دیا کہ گلزار بابا! ذیشان ایک سچا دلیر اور نڈر مجاہد تھا۔ اس نے خدا کے حکم کی تعمیل کی اور سچائی کی راہ میں لڑتے ہوئے خدا کے لیے جامِ شہادت نوش کیا۔ یہ سراسر الزام اور جھوٹ ہے کہ وہ کشمیری بھائیوں کی بختری کرتا تھا اور انہیں نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔ کل اس نے تنہا چار فوجیوں کو لکارتا تھا اور ان سے مقابلہ بھی کیا تھا۔ ان ظالموں کے پاس خود کار ہتھیار تھے اور تعداد میں بھی زیادہ تھے، مگر ذیشان کے پاس صرف ایک ہی گن تھی، جس سے وہ پل کے آس پاس کے علاقوں کی حفاظت کرتا تھا۔ وہ طاقت کے نشے میں پھور ان کافروں پر ٹوٹ پڑا تھا، جو کہ ہم سب لڑکیوں کی عصمت کو پامال کرنے کے درپے تھے۔ اگر وہ اس وقت اس مقام پر موجود نہ ہوتا تو آج یا تو ہم بہت بُری حالت میں ہوتے یا پھر مر چکے ہوتے۔ بدست ہاتھی کی طرح وہ نشے میں دھت اور منہ سے اول فول بک رہے تھے۔ ہم لڑکیاں تو ان ظالموں کو دیکھ کر بُری طرح سہم گئی تھیں۔

میں نے دائیں بائیں مدد کے لیے نظر دوڑائی تو میری نظر ذیشان پر پڑی، وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر اسے آواز دے ڈالی۔
”ذیشان! ہمیں ان ظالموں سے بچاؤ۔“ یہ آواز سن کر وہ بھی چونک پڑے اور اسے لٹکانے لگے۔ ذیشان کے پاس ایک گن تھی۔ وہ ہمارے لیے ڈھال بنا ہوا تھا اور ہمیں اس نے ایک درخت کے پیچھے کر دیا تھا اور خود تنہا ان فوجیوں کا مقابلہ کرتا رہا تھا۔ وہ ہم تک پہنچنا چاہتے تھے، مگر ذیشان انہیں روکے ہوئے تھا۔ مقابلے کے دوران اس کی ٹانگ پر گولی لگی۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے اس کی ٹانگ سے خون بہتے ہوئے دیکھا تھا، لیکن اس نے کوئی پروا نہ کی تھی اور ایک انڈین فوجی کو واصل جہنم کر دیا تھا۔ وہ فوجی جو تیزی سے ہماری طرف آرہے تھے۔ وہ رُک گئے، اپنے ساگی کا حال دیکھ کر اور انہوں نے درختوں کے پیچھے پوزیشن بنالی تھی۔ ذیشان نے آہستگی سے میری طرف دیکھ کر مجھے آواز دی اور کہا۔

”نازو! جب تک ہوسکا میں انہیں روکوں گا۔ تم پل والی سائڈ سے ان لڑکیوں کو لے کر یہاں سے بھاگو۔“

میں نے روتے ہوئے جواب دیا۔
”نہیں، ذیشان میں یوں نہ چھوڑ کر تمہیں جاؤں گی۔ یہ جہنمی قریب ہی ہے اس کے ہتھیار سے ان ظالموں کا تمہارے ساتھ مقابلہ کروں گی۔“ لیکن اس نے سخت لہجے میں جواب دیا تھا۔
”بے وقوفی کی بات نہ کرو، تم سے یہ گن اٹھ بھی نہیں سکتی، بس میری بات سنو۔ جتنا جلدی ہو سکے نکل جاؤ، ورنہ میرا اتنا کچھ کرنا کا مقصد ہی ختم ہو جائے گا۔ اگر یہ تم لڑکیوں تک پہنچ گئے، جو یہ کر نہیں سکتے میرے جیتے جی، تو میں خدا کے آگے سرخرو نہیں ہو پاؤں گا۔ وقت بہت کم ہے جتنا جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ تم لوگ، اگر زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔“

وہ یہ کہتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا اور بابا! میں اور میری مینوں بھولیاں درختوں کی اوٹ لیتے ہوئے پل کی

جانب بڑھ گئے۔ وہ ظالم وحشی ہے دروغ گولیاں برسا رہے تھے۔ مجھے علم تھا کہ ڈیشان کا بیچ لکھنا ناممکن تھا، مگر میں اس کی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ میرے ساتھ میری بھولیاں بھی تھیں جن کو بچانا اب میری ذمہ داری تھی۔ میں نے اسے خدا کے حوالے کیا اور اپنی دوستوں کے ساتھ پل کے راستے شہر تک پہنچ گئی۔ بس یہی سچ ہے بابا! ڈیشان فرشتوں کی طرح معصوم تھا، وہ آخری وقت تک لڑا اور ہمیں اسی نے ہی ان درندوں سے بچایا۔

گلزار بابا یہ سب سن کر زار و قطار رونے لگے اور بس اتنا کہا۔ ”شکر اللہ، اب میں سکون سے مر سکوں گا۔“ انہوں نے کلمہ شہادت پڑھا اور آنکھیں بند کر لیں، پھر سب پکارتے ہی رہ گئے، مگر گلزار بابا نے آنکھیں نہ کھولیں۔ ان کی روح جہان فانی سے کوچ کر چکی تھی۔ میں نے بے دردی سے اپنی آنکھیں مسل لیں جن میں کانٹے سے چھ رہے تھے، پھر سب میت کے انتظام میں لگ گئے اور میں اپنے گھر واپس لوٹ آئی۔

آج مجھے سب یاد آ رہا تھا۔ وہ تمام پل جو میں نے گلزار بابا کے ساتھ گزارے تھے۔ وہ پہلا دن بھی جو میرا مقبوضہ کشمیر میں تھا، میں اپنے والدین کے ساتھ اپنی دادی کی وفات پر آئی تھی۔ یہ ہمارا علاقہ سری نگر کے قریب کا ہی علاقہ تھا۔ بن پورہ اس دادی کا نام تھا۔ یہ بے حد حسین دادی تھی، چاروں طرف سے بلند پہاڑوں سے گھری ہوئی بالکل جنت کا نمونہ۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب پاکستان اور انڈیا کی جنگ چھڑی ہوئی تھی اور کارگل کا محاذ زوروں پر تھا۔ پاکستان کی جیت یقینی نظر آرہی تھی۔ کشمیری مجاہدین پاکستان آرمی کا ساتھ دے رہے تھے، ہر محاذ پر بھارتی فوج پسپا ہو رہی تھی۔

میں کیوں کہ پہلی بار کشمیر آئی تھی، اس لیے مجھے سب کچھ بے حد حسین لگ رہا تھا۔ ایک تو کشمیر کا حسن اس کے اوپر سے موسم کی الگ سے رعنائیاں، میں تو اس حسن میں گم سی ہوئی تھی۔ نومبر کا مہینہ چل رہا تھا۔ درختوں کے پتے راستوں کو اپنے زرد پتوں سے ڈھانپ لیتے تھے۔ لال اور زرد پتوں کا امتزاج ایک حسین منظر پیش کر رہا تھا۔ میں اس حسن کی تصویر کو اپنی نظروں میں سمو لینا چاہتی تھی۔ قدرت کے اس حسین حسن نے میری سوچے سمجھے

کی صلاحیت تک سلب کر لی تھی اور میں بالکل رو بوٹ کی طرح بغیر سوچے سمجھے ان راہوں میں نکل پڑی تھی۔ میرے قدموں کے نیچے موجود پتے جو مجھے اپنی موجودگی کا ناکام احساس دلانے کی کوشش کر رہے تھے اور میں نادان اس طلسمانی ماحول کے طلسم میں ایسی جکڑی کہ یہ ہوش بھی نہ رہا کہ میرا رخ کھینچنے کی طرف ہو گیا ہے جہاں کئی طرح کے چھوٹے بڑے جانوروں کا ممکن تھا۔ کسی جانور کی چنگھاڑ نے مجھے واپس شعور میں دھکیلا۔ ہوش تو آ گیا پر جب دیکھا تو راستہ بھول گئی تھی۔ پیچھے پلٹ کر پہچاننے کی کوشش کرنے لگی، مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور طلسم کی جگہ اب خوف نے لیا، میں رونے لگی۔ اتنے میں مجھے ایک انتہائی شینق آواز سنائی دی۔

”رو مت بیٹا! دیکھو تم تنہا نہیں ہو، میں اب تمہارے ساتھ ہوں۔“

میں نے آواز کی طرف رخ کیا تو اپنے سامنے ایک شینق بزرگ ہستی کو دیکھا۔ لمبا قد، گورا رنگ اور باریش شخصیت، بہت جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے یہ بزرگ۔ میرے دل کو ڈھارس ہوئی۔ وہ بزرگ میرے قریب آ گئے اور بولے۔

”رو نہیں بیٹا، میں کوئی جن بھوت نہیں بلکہ ایک عام انسان ہوں۔“ میں جواب دیے بغیر انہیں دیکھتی گئی۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگے۔ ”میرے پیچھے پیچھے آؤ بیٹا، لگتا ہے تم یہاں نئی ہو۔ اس جگہ تمہیں اکیلے تو بالکل ہی نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ جگہ انتہائی خطرناک ہے۔“

میں نے پہلی دفعہ لب کھولے کہ بابا بس یہاں کے ماحول کی خوب صورتی مجھے کھینچنے لے آئی، جب ہوش آیا تو راہ سے ہٹک چکی تھی۔ انہوں نے کہا۔

”شکر ادا کرو کہ میں آج یہاں تک گھر کے لیے لکڑیاں جمع کرنے اور خشک پتے ایک بوری میں بند کرنے چلا آیا، ورنہ نجانے تمہارا کیا بنتا بیٹا۔ حیرت ہے تمہیں احساس تک نہ ہوا کہ تم انجان راستے پر چلی جا رہی ہو۔ خیر میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ برف باری ہونے کو ہے۔ جب کچھ موسم میں بہتری آئے گی تو مجھے گھر کا

ایڈریس دینا، میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔“

”بند پورہ ایک چھوٹی دادی ہے جہاں سب لوگ سب کو جانتے ہیں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور بابا کے پیچھے چل پڑی جو اس وقت میرے لیے رحمت کے فرشتے سے کم ثابت نہیں ہو رہے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں ہی ہم بابا کے گھر پہنچ گئے۔ یہ پتھروں سے بنی ہوئی ایک پرانی عمارت تھی جس کی چنی سے دھواں نکل رہا تھا، جو یہ بتا دے رہا تھا کہ یہ گھر آباد ہے، ورنہ آس پاس کا پورا علاقہ صرف اور صرف کھنکھاتے جنگلات سے بھرا ہوا تھا۔ بابا نے گھر کا دروازہ کھولا اور مجھے خوشگوار احساس ایک دم سے ہوا۔ اندر سے گھر کافی گرم تھا، شاید انگریزوں یا کوئٹہ اسٹوپ جیسی کوئی چیز چل رہی تھی۔ گرمائی ملی تو کچھ جان میں جان آئی۔ ایک چھوٹا سا بلی کا بچہ نجانے کہاں سے نکل کر آیا اور میرے پاؤں میں اپنے آپ کو رگڑنے لگا۔ میں نے اسے ہاتھوں میں اٹھالیا۔ وہ مزاحمت کے بغیر آ گیا اور میاؤں میاؤں کر کے خوشی کا اظہار کرنے لگا۔ بابا نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور بولے۔

”بیٹا تم یہاں بیٹھ کر آرام کرو، میں اپنی بیگم کو تمہاری اطلاع دے کر آتا ہوں۔ تمہیں ایک گرم قبوہ کی پیالی کی اشد ضرورت ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے بابا کی طرف دیکھا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔ بابا مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں وہیں ایک طرف کو لگے ہوئے بیچ پر بیٹھ گئی جس کے اوپر روٹی کا گدا ڈال کر اسے آرام دہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس وقت وہ مجھے نعمت سے کم نہ لگی۔ میں واقعی بہت تھک گئی تھی۔ میں نے اب اپنے ارد گرد کے ماحول کا مشاہدہ شروع کیا۔ میری گود سے وہ بجلی کا پچ اتر کر ایک طرف کو چلنے لگا۔ میں اسے بلانے لگی، مگر جب یہ دیکھا کہ جس طرف یہ بلی کا بچہ چلا جا رہا تھا، وہاں ایک میری ہی عمر کا لڑکا کھڑا بلی کو بلاتا تھا۔ میں ٹھٹھک کر رک گئی اور تھوڑی سی بزل بھی ہو گئی۔ وہ بچہ مجھے دیکھ کر حیران ہو رہا تھا اور مجھے کھورتے ہوئے میرے سامنے سے گزر گیا۔ وہ بھی اسی طرف بڑھ گیا جس طرف وہ بزرگ گئے تھے، تھوڑی دور جاتے ہی اس بچے نے بابا کو پکارنا شروع کر دیا۔

”بابا جانی اور بابا جانی! دیکھیے آپ دروازہ کھول کر پھر آ گئے، ایک چور ہمارے گھر میں کھس آیا ہے۔“ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا تو میں گھبرا گئی اور شرمندگی کے مارے سرخ ہو گئی، پھر بابا کی آواز آئی۔

”نہیں، بیٹا میرے ساتھ ہی یہ بچی آئی ہے۔“ انہوں نے محبت سے جواب دیا۔ میں سمجھ گئی ان دونوں میں باپ بیٹے کا رشتہ تھا۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ لڑکا پھر نظر آیا، اس کے ہاتھ میں چائے کے دو کپ تھے۔ میں نے شکریہ کے ساتھ ایک کپ لے لیا اور خاموشی سے کھڑکی جو کہ بیچ کے نزدیک ہی موجود تھی اس سے باہر دیکھنے لگی۔ اب ماحول میں رات کی سیاہی بھی بڑھنے لگی تھی اور برف باری بھی ہلکی ہلکی شروع ہو گئی تھی۔ مجھے گھر والوں کی پریشانی ہو رہی تھی، وہ یقیناً پریشان ہوں گے۔ میں نے متشکر نظروں سے اس لڑکے کی طرف دیکھا اور بولی۔

”میرے گھر والے پریشان ہوں گے۔“ وہ لڑکا مسکرایا اور بولا۔

”شکر ہے آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔“ میں نے پریشانی اور غصے کے ملے جلے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

”ہر انسان سے غلطی ہو جاتی ہے، مجھ سے بھی ہو گئی۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”مگر اتنی فاش غلطی؟ محترمہ آپ جان سے بھی ہاتھ دھو سکتی تھیں۔ کوئی بھی جنگلی جانور، چیتا، رینجھ یا ٹائیگر آپ کو سالم نگل لیتا۔“ شاید وہ مجھے ڈرا رہا تھا۔ مجھے غصہ آ گیا اور غصے میں جواب دیا میں نے۔

”واہ ایسے ہی سالم نگل لیتا، آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے آپ روزیہ دیکھتے ہیں۔“ وہ ہنس پڑا اور بولا۔

”ایک تو غلطی اوپر سے سینہ زوری۔“ میں غصے میں آ گئی۔ ابھی کوئی سخت جواب دینے کو تھی کہ بابا پھر آتے ہوئے نظر آئے اور میں نے اپنا ارادہ ملتوی کیا اور صرف اس لڑکے کو کھورتے پر اکتفا کیا۔

”کیسی ہو بیٹا، اب کچھ طبیعت بحال ہوئی۔ شکر ادا کرو میں وہاں آ گیا، ورنہ کوئی درندہ یا پھر انڈین درندوں کے ہتھے تم چڑھ جاتیں۔“ ابھی یہ باتیں ہوئی رہی تھیں کہ بابا جی کی زوجہ محترمہ بھی آ گئیں۔ وہ بہت محبت سے مجھ سے ملیں اور لاکھ لاکھ شکر ادا کرنے لگیں کہ میں محفوظ

ہاتھوں میں آگئی ہوں۔ انہوں نے بابا اور ذیشان سے مخاطب ہو کر کہا۔
 ”ہمیں جلد از جلد ان کی اطلاع خیریت کی ان کے والدین تک پہنچا دینی چاہیے۔ وہ بے حد پریشان ہوں گے۔“

بابا نے کہا۔ ”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو نیک بخت۔“
 اور مجھ سے میرا نام پوچھا، میں نے اپنا نام بتایا اور پھر ایڈریس بھی بتا دیا۔ گھڑا بابا نے ذیشان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ ہمیں ابھی لکھنا ہوگا تاکہ ان کے والدین کو لے کر آسکیں اور ان کی خیریت سے بھی مطلع کر دیں۔“
 ذیشان نے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں نکل پڑے۔ اتنی دیر میں اور گھڑا بابا کی زوجہ صغرا بی بی آپس میں بات چیت کرنے لگے۔

زیادہ وقت نہیں لگا۔ تھوڑی دیر میں ہی میرے والدین آگئے۔ امی نے مجھے سینے سے لگالیا اور صغرا بی بی کا شکریہ ادا کرنے لگی۔ اس پر وہ کہنے لگیں کہ ”ایسا نہ کہیں ناز بھی تو ہماری بیٹی ہی کی طرح ہے۔“ تھوڑی دیر کے بعد میں اور امی ابو واپس گھر آگئے۔ وادی کی وفات کے بعد اس گھر میں ہم نے کچھ عرصہ گزارنے کا فیصلہ کیا، پھر کچھ ایسا ہوا کہ ہمیں یہ جگہ بھاگ گئی۔ اس وادی کی خوب صورتی اور سادگی نے ہمارا دل موہ لیا اور ہم نے یہاں ہی رہنے کا ارادہ بنالیا۔ میرے والدین نے میرا داخلہ بھی وہاں کے کالج میں کرادیا اور میں وہاں پڑھنے لگی، مگر ابھی کچھ عرصہ ہی وہاں ہمارا گزارا تھا کہ اس پاس کے علاقوں کی طرح اس وادی کے حالات بھی خراب ہونے لگے۔ آئے دن فائرنگ اور دھماکے ہونے لگے۔ بھارتی فوجی کسی کے گھر بھی گھس کر بغیر تحقیق کے مطلوبہ افراد کو اپنے ساتھ لے جاتے اور اگر کوئی مزاحمت کرتا یا آواز بلند کرتا تو وہ یا تو مارا جاتا یا پھر اسے بھی دھریا جاتا اور اگلے دن اسے آٹک وادی کا لقب مل جاتا۔

روزانہ خبر ملتی فلاح جگہ سے تشدد زدہ لاش ملی، فلاں وادی میں فائرنگ کر کے نوجوان کو مار دیا۔ بعض دفعہ تو یہ ظالم فوجی بلا اشتعال کے فائرنگ کر دیتے،

بالکل ایسا ہی ایک واقعہ میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ میں اور میرے والد دریائے نیلم کے کنارے کھینچے ہوئے بچوں کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک بھارتی فوجیوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ ہم سب گولیوں کی زد میں تھے۔ میرے والد نے میرا ہاتھ تھام لیا اور ایک طرف دوڑ لگا دی۔ میں ان بچوں کو دیکھ رہی تھی اور چلا رہی تھی کہ ان کا کیا بنے گا کہ ایک نوجوان نظر آیا جو ان بچوں کو بچانے کے لیے دوڑا چلا آ رہا تھا۔ میرے والد مجھے خطرے سے دور لے آئے اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے دور چلی آئی۔ ایک محفوظ مقام پر مجھے رکنے کا اشارہ کر کے وہ واپس پلٹے، اس نوجوان کی مدد کرنے کے لیے جو بچوں کو اٹھا اٹھا کر لارہا تھا۔ انہوں نے بھی دو بچوں کو اٹھایا اور انہیں محفوظ مقام پر لانے کی کوشش کرنے لگے، اتنے میں ایک گولی سنائی ہوئی آئی اور ایک بارہ سالہ بچی کے منکے میں لگی وہ شاید یہاں پانی بھرنے آئی تھی۔ وہ ڈر کر رونے لگی۔ اس نوجوان نے بچی کا ہاتھ تھام لیا اور ایک طرف دوڑ لگا دی تو بچی نے جانے سے انکار کر دیا اور اپنے بھائی کی طرف اشارہ کیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا، مگر وہ اسے اپنے ساتھ نہ لے جاسکی۔ ظالموں کی ایک گولی اس کے بھائی کی گردن میں پیوست ہو گئی اور وہ وہیں گر پڑا۔ اس بہادر نوجوان نے بچے اور بچی دونوں کو گود میں اٹھالیا اور گولیوں کی بوچھاڑ میں ان دونوں بچوں کو خطرے سے دور لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنے میں میرے والد بھی آگئے اور انہوں نے بچے کو تھام لیا۔ محفوظ جگہ پہنچ کر انہوں نے اور اس نوجوان نے بچے کا خون روکنے کی کوشش شروع کر دی، میں بھی وہیں آگئی۔ میری نظر اس نوجوان پر پڑی تو میں فوراً پہچان گئی، وہ گھڑا بابا کا بیٹا ذیشان تھا۔ میرے والد اور ذیشان پوری کوشش کر رہے تھے، مگر اس بچے کا خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا۔ میں نے اپنا دوپٹا پھاڑ کر اسے بچانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ ایک دوپٹا اس کا خون نہ روک سکا اور آخر کار اس نے ہمارے سامنے ہی دم توڑ دیا۔ ایک ٹمھی کلی کھلنے سے پہلے ہی مڑ جھاگتی تھی۔ بچے کی بہن یہ سب دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھی۔

یہ واقعہ اور ایسے ہی بہت سارے واقعات وہاں روز کا معمول بن چکے تھے۔ یہ بھارتی ورنڈے لوگوں پر اپنا خوف اور دہشت بٹھانا چاہتے تھے اور اس کے لیے وہ ہر حد سے گزر جاتے تھے۔ وہ نوجوان لڑکیوں کو ان کے گھروں سے زبردستی اٹھا لیتے یا پھر راستے سے اغوا کر لیتے اور چند دن کے بعد ان کی لاشیں وادی یا نیلم کے پاس سے ملتی تھیں۔ نجانے کتنی ہی لڑکیاں اس وادی ”بن پورہ“ کی ان ورنڈوں کا شکار بن چکی تھیں۔

یہ حالات دیکھ کر میرے والد نے واپس دہلی جانے کا ارادہ بنالیا۔ بات بھی صحیح تھی۔ بگڑتی ہوئی صورت حال اور آئے دن کی بربریت دیکھ کر کون چاہے گا ایسے ماحول میں رہے، مگر سلام سے ان کشمیریوں کو جو یہ سب برداشت کر رہے تھے اور جمیل رہے تھے۔ میرا دل کشمیر چھوڑنے کا بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ یہاں کے لوگوں اور وادیوں سے مجھے پیار تھا، مگر والدین کے حکم کے آگے میں مجبور تھی۔ میں اب پری میڈیکل میں تھی اور آگے مزید تعلیم کے لیے مجھے یہاں سے جانا ہی تھا، سو ہم لوگ اپنا سامان بہت بدولی سے باندھنے لگے۔ میں نے والدہ سے کہا۔ امی جان میرا آج بن پورہ کے کالج میں آخری دن ہے۔ میں اپنی دوستوں کو آپ سے ملوانے لاؤں گی۔ امی نے کہا ہاں ضرور لانا۔ میں صبح جلدی اٹھ گئی اور نماز پڑھ کر وقت سے تھوڑا پہلے ہی تیار ہو گئی اور کالج پہنچ گئی۔ دل بہت اُداس تھا، اپنا آپ جو چھوڑ کر جا رہی تھی۔ میری سب سہیلیاں بھی اُداس تھیں۔ میں نے سب کو خدا حافظ کہا اور چھٹی کے بعد اپنی بھولیوں کو ملوانے میں اپنے ساتھ ہی کالج سے انہیں لے کر گھر کی جانب چل پڑی۔ گھر اور کالج کے درمیان بازار تھا۔ میری دوستوں نے کہا کہ کیوں ناکھانے کے لیے کچھ لے لیں۔ میرے منہ مٹنے کے باوجود انہوں نے سوسے لیے، ابھی ہم نے پیسے ہی دیے تھے کہ وہاں کچھ بھارتی فوجی آگئے اور ہمارے ساتھ بدتمیزی کرنے لگے۔ میں نے انہیں شرم دلائی تو ان میں سے ایک نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے اسے دھکا دے دیا اور اپنی دوستوں کو پھاگنے کا اشارہ کیا، کیوں کہ میں ان کے ارادے جان گئی تھی۔ اپنا ہاتھ چھڑوا کر میں بھاگ کھڑی ہوئی۔ بازار کے ساتھ ہی گھٹنا جنگل

تھا۔ ہم نے وہاں کا رخ کیا۔ بھاگتے ہوئے میں کسی سے ٹکرائی۔ جب دیکھا تو وہ ذیشان ہی تھا۔ میں نے ذیشان کو کہا، ہماری مدد کرو، یہ لوگ ہمیں اغوا کرنا چاہتے ہیں۔ ذیشان اس وقت نہیں سے آ رہا تھا اور اس کے پاس گن بھی تھی اس نے مجھے تسلی دی اور کہا فکر نہ کرو، اللہ نے چاہا تو یہ سب میرے ہاتھوں واصل جہنم ہوں گے۔ اب ہم تمھیں درختوں کے درمیان میں تھے۔ ذیشان اکیلا تھا اس کے پاس صرف ایک گن تھی، مگر وہ مردانہ وار ان چاروں بھارتی ورنڈوں سے لڑ رہا تھا۔ وہ ہماری ڈھال بن گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ زخمی ہو گیا تھا، مگر وہ لڑتا رہا پھر اس نے ہمیں وہاں سے نکلنے کو کہا اور مجھے اور میری دوستوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے جانا پڑا۔ ہم اپنے اپنے گھر میں چلے گئے۔ صبح خبر ملی کہ ذیشان مارا گیا، مگر یہ خبر بھی ملی کہ اس کے اوپر الزام آیا ہے کہ وہ بھارتی فوجیوں کو مجاہدین کی تحریک کر رہا تھا کہ اسے گولی لگی۔ یہ افواہ کیسے پھیلی۔ یہ پتا نہیں، مگر یہ سراسر الزام تھا۔ اس نے تو ہمیں بجاتے ہوئے جام شہادت نوش کیا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں گزارا بابا کے پاس بے تابانہ چلی گئی۔ وہاں پہنچی تو ان کو قرب المرگ پایا اور جب لوگوں نے بتایا کہ وہ کس وجہ سے اس تکلیف دہ کیفیت میں ہیں تو میں نے فیصلہ کیا کہ سب کچھ کھل کر بیان کر دوں گی، تاکہ ان کو اس تکلیف سے نجات ملے، جس نے انہیں اس حال کو پہنچا دیا ہے، پھر سب تفصیلات میں نے بیان کر دیں، جو کہ میں پہلے لکھ چکی ہوں۔

یہ میرا مقبوضہ کشمیر میں آخری دن تھا۔ میں اپنے ساتھ بہت سی یادیں لے کر جا رہی تھی۔ ذیشان کی شہادت اور گھڑا بابا کی موت۔ تمام راستے میں دعا کرتی رہی کہ یا اللہ! میرے کشمیر کو ان ظالموں کی قید سے آزادی دلا، تاکہ وہ سکھ چین سے اپنی زندگیاں بسر کر سکیں۔ آپ سب بھی ان کے لیے دعا کریں کہ خدا انہیں ان کی قربانیوں کا صلہ دے اور وہ آزادی کی زندگی گزار سکیں۔ (آمین)

☆.....☆



ہمدردی کے دیپ جلائی ایک خوب صورت تحریر

میرا نام فاطمہ ہے۔ دو بھائیوں اور تین بہنوں میں میرا نمبر سب سے آخری ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ میرے وجود کی موجودگی اور عدم موجودگی کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے۔ والد اور والدہ دونوں خالص دیہاتی ماحول کے ایسے اُن پڑھ والدین تھے، جن کی نظر میں بچوں کی تعداد میں اضافہ عین حکم رسی اور گھر اور باہر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لیے دو ہاتھوں کا اضافہ مانا جاتا تھا۔ شروع میں میرے دونوں بڑے بھائی قریبی سرکاری اسکول میں تعلیم حاصل کرنے جایا کرتے تھے، مگر جلد ہی سرکاری ماسٹر کے طریقہ تعلیم سے اکتا گئے کہ یہ ماسٹر بچوں کو انسان کم اور مرغزا زیادہ بناتے تھے، لہذا ان کی تعلیم بالترتیب جماعت چہارم اور پنجم سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکی، لیکن خدا کی قدرت دیکھیے کہ اسی ماحول میں رہتے ہوئے میں نے نہ صرف میٹرک (سرکاری اسکول) سے کر لیا، بلکہ آج کل پرائیوٹ ایف ایس سی کی تیاری بھی کر رہی ہوں۔ اس تعلیم کے حصول میں مجھ سے زیادہ میری سب سے بڑی بہن کو کریدٹ جاتا ہے، جنہوں نے ایک ماں کی طرح نہ صرف ہر صبح تیار کر کے اسکول بھیجنے کی

میری ذمہ داری اٹھائی، بلکہ اس راہ میں آنے والی مشکلات کا حل بھی نکالتی رہیں۔ میں تاحیات اُن کی مشکور بھی رہوں گی اور دعا گو بھی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کا مستقبل اتنا روشن کرے، جتنا انہوں نے میرے ذہن و دل کو تعلیم کی روشنی سے منور کر کے کیا ہے۔ میٹرک تک کی سرکاری اسکول کی ذمہ داری تو جیسے تیسے کر کے بابا نے اٹھائی لی، مگر ایف ایس سی کے لیے انہوں نے صاف منع کر دیا کہ آگے تعلیم دلانا اُن کے بس سے باہر ہے۔

اس کا حل بھی باجی نے ہی نکالا۔ وہ یوں کہ گاؤں کے جن گھروں کے بچے سرکاری ماسٹر کے ستائے ہوئے تھے اور اُن کے والدین واقعی انہیں پڑھانا چاہتے تھے، باجی نے انہیں مجھ سے ٹیوشن پڑھنے پر لگا دیا۔ قدغن تو ہمارے اس عمل پر بھی خوب لگائی گئی کہ دیکھو تو بالشت بھر کی چھو کر ہے، اپنے سے لے لے لڑکوں کے سامنے بیٹھ کر اُن کو پڑھائے گی۔ اس کے تو ماں باپ کے دیدوں میں پانی اُتر آیا ہے، مگر کیا کیا جائے گاؤں کے ماحول اور آب و ہوا کا کہ جماعت پنجم تک پہنچتے پہنچتے یہاں کے لڑکے نہ صرف قد میں اپنے باپوں سے لے ہو جاتے، بلکہ کچھ کے تو

چہروں پر بھی جوانی کے آثار نظر آنے لگتے۔ جن چند بچوں نے شروع میں مجھ سے ٹیوشن پڑھی، وہ نہ صرف سرکاری ماسٹر کے مولا بخش سے محفوظ ہو گئے، بلکہ مرغزا بن کر گزروں کوں کرنے کے بجائے انسان بن کر باعزت طریقے سے اپنے تعلیمی مدارج طے کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے میرے پاس پڑھنے والے لڑکے اور لڑکیوں کی خاصی تعداد جمع ہو گئی اور اس سلسلے کا سب سے بڑا فائدہ ہماری معاشی پریشانیوں میں سونی حد حل کی صورت میں حاصل ہوا، جس نے بدخواہوں کی لن ترانیوں پر بھی پردہ ڈال دیا۔

مجھے تعلیم کے حصول کا جنون اور نصابی کے علاوہ دیگر غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا بھی بہت شوق تھا۔ اس کے لیے مجھے مواقع تو بہت زیادہ میسر نہ تھے، مگر جہاں سے جتنا ادبی مواد مل جاتا میں اسے پڑھ ڈالتی اور اسی پڑھنے کے شوق نے مجھے اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے واقعات کو صفحہ قرطاس پر بکھیرنے کا حوصلہ دیا اور اس حوصلے نے بھی کسی حد تک مجھے معاشی مدد

فراہم کی۔

یقیناً قارئین میرا پس منظر اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے، لیکن میری کہانی تو ابھی شروع ہوئی ہے، یہ پھر بھی سہی..... آج تو یہ چند الفاظ قرطاس پر بکھیرنے کا مقصد اپنے پاس پڑھنے کے لیے آنے والے بچوں میں سے ایک بچے مظہر کی انتہائی اداسی صورت کے پیچھے چھپی ایک کہانی بیان کرنا ہے۔ دراصل میں نہ صرف بچوں کو پڑھاتی ہوں، نصاب کی تعلیم دیتی ہوں، بلکہ اُن کو دیگر اسلامی کہانیاں اور واقعات بھی بگا ہے سناتی رہتی ہوں اور اُن کی پریشانیوں اور الجھنوں کا احوال سن کر اُن کی مدد یا پھر صرف بعض اوقات زبانی کاؤنسلنگ کے ذریعے ہی اُن کی بھرپور مدد کرتی ہوں اور آج بھی یہی ہوا۔

مظہر کے اداس اور پریشان چہرے کو دیکھ کر میں نے اُس سے پوچھا ”کیا بات ہے آج تم اس قدر اداس کیوں ہو۔“ میرے اس سوال کا اُس نے جو جواب دیا، وہ اس قدر بُرد اور دہنی بر سچائی تھا، کہ



میں نے سوچا یہ واقعہ ”بچی کہانیاں“ کے قارئین سے بھی شیئر کیا جائے کہ یہ سچا واقعہ زندگی میں حاصل ہونے والے اسباق میں سے ایک سبق ہے۔ اور اس کے دوست ارباز کی ذات سے متعلق ہے جو کہ جماعت نہم میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ مظہر نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ ”باجی کل میں جب صبح اسکول جا رہا تھا تو ابو نے مجھے ایک اسپتال کی رسپدی اور کہا کہ مظہر بیٹا اسکول سے واپسی پر اپنی امی کے خون کی رپورٹ اسپتال سے لیتے آنا، کیوں کہ تمہارے اسکول سے واپسی کے راستے پر ہی تو یہ سرکاری اسپتال پڑتا ہے، لہذا اسکول سے چھٹی کے بعد میں اسپتال چلا گیا۔ یہاں سرکاری اسپتال میں بہت رش ہوتا ہے۔ میں رپورٹ لینے کے لیے لائن میں لگا ہوا تھا اور اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک میری نظر ارباز پر پڑی۔ ارباز میرا ہم جماعت تھا اور بہت زیادہ شرارتی اور دوسروں کو تنگ کر کے مزہ لینے والا لڑکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ارباز ایک انتہائی بوڑھی خاتون سے باتیں کر رہا ہے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ اس کی دادی یا نانی وغیرہ ہوں گی، مگر چوں کہ وہ دونوں مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑے تھے، لہذا ان دونوں کے درمیان ہونے والی بات چیت میں آسانی سے سن سکتا تھا۔ وہ بوڑھی خاتون، جن کو دکھائی بھی کم دیتا تھا، وہ ارباز سے کہہ رہی تھیں۔ ”بیٹا تم یہ سو روپے لے لو، کیوں کہ سامنے والی کینٹین پر بڑا رش ہے اور میں بوڑھی جان ہوں، وہاں تک پہنچ نہ پاؤں گی اس لیے بیٹا ذرا مہربانی کر کے وہاں سے میرے لیے ایک پانی کی بوتل چھوٹی والی اور ایک بن کباب لا کر دے دو۔ میں نے ناشتے سے پہلے والا خون ٹیسٹ کر لیا ہے، اب مجھے ناشتا کر کے دوبارہ کرانا ہے۔ اگر اب میں گھر جا کر واپس آؤں گی تو مجھے بہت دیر ہو جائے گی اور ایک بڑی سڑک بھی تو کراس کرنا پڑتی ہے، اسپتال کے سامنے ہی۔ اگر تم یہ دونوں چیزیں لا دو تو تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔“

ارباز نے جی اچھا اتنا کہہ کے بڑی تابعداری سے اپنی گردن ہلائی، جیسے کہ وہ بہت

ایمان داری سے بڑی بی کی مدد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ بہت شرارتی ہے، ضرور یہ بی اتناں کو چکمہ دے کر نکل جائے گا اور پھر ہوا بھی نہیں۔ میں نے دیکھا کہ بوڑھی اتناں سے وہ سو روپے لے کر کینٹین کے رش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے باہر مین گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ جب تک میری رپورٹ لینے کی باری آچکی تھی۔ میں نے رپورٹ جیب میں رکھی اور باہر کی طرف بڑھا تو میری نظر بوڑھی خاتون پر پڑی، جو حلیے سے بہت غریب دکھائی دیتی تھیں اور اب وہ بہت پریشان نظر آ رہی تھی، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ رونے کے قریب تھی اور بار بار کینٹین کی جانب دیکھ رہی تھی کہ جہاں رش مزید بڑھ گیا تھا۔ میرے دل میں اچانک ایک خیال آیا کہ صبح امانے جو سو روپے بچ اور کرائے کے لیے مجھے دیے تھے، وہ میری جیب میں پڑے ہیں، کیوں نہ میں ان روپوں سے اس بوڑھی خاتون کی مدد کروں، جو بہت پریشان نظر آ رہی ہیں۔ میرا کیا ہے، میں تو اکثر ہی پیسے بچانے کے لیے پیدل گھر چلا جاتا ہوں۔ اپنے دل میں یہ خیال آتے ہی میں جلدی سے کینٹین کی جانب بڑھا اور پانی کی چھوٹی بوتل اور بن کباب لے کر ان بوڑھی خاتون کی طرف بڑھا اور دونوں چیزیں ان کو تھمتے ہوئے بولا۔ اتناں رش بہت زیادہ تھا، اس لیے دیر ہوگئی۔ یہ لیس آپ کی چیزیں اور یہ رہے آپ کے بقیہ چالیس روپے۔ میرے ہاتھ سے چیزیں اور بقیہ روپے لیتے ہوئے بوڑھی اتناں نے مجھے بہت ساری دعا میں دیں کہ بیٹا اللہ تم کو بہت خوشیاں دے، جگ جگ آباد رہو، خوب پڑھو اور بڑے آدمی بنو اور میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ان بوڑھی امماں نے مجھے ارباز ہی سمجھا اور ان کو اس کی شکل یاد نہیں رہی تھی۔ اس لیے وہ مجھے وہی لڑکا سمجھ کر دعا میں دیتی رہیں، جب کہ ارباز تو کب کا ان کے سو روپے لے کر فو چکر ہو چکا تھا۔ بہر حال میرا مقصد دکھاوا تو تھا نہیں، میں نے تو محض انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت یہ کام سر انجام دیا تھا۔“

مظہر مجھ سے بولا! ”باجی آپ نے ہی تو ایک دن بتایا تھا کہ صرف ان کو ہی دینا ثواب کا کام نہیں جو مانگ کر کھاتے ہیں، بلکہ ان کو دینا بھی ثواب کا کام ہے جو کسی مصیبت میں گرفتار ہوں، خود دار ہوں، مانگ نہ رہے ہوں اور کسی کی مدد کرنے کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ اُسے بتایا جائے اور بتایا جائے، بلکہ نیکی کے یہ کام تو انسان اللہ تعالیٰ کے لیے کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ایک ہاتھ سے دودو دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ بہر حال مجھے گھر پہنچنا تھا۔ میں جلدی سے باہر نکلا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر پہنچا اور رپورٹ اپنی امی کو پکڑائی اور کمرے میں جا کر اگلے دن جو میرا ریاضی کا ٹیسٹ تھا، اُس کی تیاری کرنے لگا۔ چوں کہ اپنے اس ہفتے کا پورا جب خرچ تو میں خرچ کر چکا تھا، اس لیے اب مجھے صبح اسکول بھی پیدل ہی جانا تھا اور لچ کے پیسے بھی نہ تھے، مگر میں مطمئن تھا کہ میں نے اپنے پیسے بلا مقصد نہیں گنوائے۔ اگر ایک دن پیدل چلنا پڑے اور لچ نہ کروں، تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

مظہر مجھ سے کہہ رہا تھا ”باجی آج صبح جب

میں اسکول پہنچا تو نوٹس بورڈ پر لگا ہوا تھا کہ آج کا ٹیسٹ کینسل ہو گیا ہے، کیوں کہ کل شام ان کی کلاس کا ایک طالب علم جلد بازی میں روڈ کراس کرتے ہوئے ایک ٹریکٹر کے نیچے آ کر جاں بحق ہو گیا اور آج اُس کی دعائے مغفرت کے لیے قرآن خوانی رکھی گئی ہے۔ کلاس کے تمام طلباء اور اسٹاف ممبرز سے شرکت کی درخواست ہے۔ نیچے طالب علم کا نام لکھا ہوا تھا اور یہ نام پڑھ کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا اور کل صبح کا اسپتال والا سارا واقعہ میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ نوٹس کے نیچے بڑے بڑے حروف میں طالب علم کا نام لکھا تھا۔ ارباز علی خان“

یہاں تک یہ واقعہ سنا کر مظہر ہچکیوں سے رونے لگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک اعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور امانت میں خیانت کرنے جیسی لعنت سے دور رکھے۔ ضروری نہیں کہ ہر بڑے عمل کا انجام دنیا ہی میں مل جائے، لیکن اس جیسے چند واقعات دکھا کر خالق کائنات نے انسانوں کے لیے درعبرت ضرور کھول رکھا ہے۔

☆.....☆

قارئین متوجہ ہوں

کیا آپ کو پرچہ نہیں ملتا؟

کچھ عرصے سے کئی شہروں سے یہ شکایات موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچہ نہیں ملتا۔ ایجنٹ حضرات کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے قارئین سے ہماری التماس ہے کہ پرچہ نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط لکھ کر یا فون کے ذریعے درج ذیل معلومات فراہم کریں۔

بکس اسٹال کا نام۔ جہاں پرچہ دستیاب نہیں۔ شہر اور علاقے کا نام۔ اگر ممکن ہو تو بک اسٹال کا سٹل نمبر یا لینڈ لائن نمبر راجے اور مزید معلومات کے لیے

محمد اقبال زمان

0300-2313256

پریل پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ

110-آدم آرکیڈ-شہید ملت روڈ/بہادر شاہ ظفر روڈ-کراچی

بگھڑا موتی پچن لیا

شازیہ گل

راگ نبر کے ذریعے زندگی کا حسین روپ پانے والی ایک زندہ کہانی

آج تک آپ نے دور جدید کی ایجادات کے استعمال کے منفی نتائج کی کہانیاں پڑھی ہوں گی، مگر آج جو کہانی میں سنارہی ہوں وہ ایک سچی کہانی ہے اور میں شکر گزار ہوں، دور جدید کی ایجاد جسے موبائل کا نام دیا جاتا ہے۔ آپ بھی حیران ہوں گے کہ موبائل کو تو معاشرے میں زہر قاتل سمجھا جا رہا ہے، نوجوانوں کے لیے۔ اسے وہ لوگ بھی بُرا کہتے ہیں جو اس کے بغیر ایک پل بھی نہیں گزار سکتے۔

ہوا کچھ یوں کہ میں یعنی شازیہ گل آٹھویں کلاس میں تھی۔ میں اس وقت بھی ڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھتی تھی۔ میں نے ایک کہانی پڑھی جس کا عنوان تھا (خاموش صدا) وہ مجھے بہت اچھی لگی اور میرے دل سے بے ساختہ یہ دعا نکلی، یا خدا کتنا اچھا ہوا اگر مجھے بھی کوئی ایسا ہی اُن دیکھا، انجانا انسان ملے اور بنا دیکھے وہ مجھ سے محبت کرنے لگے، شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔

اس دن میں بہت اُداس تھی۔ میرے امی ابو میرے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے اور ہم دو ہی بہن بھائی تھے۔ بھائی مجھ سے 10 سال بڑا تھا اور امی کے مرنے کے دو سال بعد بھائی کی شادی ہو گئی تھی۔ بھائی سخت مزاج تھیں، ہر وقت لڑنا جھگڑنا ان کی عادت تھی۔ آج بھی وہ

وہ 10 جولائی 2007ء کی رات تھی، مسلسل کال آ رہی تھی، مگر میں ریسیو نہیں کر رہی تھی، ڈر رہی تھی کہ نجانے کون ہو، سوچا صبح ساتھ والی باجی کے گھر جا کر خود ہی کال کر کے منع کر دوں گی اور سوری کر کے بات ختم کر دوں گی، کیوں کہ ابھی تو چھٹیاں ہیں، مگر چھٹیوں کے بعد تو میرا موبائل گھر پر ہی ہوگا، کیوں کہ موبائل اسکول لے جانے کی پرمیشن نہیں تھی، اس لیے مسئلہ نہ بن

جائے۔ خدا خدا کر کے رات گزری، صبح ہوئی تو میں ساتھ والی باجی کے گھر گئی۔ وہاں جا کر کال ملائی۔ دوسری طرف کال ریسیو ہوئی۔ نیند میں ڈوبی آواز۔

”ہیلو! السلام علیکم۔“

”جی! وعلیکم السلام! جی کس سے بات کرنی ہے؟“

دوسری طرف سے کال اٹھانے والے نے کہا۔

ریکوسٹ ہے کہ پلیز آپ اب مجھ سے دوستی کر لیں۔“

تو میں نے جواب دیا کہ ”سوری میں لڑکوں سے دوستی نہیں کرتی۔“

تو کہنے لگا۔ ”دوستی نہیں کرتی تو نہ سہی، پلیز آپ مجھ سے انسانیت کے نام سے بات کر لیں۔ ہم ایک دوسرے سے ڈکھ سکھ تو شیئر کر سکتے ہیں۔“ نجانے کیوں دل نے کہا



میں نے کہا۔ ”جی دیکھیں سر! مجھے آپ سے ہی بات کرنی ہے۔ سوری دراصل کل مجھ سے غلطی سے آپ کے نمبر پر میسج سینڈ ہو گیا تھا، مگر آپ رات بھر بار بار کال کر کے مجھے پریشان کرتے تھے۔ دوسری طرف سے کہا گیا! ”دیکھیں مس! میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کون ہے جس نے مجھے میسج کیا ہے، بہر حال اب میں آپ کو تنگ نہیں کروں گا۔ ہاں ایک

کہ اس پر اعتبار کر لو، میں نے اس کی دوستی قبول کر لی۔ اس نے اپنا نام ارشاد بتایا۔ پیار سے سب اسے گل کہتے ہیں۔ گل کے بھی امی ابو فوت ہو چکے تھے، بہنیں شادی شدہ تھیں۔ بھائی بھی اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف تھے۔ گل نے اپنے دوست کے گھر رہائش اختیار کی ہوئی تھی۔ اس کے دوست سنی کے ماں باپ نے اسے بیٹا بنایا ہوا تھا اور واقعی وہ حقیقی ماں باپ سے بڑھ کر محبت کرتے تھے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں تھا۔ بھائی نے مجھے آواز دی۔ شادی چائے لے کے آؤ۔ میں نے چائے لا کر رکھی تو اس نے دھیرے سے نظریں اٹھائیں۔ وہ میری سوچ سے بھی کہیں زیادہ پیارا تھا۔ میں بھی اسے بہت اچھی لگی۔ بس ایک دن وہ رکا اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے وہ چلا گیا۔ دوسری بار اپنے بڑے بھائی اور بھائی کو لے کر آ گیا۔ انہوں نے میرے رشتے کی بات کی۔ میرے بھائی نے سوچے کا ٹائم مانگا اور پھر کچھ ماہ بعد ہماری منگنی ہو گئی۔ اس دوران ہماری روز فون پر بات ہوتی رہی۔ میں نوں کلاس میں پہنچ گئی تھی۔

وہ رات 11 بجے کال کرتا تھا تو بات کرتے کرتے صبح 7 بج جاتے تھے۔ میری بڑھائی ڈسٹرب ہونے لگی تھی۔ میں اسے منع کرتی کہ ایک گھنٹا بات کیا کرو، مگر اس کا دل ہی نہیں بھرتا تھا، بات کرنے سے۔ اسی طرح میں نے میٹرک کر لیا اور میری شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور یوں میں رخصت ہو کر اپنے ساجن کے گھر آ گئی۔

میرے سسرال میں سب بہت اچھے ہیں۔ میری نندیں، دیور، دیورانیوں سب لوگ بہت پیار کرنے والے ہیں۔ ساس سسر اور ماں باپ کی کمی تو سنی کے ماں باپ نے پوری کر دی۔ انہیں ہم بھی ماما، پاپا کہتے ہیں۔

میری شادی کا پانچواں سال ہے اور خدا کا شکر ہے ہماری زندگی روز اول کی طرح حسین ہے۔ گل کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ہمارے دو پیارے پیارے بچے ہیں۔ ذیشان اور حجاب۔ ذیشان چھوٹا ہے اور حجاب 3 سال کی ہونے والی ہے۔ ہمارا گھر ہماری جنت ہے۔ گل نے میرے ہی گاؤں میں میرے لیے گھر بنایا ہے۔

مجھے ایک میسج سے اتنا پیارا جیون سا بھی مل گیا، مگر یہ اس صبر کا پھل ہے جو میں نے بھائی کے ظلم و ستم برداشت کر کے کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا۔

گل کا ملنا تو میرا نصیب تھا، مگر میں نے اس کے سوا کبھی کسی راجگ نمبر کو نہیں ریسو کیا۔ آج میری زندگی مثالی زندگی ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ پلیز میرے لیے دعا کریں کہ خدا ہماری زندگی کو نظر بد سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

☆.....☆

اس کی زندگی بھی کچھ میری طرح ہی تھی۔ وہ آر کے کام کا بہترین کاریگر تھا۔ گل کی آواز بھی بہت خوب صورت تھی، جو کسی بھی لڑکی کو اپنے سحر میں گرفتار کر سکتی تھی۔ سو مجھے بھی اس کی آواز نے اپنی طرف کھینچنے پر مجبور کیا۔ ایک دن دوستی ہوئی، دوسرے دن بنا دیکھے اس نے مجھ سے محبت کا اظہار کر دیا اور تیسرے دن کہنے لگا۔ کیا آپ مجھ سے شادی کروگی۔ میں تو حیران رہ گئی۔ میں نے کہا۔ ”گل آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے، نہ میں آپ کے بارے میں جانتی ہوں۔ بنا جانے آپ اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں۔“ تو گل کہنے لگا۔

”مجھی محبت شکل صورت نہیں دیکھتی، یہ تو روح کی محبت ہوتی ہے، ہاں اگر آپ مجھے دیکھ کر پسند کر کے شادی کرنا چاہتی ہو تو پھر اور بات ہے۔“

میں نے کہا! نہیں میں بھی شکل و صورت کی قائل نہیں، ہاں یہ فکر ہے کہ آپ میرے گھر والوں سے رشتہ کیسے مانگو گے، تو اس نے کہا آپ مجھے اپنا بیٹا بتاؤ، آپ رہتی کہاں ہو؟

جب میں نے اپنے گاؤں کا نام بتایا تو وہ کہنے لگا۔ ”ارے واہ وہاں تو میرا ایک دوست بھی رہتا ہے۔“ جب اس نے دوست کا بتایا تو میں حیران ہوئی، کیوں کہ جو نام وہ بتا رہا تھا وہ میرے بھائی کا نام تھا۔

میں نے کہا ”سیل نمبر بتاؤ۔“ تو کہنے لگا۔ تم کیا کرتی ہو۔ میں نے کہا جو نام آپ نے بتایا ہے وہ میرے بھائی کا ہے، پھر جب اس نے سیل نمبر بتایا تو واقعی وہ میرے بھائی کا نمبر تھا۔ میں نے کہا کہ آپ تو میرے ہی بھائی کے دوست ہیں اور شاید اتفاق بھی اسی کو کہتے ہیں۔ یہ سن کر تو وہ بہت خوش ہوا۔

پھر تو روز وہ بھائی سے باتیں کرتا۔ اس نے بھائی کو پشاور آنے کی دعوت دی۔ بھائی نے اسے اپنے گھر آنے کی، پھر عید قریب تھی۔ اس نے آنے کا وعدہ کیا، شاید تقدیر میرا ساتھ دے رہی تھی۔ بھائی کا یہ واحد دوست تھا جسے بھائی اپنے گھر لے کے آئے۔ بھائی نے بھائی کو کہا کہ میرا بہت اچھا دوست بہت دور سے آرہا ہے، اس لیے کچھ اچھے سے تیاری کرنا۔ تقریباً دو ڈھائی بجے کے قریب بھائی اسے لے کر گھر آئے۔ اس سے پہلے ہم

مسئلہ یہ ہے

خلق خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ خلق خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے اولین شمارے سے شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورت حال یہ ہو گئی کہ اگر ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپر وڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دعا اور مسلمانوں و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دُعا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعا کے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپر وڈاک کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/- روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مدد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحب استطاعت حضرات نوکین منی 300/- روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسب استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

- (1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جوہلے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔
- (2)..... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے نام ارسال کریں۔
- (3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ 110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ۔ کراچی

□ کلثوم فوزیہ۔ کراچی
☆ بیٹی کلثوم! مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو تاکہ تمہیں تفصیل سے جواب دیا جاسکے۔

□ نعمان۔ کراچی
☆ بیٹے نعمان، تم چاہتے ہو کہ تمہارا مسئلہ شائع نہیں کیا جائے، لہذا صرف جواب دے رہا ہوں۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 3-3 صبح پڑھو، ”یارِ مومن“ مدت ایک ماہ ہے۔

□ ن م۔ اسلام آباد
o باباجی السلام علیکم۔ میری شادی میری مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ والدین کا دباؤ زیادہ تھا۔ جب سے شادی ہوئی ہے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ گھر میں لڑائی جھگڑا زیادہ رہتا ہے۔ میں بہت پریشان رہتا ہوں۔ اپنی بیوی کو طلاق دے دوں، دوسری شادی کر لوں۔ والد نہیں چاہتے کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دوں۔ میرے والد نے میری بیوی کو بہت سمجھایا لیکن وہ کسی کی بات نہیں سنتی۔ اب میں حالات کی وجہ سے بہت اکتا گیا ہوں۔ کیا میرے حالات کبھی ٹھیک ہوں گے باباجی! پلیز کچھ ایسا وظیفہ اور تعویذ دیں کہ میری دوسری شادی بھی ہو جائے، میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔ کیا میں دوسری شادی کر لوں؟

☆ بیٹے ن م۔ تمہارا برتاؤ اپنی بیوی کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔ اب تمہاری بیوی ضدی ہو گئی ہے۔ تمہارے ذہن میں یہ بیٹھا ہوا ہے کہ تمہاری شادی تمہاری مرضی کے خلاف ہوئی ہے۔ فی الحال نبھانے کی کوشش کرو اور نماز پنجگانہ کو معمول بناؤ۔ دوسری شادی کے بارے میں نومبر 2014ء کے بعد سوچنا۔ تم بھی اپنے رویے میں نرمی پیدا کرو۔ ممکن ہے حالات ٹھیک ہو جائیں۔ ہر نماز کے بعد حاجی یا قیوم 300 بار پڑھو۔

□ زبیدہ شاہنواز۔ گھوٹکی
o پیارے باباجی! میرے شوہر پچھلے 7 سالوں سے انگلینڈ میں تھے، اب واپس آ گئے ہیں، اب یہاں کوئی کاروبار کرنا چاہتے ہیں۔ پلیز استخارہ کر کے بتائیے کہ دوبارہ بیرون ملک جانا بہتر ہے یا نہیں؟

☆ بیٹی زبیدہ! بیرون ملک جا کر کاروبار کرنے کا امکان کم ہے۔ تمہارے شوہر کو یہیں کاروبار کرنا

چاہیے۔ گیس یا تیل سے منسلک کاروبار تمہارے شوہر کے لیے فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ 2014ء کے آخر میں احتیاط برتو بھروسہ کرنے میں محتاط رہو، مالی طور پر سے نقصان یا دھوکے کے امکانات ہیں، مالی لین دین میں حقائق کا صحیح تجزیہ کرو۔ تمہارے شوہر سمجھ دار اور محنتی ہیں، کاروبار کرنے میں مالی ترقی کی نشان دہی ہے مگر نماز کی پابندی کرو۔ یا لطیف یا کریم کا ورد ہر نماز کے بعد بکثرت کرو۔ مزید کامیابی کے لیے آفس سے تعویذ منگوا لو۔

□ محترم علی۔ ٹنڈو آدم
o باباجی! میں کاروبار کر رہا ہوں۔ 4 سال سے نقصان ہو رہا ہے کیا میں اس کاروبار کو جاری رکھوں یا کاروبار کو تبدیل کر لوں۔ میں یہ کاروبار ایک دوست کی شراکت میں کر رہا ہوں۔ نقصان کی وجہ سے ہم دونوں پریشان ہیں۔ ہمارے حالات کب ٹھیک ہوں گے۔ میرے لیے مناسب وظیفہ تجویز کر دیں۔ اس وظیفے کو کب اور کس طرح کرنا چاہیے؟

☆ بیٹی محترم! تمہارے حالات ظاہراً ٹھیک لگ رہے ہیں۔ کاروبار کے سلسلے میں حقائق کا تجزیہ کرو اور اس کاروبار کو جاری رکھو۔ حالات حاضرہ کے تحت اپنے کاروبار میں جدت پیدا کرو۔ اگلے 6 ماہ اہم ہیں۔ اخراجات کو قابو میں رکھیں۔ دھیرے دھیرے مالی طور سے حالات ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ کاروبار کی وسعت کے لیے نماز کی پابندی کرو۔ نماز مغرب کے بعد سورۃ واقعہ کی تلاوت کر کے پانی دم کرو اور کاروبار کی ترقی کے لیے آفس سے تعویذ منگوا لو۔

□ مارہ۔ حیدر آباد
o پیارے باباجی! السلام علیکم میرے شوہر نے مجھ سے پوچھے بغیر دوسری شادی کر لی۔ 4 سال ہو گئے ہیں مگر میرے اولاد نہیں ہوئی۔ میرے شوہر کا برتاؤ میرے ساتھ صحیح ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے شادی صرف اولاد کی وجہ سے کی ہے۔ مجھ سے یہ شادی برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ کوئی وظیفہ، تعویذ بتائیں کہ میں بھی اولاد کی خوشی دیکھ سکوں۔

☆ بی بی مائرہ! میانہ روی سے کام لو، صورتحال بہتر ہو رہی ہے، مثبت پہلو کو مد نظر رکھو اور حالات سے سمجھوتہ کرو۔ نماز بیگانہ معمول بناؤ حالات ٹھیک ہو سکتے ہیں، خود اعتمادی سے کام لو۔ نماز کی پابندی کرو اور ہر ماہ ایک مخصوص رقم کسی ضرورت مند کو صدقے کی مد میں دیا کرو۔ نماز عصر کے بعد سورۃ الفجر دو بار پڑھنا معمول بناؤ۔ 41 دن تک اور حالات کی بہتری کے لیے آفس سے تعویذ منگوا لو۔

□ احسان الرحمن - حیدر آباد

○ باباجی! الیکٹریکل انجینئر ہوں 5 سال میں نے پرائیویٹ ملازمت کی ہے۔ گورنمنٹ کی ملازمت کی ہے۔ گورنمنٹ کی ملازمت کے لیے کوشش کی، اس کے علاوہ 12 جگہ انٹرویوز دیے لیکن گورنمنٹ کی اچھی ملازمت ملنے میں ناکامی ہوئی۔ اب نوکری چھوڑ کر الیکٹریکل اسٹور کھول لیا ہے، کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ کچھ ایسا وظیفہ دیں کہ اچھی ملازمت مل جائے۔

☆ بی بی احسان الرحمن! اچھی ملازمت کے لیے کوشش جاری رکھو اور اپنے اسٹور کو بھی چلاتے رہو۔ نماز کی پابندی کرو سورۃ واقعہ ہر نماز عشاء کے بعد ایک بار پڑھو۔ بہتر حالات اور اگلے برس تک مالی ترقی کی نشاندہی ہے۔ ترقی کے لیے آفس سے تعویذ منگوا لو۔

□ ارسلان احمد - شیخوپورہ

○ باباجی۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے، وہ اسکول ٹیوشن پڑھنے جاتا ہے، اس کا پڑھائی میں دل نہیں لگتا، وہ شرارتیں زیادہ کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا دھیان پڑھائی میں زیادہ لگے۔ اس کا نام محمد میر احمد ہے۔ سب لوگ کہتے ہیں کہ یہ نام ٹھیک نہیں ہے، دوسرے میری آمدنی بہت کم ہے۔ میرے حالات کب ٹھیک ہوں گے۔ بچے کا بھی پڑھائی میں دل لگے۔

☆ بی بی ارسلان۔ تمہارے بیٹے کا نام ٹھیک نہیں ہے، اس کا نام تبدیل کر کے "نویذ" رکھ دو، یہ بہتر اور مناسب ہے۔ غیر دانستہ طور سے تمہارا برتاؤ بیٹے کے ساتھ ٹھیک نہیں، اس کی ہر بات ماننا ٹھیک نہیں، پڑھائی کے لیے اسے وقت کی پابندی کراؤ۔ ذرا سختی کرو، نام کی

تبدیلی سے بھی فرق پڑ سکتا ہے۔ تمہارے کاروبار کے لیے تعویذ لکھ دیا ہے۔ آفس سے منگوا لو۔ آمدنی میں اضافہ ہو سکتا ہے، نماز کی پابندی کرو، سب کچھ بہتر ہو جائے گا۔

□ ام اصغر - ساہیوال

○ باباجی! میرا بھائی 7 سال سے گڈز ٹرانسپورٹ یعنی ٹرک کے ذریعے سامان تجارت مختلف شہروں میں لے جانے کا کام کرتا ہے۔ اکثر مالی پریشانی رہتی ہے، کچھ فائدے کے بعد نقصان ہو جاتا ہے، اکثر مالی پریشانی رہتی ہے۔ وہ اپنا کاروبار تبدیل کر رہے ہیں، استخارہ کر کے بتائیے کہ کون سا کام مفید رہے گا۔ پولٹری فارم، ریسٹورنٹ یا بیرون ملک ملازمت کی کوشش..... باباجی اسی ماہ جلدی جواب دیجیے، ابھی تک بھائی کی شادی بھی نہیں ہوئی ہے، بات بنتے بنتے بگڑ جاتی ہے۔ پلیز دعا فرمائیں۔

☆ بی بی ام اصغر! بھائی جو کام کر رہا ہے وہی مناسب ہے۔ گڈز ٹرانسپورٹ کا کام جاری رکھے، اپنے ٹرک کو کسی کو ٹھیکے پر دے دے یا فروخت کر دے، صرف سامان تجارت کی بکنگ کا آفس پر قرار رکھے اور کمیشن پر دوسرے ٹرانسپورٹ کے ذریعے سامان تجارت کو بھجوائے، اگر ٹرک فروخت کر دے تو زیادہ بہتر ہے۔ پولٹری فارم یا فوڈ ریسٹورنٹ چلانا تمہارے بھائی کے لیے نقصان دہ ہے۔ تمہارا بھائی دوسروں پر بھروسہ آسانی سے کر لیتا ہے۔ ایک جگہ بیٹھ کر کمیشن کا کام آسانی سے کر سکتا ہے۔ بیرون ملک جانا بھی ٹھیک نہیں ہے، بھائی ست اور لا پروا ظاہر ہو رہا ہے، قیاس آرائی زیادہ کرتا ہے۔ ممکن ہے سامان کی بکنگ کا کام شروع کرنے میں دقت کا سامنا ہو۔ نماز کی پابندی کرے اور صدقہ خیرات کرتا رہے۔ آفس سے تعویذ منگوا لو۔

□ ام س - چیچہ وطنی

○ پیارے باباجی! السلام علیکم 4 سال سے نیٹ کے ذریعے ایک لڑکے سے رابطے میں ہوں۔ ہماری لڑائیاں بھی ہوتی ہیں اور منافی ہمیشہ میں ہوں کیوں کہ وہ مجھ سے بات نہیں کرتا تو میرا درد و کراہی ہو جاتا ہے

اور کچھ بھی اچھا نہیں لگتا، یہاں تک کہ گھر والے بھی برے لگتے ہیں۔ شدید غصہ آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی اور وہ بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مسئلہ میری فیملی کی طرف سے ہے، ہمارے ہاں خاندان سے باہر شادی نہیں ہوتی۔ باباجی! وہ مجھ سے جنت میں ملنے کا خواہشمند ہے، پلیز کچھ ایسا وظیفہ بتائیے کہ میرے گھر والے مان جائیں۔

☆ بی بی! تمہاری تحریر سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اصل مسئلہ تمہارے ہی ساتھ ہے۔ لڑکے نے جنت میں ملنے کی خواہش ظاہر کر کے یہ قبول کر لیا کہ اس دنیا میں ملنا ممکن نہیں۔ تم بھی خود کو سنبھالو۔ آنسوؤں پر قابو پاؤ اور یہ مان لو کہ شادی سے پہلے بار بار منانا آسان جبکہ بعد میں ایک بار بھی منانا مشکل ہوتا ہے۔ شدید غصہ، گھر والوں سے بے زاری، غیر معمولی ضد، چڑچڑاہٹ، کچھ اچھا نہ لگتا خاص طور پر گھر والے، غلط اندازے، یہ سب ظاہر کر رہے ہیں کہ تمہارے ساتھ ذہنی صحت کا مسئلہ ہو رہا ہے۔ ایسے لوگ نہ خود خوش رہتے ہیں نہ دوسروں کو رہنے دیتے ہیں۔ جذباتی عدم توازن یقیناً تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اپنے رویے پر قابو پانے کے لیے حقائق کو قبول کرنا ہی ہوگا۔ ذہنی سکون کے لیے نماز کو خشوع و خضوع سے پڑھو ہر نماز کے بعد یا سلام کی دو دو تسبیح پڑھو۔ تعویذ آفس سے منگوا لو اور اسے اپنے بچے میں سی لو، خدا رحم کرے گا۔

□ ذوالقرنین - چکوال

○ باباجی! السلام علیکم میرا مسئلہ صرف آپ حل کر سکتے ہیں۔ ہم صرف دو بھائی ہیں۔ محلے میں چچا رہتے ہیں، ان کی زمین بیٹیاں ہیں۔ ایک بیٹی بہت خوب صورت ہے۔ اس نے خاندان میں اور باہر کتنے ہی لڑکوں سے دوستی کر رکھی ہے، پروا نہیں کرتی، راتوں کو گھر والوں کو چھوڑ کر نکل جاتی ہے، کوئی جاننے والا اس کو تنہا سڑکوں پر گھومتے دیکھ کر گھر لے آتا ہے۔ اب گھر میں تالا ڈال کر رکھتے ہیں تو شور کرتی ہے۔ اس کی عمر 20 سال کے قریب ہوگی، بچوں کی طرح چلا چلا کر رونے لگتی ہے، اس کی حرکتوں کی وجہ سے کوئی اس سے شادی پر تیار نہیں۔ چچا نے میرے والد سے ذکر کیا ہے مگر میں بھی ایسی لڑکی کو

نہیں اپنانا چاہتا۔ کبھی اس پر ترس بھی آتا ہے، ایک مرتبہ تو ہماری چچی نے اس کے ہاتھ، پیر باندھ دیے اور کمرے میں بند کر دیا پھر بھی اس نے چیخنا چلانا نہیں چھوڑا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس پر ظلم ہو رہا ہے۔ میری امی کہتی ہیں شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گی۔ پلیز باباجی! بتائیے میں کیا کروں، کوئی ایسا تعویذ دیں کہ یا تو وہ ٹھیک ہو جائے گا یا یہ رشتہ خود ختم ہو جائے۔

☆ بی بی ذوالقرنین! ایک لڑکی کا بغیر کسی سبب کے راتوں کو باہر نکل جانا اور سڑکوں پر گھومنا، لڑکوں سے بے تکلف ہونا، چیخنا چلانا وہ بھی بچوں کی طرح.....! یہ سب ظاہر کرتا ہے کہ اس کی ذہنی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ ایک طرف تم نے لڑکوں سے دوستی کرنے کا ذکر کیا تو دوسری طرف وہ تنہا سڑکوں پر گھومتی ہوئی ملی، اس بات سے بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کو اپنے عمل پر کنٹرول نہیں ہے اور چیخنے چلانے کا بھی شعور نہیں کیوں کہ جب دماغ ہی ٹھیک طرح کام نہ کر رہا ہو تو ایسی لڑکی پر ظلم و تشدد کر کے اپنی مرضی نہیں کروائی جاسکتی۔ ذہنی مریضوں میں لڑکیاں ہوں یا لڑکے، شادی ان کا علاج نہیں ہوتی کیوں کہ یہ لوگ پہلے ہی بے شمار مسائل کا شکار ہوتے ہیں، شادی کے بعد اور زیادہ مشکلات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اسے فی الحال اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ والدین اور بہن بھائی خیال رکھیں۔ آفس سے تعویذ منگوا لو اور اسے بچے میں سی دو۔ اس بچی کی والدہ ہر نماز مغرب کے بعد ایک بار سورۃ الفجر کی تلاوت کر کے دم والا پانی اسے پلائیں یہ عمل 41 دن کرنا ہے۔

□ رخشندہ - لاہور

○ پیارے باباجی! میں نے حال ہی میں ایک نئی اسکول میں پڑھانا شروع کیا ہے۔ 15 دن کی ٹریننگ کی۔ اس میں مجھے کئی لوگوں سے شکایات ہوئیں۔ میں نے ذکر کیا تو لوگ مجھ سے ناراض ہو گئے جبکہ پرنسپل نے میری حمایت کی۔ اب کئی لڑکیاں مل کر آپس میں باتیں کرتی ہیں اور میرے آنے پر خاموش ہو جاتی ہیں، نہ میرے ساتھ بیٹھتی ہیں نہ مجھ سے بات کرتی

ہیں۔ اتنا عجیب لگتا ہے کہ یہ اسکول چھوڑ دوں۔ کہیں اور جا کر دیکھوں شاید وہاں اچھے لوگ ملیں۔ باباجی پلیز کچھ ایسا وظیفہ بتائیں کہ میں ان میں سب باتوں کا سامنا کر سکوں۔

☆ بیٹی رخشہ! تم کہیں بھی چلی جاؤ، دوسروں کے تعاون کے بغیر تربیت حاصل کرنی بے حد مشکل ہوگی۔ کہیں پر بھی تمام لوگ پسند کے مطابق نہیں ہوتے۔ لہذا شکوہ شکایت نظر انداز کر کے سیکھنے اور کام کرنے کے مواقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ جلد ہی تم یہ بات سمجھ جاؤ گی کہ دوسروں کی شکایات کر کے محض وقت ضائع کرتا ہے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ نماز عصر کے بعد یا فاتح کی تین بار تسبیح پڑھ لو، اللہ کرم کرے گا۔

□ مینی شرف۔ حیدر آباد

○ پیارے باباجی! میں ایک ایسے مسئلے پر آپ سے مدد چاہتی ہوں، جو میں صرف آپ ہی کے آگے بیان کر سکتی ہوں، میں ایک ایسے لڑکے کے بارے میں بات کر رہی ہوں جس نے میری خاطر زہر کھالیا تھا۔ اس دوا کی شیشی پر صاف صاف لکھا تھا کہ یہ زہر ہے یعنی وہ میرے بغیر جی نہیں سکتا تھا۔ میں اس کی محبت سے اس قدر متاثر ہوئی کہ اعلیٰ تعلیم ہونے کے باوجود اپنے والد سے کہہ دیا کہ اگر میں شادی کروں گی تو اسی سے ورنہ نہیں کروں گی۔ والدہ بھی میری ضد کے سامنے خاموش ہو گئیں۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ منگنی کے فوراً بعد اس لڑکے نے مجھ سے بدتمیزی کی۔ میں نے منگنی ختم کرنے کی بات کی تو وہ مجھے قتل کی دھمکی دینے لگا حالانکہ میرا منگنی توڑنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اب میرا حال اس قدر خراب ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ بات ختم کرنا چاہتی ہوں اور آئندہ اس لڑکے کی شکل سے بھی خوف محسوس ہوگا، ملنے کے تصور پر گھبراہٹ ہوتی ہے۔ بتائیے میں کیسے اس معصیت سے چھٹکارا پاؤں؟

☆ بیٹی یعنی! حقیقت یہ ہے کہ لڑکے نے تمہاری خاطر زہر پی دیا نہیں کھائی بلکہ اس کو ایسا کرنا ہی تھا کیوں کہ اس کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں، یہی وجہ ہے کہ اب بدتمیزی کر رہا ہے۔ قتل کی دھمکی معمولی نہیں، وہ اپنی بات

منوا کر بھی روپے پر قابو نہ پاسکا اس لیے ایسے لڑکے سے رشتہ جوڑنا اپنی زندگی خراب کرنا ہے۔ موجودہ خوف اور گھبراہٹ عارضی ہے۔ اس سے نجات حاصل کرنا تمہارے اختیار میں بھی ہے۔ تم پابندی سے نماز ادا کرو اور یا شکور کی دو تسبیحات ہر نماز مغرب کے بعد 21 دن تک پڑھو۔ اللہ کریم کرے گا۔

□ فائزہ۔ کراچی

○ السلام علیکم باباجی! میں پہلی دفعہ آپ کو خط لکھ رہی ہوں اور یقین ہے کہ آپ اس کا جواب ضرور دیں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میری بہن جس کا نام شاکرہ ہے، وہ کچھ عجیب و غریب حرکتیں کرتی ہے۔ اس کے دونوں علاج کروائے بلکہ ڈاکٹری علاج تو ابھی بھی چل رہا ہے۔ روحانی بھی ہوا تھا مگر اس پر کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ وہ اکثر رات کو اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور دیوار پر زور زور سے لاتی اور گھونٹے مارتی ہے اور بہت غلیظ قسم کی گالیاں دیتی ہے۔ ہر وقت ہر کسی سے اسے بدبو آتی محسوس ہوتی ہے۔ دن میں بھی یہی صورت حال رہتی ہے۔ میری والدہ اس کی وجہ سے بہت ٹینشن میں رہتی ہیں۔ پلیز، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر بتادیں کہ اس کو کیا پرالیم ہے؟ یہ بیماری 7،8 سال سے ہے۔ پلیز، علاج بتادیں۔ باباجی! ہم آپ کے مشکور رہیں گے۔

☆ بیٹی فائزہ! اللہ تمہاری بہن کو مکمل شفاء عطا فرمائے۔ والدہ سے کہو، بعد نماز فجر اور عشاء 11-11 بار سورۃ الناس پڑھیں اور پانی پر دم کر کے بیٹی کو پلا دیں۔ بہن سے کہو وہ خود بھی بکثرت سورۃ الناس پڑھا کرے۔ یہ عمل ایک ماہ کرو پھر مجھے حالات سے آگاہ کرو۔

□ گلزار بی بی۔ لالہ موی

○ باباجی! اللہ آپ کو اچھا رکھے۔ میں اپنے چھوٹے بیٹے کی طرف سے بہت پریشان ہوں، اس کو ضد ہے کہ وہ پاکستان میں کچھ نہیں کرے گا بلکہ باہر جا کر نوکری کرے گا۔ کئی دفعہ لندن اور امریکا کے لیے پلائی کیا مگر کچھ نہ ہوا۔ بہت پیسے بھی برباد ہوئے۔ اب منہ لٹکائے بیٹھا ہے کہ سعودی عرب جاؤں گا۔ باباجی! کہیں بھیجنا کیا آسان ہے؟ پھر سعودی عرب میں تو نوکریاں

بھی نہیں ملتیں، وہاں کا تو قانون ہی بہت سخت ہے۔ آپ کوئی ایسا عمل بتائیں جس کی برکت سے اُسے عقل آجائے اور وہ ہمیں پریشان کرنا چھوڑ دے۔ اُس کے رویے کی وجہ سے گھر کا ماحول بہت خراب رہتا ہے۔ والد تو اُس کی شکل ہی نہیں دیکھنا چاہتے۔ میرے لیے یہ بڑی مشکل صورت حال ہے۔ وظیفہ میں کروں گی۔ اگر تعویذ دینا چاہیں تو وہ بھی منگوا لوں گی۔

☆ بیٹی گلزار! مجھے تمہاری پریشانی کا اندازہ ہے مگر بیٹی..... اس معاملے کو سمجھ داری سے حل کرو۔ بے شک بیٹے کا رویہ غلط ہے مگر یہ تو وہ بچہ ہی، اس کو محبت اور نرمی سے سمجھاؤ۔ والد صاحب سے بھی کہو اس طرح اولاد کو نہیں چھوڑا جاتا۔ بہت بڑی نعمت ہے اللہ کی اور امانت بھی ہے پھر ماں باپ کا فرض ہے، ہر لمحے اولاد کی تربیت کرنا۔ اس کا بے جا ضد کرنا ہی ثابت کرتا ہے کہ وہ بے عقل ہے پھر تم لوگوں نے بھی کسی حد تک اس کا ساتھ دیا لہذا اب اس کو سمجھنے میں کچھ وقت لگے گا۔ بیٹے کا سب سے اچھا دوست اس کا باپ ہوتا ہے لہذا وہی اس کو نرمی اور محبت سے سمجھائے۔ تم حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور کیا کرو۔ وظیفے کی مدت ایک ماہ دس دن ہے۔ تم ہر نماز کے بعد 99،99 بار پڑھو۔

وَسَيُنَاغْفِرُ لَنَا ذُنُوبَنَا وَاللَّهُ يَتَذَكَّرُ الْعَزِيزُ
يَا لَيْلِي حَانَ وَلَاتُ جَعَلَنِي خَلْقًا مِّنْ عِبَادِكَ اللَّهُ يَنْزِلُ
اول و آخر درود شریف 9،9 بار پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ زرینہ۔ کھاریاں

☆ زرینہ بیٹی! اللہ تعالیٰ پر کامل یقین رکھنے والے ہی ہمیشہ کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔ تم بھی اس ذات با صفات پر پختہ یقین رکھو گی تو ہمیشہ کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔ نماز پنجگانہ کی پابندی کرو۔ ہر نماز کے بعد کثرت سے استغفار پڑھا کرو۔ وہ قادر مطلق تمہاری ہر جائز مراد ضرور پوری فرمائے گا۔ دل کی تمام گہرائیوں اور خلوص کے ساتھ اس کی بارگاہ میں دعا کرو۔ وہ باری تعالیٰ اپنا کرم فرمائے گا۔ ایک آزمودہ وظیفہ تمہارے لیے تجویز کر رہا ہوں۔ یہ وظیفہ

14 دفعہ بعد نماز عشاء 11 دن تک پڑھو۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى رَسُوْلِكَ وَسَلِّمْ عَلٰى اٰلِهِ
اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى رَسُوْلِكَ وَسَلِّمْ عَلٰى اٰلِهِ
مَسْرُوْمٌ

یہ وظیفہ چاند کی ابتدائی تاریخوں میں شروع کرنا اور وظیفے کے اختتام پر اس مہربان مالک کے حضور انتہائی خشوع و خضوع سے اپنی حاجت بیان کرنا۔ رب رؤف و رحیم تمہاری جائز مراد پوری فرمائے گا۔

□ صفیٰ بی بی۔ پاکپتن

☆ صفیٰ بیٹی! سب کچھ اس ذات باری کی مرضی سے ہوتا ہے۔ ہم عاجز و گناہ گار بندے اس کی مصلحت سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے بندوں کے حق میں ہمیشہ بہتر ہی کرتا ہے۔ اگر ہم سب کچھ اسی پاک بے نیاز ذات پر چھوڑ دیں تو بہت سی فکر وں اور پریشانیوں سے محفوظ ہو جائیں۔ ایک بات اچھی طرح سمجھ لو کہ قرآن مجید ہمارے لیے راہ ہدایت اور ضابطہ حیات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ہماری رہنمائی کے لیے بھیجا ہے، ہمیں بھی علم کے اس خزانے سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اسی میں ہماری بقا ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوگی کہ تم پنج وقتہ نماز کی پابند ہو اور قرآن مجید کی تلاوت بھی بلاناغہ کرتی ہو۔ باری تعالیٰ تمہیں اس کا اجر ضرور دے گا۔ میں تمہارے لیے انتہائی آسان اور آزمودہ وظیفہ تحریر کر رہا ہوں۔ بعد نماز عشاء مندرجہ ذیل آیات کو 113 مرتبہ پڑھو اور اس غفور الرحیم سے انتہائی خلوص نیت اور مکمل یقین کے ساتھ دعا مانگو۔ ان شاء اللہ تمہاری دلی مراد پوری ہوگی۔

يَعْلَمُ سِرَّ الْمَوْتُومَاتِ ۝ يَخْصِرُ اللّٰهُ يَخْصِرُ
مَنْ يَشَاءُ ۝ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيْمُ ۝

□ ثریا شاہ۔ ٹھٹھہ

○ باباجی! میں ہمیشہ اپنے ہر مسئلے کا حل آپ سے پوچھتی ہوں اور اللہ کا بڑا احسان ہے، ہمیشہ کامیاب بھی رہی۔ دو سال قبل آپ سے اپنی شادی کے لیے وظیفہ لیا تھا، آج اپنے سسرال میں بہت خوش ہوں۔ سب لوگ بہت پیار کرتے ہیں۔ شوہر بھی بہت اچھے ہیں، وہ لندن میں ہوتے ہیں۔ باباجی! کچھ عرصے میں، میں بھی انہی

کے پاس چلی جاؤں گی، مگر چاہتی ہوں جانے سے قبل آپ سے اولاد اور خوشگوار کامیاب زندگی کے تعویذ لیتی جاؤں۔ بابا! میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ وہاں جا کر بھی آپ سے رابطے میں رہوں۔ جوانی لقاۃ ساتھ ہے، وہاں سے رابطے کا طریقہ کار و دیگر تفصیلات لکھ دیں گے۔ مجھے ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ بیٹی ثریا! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ تم مجھ سے رابطہ رکھ سکتی ہو۔ تعویذ میں تیار کروں گا، مگر کچھ تفصیل درکار ہے، لہذا براہ راست خط لکھ دیا ہے۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ نور زمان۔ کوئٹہ

○ باباجی! میں آپ کا کالم ایک عرصے سے پڑھ رہا ہوں مگر خط پہلی دفعہ لکھا ہے۔ امید ہے کہ ضرور جواب دیں گے۔ باباجی! میں ایک پڑھا لکھا انسان ہوں، شریف گھرانے سے تعلق ہے۔ والد نے ساری عمر محنت سے کمائی کی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں۔ والدہ، دو بہنیں اور ایک چھوٹا معذور بھائی میری ذمہ داری ہے۔ میں بہت محنت کے باوجود اس حد تک نہیں کما پاتا جس کی مجھے اور میرے گھر والوں کو ضرورت ہے۔ والدہ اور بہنیں بھی کچھ نہیں کہتیں، مگر میں خود سمجھتا ہوں، اس لیے چاہتا ہوں کہ کسی طرح باہر نکل جاؤں۔ آپ مجھے وظیفہ دیجیے تاکہ میری خواہش پوری ہو سکے۔

☆ بیٹے نور! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ یقیناً پیسا بہت اہم ہے، مگر سب کچھ نہیں۔ انسان کو انسان کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اگر تم باہر چلے جاؤ گے تو تمہارے گھر والوں کو کون سنبھالے گا؟ والدہ ہیں، بہنیں ہیں، معذور بھائی ہے۔ بیٹے! آج کل کے دور میں لوگ صحت مند لوگوں کی ذمہ داری نہیں لیتے پھر بھائی معذور ہے۔ سوچو، تمہارے گھر کو تمہاری بہت ضرورت ہے۔ مایوس مت ہو۔ اللہ تمہیں اپنے ملک ہی میں وافر رزق عطا کرے گا۔ مانگو تو سہی۔ نماز فجر یا نماز عشاء کے بعد ایک بار سورہ رخصت ترجمے کے ساتھ پڑھو اور دعا کرو، مدت ایک ماہ ہے۔

□ شہناز۔ جہلم

○ تمہاری خواہش پر مسئلہ شائع نہیں کیا جا رہا۔

☆ بیٹی شہناز! تمہارا طویل اور تفصیلی خط پڑھا۔ بیٹی! تمہیں اس سے قبل بھی وظیفہ دیا گیا تھا جسے تم نے درست طریقے سے نہیں کیا۔ کوئی بھی وظیفہ پڑھنے کے لیے اولین شرط ہے۔ نماز منجگانہ کی پابندی! اگر اول وقت میں نمازوں کی ادائیگی کرو تو افضل ہے۔ کوشش کرو کہ کوئی نماز کسی بھی حال میں قضا نہ ہونے پائے۔ خدا خواستہ انتہائی مجبوری کی حالت میں قضا ہو بھی جائے تو قضا ضرور پڑھ لیا کرو۔ دوسری شرط ہے تمام فضولیات اور کمزوریاں سے پرہیز، یعنی جھوٹ، فیبت، فحش گوئی، موسیقی، فلم، بی بی وغیرہ سے مکمل پرہیز۔ تیسری شرط ہے خلوص نیت، یعنی اس مہربان مالک سے جو دعا بھی کرو، کامل اور پختہ یقین کے ساتھ کرو اور اس مالک کل کی ذات سے امید رکھو کہ وہ تمہاری دعا ضرور قبول کرے گا۔ ہر وقت با وضو رہنے کی کوشش کرو۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ”یا حی یا قیوم“ کا ورد کیا کرو۔ تمہارے لیے انتہائی آزمودہ اور موثر عمل تجویز کر رہا ہوں۔ درج بالا شرائط پوری کرنے کے بعد ہر روز بعد نماز فجر 100 مرتبہ ”سورہ اخلاص“ کا ورد کرو۔ ورد کے بعد اس مالک حقیقی کی بارگاہ میں گڑگڑا کر انتہائی خشوع و خضوع سے اپنی حالت بیان کرو۔ اس عمل کی مدت 11 روز ہے۔ خلوص نیت شرط ہے۔ اللہ رب العزت اپنے کسی بندے کو مایوس نہیں کرتا۔ ایک مہینے بعد مجھے صورت حال سے آگاہ کرنا۔

□ علیزے۔ پشاور

○ باباجان! میں آپ کا کالم بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آپ کا سمجھانے کا انداز بالکل گھر کے بڑوں جیسا ہے۔ ہم سب گھر والے آپ کو بہت پسند کرتے ہیں۔ باباجان! میں انٹر میں پڑھتی ہوں۔ چھ مہینے پہلے تک میرا رنگ بہت صاف تھا، چہرے پر کوئی دانہ بھی نہیں تھا مگر اب میرا رنگ بھی روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے اور چہرہ بھی دانوں سے بھر گیا ہے۔ میں نے آپ کی دوائی کے بارے میں پڑھا ہے۔ پلیز مجھے منگوانے کا طریقہ بتا دیں اور کیا کھانے پینے میں بھی کچھ احتیاط کرنی ہوگی؟ میں آپ کے جواب کا شدت سے انتظار کروں گی۔

☆ بیٹی علیزے! دوا میں تیار کروں گا، اس کے لیے ضروری ہے کہ تم مجھے براہ راست خط لکھو، خط میں اپنی

عمر اور وزن ضرور تحریر کرنا۔ جو بھی احتیاط کرنی ہوگی، وہ میں دوا کے ساتھ ہی ارسال کروں گا۔

□ روبی ہاشم خان۔ ہزارہ

○ باباجی! میں نے اس سے پہلے بھی آپ کو کئی خط لکھے مگر جواب نہیں ملے۔ شاید خط آپ تک پہنچنے ہی نہیں۔ میں بہت اذیت سے گزر رہی ہوں۔ میری شادی گھر والوں اور میرے شوہر کی مرضی سے ہوئی۔ شادی کے کچھ دن تو سکون سے گزرے مگر پھر لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ باباجی! پہلے تو میں بھی جواب دیتی تھی مگر اب نہیں دیتی، میرے شوہر حد سے زیادہ گندی زبان استعمال کرتے ہیں۔ وہ میرے کردار پر بھی کچھ اچھالتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں اور مارنے سے بھی باز نہیں آتے، بالکل عورتوں کی طرح طعنے دیتے ہیں، جو چیز میں سوچ بھی نہیں رہی ہوتی، اس کا الزام لگا دیتے ہیں۔ باباجی! میرا ایک بیٹا ہے، اس کی وجہ سے بھی مجھے بہت تنگ کرتے ہیں کہ میں بچے کا خیال نہیں رکھتی، حالانکہ باباجی! انہیں خود بچے کی ضروریات کا ہوش نہیں رہتا۔ مجھے بار بار کہنا پڑتا ہے کہ دودھ چاہیے یا پکڑے بنادیں۔ اس پر بھی منہ بناتے ہیں۔ باباجی! آپ کو یہ سب لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میرے لیے اب ایسی زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔ آخر میری بھی کوئی عزت ہے، عورت ہونا یا بیوی ہونا باعث ذلت تو نہیں؟ آپ مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں؟

☆ بیٹی روبی! تمہارا مسئلہ آج کل ہر دوسرے گھر کا ہے۔ مردوں کی زبان بہت خراب ہو گئی ہے۔ اصل میں باہر کی ناکامیوں کا بدلہ وہ اس طرح لیتے ہیں۔ عورتیں تو گھر میں ہوتی ہیں، انہیں باہر کے حالات کا اندازہ نہیں ہوتا۔ جس آدمی سے جیسا سلوک روا رکھتے ہیں، وہی وہ اپنے گھر کے ساتھ رکھتا ہے، لہذا سمجھ جاؤ کہ جس کو باہر عزت نہیں ملتی، وہ گھر میں بے ہودہ رویہ رکھتا ہے۔ جس شخص کی لوگ عزت کرتے ہیں، وہ اپنے ارد گرد موجود لوگوں کو بھی عزت دیتا ہے۔ یہ سادہ سا اصول ہے۔ تم وہی چیز سامنے والے کو لوٹاؤ گی جو تمہارے پاس ہوگی، لہذا بیٹی! تم مستقل مزاجی اور صبر سے اس مشکل کا سامنا کرو۔ ہر شخص اپنا نہیں ہوتا اور ضروری نہیں کہ مردوں سے تعلق توڑ لیا جائے۔ انہیں سدھارنے کی کوشش ضرور

کرنی چاہیے۔ تم زبان درازی مت کیا کرو چاہے بات کتنی تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔ چپ ہو جایا کرو۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورہ یٰسین پڑھو اور دعا کرو۔ بیٹی! مجھے یقین ہے کہ اللہ تمہارے شوہر کو ضرور عقل دے گا۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ راشدہ۔ ملتان

○ باباجی! میں بہت ہمت کر کے آپ کو اپنا مسئلہ بتا رہی ہوں۔ آپ یقین کیجیے، میں نے یہ بات آج تک کسی کو نہیں بتائی۔ میں اپنے چچا زاد بھائی کو بہت پسند کرتی ہوں اور وہ بھی مجھے بہت پسند کرتا ہے۔ ہمارے گھر والے اس رشتے پر راضی نہ تھے، لہذا ہم دونوں نے بہت مجبوری میں انتہائی قدم اٹھایا اور کراچی جا کر کورٹ میرج کر لی۔ وہ کراچی ہی میں جا کر رہتا ہے اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بہن کے گھر کراچی گئی تھی۔ باباجی! میں جانتی ہوں کہ آپ کو یہ بات پسند نہیں آئے گی مگر میں مانتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ شادی کے بعد میں واپس آ گئی۔ ہم انتظار کر رہے تھے کہ حالات ٹھیک ہوں تو گھر والوں کو راضی کرنے کی کوشش کریں۔ باباجی! اب حالات یکدم تبدیل ہو گئے۔ میں امید سے ہوں، وہ ڈاکٹر کے پاس جانے سے منع کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ قتل ہے، مگر باباجی! آج نہیں تو کل گھر والوں کو پتا چل جائے گا پھر کیا ہوگا؟ میرے بھائی مجھے قتل کر دیں گے۔ خدا کے لیے مجھے بچالیں۔ یہ آپ کا ہم تنوں پر احسان ہوگا۔

☆ بیٹی راشدہ! تم بڑی لکھی سمجھ دار لڑکی ہو پھر ایسی حرکت کیوں کی؟ گھر والوں کو دھوکا دیا، اپنے آپ کو مشکل میں ڈالا اور اب قتل جیسا گناہ کرنے جا رہی ہو؟ کتنی غلطیاں کرو گی؟ میں سمجھتا ہوں کہ حالات بہت نازک ہیں، مگر ایک حل ہے بیٹی! مزید غلطیاں کرنے کے بجائے اب سچائی اپنی والدہ کو بتادو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حالات سنبھال لیں گی۔ تمہیں ضرور برا بھلا نہیں لگی، وہ ان کا حق ہے۔ کام بھی تم نے انتہائی جاہلانہ کیا ہے مگر بہر حال ماں ہیں۔ تمہاری اور خاندان کی عزت بچالیں گی۔ جس قدر جلدی ممکن ہو، مجھ سے تعویذ منگو اور پھر والدہ سے بات کرلو۔ بکثرت توبہ استغفار پڑھا کرو۔ مجھے جلدی جلدی حالات سے آگاہ کرو۔

□ روشنی حنیف - خانیوال

○ باباجی! میں مالی طور پر بہت پریشان ہوں۔ شوہر حد سے زیادہ غیر ذمے دار ہیں۔ ایک دن کام پر جاتے ہیں، باقی چھ دن گھر میں پڑے سوتے رہتے ہیں۔ بچوں کے ساتھ مار پیٹ، گالم گلوچ اس وجہ سے بچے بھی خراب ہو رہے ہیں۔ باباجی! میں کیا کروں؟ بچوں کی خاطر گزارا ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ بچوں کی ہی خاطر شوہر کو چھوڑنا چاہتی ہوں تاکہ اکیلے رہ کر ان کی تربیت تو کر سکوں۔ پیٹ تو ابھی بھی خالی ہی رہتا ہے۔ بعد میں بھی رہے گا، مگر یہ اطمینان تو ہوگا کہ ہر وقت کوئی گندی گندی گالیاں تو نہیں دے رہا۔ میں خود ان پڑھ ہوں، کسی سے آپ کو خط لکھوا رہی ہوں۔ مجھے رسالے میں ضرور جواب دیں۔

☆ بیٹی روشنی! جن حالات سے تم گزر رہی ہو، یہ حالات بہت عام ہوتے جا رہے ہیں۔ یقیناً ہر برائی کی اصل وجہ دین سے دوری ہے۔ بہر حال بیٹی! میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ جلد بازی مت کرو۔ بچوں کو محبت سے سمجھاؤ۔ بچے بڑے ذہین ہوتے ہیں، جیسا بھی ہے، ان کا باپ ہے، ان پر اس کی عزت فرض ہے۔ اگر انہیں آج یہ سکھاؤ گی کہ باپ غلط ہے اور اس کو چھوڑ دینا ہی ٹھیک ہے تو کل وہ تمہاری کسی بات پر اختلاف کر کے تمہیں بھی چھوڑ سکتے ہیں۔ لہذا غلط بات مت سکھاؤ۔ مشکل حالات میں اللہ سے مدد مانگو، وہ سب کی منتا ہے۔

اللَّهُمَّ رَبِّ هَذِهِ الدَّعْوَةِ الْغَائِبَةِ
الْمُسْتَجَابَةِ تَحَاذِرْهُمُ الْفَحْشَ وَالْمُنْكَرَ
أَحْبِبْنَا عَلَيْهَا وَأَمْسِكْهَا قَلْبًا وَاعْتَصِمْنَا
بِهَا وَاجْعَلْنَا مِنْ عِبَادِكَ الْخَائِفِينَ آمَنَ آمَنَ

مندرجہ بالا آیت ہر نماز کے بعد 33 بار پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ شمع - واہ کینٹ

○ باباجی! میں آپ کے توسط سے اپنے محسنوں کا شکر یہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ اللہ انہیں دنیا کی تمام نعمتیں عطا فرمائے اور آخرت میں بھی بلند درجہ دے۔ جس کڑے وقت میں عزت اور بھرم کے ساتھ میری مدد کی، میں اور میرے بچے ہمیشہ ان کے مقروض رہیں گے۔ آپ ہمارے سروں پر سلامت رہیں۔ آپ کی موجودگی میں بھی کچھ لوگ براہ راست مدد کرنا چاہتے ہیں۔ میں

ایسے لوگوں سے معذرت کرتی ہوں۔ غریب ضرور ہوں مگر عزت دار ہوں۔ باباجی! اب مجھے یقین ہو گیا کہ میری ماں سچ کہتی تھیں کہ اللہ کی دنیا میں اچھے لوگ باقی ہیں۔ اللہ آپ کو بہت سکھ دے اور ان کو بھی جن کی وجہ سے میرے کچھ آنسو پونچھ گئے۔

☆ بیٹی شمع! بس اللہ پر بھروسہ کرو۔ بے شک دنیا میں ابھی اچھے لوگ ہیں جو صلے کی پرواہ نہیں کرتے، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ انسان کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔ صلہ تو اللہ ہی دیتا ہے۔ ایسے لوگ یقیناً نیک کے نیک بندے ہیں اور جنت میں گھر بناتے ہیں۔

□ روحانہ نواب - میلسی

○ محترم جناب باباجی! السلام علیکم۔ اللہ آپ کو صحت، تن درستی دے۔ (آمین) میں ایک اہم مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ محترم! میرا ایک ہی بھائی ہے جو پانچ سال سے شادی شدہ ہے۔ اس کی بیوی نے پہلے دن سے ہی میرے والدین کو کچھ نہیں سمجھا۔ بھائی، والدین کا بہت فرماں بردار ہے۔ ان کا بہت خیال رکھتا ہے، لیکن اس کی بیوی زیادہ وقت میرے والدین کے ساتھ معمولی باتوں پر لڑتی رہتی ہے۔ وہ لڑائی دیکھتا بھی ہے لیکن بیوی کو کچھ نہیں کہتا، نہ ہی اسے منع کرتا ہے۔ اور اس کی طرف داری بھی کرتا ہے۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ میری والدہ صاحبہ کو ایسا کچھ پڑھنے کو دیں کہ بھائی کی بیوی لڑائی کرنا چھوڑ دے اور ان کی عزت کرے اور بھائی، والدین کا فرماں بردار ہی رہے اور بیوی کی بے جا حمایت نہ کرے۔ آپ یہ بھی بتائیں کہ اس نے بھائی پر کچھ عمل وغیرہ تو نہیں کروایا ہے؟ کیوں کہ وہ ہر وقت بڑبڑاتی رہتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرا خط ضرور شامل کریں گے اور اس کا جواب جلد دیں گے۔ میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ والدہ کا، بھائی کا اور بھابی کا نام لکھ رہی ہوں۔

☆ بیٹی روحانہ! اللہ تمہارے گھر سب اطمینان و سکون رکھے۔ تمہاری بھانج کوئی عمل نہیں کر رہی ہے۔ یہ ہر گھر کی اپنی تربیت ہوتی ہے کہ کچھ لوگ بڑوں کی عزت کرتے ہیں اور کچھ نہیں۔ تم یہی سوچ لو، جس عورت کو اس کے گھر سے اچھی تربیت نہیں ملی، تمہارا بھائی اس کو

کیسے درست کر دے گا؟ بہر حال درگزر کرو معاملات کو، اگر بھائی سے محبت ہے۔ اس کی صحت و سلامت کے لیے دعا کرو۔ ہر نماز کے بعد ایک سو پنج پڑھو۔

لَا تُخْذِلُنِي فِي دَعْوَتِي يَا كَرِيمُ
خَيْرُكَ يَا كَرِيمُ يَا كَرِيمُ يَا كَرِيمُ

اول و آخر دو شریف پھر دعا کرو۔ معاملات میں بالکل خاموش رکھو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ محمد خان - دادو

○ بابا سائیں! السلام علیکم! گزشتہ سال آپ نے مجھے جو وظیفہ بتایا تھا، اسے پڑھنے سے میرا مسئلہ حل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی صحت اور تندرستی برقرار رکھے اور آپ کو طویل عمر عطا فرمائے۔ (آمین) تاکہ آپ اسی طرح خلق خدا کی خدمت کرتے رہیں۔ بابا سائیں! میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جن سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ بس تا عمر آپ کو دعائیں دیتا رہوں گا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ کی دعاؤں سے اب مجھے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہے۔

☆ بیٹی محمد خان! میرا شکریہ ادا کر کے مجھے گناہ گار مت کرو۔ میں تو اس رحمن و رحیم کا عاجز و گناہ گار بندہ ہوں۔ اس رحمن و رحیم کا لاکھ لاکھ احسان ہے جس نے تمہارا مسئلہ حل کیا۔ نماز کی طرف سے غافل مت ہو جانا۔ زیادہ افضل تو یہ ہے کہ تمام نمازیں باجماعت ادا کیا کرو۔ اپنی نیک کمائی سے ہر ماہ حسب توفیق و استطاعت خیرات کر دیا کرو اور کوشش کرو کہ تمہاری ذات سے ہمیشہ دوسروں کو فائدہ ہی پہنچے۔ جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمہارا مسئلہ حل کیا ہے، تم بھی اس کے بندوں کے کام آؤ۔ اپنے ارد گرد نظر ڈالو، تمہیں ایسے لوگ مل جائیں گے جو اپنی سفید پوشی کے بھرم میں کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتے۔ میرے پاس بھی ایسے بہت سے مستحقین آتے ہیں۔ میں حتی المقدور ان کی مدد بھی کرتا رہتا ہوں کیوں کہ اللہ کی راہ میں خیرات کرنے سے رزق میں بے پناہ برکت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں نیکی کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

☆.....☆

علاج اور کسٹل مشافہ

میرے عزیزو!

اللہ تعالیٰ! سب کو اپنی امان میں رکھے۔

☆ اگر آپ اپنے حلق اور گلے کے مسائل اور دوسری جلدی بیماریوں سے پریشان ہیں؟

☆ اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خورے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ دانتوں کی گونا گوں تکالیف میں مبتلا ہیں۔

☆ اگر آپ موٹاپے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوائیں موجود ہیں۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ علاج معالجے اور دواؤں کی طلب کے لیے جوابی لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

110 آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ، بہادر شاہ ظفر روڈ، کراچی

سُخن پلاک

غزل

تیری زلفوں کا خم بنا لایا
دل کو مشقِ ستم بنا لایا
دیکھ کے صورتِ برہم تیری
اپنی آنکھوں کو خم بنا لایا
لوگ رکھتے ہیں سر کو قدموں میں
میں تو سر کو قدم بنا لایا
حسرت دید لیے آنکھوں میں
تیرے آنسو قسم بنا لایا
دل کی باتیں نہ جو سمجھ سکے
میں بھی ایسا صنم بنا لایا
تو نے مارے تھے پیار سے پتھر
میں تو دل کا زخم بنا لایا
میں بھی تیریزی اس کی چاہت کو
اپنی ہستی کا غم بنا لایا

شاعر: ڈاکٹر شاہ محمد تیریزی، کراچی

انتظار کے پل

انتظار کے وہ پل

جو میں

تیرے انتظار میں گزارتا ہوں

جچ بوجھ تو

زندگی کا حاصل لگتے ہیں

کیوں کر!

تیرا انتظار

میری زندگی کا حاصل ہے

شاعر: نعمان خان نیازی۔ میانوالی

غزل

ہم کو احباب ہمارے نہیں جینے دیں گے
قربتوں کے یہ سہارے نہیں جینے دیں گے
ایسا لگتا ہے کہ ہنستے ہیں مرے حال پہ سب
یہ چمکتے ہوئے تارے نہیں جینے دیں گے
راکھ ہو جائے گا دل ختم نہ ہوگی وحشت
جلتے بجھتے یہ شرارے نہیں جینے دیں گے
رفتہ رفتہ سبھی ہو جائیں گے احباب جدا
لوگ اس خوف کے مارے نہیں جینے دیں گے
دفن کر کے ہی انہیں چین ملے گا نیر
لوگ تو گور کنارے نہیں جینے دیں گے

شاعر: نیرضوی۔ کراچی

غزل

محبت کے زخموں کو تازہ کرو گے
اگر واپسی کا ارادہ کرو گے
شکوں نہ ملے گا یقیں ہے تمہیں بھی
مجھے رات دن بس پکارا کرو گے
چلو جون تم کاٹ لو گے اکیلے
دمبر میں کیسے گزارا کرو گے
ابھنے لگو گے مجھے یاد کر کے
جو زلفوں کو اپنی سنوارا کرو گے
مری یاد میں پھر چین دل میں ہوگی
جو تم چوڑیوں کو اتارا کرو گے
تو پھر معاف تم کو کرے گا نہ عادل
اگر تم لڑائی دوبارہ کرو گے

شاعر: عادل حسین، کراچی

زندگی کا حاصل

دن تو کسی طور گزر جاتا ہے جاناں!!

مگر رات کی خامشی

تیری یادوں کا شور لے

ہمارے دل و دماغ میں

محفل سجائے رکھتی ہے

اور ہم!!

یادوں کے درپچوں پر سفر کرتے ہوئے

دور..... بہت دور نکل جاتے ہیں

مگر جب پلٹ کر دیکھتے ہیں تو!

آنکھیں اشک بار اور.....

وجود کرچی کرچی ہو کر بکھرے لگتا ہے

کیا یہی زندگی کا حاصل ہے؟

شاعرہ: شمیمہ ناز، اورنگی۔ کراچی

غزل

جو دل سے ہمیں بھلا دیتے ہیں
پیار میں خوب ہمیں سزا دیتے ہیں
لی کے زہر تہائیوں کا ہم لوگ
تجھے اپنا دکھ پھر سنا دیتے ہیں
شکلتے خواب تھے اندھیری تھی رات
کچھ لوگ اپنی پہچان کرا دیتے ہیں
آس کا کوئی پھول کھلا نہ گلشن میں
لوگ گزری ہوئی باتوں کو ہوا دیتے ہیں
گر گئے ہیں خود اپنی نظروں میں جاوید
لوگ مفلس جان کے دعا دیتے ہیں

شاعر: اسلم جاوید۔ فیصل آباد

بہت تکلیف دیتے ہیں

سرد موسم، سرد لہجہ بہت تکلیف دیتے ہیں
بدلتی رت، بدلتے لوگ بہت تکلیف دیتے ہیں
بہار آ کے پیڑوں کو جایا نہ کرے کہ اس کے بعد
خزاں میں یہ گرتے جتے بہت تکلیف دیتے ہیں

پل میں اپنا بنالینا پھر اچانک ہی چلے جانا
جدائی کے وہ لمحے بہت تکلیف دیتے ہیں
خوابوں کو خواب رہنے دو ان پر یقیں نہ کرو!
نہ ہو تعبیر جن خوابوں کی بہت تکلیف دیتے ہیں
لتے ہیں پیار سے دلوں میں بغض رکھتے ہیں
منافق لوگ دنیا کے بہت تکلیف دیتے ہیں

شاعرہ: شائستہ جمال

کیا تم بھول گئے ہو

کیا تم بھول گئے ہو سب کچھ!

سر درتوں میں شام سے تک

اک دو بجے کو نکتے رہنا

منہ سے پھر بھی کچھ نہ کہنا

اکھیوں سے بس باتیں کہنا

جچ سب کچھ بھول گئے ہو!

وہ بچپن کی میٹھی یادیں

مل کر رہنے کی وہ باتیں

کیا تم بھول گئے ہو سب کچھ!

پورے چاند کی پوری رات کو

بالوں میں پھر انگلی پھیر کے

مجھ کو بیٹھے گیت سنانا

جچ سب کچھ بھول گئے ہو!

شاعر: آصف ریاض۔ جھنگ

التجا

روح کا جو زخم ہے

یہ تاسور بن جائے گا

التجا ہے وقت تجھ سے..... ختم جا

یہ بندہ مر جائے گا

شاعر: مرزا یاسر بیگ، کراچی

سکھ، چین کھو کر.....

آسان نہیں ہوتا ہے لکھتا

دنیا سے پڑتا ہے لڑنا

غم کو سیٹ کے اپنے اندر
جھول میں پڑتا ہے بھرنا
چند دنوں کا روگ نہیں یہ
گر گر کے پڑتا ہے سنبھلنا
جو اتنی بھی بات سنے تا
سکھ اور چین کو کھو کے مہرجی
جیتے جی پڑتا ہے مرنا
شاعر: مہریم۔ لاہور

آنکھیں، جھیل اور کنول
جاناں تم تو جانتے ہو
وجہ!

میری تنہائی کی
یوں در بدر جھکنے کی
جگہ ہنسی کی
کہ تیرے بعد جاناں
کوئی تجھ سا مل ہی نہ پایا
کہ تم تو تھے مانند کنول
اور میری آنکھوں کی جھیل تو
کب کی سوکھ چکی ہے
پھر دوسرا کوئی کنول
کھل ہی نہ پایا

شاعر: شاہد فراز۔ حیدر آباد

غزل

پتھر دل ہیں پتھر لوگ
ایسے ملے ہیں اکثر لوگ
لفظوں سے وہ مارتے ہیں
ہنس ہنس کر یاں خنجر لوگ
سچا کون ہے، جھوٹا کون
ظاہر ہوں گے کتر لوگ
کیونکر اپنا چنتے ہیں
جھوٹوں کو یہ رہبر لوگ
فٹ پاتھوں پہ کانٹے ہیں

راتیں اپنی بے گھر لوگ
ہم بھی کرتے پیار نوید
مل جاتے گر بہتر لوگ
شاعر: نوید سہیل لاکھو۔ ہوسری

غزل

تو بنی ہے جب سے میری زندگی
مل گئی ہے اس جہاں کی ہر خوشی
تھا کبھی ویران اس دل کا مگر
تیرے آنے سے ہوئی ہے روشنی
جب سے تھا ہے تمہارے ہاتھ کو
ہر کسی سے ہو گئی ہے دشمنی
تم کسی کے درد کو سمجھو گے کیا
تم نے دیکھی ہی نہیں ہے مفلسی
اے امیر شہر کچھ تو خوف کر
لوگ اب کرنے لگے ہیں خودکشی
اپنے مطلب سے یہاں ملتے ہیں سب
کون کرتا ہے کسی سے دوستی
کب تک آخر کہیں گے ہم ترا
یہ تغافل، یہ ستم، یہ بے رخی

شاعر: ریحان آفاق۔ حیدر آباد

غزل

منزل میری کہاں ہے راہوں سے پوچھتی ہوں
پاؤں گی پھول کیسے خاروں سے پوچھتی ہوں
افسردگی نے اب تو لاچار کر دیا ہے
پھٹے سکوں کا مسکن آہوں سے پوچھتی ہوں
معلوم یہ تو ہے ہی ہوگی سحر بھی لیکن
راتوں کو چپکتے ہوئے تاروں سے پوچھتی ہوں
شاعرہ: عصمت پروین عظیمی۔ کراچی

غزل

دل میں اپنے ملال رکھا ہے
پھر بھی خود کو سنبھال رکھا ہے
بھول جاؤں میں کس طرح تجھ کو

تیری یادوں کو پال رکھا ہے
اشک ہم نے چھپا کر آنکھوں میں
رُخ پہ جاہ و جلال رکھا ہے
نقہ سے کا نہیں فقط، ساقی!
آنکھ میں بھی کمال رکھا ہے!
اُس کی یادوں سے آج بھی فائق
کوچہ دل اُجال رکھا ہے
شاعر: عمران فائق۔ کابل پور موٹی، انک

اے جان

اے جان
میری پہلی محبت ہو تم
اب لوٹ آؤ نا؟

مجھے تم بن زندگی ادھوری ادھوری سی لگتی ہے
کہیں یہ تمہاری ناراضگی
اور مجھے سے خفا خفا رہتا
مجھے موت کی نیند نہ سلا دے

شاعر: مہر شاہد حسین۔ حب چوکی

غزل

جیون کی ہر پریم کہانی تیرے نام
میری ہر اک درد نشانی تیرے نام
میرے ہر اک لفظ میں تیری صورت ہے
لحہ لمحہ شام سنبھالی تیرے نام
میرا ہر اک نقش تمہارا اُجلا پن
جذبوں سے بھر پور جوانی تیرے نام
میری سوچ یہ کہتی ہے تم میرے ہو
میرے پیار کی بات پڑانی تیرے نام
کمرے میں خاموش پڑا سا رہتا ہوں
ان آنکھوں سے بہتا پانی تیرے نام
میں نے ساجد اب یہ اکثر لکھتا ہے
دریا کی ہر ایک روانی تیرے نام
شاعر: ملک عاشق حسین ساجد۔ ہیڈ بکائی، مظفر گڑھ

جاتے لمحوں کی صدا
جاتے لمحوں کی صدا
کس سفر میں ہیں ابھی تک
دل کی دھڑکن مضطرب ہے
میری آنکھوں میں ٹوٹے لکھ دیا ہے
وہ منظر جو کبھی دیکھا نہیں
کہیں رنگین گال مرجھا رہے ہیں
کہیں اپنے پچھڑتے جا رہے ہیں
سنو!

جاتے ہوئے پل کی صدا
کبھی فرصت ملے تو غور کرنا

شاعرہ: نگہت اکرم۔ لاہور

اب تو جانم ہوش میں آؤ

بڑے بھیما مان بھی جاؤ، جھوٹے بھیما مان بھی جاؤ
قوم کا اور نہ بینڈ بجاؤ
بجلی ہے نہ پانی ہے، کمر تو ڈگرانی ہے
وہی پہلے جیسی کہانی ہے
مزے لوٹو اور مال بناؤ، قوم کا اور نہ بینڈ بجاؤ
خواب ہوئے سب چکنا چور، ڈیزل، پیٹرول پہنچ سے دور
گیس نے کیا بہت رنجور
ہو سکا نہ کوئی سجاؤ
قوم کا اور نہ بینڈ بجاؤ
میں بیچارے، بھوکے تنگے، عیش اڑائیں لے لے لنگے
ڈاکو، لٹیرے اور مسٹڈے
خدارا اور نہ لوٹی پاؤ
قوم کا اور نہ بینڈ بجاؤ
سنبھلنا کوئی نہ سلیقہ ہے، وہی طور طریقہ ہے
اپنا سب کچھ امریکہ ہے
اب تو جانم ہوش میں آؤ
قوم کا اور نہ بینڈ بجاؤ

شاعر: ڈاکٹر مصغر احمد۔ بڑا گواہ، جہلم

سنگِ ملاہمت

میجر (ر) امتیاز حسین ملک

وقت کے ہاتھوں چٹ ہو جانے والے ایک کرنل کی داستانِ ملاہمت



رواق ہے۔ ان ہی کی وجہ سے فلفی، فالودہ، پھن، چائے، چھوٹے، کچھ بڑے اچھے کی ریڑھیاں اور آٹس کریم کی سائیکلس بھی آ جاتی ہیں۔ چوں کہ پارک کے ارد گرد گھر ہی گھر میں، اس لیے مرد چاہے اندر نہ آئیں لیکن وہ اس کے ارد گرد نظر آتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی بچوں کو بلانے تو کبھی بچوں دایوں کو، کبھی کسی کے رونے کی آواز سن کر اور کبھی کسی روتے کو چپ کرانے مردوں کے چکر لگتے ہی رہتے ہیں۔ ویسے بھی محلے داری ہے، سب ہی ایک دوسرے کو تھوڑا بہت تو جانتے پہچانتے ہی ہیں۔ کون فجر کی نماز کے لیے جاتا ہے اور کون صبح سویرے سیر یا جاگنگ کے لیے، سب جانتے ہیں۔

”گڈی“ بھی اس پارک کی مانوس چیز ہے۔ اتنی ہی جتنے اس کے جھولے، چھتریاں یا بیچ، سب ہی اسے پہچانتے ہیں، لیکن شاید کسی اور نام سے، مجھے تو اس کا اصل نام پتا بھی نہیں ”گڈی“ تو میں نے اس کا نام اس کی فطرت اور عادتوں کو دیکھ کر رکھ لیا ہے، اس کی زندگی میں اتنی باقاعدگی ہے کہ اگر کسی دن وہ نہ آئے یا دیر سے آئے تو سارا پارک حیران ہوتا ہے، پھر جس دن وہ آتی ہے تو لوگ ہی نہیں درخت اور جھولے بھی پوچھ رہے

ہیں، جیسے کہ ڈاکٹروں نے نسخے میں لکھ دیا ہو۔ صبح بچوں کو اسکول اور شوہروں کو آفس بھیج کر، دوپہر کو کام کاج سے فارغ ہو کر اور شام کو بچوں کے کھیل کود اور اپنے تفریح کے پیریڈ میں کچھریاں لگتی ہیں۔ اس پارک کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ یہاں کا ”ہائیڈ پارک“ ہے، جہاں خدمات کا کھل کر اظہار کیا جاسکتا ہے۔

مرد حضرات کا داخلہ تقریباً بند ہے اس لیے خواتین کو کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہیں۔ لڑائی جھگڑے کے میچوں کے لیے بھی یہ کھلی فضا اور وافر مواقع مہیا کرتا ہے۔ اس پارک میں عورتوں کی کثرت کے سبب مردوں کا داخلہ یہاں خود ہی بند ہو گیا ہے۔ انہیں کسی نے روکا نہیں ہے، خواتین نے اسے اتنا اپنا لیا اور ہر وقت اتنی تعداد میں موجود ہوتی ہیں کہ مرد خود ہی میدان چھوڑ گئے ہیں۔ کوئی اکاؤنٹ نظر آ بھی جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ کسی کامہان ہے۔ اس بے چارے کو کبھی اس بری طرح سے گھورا جاتا ہے کہ وہ دوبارہ آنے کی جرأت نہیں کرتا۔ پارک بھی خوب صورت ہے، لیکن اس کا اصل حسن تیلیوں کی طرح دوڑتے بھاگتے بچے اور رنگ برنگے ہوا میں لہراتے آچکل ہیں۔ ان ہی کے دم سے اس کی ساری

کے گرد لوہے کی باڑ لگی ہوئی ہے جس میں چاروں طرف ایک ایک راستہ نکلتا ہے۔ پارک کے عین درمیان میں مخالف سمتوں میں کراس کرتے ہوئے دو فٹ پاتھ ہیں جو پارک کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ چاروں حصوں میں مختلف قسم کے جھولے لگے ہوئے ہیں۔ باڑ کے اندر چاروں طرف اور جھولوں کے ساتھ لوہے کے بیچ لگے ہوئے ہیں۔ بارش اور دھوپ سے بچنے کے لیے پارک کے دو کونوں میں لوہے کی چھتریاں لگی ہوئی ہیں۔ جس کے نیچے بھی بیچ لگے ہوئے ہیں، جہاں بیٹھ کر لوگ موسم سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے ڈبل اسٹوری گھر ہیں، جن سے پارک ہر وقت نظر آتا رہتا ہے۔

ان گھروں میں چوں کہ صحن نہیں ہیں، اس لیے یہ کمی بھی اسی پارک سے پوری کی جاتی ہے۔ بعض گھر تو اس سے رکھا صحن ہی کا کام لیتے ہیں۔ خواتین نے چوں کہ زیادہ وقت گھر میں ہی گزارنا ہوتا ہے، اس لیے اس سے بیچ فائدہ بھی وہی اٹھاتی ہیں۔ مثلاً بچے روئے تو پارک کا چکر لگوا لیتی ہیں۔ زیادہ روئے تو جھولا بھی جھلا دیتی ہیں، بچے تنگ کریں یا ان سے بیزار ہوں تو پارک بھیج دیتی ہیں، میاں بیوی کو پیار محبت یا لڑنے جھگڑنے کے لیے تنہائی نہ ملے تو بچوں کو پارک بھیج دیا جاتا ہے۔ خواتین کی صبح، دوپہر اور شام چھتر یوں کے نیچے کچھریاں یوں لگتی

اسلام آباد کی خاص چیزوں میں سے ایک اس کے پارک ہیں۔ پارکوں سے میری مراد صرف بڑے پارک مثلاً راول جھیل پارک، شکر پڑیاں یا دامن کوہ وغیرہ ہی نہیں، بلکہ وہ چھوٹے چلڈرن پارک، گرین ایریاز اور جاگنگ ٹریک وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں، جن کا اس کے طول و عرض میں جال سا بچھا ہوا ہے۔ یہی چھوٹے چھوٹے پارک یہاں کے شہریوں کی تفریح کا اصل سامان ہیں، جن سے بچے، بوڑھے، جوان اور خواتین سب ہی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اسلام آباد بجا طور پر ان پر فخر کر سکتا ہے، کیوں کہ یہ سہولت پاکستان کے کسی اور شہر میں نہیں ہے۔ میں 10/11 سیکٹر میں رہتا ہوں، جو اسلام آباد کا سب سے گیا گزرا سیکٹر سمجھا جاتا ہے، لیکن یہاں بھی صورت حال یہ ہے کہ میری چھوٹی سی گلی کے مغرب میں بھی پارک ہے اور مشرق میں بھی۔ مشرقی گلی والا پارک تو خیر کافی بڑا ہے، اس لیے کہ یہ دو سب سیکٹرز کے درمیان گرین ایریاز میں واقع ہے۔ اس گرین ایریا میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اس طرح کے تین چلڈرن پارک ہیں، جن کے ارد گرد جاگنگ ٹریک بنا ہوا ہے، لیکن مغربی گلی کا پارک صحیح محلے کا پارک ہے۔ یہ پارک اس طرح بنایا گیا ہے کہ درمیان میں پارک ہے جس کے ارد گرد چاروں طرف سڑک اور پھر مکانات کی قطاریں ہیں، جن کا رخ پارک ہی کی طرف ہے، پارک

ہوتے ہیں۔ ”خیر تو تھی؟“ صبح سویرے وہ پارک کے اندر کے لمبے فٹ پاتھ پر شمالاً جنوباً سیر کرتی ہے، پھر ایک مخصوص جھولے (پینک) پر جھولا جھولتی ہے۔ اس کا وقت، اس کی جگہ، اس کا رخ، اس کی رفتار اور اس کا لباس ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے۔ مجھے تو ہر لحاظ سے وہ فوجی لگتی ہے، لباس بھی یونیفارم سا لگتا ہے۔ شکل کی قبول صورت ہے، رنگ کھلتا، گندی، قد درمیانہ، جسم قدرے فریبہ، آنکھیں خوبصورت اور چال سپاہیانہ ہے۔ اصل چیز اس کے ڈسٹن اور جھولے سے لطف اندوز ہونے کا اسٹائل ہے، جس کی طرف بندہ توجہ دے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سیر سے تھک کر جب وہ جھولے پر جا بیٹھتی ہے تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی ہے۔ اس کا جھولا بھی مخصوص ہے، اس کے علاوہ میں نے اسے کسی اور جھولے پر نہیں دیکھا، چھٹی والے دن اس کے ساتھ ایک دو اور بھی کم عمر لڑکیاں ہوتی ہیں، لیکن یہ اسی مخصوص جھولے پر ہی ہوتی ہے۔ جھولتے ہوئے جب اس کے گلے میں لٹکا دو پٹا اور اس کی پونی ہوا میں لہراتے ہیں تو پارک میں اور کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ وہ جھولے پر رہتی بھی بڑی دیر تک ہے، وہ کچھ گنگنائی بھی رہتی ہے، لیکن پتا نہیں کیا۔ وہ جھولے پر زیادہ سے زیادہ اوپر جانے کی کوشش کرتی ہے، لیکن کبھی کھڑے ہو کر پینک نہیں چڑھاتی۔ وہ جھولے پر بہت سرور نظر آتی ہے، اس کی ہر اداسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی ہے۔ کئی دفعہ میں نے اسے جھولے پر موبائل پر باتیں کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ وہ اڑنے کی شوقین لگتی ہے، میں نے اسی لیے اس کا نام ”گڈی“ رکھا ہوا ہے۔ میری آج تک اس سے بات نہیں ہوئی، یہ تو بس راستے کے ایک منظر کی طرح سے ہے جو بندے کو اچھا لگے تو اسے دیکھنے کو دل کرتا ہے۔ دیکھنے کو رک بھی جاتا ہے اور جس دن نہ دیکھے کوئی کی سی بھی محسوس کرتا ہے۔

ایک روز پارک کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے گڈی کے پاس ایک شخص کو کھڑے دیکھا تو میں چونکا۔ کوئی کچھ کہنے یا بلانے آیا ہوگا۔ میں نے دل میں سوچا، گو کہ کوئی ایسی عجیب چیز نہیں تھی، لیکن چونکا دینے والی چیز اس شخص کی شکل و صورت تھی، جو مجھے کافی مانوس سی لگی۔ کچھ دیر وہیں رک کر میں اسے دیکھتا رہا، لیکن یاد

نہ آیا کہ اسے کہاں دیکھا تھا۔ جب احساس ہوا کہ لوگ میرے اس طرح دیکھنے کو محسوس نہ کر رہے ہوں تو میں آفس چلا گیا۔ آفس پہنچ کر پھر تسلی سے ذہن پر زور دیا تو یاد آ گیا کہ یہ تو کرل انور خان کا فارم منیجر تھا، لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شکل اس سے ملتی ہو، اس لیے گڈی سے تصدیق کرنے کا فیصلہ کیا۔

انور خان کے منیجر کو دیکھ کر مجھے بہت کچھ یاد آیا۔ سارا دن ذہن میں گزر رہے ہوئے واقعات کی فلم سی چلتی رہی۔ گڈی کے گھر کا پتا نہیں تھا، اس لیے دوسرے دن کا انتظار مجبوری تھی۔

دوسری صبح جب میں گڈی کے پاس گیا تو وہ جھولے پر ہی موجود تھی۔ مجھے قریب کھڑے دیکھ کر اس نے جھولا روک دیا اور پوچھا۔

”جی انکل، کوئی کام ہے مجھ سے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”کل آپ کے پاس ایک صاحب کھڑے تھے، ان کی شکل مجھے کافی مانوس سی لگی تھی، لگتا ہے ان سے تمہاری پرانی ملاقات ہے۔ وہ کون تھے اور کیا کرتے ہیں؟“ میں نے ایک ہی سانس میں سارے سوال کر ڈالے۔

”پہلے فوج میں رہے، پھر ایک ایگر نیکلر فارم کے منیجر رہے اور اب گھر پر ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں۔“ گڈی نے اطمینان سے جواب دیا۔ بس مجھے اتنی ہی معلومات کی ضرورت تھی۔ تصدیق ہو گئی کہ وہ انور خان کا منیجر ہی تھا۔ میں نے گڈی کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے چلا آیا۔ تصدیق کیا ہوئی یادوں کی بارات ہی چل پڑی۔ بارات گڈی کے جھولے سے اسے اور اس کے والد کو لے کر چلی تو سیدھی لاہور جا پہنچی، پھر وہاں سے کرل انور کو بھی ساتھ لیا اور کوئٹہ پہنچ گئی، پھر وہاں سے گھومتی گھامتی واپس گڈی کے جھولے پر آ گئی، چلیے آپ کو بھی بارات کے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

لاہور کا پوسٹنگ آرڈر آیا تو میں ساہیوال میں نیشنل گارڈ میں تھا۔ کسی پنجابی کے لیے لاہور کی پوسٹنگ خوشی کی خبر ہوئی ہے، لیکن میرے لیے یہ کئی اور لحاظ سے بھی اچھی خبر تھی۔ پہلی چیز تو یہ تھی کہ کسی اچھی جگہ کی پوسٹنگ کے بعد عموماً پوسٹنگ نسبتاً ”ہارڈ ایریا“ یعنی

مشکل اور دور کی جگہ ہوتی ہے، اس لحاظ سے ساہیوال سے لاہور پوسٹنگ بڑی اچھی تھی۔ دوسرا پنجابی ہونے کے باوجود میں نے آج تک لاہور کو ٹھیک طرح سے نہیں دیکھا تھا، بس مسافروں کی طرح آتے جاتے ہی دیکھا تھا، گویا میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اس لیے کہ پنجاب میں کہتے ہیں ”جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔“ اس پوسٹنگ سے مجھے پیدا ہونے کا موقع مل رہا تھا۔ نزدیک ہونے کی وجہ سے وہاں جانا اور شفٹ کرنا بھی آسان تھا۔ گھر سے قریب ہونے کی وجہ سے دکھ سکھ میں شرکت بھی آسان تھی۔

رپورٹ کرنے سے پہلے یونٹ سے رابطہ ضروری تھا، تاکہ پتا چلے کہ گھر مل جائے گا یا نہیں، تاکہ فیملی کی شفٹنگ کے متعلق فیصلہ کیا جاسکے۔ شادی شدہ لوگوں کے لیے فیملی کی شفٹنگ بھی بڑا مسئلہ ہوتا ہے، کیوں کہ اس کے لیے بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ رابطہ کیا تو پتا چلا کہ گھر تو مل جائے گا لیکن یونٹ کو سٹج جانے کی تیاریوں میں ہے۔ آرڈر مل چکے ہیں اور دو مہینے تک کوئٹہ روانگی ہے، گویا پوسٹنگ لاہور کی نہیں بلکہ کوئٹہ کی تھی، لاہور کا تو بس بیچ میں محض نام ہی تھا۔ اب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں خود اکیلا لاہور چلا جاؤں اور فیملی بعد میں ڈائریکٹ کوئٹہ چلی جائے، لیکن میں چونکہ پہلے ایک دفعہ ملٹری اسٹیشنل ٹرین میں سفر کر چکا تھا، اس لیے ہم نے پہلے فیملی کے ساتھ لاہور جانے اور پھر یونٹ کے ساتھ ملٹری اسٹیشنل میں کوئٹہ جانے کا فیصلہ کیا۔ ملٹری اسٹیشنل ٹرین میں سفر کا اپنا ہی مزا ہوتا ہے۔ ویسے بھی اس میں سوائے نام کے اور کچھ بھی اسٹیشنل نہیں ہوتا، کیوں کہ اس میں کوئی بھی جدید سہولت میسر نہیں ہوتی۔ اس میں ایئر کنڈیشنڈ یا لوئر ایئر کنڈیشنڈ وغیرہ کا کوئی ڈبہ نہیں ہوتا۔ فرسٹ کلاس ہی سب سے اعلیٰ درجہ ہوتا ہے۔ لیکن اسے ملٹری اسٹیشنل صرف اس لیے کہتے ہیں کہ یہ ملٹری کو لانے اور لے جانے کے لیے ہی مخصوص ہوتی ہے اور اس میں سویلین لوگ سفر نہیں کر سکتے۔ اصل میں اسے اسٹیشنل اس میں سفر کرنے والے بناتے ہیں، چونکہ اس میں سارے اپنی ہی یونٹ کے لوگ ہوتے ہیں، اس لیے یہ سارا سفر ہی پکنک بن جاتا ہے، ورنہ تو سہولتوں کا فقدان اسے سفر سے ”سفرنگ“ بنا دیتا ہے۔

ساہیوال سے لاہور چھوٹا سا سفر ہے، اس لیے ٹرین سے جانا مناسب نہ تھا۔ سامان کا جانا ہی مسئلہ تھا، اس لیے اسے ٹرک سے لے جانے کا فیصلہ کیا گیا، بقول ڈاکٹر یونس پٹ ”سفر میں سب سے بھاری سامان بیوی ہی ہوتی ہے۔“ لیکن ہم نے انہیں کار ہی میں لے جانا مناسب سمجھا۔ مقررہ تاریخ پر میں نے اکیلے ہی یونٹ میں رپورٹ کی، گھر وغیرہ ٹھیک کر آیا اور پھر کوئی ہفتے بھر بعد فیملی کو بھی لاہور شفٹ کر لیا۔ ہمارا یہ ہفتہ آفیسرز میس میں گزرا۔ بال بچوں کے ساتھ کافی عرصہ گزارنے کے بعد چھٹروں کے میس میں رہنا بھی بڑی عیاشی ہوتی ہے، شادی کے بعد تو یہ موقع کم ہی نصیب ہوتا ہے اور پھر یہ سینک کڑا کر پچھڑوں میں شامل ہونے والی بات ہوتی ہے۔

یونٹ جانے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی، ہم بھی لگ گئے۔ میں اس سے پہلے کئی یونٹوں میں سروس کر چکا ہوں، اس لیے یونٹ کی زندگی کوئی نئی چیز نہیں تھی، لیکن اس یونٹ میں مجھے کچھ عجیب سی محسن اور خوف کی فضا محسوس ہوئی۔ سب لوگ مجھے خوف زدہ سے اور جلدی میں محسوس ہوئے، جیسے کوئی لاشی لے کر ان کے پیچھے لگا ہوا ہو۔ مجھے یہاں کوئی بھی خوش دلی اور شوق سے کام نہ کرتا ہوا نظر نہ آیا، بلکہ مجھے تو ایسا لگا کہ جیسے لوگ مجبوراً کر رہے ہوں۔ اس لیے کام بھی یہاں ”ڈنگ شاؤ“ یعنی وقت گزاری کے طور پر ہی ہو رہے تھے۔ اگر شوق اور جذبہ نہ ہو تو کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مجھے اس کی وجہ بھی جلد ہی معلوم ہو گئی۔ اس کی اصل وجہ یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر کرل انور احمد خان تھے، جنہیں لوگوں کو اذیت میں مبتلا رکھنے میں شاید مزا آتا تھا۔ میں نے انہیں کسی سے بھی سیدھے منہ بات کرتے ہوئے بھی نہ دیکھا۔ وہ اپنے سے جو نیئر کو تو انسان ہی نہیں سمجھتے تھے۔

فوج میں طریقہ ہے کہ ہر نئے آنے والے افسر کا کمانڈنگ افسر سے انٹرویو ہوتا ہے۔ انٹرویو تو ہمارا بھی ہوا تھا لیکن عجیب و غریب، خواہ مخواہ کی کشیدگی کے ماحول میں جیسے کوئی پرانی ناراضگی ہو۔ ذرا بھی اپنائیت اور خوشی کا اظہار نہ کیا گیا تھا۔ لہجہ بالکل روکھا اور خشک جیسے مجبوراً ملے ہوں۔ گردن ایسی اکڑی ہوئی جیسے اس میں سر پانٹ ہو، یہی ماحول یونٹ میں ہر طرف نظر آیا۔ مجھے تو یقین

نہیں آتا تھا کہ صرف ایک شخص کی وجہ سے پوری یونٹ کا ماحول اتنا کشیدہ ہو سکتا ہے، لیکن آنکھوں سے دیکھا تھا اس لیے جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

جب کوئی ملٹری یونٹ کسی کینٹ سے رخصت ہوتی ہے تو اسے بڑے پر تکلف اور متاثر کن انداز میں "بینڈ باجے" کے ساتھ رخصت کیا جاتا ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ بینڈ باجا تو خوشی کے موقع پر بجایا جاتا ہے، یہ تو الوداعی پروگرام ہے، اس میں پھر بینڈ باجا کیسا، کہیں یونٹ سے جان تو نہیں چھڑائی جارہی تھی، لیکن ہر موقع کے لیے ملٹری بینڈ کی علیحدہ دھن ہوتی ہے۔ اگر خوشی کی ہے تو غم کی بھی ہے، استقبال ہے تو الوداعی بھی ہے۔ ایسے موقع پر الوداعی دھنیں بجائی جاتی ہیں۔ یہ الگ چیز ہے کہ ان الوداعی دھنوں پر بھی لوگ ناچتے ہیں۔ اس یونٹ کا بھی پلیٹ فارم پر ہی سارا الوداعی پروگرام ہوا۔ پر تکلف چائے وغیرہ دی گئی۔ اس میں شرکت کے لیے کافی لوگ آئے ہوئے تھے۔ سب کچھ ہو گیا تھا بس آخری مرحلہ رہ گیا تھا، وہ تھا رخصت کرنے والوں اور رخصت ہونے والوں کے ہاتھ ہلانے اور خدا حافظ کہنے کا، لیکن یہ مرحلہ کافی لمبا ہو گیا۔ ٹرین چلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی، ہم رخصت ہونے والوں سے زیادہ تو رخصت کرنے والے بے چین ہوں گے، کہیں ٹرین چلے تو وہ بھی فارغ ہو کر گھروں کو جائیں یا کوئی اور کام کریں۔

ملٹری اسٹیشن کا یہ بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ نام تو اس کا اسٹیشن ٹرین ہے، لیکن ترجیحات میں یہ سب سے آخر میں آتی ہے۔ پہلے عام مسافر ٹرینیں گزاری جاتی ہیں، پھر جب سب گزر جاتی ہیں تو پھر اس کی باری آتی ہے۔ سب کی طرح فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بیٹھے ہوئے کرل صاحب بھی ٹرین کے چلنے میں تاخیر کی وجہ سے سخت بے چین تھے، بلکہ وہ دوسروں سے زیادہ مضطرب تھے۔ وہ شاید اپنی طبیعت کے علاوہ اپنے مہمان کی وجہ سے بھی بڑی سخت محسوس کر رہے ہوں، جو انہیں رخصت کرنے آیا ہوا تھا۔ یہ ادھیڑ عمر کا لمبا چوڑا اور قدرے موٹا سا شخص تھا، جسے ہم میں سے کوئی بھی نہیں پہچانتا تھا۔ شلوار قمیص پر واسکٹ پہنے اس شخص کو اس کے ضرورت سے زیادہ عاجزانہ اور خوشامد انداز روئے کی وجہ سے سب نے ہی نوٹ کیا۔ اسی شخص کو میں نے آج

گڈی کے ساتھ دیکھا تھا۔ مجھے ڈنٹے کے سامنے سے گزرتے دیکھ کر کرل صاحب نے روانگی میں تاخیر کی وجہ معلوم کرنے کے لیے کہا۔ میں نے پتا کیا تو اسٹیشن والوں کے پاس بڑا آسان سا جواب تھا کہ فلاں ٹرین آرہی ہے وہ گزر جائے تو چلا تے ہیں۔ یہی جواب میں نے کرل صاحب کو بتا دیا۔ کرل صاحب کی حالت کا سب کو اندازہ تھا، وہ کس قدر خون کے گھونٹ پی رہے ہوں گے، لیکن کہہ ہی کیا سکتے تھے۔ کس کو جھاڑیں، کس کی بے عزتی کریں، یہ کوئی فوج تو تھی نہیں کہ ان کی تھانیداری چلتی اور ریلوے والے ان کے ماتحت تو تھے نہیں جن پر وہ رعب جھاڑتے، خدا خدا کر کے ٹرین چلی تو دونوں طرف سے ہاتھ ہلائے گئے۔ خدا حافظ اور خدا ہی حافظ کے جملوں کا تبادلہ ہوا۔ ہم لوگ مسکراہٹوں کے سائے میں روانہ ہوئے۔

ٹرین تیسرے دن آرام سے روٹی سسکتی کوئٹہ پہنچی، کیوں کہ ریلوے والوں کو کوئی جلدی تھی اور نہ ہی ہمیں، اس طرح کے دیرسور سے ہماری صحت پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ دیر ہو بھی جاتی تو نہ ریلوے والوں کا کچھ بگڑتا تھا نہ ہمارا۔ یہ تو ایسا سفر تھا کہ جس کی منزل کہیں بھاگ کر نہیں جاسکتی تھی، بلکہ یوں کہیے کہ خود ہمارا سفر ہی منزل تھا۔ ریلوے والوں کو پتا تھا کہ وہ ملازم سرکار کے ہیں۔ اگر یہ سفر، یہ ڈیوٹی ختم ہوگئی تو کوئی دوسری شروع ہو جائے گی، پھر ہم نے بھی تو وہاں یہی کچھ کرنا تھا جو ہم ٹرین میں کر رہے تھے۔ وہاں بھی پریڈیں ہی تھیں، یہاں بھی پریڈیں ہی ہیں۔ یاد رہیں فوج بھی آغاز سے انجام تک پریڈ ہی رہتی ہے، راستے میں جہاں بھی کھانے کا وقت ہوتا، ٹرین سائینڈ پلیٹ فارم پر روک دی جاتی۔ کھانا پکنا اور پھر منظم طریقے سے سب کو کھلایا جاتا۔ یہ سب کچھ بھی پریڈ ہی کی طرح ہوتا تھا، پھر کھانے پینے کے بعد ریلوے والوں کو بتا دیا جاتا تھا کہ ہم لوگ روانگی کے لیے تیار ہیں تو وہ ٹریفک اور موقع دیکھ کر ٹرین پھر سے روانہ کر دیتے۔

ٹرین روکنا ہمارے اختیار میں تھا، لیکن چلانا ریلوے والوں کے اختیار میں۔ ویسے تو لاہور سے روانہ ہونے سے پہلے بہت سے پروگرام وغیرہ بنے تھے، لیکن سب دھڑے کے دھڑے رہ گئے۔ ٹرین جہاں بھی رکتی

کوہ گراں بن جاتی، پھر وہاں سے اس کا چلنا بھی جاں سے گزرتا ہی ہوتا۔

سفر کے دوران وقت گزاری کے لیے کرل صاحب کے سوا سب ہی ڈبوں میں تفریحی پروگرام چلتے رہے۔ اس میں آفیسر فیلڈ میس خاص طور پر متحرک رہی۔ ہر یونٹ میں ایک فیلڈ میس ہوتی ہے جس کا کام جنگ، جنگی اور تربیتی مشقوں اور سفر وغیرہ میں افسروں کے طعام اور تفریح وغیرہ کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ ان کے پاس کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ تفریح کا بھی کافی سامان ہوتا ہے، مثلاً ٹیلی ویژن، وی سی آر، ناش، ڈرافٹ اور شطرنج وغیرہ۔ اس کے علاوہ اگر کہیں جانا ہو تو سفر اور علاقے کی ضروریات کے مطابق اور چیزیں بھی رکھ لی جاتی ہیں۔ اس سفر کے دوران اسے بھی خدمت کا خوب موقع ملا۔ کرل صاحب البتہ نہ خود ڈبے سے باہر نکلے اور نہ کسی نے ان کے ڈبے میں جانے کی جرات کی، لیکن ٹرین روکنے اور چلانے کے لیے ان سے اجازت اگر لی جاتی تھی یا پھر پروگرام میں اگر کوئی تبدیلی ہوتی تو انہیں رپورٹ کی جاتی تھی۔ اس زمانے میں موبائل فون وغیرہ تو ہوتے نہیں تھے، اس لیے متعلقہ اسٹاف کو رپورٹ کے لیے خود جانا پڑتا تھا۔ وقتوں کے دوران میس اسٹاف انہیں کھانا اور چائے وغیرہ ڈبے میں ہی دے جاتا۔ اگر انہیں کچھ کہنا ہوتا یا کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ فیلڈ میس فون پر کہہ دیتے تھے۔ اس طرح وہ بھی خوش تھے اور ہم بھی، وہ بھی آرام سے تھے اور ہم لوگ بھی، اس موقع پر مجھے نمبر جعفری کا شعر یاد آتا ہے۔۔۔۔۔

میری بیوی قبر میں کیٹی ہے جس ہنگام سے وہ بھی ہے آرام سے اور میں بھی ہوں آرام سے کوئٹہ میں استقبال پر پروگرام بھی ویسا ہی پر تکلف تھا جیسا کہ لاہور کا الوداعی پروگرام تھا، بس فرق تھا تو صرف چہروں کا یا چائے کا اہتمام کی جگہ کا۔ کوئٹہ میں چائے کا انتظام پلیٹ فارم کی بجائے یونٹ کے اپنے علاقے میں کیا گیا تھا۔ لاہور سے کچھ عرصہ پہلے بھی گئی ایڈوانس پارٹی نے رہائش وغیرہ کا یہاں سب انتظام کیا ہوا تھا۔ استقبال پر پروگرام کے بعد سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ قسطنطنیہ شروع میں اکٹھی رکھی گئیں، پھر جیسے جیسے گھر ملتے گئے، لوگ اپنے اہل خانہ کو شفٹ کرتے گئے۔ جب

ہماری باری آئی تو ہم بھی شفٹ کر گئے۔ یونٹ میں سب افسروں اور ان کے گھروالوں کے درمیان بہت قریبی تعلقات ہوتے ہیں۔ وہ آپس میں بالکل رشتے داروں کی طرح ہو جاتے ہیں۔ یہاں بھی ہم سب گویا رشتے دار ہی بن گئے تھے اور لوگوں کا ایک دوسرے کے یہاں بالکل اسی طرح آنا جانا تھا جیسے رشتے داروں میں ہوتا ہے، سوائے کرل صاحب اور ان کی فیملی کے۔ انہوں نے خود ہی فاصلہ اتار رکھا ہوا تھا یونٹ میں بھی اور گھروں میں بھی۔ اہل خانہ میں تو فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ ایک دوسرے کو پہچانتے بھی مشکل سے ہی تھے۔ ان کی بیگم بھی ہماری بیگمات سے ایسے ہی ملتیں جیسے کمانڈنگ افسر ہوں۔

فوج میں دستور ہے کہ جو بھی نیا افسر یونٹ میں آئے تو اسے اپنی فیملی کے ساتھ کمانڈنگ افسر کے گھر ایک دفعہ ضرور جانا ہوتا ہے۔ اس کے بعد کا آنا جانا تعلقات کی نوعیت پر ہے۔ دستور کے مطابق ہم بھی کرل صاحب کے گھر گئے، لیکن یہ ہمارا پہلا اور آخری وزٹ ثابت ہوا۔ اس کے بات نہ بھی میرا دل ان سے ملنے کو چاہا اور نہ ہی میرے اہل خانہ کا اور قریباً سب ہی افسروں کے ساتھ یہی صورت حال تھی۔ یہ بھی دستور ہے کہ اگر کوئی افسر اہل خانہ کے ساتھ کمانڈنگ افسر کے گھر جائے تو جواباً کمانڈنگ افسر کو بھی اس افسر کے گھر جانا ہوتا ہے، لیکن ہمارے کمانڈنگ افسر نے کبھی اس کی زحمت ہی نہ کی۔

سنائے کہ انہوں نے مہمانوں کو دو درجوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ یونٹ کے افسر اور عام لوگ نچلے درجے میں آتے تھے، جن سے وہ باہر لان میں یا ایک عام سے کمرے میں ملتے تھے، جبکہ بڑے لوگوں اور سینئر افسروں کے لیے ایک خاص ڈرائنگ روم مخصوص تھا۔ ان کے اس رویے کی وجہ سے یونٹ میں نیچے سے اوپر تک سب ہی نے اظہار نفرت کے لیے ان کے مختلف نام رکھے ہوئے تھے۔ کوئی انہیں "مشکی" کہتا تھا تو کوئی "کالاناگ" اور کوئی "فرعون" سب ہی نام ان کی رنگت، اکڑی ہوئی گردن اور ان کے رویے کی وجہ سے معروف تھے۔

یونٹ میں ہر روز گیارہ بجے "ٹی بریک" ہوتا ہے، جس میں سب افسر اکٹھے چائے پیتے ہیں۔ ایک دن ٹی بریک کے دوران ان کا بھی کوئی بے تکلف دوست آیا ہوا تھا، جس کی وجہ سے وہ بھی "بے تکلف" موڈ میں تھے، جو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فوراً سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کا کردار ”نوری نت“ یاد آ گیا۔ وہ بھی فلم میں ہیرو کے بھائی کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے۔ کرنل صاحب نے جس آرام، مزے اور فخر سے یہ داستان سنائی تھی، یوں لگا جیسے ہم سندھ کے کسی وڈیرے کی اوطاق یا جنوبی پنجاب کی کسی پنچایت میں بیٹھے ہوں۔ اس قصے کو سننے کے بعد کرنل صاحب کی دہشت تو اور بھی بیٹھ گئی، لیکن لوگوں کے درمیان ان سے نفرت اور فاصلہ اور بھی بڑھ گیا۔

کچھ عرصے بعد کرنل صاحب یونٹ سے غائب ہونے لگے۔ ویسے تو ان کی غیر حاضری مفاد عامہ میں تھی، اس لیے سب کو اچھی لگی، لیکن کچھ عجیب سی بھی لگی، پھر یہ غیر حاضریاں لمبی ہونے لگیں۔ وہ کئی کئی دن یونٹ سے غائب رہنے لگے۔ جب بھی آتے بھی تو پریشان نظر آتے۔ ان کا گرجنا برسا بھی کم ہو گیا تھا اور آہستہ آہستہ ان کی گردن سے سر یا بھی نکل گیا اور نظر بھی جھکی نظر آنے لگی۔ اب انہیں خدا بھی یاد آنے لگ گیا تھا اور عام لوگ بھی۔ یہ حال بھی ہو گیا کہ وہ لوگوں سے دعا کی درخواست بھی کرنے لگے۔ ہم لوگ ان میں اتنی بڑی بڑی تبدیلیاں دیکھ کر حیران تھے، لیکن جب حقائق کا پتا چلا تو ایمان تازہ ہو گیا۔

کرنل صاحب کا اگوتا بیٹا مری کے کسی کالج میں پڑھتا تھا۔ باپ کی طرح اس کی گردن میں بھی نہ صرف سر یا فٹ تھا، بلکہ اگوتا ہونے کی وجہ سے اس کا دماغ بھی کافی خراب تھا۔ اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی، جس کے نتیجے میں اس کے ہاتھوں ایک لڑکا قتل ہو گیا۔ دونوں باپ بیٹا اس قتل کے سلسلے میں ایسے پھنسے کہ پھر بھی نہ نکل سکے۔ کرنل صاحب نے بڑی کوشش کی، ہر طریقہ آزما دیا، روپیہ پانی کی طرح بہایا، سب کچھ داؤ پر لگا دیا، لیکن کوئی بھی طریقہ کامیاب نہ ہوسکا، کیوں کہ مخالف پارٹی بھی ان سے کم نہ تھی۔ اس نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ اس ایک واقعے نے انہیں توڑ کے اور برباد کر کے رکھ دیا۔ ان کا سارا غرور خاک میں مل گیا تھا۔ ان کی تنہی ہوئی گردن ایسی جھکی کہ پھر بھی نہ اٹھ سکی۔ کچھ عرصے بعد میری اس یونٹ سے باہر ٹرانسفر ہو گئی، بعد میں پتا چلا کہ کرنل صاحب نے بیٹے کی جان بچانے کے لیے اسے ملک سے کہیں باہر بھیج دیا اور خود بھی کہیں گوشہ گمانی میں چلے گئے۔

☆.....☆

وہ عموماً بہت کم ہوتے تھے۔ باتوں باتوں میں ان کے لاہور کے فارم کی بات چٹری، جو چلتے چلتے ان کے لاہور ریلوے اسٹیشن پر آئے مہمان تک جا پہنچی۔ کرنل صاحب نے بتایا کہ وہ ان کے لاہور بارڈر پر واقع ایگریکلچر فارم کا منیجر تھا۔ اس کے ضرورت سے زیادہ عاجزانہ اور خوشامدانہ رویے کی بات ہوئی تو کرنل صاحب ہنسنے لگے اور پھر یوں گویا ہوئے ”اس کا رویہ اب ہمیشہ ایسا ہی رہے گا، کیوں کہ میں نے اس کا کام ہی ایسا کیا ہے کہ اس کی گردن ہمیشہ نیچی ہی رہے گی۔“ ہم نے پوچھا تو انہوں نے اس کا قصہ بڑے فخر سے بتایا۔ کہنے لگے۔

”ایک دفعہ مجھے لاہور سے اس کا فون آیا کہ میں سخت مصیبت میں ہوں، خدا کے لیے میری مدد کریں۔ میں سمجھا شاید زمین کا کوئی مسئلہ ہے، اس لیے جلدی ہی اس کے پاس زمینوں پر چلا گیا۔ وہاں جا کر دیکھا تو اسے واقعی مصیبت میں مبتلا پایا، لیکن یہ زمین کا کوئی مسئلہ نہ تھا، بلکہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ گاؤں کے ایک بد معاش جوان نے اس کی بیٹی کو اغوا کر لیا تھا۔ وہ اتنا طاقتور اور اثر و رسوخ والا تھا کہ یہ اس کا اب تک کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا تھا۔ نہ تو ابھی تک اس کی بیٹی واپس ہوئی تھی اور نہ ہی اس کا بدلہ آ رہا تھا۔ اس مسئلے کی وجہ سے اس کی اتنی بے عزتی ہوئی تھی کہ وہ گاؤں میں چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ معاملہ واقعی بہت سنگین تھا۔ یہ صرف میرے منبر کی ہی بے عزتی نہیں تھی بلکہ میری اپنی بھی تھی، اس لیے میں نے ایسے اقدامات کا فیصلہ کیا کہ نہ صرف لڑکی ہی واپس ہو اور میرے منبر کی عزت بحال ہو، بلکہ علاقے میں میرا دبدبہ اور رعب بھی قائم ہو جائے، پھر ہوا بھی یہی، نہ صرف یہ کہ لڑکی واپس ہوگی، بلکہ وہ بد معاش بھی میرے قدموں میں آگرا۔“ ہم نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیا جادو کیا تھا۔“ تو انہوں نے بتایا کہ ”میں نے اسے علاقے سے بندے بلائے اور اس لڑکے کی ماں کو اغوا کر لیا۔ لڑکا خود ہی لڑکی کو لے کر میرے قدموں پر آگرا۔“ جب ہم نے پوچھا کہ آپ نے اس بد معاش کے ساتھ کیا سلوک کیا تو ان کی گردن اٹھ گئی اور بڑے فخر سے لہجے میں بولے۔

”کچھ بھی نہیں۔ میں نے بس اس کی ٹانگیں تڑوا دیں اور باہر پھینک دیا، تاکہ ہمیشہ یاد رکھے اور اس کی ماں کو بھی چھوڑ دیا۔“ اس موقع پر ہمیں پنجابی فلم ”مولا جٹ“